پاکستان کی سیاسی تاریخ 10

مشرقی پاکستان کی تحریکِ علیحدگی کا آغاز

زاہد چودھری

تکمیل و ترتیب: حسن جعفر زیدی

ادارہ مطالعۂ تاریخ

پاکستان کی سیاسی تاریخ

جلد 10

مشرقی پاکستان

کی تحریکِ علیحدگی کا آغاز

(1947ء - 1951ء)

زاہد چودھری

تکمیل و ترتیب:

حسن جعفر زیدی

ادارہ مطالعہ تاریخ

فہرست

باب 5: مرکزی حکومت کا بنگالی عوام کے سیاسی، معاشی و ثقافتی حقوق تسلیم کرنے سے انکار اور مسلم لیگ کی کوکھ سے عوامی مسلم لیگ کا جنم 161

باب6: صوبائی مسلم لیگ کی جانب سے معاشی، سیاسی، انتظامی وثقافتی خودمختاری کے مطالبات اور کراچی و پنجاب کا فسطائی رویہ 197

باب10: لیاقت علی اپنے قتل تک بھی مشرقی بنگال کونو آبادی بنا کر رکھنے کی ہٹ دھرمی پر قائم رہا 349

دیباچہ ایڈیشن دوم

دیباچہ ایڈیشن اوّل

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کو تقریباً 24 برس ہونے کو آرہے ہیں لیکن یہ سوال آج بھی جواب طلب ہے کہ مشرقی پاکستان کیوں علیحدہ ہوا؟ اس کی علیحدگی کا کون ذمہ دار تھا؟ کچھ لوگ مجیب الرحمن کو ذمہ دار گردانتے ہیں، کچھ بھٹو کو اور کچھ یحییٰ خان کو اور کچھ ان تینوں کو یا ان میں مختلف ترتیب سے دو دو کو۔ بعض کا خیال ہے کہ دراصل مشرقی بنگال کے ہندو پروفیسروں نے بنگالی نوجوانوں کو ورغلا لیا تھا جنہوں نے علیحدگی کی تحریک چلائی اور بھارت نے ان کی مدد کر کے تحریک علیحدگی کو کامیاب کروایا۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر امریکہ کا ساتواں بحری بیڑہ بروقت پہنچ جاتا تو بنگلہ دیش کبھی نہ بنتا، یہ سارا سی۔ آئی۔ اے کا کیا دھرا ہے، امریکہ نے پاکستان کو دھوکہ دیا اور پاکستان کو تقسیم کروادیا۔ بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سارا راز حمود الرحمن کمیشن رپورٹ میں موجود ہے، اگر اسے شائع کر دیا جائے تو علیحدگی کے ذمہ داروں کا پتہ چل جائے گا اور بعض حضرات تو یہاں تک کہتے ہیں کہ سارا قصور انتخابات کا ہے، اگر 1970ء میں انتخابات ہی نہ کروائے جاتے اور مارشل لاء کو طول دے دیا جاتا تو مشرقی پاکستان کو بزور شمشیر ساتھ رکھا جا سکتا تھا۔ دراصل یہ بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے لوگ اپنے گریبان میں جھانک کر نہیں دیکھنا چاہتے کیونکہ اگر وہ ایسا کریں تو خود ان کا اپنا چہرہ اس کی علیحدگی کی ذمہ داری کے داغ سے داغدار ہوا نظر آجائے گا۔ دراصل مشرقی پاکستان کی علیحدگی کوئی پوشیدہ راز نہیں ہے یہ ایک کھلی کتاب ہے، جسے پڑھنے کے لئے صرف اخلاقی جرأت کی ضرورت ہے۔

اس سے پیشتر نویں جلد میں تحریک پاکستان میں بنگالی مسلمانوں کا نمایاں کردار واضح

ہو کر سامنے آ چکا ہے۔ ہندو غلبہ سے نجات کے لئے بنگالی مسلمانوں کی فقید المثال جدوجہد کا ثمر جب قیام پاکستان کی صورت میں حاصل ہو چکا تو سب سے پہلے بنگالی مسلمانوں کو ہی اس ثمر سے محروم کرنے کی کوشش کی گئی۔ مغربی پاکستان میں واقع پاکستان کی مرکزی حکومت نے مشرقی بنگال کے ساتھ ایک نو آبادی کا سا سلوک کرنا شروع کر دیا۔ مسلح افواج کے دروازے ہمیشہ سے انگریزوں نے بنگالیوں کے لئے بند کر رکھے تھے کیونکہ بنگالیوں نے انگریزوں کے خلاف طویل مسلح جدوجہد کی تھی اور وہ وفاداری کے اس معیار پر پورے نہیں اترتے تھے جس پر پنجابی اتر چکے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد بھی یہ دروازے ان پر بند رکھے گئے۔ کہا گیا کہ وہ تعلیمی، جسمانی اور ذہنی طور پر اس معیار پر پورے نہیں اترتے جو مسلح افواج میں بھرتی کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ چنانچہ مشرقی پاکستان میں پنجابی فوجی افسر تعینات کئے گئے جو مقامی باشندوں سے انتہائی حقارت آمیز سلوک کرتے تھے۔ بقیہ ملازمتوں میں بنگالیوں کا دروازہ بند کرنے کے لئے ان پر اردو زبان مسلط کر دی گئی اور کہا گیا کہ پہلے وہ اردو پڑھنے لکھنے میں مہارت حاصل کریں تو پھر وہ ان ملازمتوں کے اہل ہوں گے۔ چنانچہ بہار کے تلیئر مقامی ملازمتوں پر چھا گئے اور بنگالی محروم رہے۔ بنگالیوں نے بنگلہ کو بھی سرکاری زبان قرار دلوانے کے لئے بڑی بھرپور تحریک چلائی۔ یہ تحریک اس قدر زوردار تھی کہ خواجہ ناظم الدین جیسے پٹھو قسم کے وزیر اعلیٰ نے بھی ان کے اس مطالبہ کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے لیکن مرکزی حکومت نے ان کا یہ جائز مطالبہ رد کر دیا۔ اس وقت مسلح افواج میں پنجابیوں کو اور بیوروکریسی میں تلیئروں کو بالادستی حاصل تھی۔ گویا پنجابیوں اور تلیئروں کو مرکزی حکومت کے دونوں اہم ستونوں پر غلبہ حاصل تھا اور وہ اس غلبہ کو برقرار رکھنے کے لئے ہر حربہ کے استعمال کو جائز سمجھتے تھے۔ جب بنگالی عوام ریاست کے اداروں میں اپنا جائز حصہ مانگتے اور اپنے سیاسی، معاشی اور ثقافتی حقوق طلب کرتے تو پنجابی شاونسٹوں اور تلیئروں کی جانب سے اسلام، اردو اور نظریۂ پاکستان کے نعروں کا سہارا لیا جاتا اور بنگالیوں پر اسلام اور پاکستان سے غداری کا الزام عائد کر دیا جاتا۔

مشرقی بنگال کو جو مخصوص جغرافیائی، علاقائی اور ثقافتی حیثیت حاصل تھی، اس کے تحت اسے خصوصی درجہ دینے کے بجائے اسے بھی سندھ، سرحد یا بلوچستان کی طرح ایک صوبہ گردانا گیا۔ وہاں پنجابی اور تلیئر فوجی اور سول بیوروکریسی کو تعینات کر کے سمجھا گیا کہ ملک کی یک جہتی کا

بندوبست کرلیا گیا ہے۔ حقیقتاً پاکستان کی سیاسی تاریخ کے ابتدائی چند ماہ کا مطالعہ ہی یہ بات واضح کردینے کے لئے کافی ہے کہ پنجابیوں اور تلیئروں نے بنگالیوں کو محکوم بنا کر رکھنے کا جو سامان کیا تھا وہ بہت عارضی تھا اور یہ انتظام زیادہ دیر چل نہیں سکتا تھا۔ بنگالیوں نے طویل جدو جہد کر کے ہندو غلبہ سے نجات اس لئے حاصل نہیں کی تھی کہ اب پنجابی اور تلیئر ان کے اوپر مسلط ہو جائیں اور انہیں سیاسی و معاشی سطح پر وہیں رہنے پر مجبور کیا جائے جہاں وہ قیام پاکستان سے پہلے تھے۔ اس غیر معقول صورت حال سے آزاد ہونے کی جدوجہد انہوں نے 1947ء کے اواخر سے ہی شروع کر دی تھی اور صاف نظر آتا تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت انہیں بزورِ شمشیر اپنے ساتھ رکھنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔

مشرقی پاکستان کے بارے میں جہاں اور بہت سا جھوٹا پروپیگنڈا کیا جاتا ہے، وہاں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بنگالی تو شروع سے بھوکے ننگے تھے اور مغربی پاکستان کے وسائل پر پلتے تھے، یہاں تک کہ سیلاب زدگان کی امداد کے لئے جو چندہ مغربی پاکستان سے جمع کر کے دیا جاتا تھا اس کا بھی بڑے تحقیر آمیز انداز میں ذکر کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بنگال کی سرزمین پر برصغیر کے دو بڑے دریاؤں گنگا اور برہم پتر کا ایک وسیع ڈیلٹا ہے۔ ہزاروں مربع میل پر پھیلا ہوا قدرتی آب پاشی اور زرخیز مٹی کا یہ خطہ سونا اگلتا تھا اور اسی لئے سونار بنگلہ (سنہرا بنگلہ) کہلاتا تھا۔ قرونِ وسطیٰ میں زرعی دولت سے ہی خوشحالی کو ناپا جاتا تھا۔ اس اعتبار سے اس زمانہ میں بنگال برصغیر کے خوشحال ترین علاقوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ یہاں جو بھی ایک مرتبہ آجاتا تھا، پھر واپس نہیں جاتا تھا۔ یہاں کی خوشحال زرعی معیشت نہ صرف خود کفیل تھی بلکہ زائد دولت بھی بڑی مقدار میں پیدا کرتی تھی۔ مغل سلطنت کے مرکزی خزانے میں سب سے زیادہ ریونیو بنگال سے جاتا تھا۔ یورپی تاجروں کے لئے برصغیر کا یہی خطہ سب سے پرکشش ثابت ہوا۔ راجستھان کے مارواڑی یہاں آکر جگت سیٹھ بن گئے جو ایسٹ انڈیا کمپنی، مغل شہنشاہ اور نواب کو قرضے دیا کرتے تھے۔ برطانوی استعماریوں اور راجستھانی مارواڑیوں نے اس خطہ کی دولت کو بے دریغ لوٹا اور یہاں سے سرمایہ مسلسل باہر منتقل کیا جس کی وجہ سے یہ خطہ قحط زدہ اور مفلوک الحال نظر آنے لگا۔ تاہم اس کے باوجود قیام پاکستان کے وقت پاکستان کی برآمدات کا سب سے بڑا حصہ مشرقی بنگال کا سنہری ریشہ یعنی پٹ سن تھی اور برآمدی تجارت سے حاصل ہونے والی آمدنی کا کثیر حصہ اسی سے حاصل

ہوتا تھا۔ مگر جب بنگالیوں کی طرف سے مطالبہ کیا جاتا تھا کہ جیوٹ بورڈ کو صوبائی تحویل میں دیا جائے اور پٹ سن سے حاصل ہونے والی آمدنی کو مشرقی بنگال کی ترقی پر خرچ کیا جائے، وہاں سکول اور ہسپتال کھولے جائیں، پل اور سڑکیں تعمیر کی جائیں تو ان پر صوبہ پرست ہونے کا الزام لگا کر ان کا یہ بے حد جائز مطالبہ بھی رد کر دیا جاتا تھا۔ مشرقی بنگال کابینہ کا وزیر خزانہ حمید الحق چودھری اسی مطالبہ کی پاداش میں برطرف کر دیا گیا اور اس پر بدعنوانی کا مقدمہ قائم کیا گیا۔ پٹ سن کی برآمدی آمدنی کو مرکزی حکومت نے کراچی کی تعمیر پر خرچ کیا اور مغربی پاکستان میں پبلک سکول، ملٹری اکیڈمی اور ٹریننگ سنٹر قائم کئے گئے۔ بنگال میں ایسا ایک سکول، اکیڈمی یا سنٹر نہ کھولا گیا۔ مغربی پاکستان میں پلوں اور سڑکوں کے جال بچھائے گئے۔ مشرقی پاکستان کو ایک پل بھی نہ نصیب ہوا۔ سڑکوں کی تعمیر یا بجلی گھروں کی تعمیر پر نہ ہونے کے برابر توجہ دی گئی۔

زیر نظر جلد میں اس موضوع پر پاکستان کے قیام کے بعد صرف ابتدائی چار برس یعنی اکتوبر 1951ء تک کے مواد کو پیش کیا گیا ہے۔ 1971ء تک بعد کے بیس برس کا مواد پیش کرنے کے لئے مزید کئی جلدیں درکار ہیں۔ تاہم اس جلد میں اس تضاد کا بنیادی ڈھانچہ ابھر کر سامنے آ جاتا ہے جو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا سبب بنا۔ اس کے بعد کے برسوں کا مواد اس تضاد کی گہرائی کو واضح کرتا چلا جائے گا اور زیر نظر جلد کے Thesis کو مزید گہرا کرتا چلا جائے گا۔

پاکستان کی سیاسی تاریخ میں قومیتوں کے تضاد کو بہت بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اسی تضاد کی وجہ سے 1971ء میں ملک تقسیم ہوا اور آج بھی ملک میں مختلف قومیتی تضاد سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ حکمران طبقوں نے شروع ہی سے قومیتی تضاد کو اول تو تسلیم ہی نہیں کیا اور اگر مجبوراً کبھی تسلیم کیا بھی تو اسے بالادست قومیت کے حق میں حل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ یہ تضادات بڑھے، گھٹے نہیں۔ ہم نے اس سلسلۂ اشاعت کی گزشتہ کئی جلدوں میں پنجابی، مہاجر، سندھی، بلوچی اور پختون قومیتوں کے تضادات کو ملک کی تاریخ کے بنیادی تضادات کے طور پر پیش کیا ہے اور نویں اور دسویں جلدیں بنگال کے قومیتی مسئلہ کو واضح کرنے کے لئے پیش کی گئی ہیں تا کہ نہ صرف مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے وابستہ سوالات کا جواب مل جائے بلکہ پاکستان کی سیاست کے سب سے اہم سوال یعنی قومیتی سوال کا احاطہ بھی مکمل ہو جائے۔ اس ملک کا مستقبل اسی سوال کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔

اس جلد کی تیاری میں بھی میرے معتمد ترین دوست خالد محبوب نے اخبارات کی فائلوں سے مواد جمع کرنے سے لے کر پروف ریڈنگ اور اشاریہ کی تیاری تک بھرپور حصہ لیا ہے۔ سمیع اللہ ظفر نے بھی حتی المقدور وقت نکال کر طباعت و اشاعت کے بارے میں مفید مشورے دیئے ہیں۔ ڈاکٹر مبشر حسن صاحب، میاں دلاور محمود صاحب، شیخ منظور صاحب، خورشید عالم صاحب، محمد اورنگ زیب صاحب، صفدر قریشی صاحب، حسین نقی صاحب، مہدی حسن صاحب، قمر عباس صاحب اور ثائر علی صاحب اس تحقیقی منصوبے کی جس خلوص اور شفقت کے ساتھ سرپرستی کر رہے ہیں اس کے بغیر ان جلدوں کی تکمیل اور اشاعت ممکن نہ تھی۔ مصطفی وحید صاحب اس تحقیقی کاوش کو جس لگن اور شوق کے ساتھ طباعت اور اشاعت کے مراحل سے گزار کر قارئین تک پہنچا رہے ہیں وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ ان کے برادر عزیز آصف جاوید اور معاون نعیم احسن ہر جلد کی تزئین اور آرائش کا کام خوب سے خوب تر کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ہر جلد پہلے سے زیادہ دیدہ زیب نظر آئے۔

حسب سابق اس جلد کے ماخذ بھی زیادہ تر اوریجنل ہیں یعنی زیادہ سے زیادہ مواد کے لئے اخبارات کی فائلوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ان میں سب سے اہم ماخذ حمید الحق چودھری (سابق وزیر خزانہ مشرقی بنگال) کا ڈھاکہ سے نکلنے والا اخبار پاکستان آبزرور ہے جس کی فائلیں کراچی کی ہمدرد لائبریری میں موجود ہیں، جہاں سے مواد جمع کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں پاکستان ٹائمز، امروز، نوائے وقت، ڈان، سول اینڈ ملٹری گزٹ اور انقلاب کی فائلوں سے مواد حاصل کیا گیا ہے۔ جن لائبریریوں سے استفادہ کیا گیا ان میں پنجاب پبلک لائبریری لاہور، پاکستان ٹائمز ریفرنس سیکشن، نوائے وقت ریکارڈ روم، ہمدرد لائبریری کراچی، عجائب گھر لائبریری لاہور اور ریسرچ سوسائٹی لائبریری پنجاب یونیورسٹی شامل ہیں۔ ان کے لائبریرین حضرات اور متعینہ عملہ کے افراد نے جس خلوص کے ساتھ تعاون کیا اس کے لئے میں اور خالد محبوب ان کے بے حد ممنون ہیں۔

گزشتہ نو جلدوں کی قارئین نے جس بھرپور طریقے سے پذیرائی اور سرپرستی کی ہے اس کے بعد دسویں جلد کے لئے ان کے اشتیاق اور شوق میں مزید اضافہ قابل فہم ہوگا۔ میں دسویں جلد کو پیش کرتے ہوئے اپنے قارئین کا بے حد ممنون ہوں جن کی حوصلہ افزائی نے مجھے دس جلدوں کی تکمیل

کے قابل بنایا۔ تاہم اس جلد میں اگر کوئی غلطی یا کوتاہی رہ گئی ہے تو میں اس کا ذمہ دار ہوں اور اپنے قارئین سے اس سلسلے میں رہنمائی چاہتا ہوں تا کہ آئندہ ایڈیشن میں اس کمی کو پورا کر دیا جائے۔

لاہور

اگست 1995ء

حسن جعفر زیدی

باب: 1

نااہل اور غیر مقبول ناظم الدین وزارت اور بنگالیوں پر غیر بنگالی افسروں اور اردو کو مسلط کرنے کی ابتدا

مشرقی اور مغربی پاکستان کے مابین جغرافیائی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی اختلافات کی وسیع خلیج

مشرقی بنگال میں علاقائی خودمختاری کی تحریک ابتدا ہی سے سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد سے زیادہ زوردار تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مغربی پاکستان اور مشرقی بنگال کے درمیان نہ صرف فاصلہ بہت زیادہ تھا بلکہ ملک کے ان دونوں علاقوں میں جغرافیائی، تاریخی، نسلی، سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی لحاظ سے بھی زمین و آسمان کا فرق تھا۔ یہ فرق اتنا زیادہ اور نمایاں تھا کہ برصغیر اور غیر ممالک کے دور اندیش سیاسی مبصرین کی رائے یہ تھی کہ اگر برصغیر کے مسلم اکثریتی علاقوں کی مملکت خداداد پاکستان ہندوستان کے توسیع پسند حکمران طبقوں کے زبردست سیاسی، معاشی اور فوجی دباؤ کے باوجود زندہ رہی تو بھی اس مملکت کے دونوں علاقے، بے شمار داخلی تضادات کے باعث، زیادہ دیر اکٹھے نہیں رہ سکیں گے۔ بعض باخبر عناصر کو بھی اپنے ملک کے ان دونوں علاقوں کے درمیان ہم آہنگی اور یکسانیت کی عدم موجودگی کا علم تھا اور ان کے اس علم میں یہ خطرہ مضمر تھا کہ محض اسلام اور مسلم قومیت کے نعروں کے زور پر قومی یک جہتی کو زیادہ دیر تک برقرار نہیں رکھا جا سکے گا۔

چودھری محمد علی مغربی پاکستان اور مشرقی بنگال کے درمیان ہر قسم کی اجنبیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''پاکستان اس لحاظ سے ایک منفرد ملک ہے کہ اس کے دو حصے ہیں جو برابر کے اہم ہیں اور ان کے درمیان ایک ہزار میل چوڑا غیر ملکی علاقہ حائل ہے...... آزادی کے

وقت کل آبادی 7 کروڑ 40 لاکھ تھی (جو 1951ء میں بڑھ کر 75842000 ہوگئی تھی۔ اس میں مشرقی پاکستان کی آبادی 42063000 نفوس پر مشتمل تھی اور مغربی پاکستان کی آبادی کے افراد کی تعداد 33779000 تھی)۔ مشرقی پاکستان کا رقبہ 55 ہزار مربع میل ہے اور مغربی پاکستان کا رقبہ 3 لاکھ 10 ہزار مربع میل ہے۔ اس طرح مشرقی پاکستان اگرچہ رقبہ کے لحاظ سے مغربی پاکستان کے چھٹے حصے کے برابر ہے لیکن اس کی آبادی مغربی پاکستان سے قدرے زیادہ ہے۔ دونوں خطوں کے قدرتی خصائص بھی ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ مشرقی پاکستان کی آب وہوا گرم مرطوب ملکوں کی سی ہے۔ اوسطاً 88 انچ سالانہ بارش ہوتی ہے۔ اس کی بیشتر زمین ہموار ہے۔ درحقیقت یہ ایک زیر تشکیل ڈیلٹا ہے۔ گنگا اور برہم پتر کے عظیم دریائی سلسلے، جو خلیج بنگال میں جا کر گرتے ہیں، ہر سال لاکھوں ٹن گار پھیلا کر زمین کی زرخیزی بڑھاتے ہیں۔ ہزاروں ندیاں ہیں جو آمدورفت کا ذریعہ ہیں۔ البتہ گاہے گاہے تند طوفان، موسلا دھار بارش اور خلاف معمول سیلاب وسیع علاقوں کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ زمین کی زرخیزی اور گرم مرطوب آب وہوا نے سارے خطے کو سبزہ زار بنا دیا ہے۔ سب سے اہم فصلیں چاول اور پٹ سن ہیں۔ شمال اور مشرق کی جانب پہاڑی علاقوں میں چائے کاشت کی جاتی ہے۔ گرم ملکوں کے پھل مثلاً کیلا، اناناس اور ناریل افراط سے ہوتے ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے مشرقی پاکستان دنیا بھر میں ایک گنجان ترین خطہ ہے۔ آبادی کی اوسط شرح 922 کس فی مربع میل تک ہے۔ بعض حصوں میں آبادی کی شرح ڈیڑھ ہزار کس فی مربع میل تک ہے۔ مغربی پاکستان منطقہ حارہ کے شمال میں واقع ہے، یہاں بارش کی اوسط سالانہ شرح 12 انچ ہے۔ گرمیوں میں سخت گرمی اور سردیوں میں سخت سردی پڑتی ہے۔ اس کے وسیع علاقے صحرا یا بے آب وگیاہ پہاڑ ہیں جو زیادہ آبادی کی کفالت نہیں کر سکتے۔ اس میں آبادی کی اوسط شرح 138 کس فی مربع میل ہے۔ زراعت کا زیادہ تر انحصار نہری آبپاشی پر ہے۔ شمال میں اونچے پہاڑوں سے کئی دریا نکلتے ہیں جو بحیرہ عرب میں جا گرتے ہیں۔ جو علاقے ان دریاؤں کی نہروں سے سیراب ہوتے ہیں ان میں زرعی خوشحالی کا دور دورہ ہے۔ اگر کافی پانی میسر آ جائے تو زیر کاشت رقبہ کو دگنا کیا جا سکتا ہے۔ سیم اور تھور کی غارت گری سے زیر کاشت اراضی میں ہر سال 75 ہزار ایکڑ کی کمی ہو جاتی ہے اور وسیع علاقوں کی زرخیزی بھی کم ہو جاتی ہے۔ مغربی پاکستان کی بڑی فصلیں گندم اور کپاس ہیں۔ گنے، چاول، مکئی

اورتمباکو کی بھی کاشت کی جاتی ہے۔ سنگتروں اور آموں کے باغات افراط سے ہیں۔ تقسیم کے وقت کلکتہ کے ہندوستان کو دیئے جانے سے مشرقی پاکستان کو نقصان عظیم پہنچا۔ غیر منقسم بنگال کے 90 فیصد صنعتی ادارے کلکتہ میں تھے یا اس کے قریبی علاقوں میں جو مغربی بنگال کا حصہ بن گئے۔ تقسیم کے وقت غیر منقسم بنگال کے صنعتی کارکنوں میں سے صرف 5 فیصد مشرقی پاکستان میں تھے۔ کارخانے، بینک، بیمہ کمپنیاں، تجارتی ادارے، درآمدی و برآمدی کمپنیاں، مواصلاتی مراکز، بجلی گھر اور اعلیٰ تعلیمی ادارے سب کے سب کلکتہ میں تھے جو غیر منقسم بنگال کا دارالحکومت تھا اور اس کی بڑی بندرگاہ تھا۔ غیر منقسم ہند کو دنیا بھر میں خام پٹ سن کی قریب قریب مکمل اجارہ داری حاصل تھی۔ اسی سنہری ریشہ کی 75 فیصد فصل اور تمام تر اعلیٰ اقسام ان علاقوں میں پیدا ہوتی تھیں جو مشرقی پاکستان میں شامل ہوئے لیکن مشرقی پاکستان میں پٹ سن کا ایک بھی کارخانہ نہیں تھا اور گانٹھیں باندھنے والی مشینیں بھی بس چند ایک ہی تھیں۔ مشرقی پاکستان میں پیدا ہونے والی پٹ سن تقریباً تمام تر کلکتہ بھیج دی جاتی تھی جہاں بہت سی جیوٹ ملوں میں اس سے بوریاں یا دوسری مصنوعات تیار کی جاتی تھیں یا گانٹھیں باندھنے کے بعد اسے بحری جہازوں کے ذریعے برآمد کر دیا جاتا تھا۔ پٹ سن ہی مشرقی پاکستان کی سب سے اہم زرآور فصل ہے اور کاشتکاروں کی خوش حالی کا انحصار اس کی قیمت فروخت پر ہے لیکن اس معاملے میں وہ بڑی حد تک کلکتہ کی منڈی کے اتار چڑھاؤ کے رحم وکرم پر ہوتے تھے جہاں سٹہ باز اور برآمد کنندگان پٹ سن کے کاشتکاروں کی کمائی سے ہاتھ رنگتے تھے۔ مشرقی پاکستان میں صرف ایک بندرگاہ چٹاگانگ میں تھی جو ایک چھوٹی سی بندرگاہ تھی اور اس میں سالانہ صرف پانچ لاکھ ٹن سامان کی درآمد کی گنجائش تھی۔ مغربی پاکستان میں سب سے اہم زرآور فصل کپاس ہے اور اسے کم وبیش وہی حیثیت حاصل ہے جو مشرقی پاکستان میں پٹ سن کو ہے۔ مغربی پاکستان کا حصہ بننے والے علاقوں میں غیر منقسم ہند کی چالیس فیصد کپاس پیدا ہوتی تھی...... لیکن پارچہ بافی کے 394 میں سے 380 کارخانے ہندوستان میں تھے اور صرف 14 پاکستان میں...... مغربی پاکستان فاضل اناج پیدا کرتا تھا۔ پنجاب کی نو آبادیوں میں سے ہند کے کم پیداواری علاقوں حتیٰ کہ انتہائی جنوب میں واقع مدراس تک کو گندم بھیجی جاتی تھی۔ لیکن مشرقی پاکستان میں اس کی بنیادی غذا چاول کی کمی تھی...... مواصلات کا مسئلہ غیر معمولی طور پر اہم تھا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان مسافت فضا میں 1200 میل اور

سمندر کے ذریعے 3000 میل تھی۔

مشرقی اور مغربی بنگال کے مابین رابطہ قائم کرنا ایک فوری ضرورت تھی......کلکتہ اور اس کی سہولتوں سے محروم ہونے کے بعد مشرقی پاکستان کا سب سے اہم مسئلہ مواصلات اور برقی طاقت جیسے بنیادی ڈھانچہ کی تخلیق تھا......اولین کام چٹاگانگ کی بندرگاہ کو جدید خطوط پر ترقی دینا اور اس کی توسیع کرنا تھا......ریلوے کی پٹریاں اور انجن دوسری جنگ عظیم میں برما محاذ کے لئے فوجی رسد اور فوجوں کی بھاری نقل وحمل کے باعث بری طرح گھس چکے تھے۔وسیع پیمانے پر نئے ساز وسامان کی ضرورت تھی۔کوئلے کی کمی بھی نازک صورت اختیار کر رہی تھی۔دریائی مواصلات جو مشرقی پاکستان کی معیشت میں بہت اہمیت رکھتے تھے ابتر حالت میں تھے۔جوائنٹ سٹیم شپ کمپنی جو سب سے بڑا مواصلاتی ادارہ تھا اس کے صدر دفاتر کلکتہ میں تھے۔مغربی پاکستان میں صورتحال نسبتاً بہتر تھی۔ پنجاب اور اس کے ہمسایہ علاقوں میں نہایت وسیع فسادات سے پیدا شدہ بدنظمی کے باوجود نارتھ ویسٹرن ریلوے، مہاجرین کی بے پایاں آمدورفت کے مسئلہ سے عہدہ برآ ہونے میں کامیاب ہوگئی کراچی کی بندرگاہ میں اگرچہ مرمت اور توسیع درکار تھی لیکن فوری ضروریات پوری کرنے کے لئے وہ کافی تھی۔سڑکوں کے معاملے میں بھی مغربی پاکستان کی حالت مشرقی پاکستان کے مقابلہ میں بہتر تھی۔مغربی پاکستان میں سڑکوں کا سلسلہ برصغیر میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھا، ایک حد تک اس کی وجہ فوجی تقاضے تھے۔اس کے برعکس مشرقی پاکستان میں ایک تو پتھر کمیاب ہے اور دوسرے وہاں ہموار میدان میں بے شمار ندیاں چکر کھاتی ہوئی بہتی ہیں۔اس لئے سڑکوں کی تعمیر ایک مشکل اور گراں کام ہے۔ چنانچہ وہاں اندرونی آمدورفت کی بیشتر ضروریات ہزاروں کی تعداد میں کشتیوں سے ہی پوری ہوتی ہیں......ملک بھر میں بجلی کی کل نصب شدہ قوت 75028 کلوواٹ تھی جس میں مشرقی پاکستان میں نصب شدہ قوت صرف 15600 کلوواٹ تھی۔[1]

چودھری محمد علی کی طرح پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ جغرافیہ کا سربراہ ڈاکٹر قاضی سعید الدین احمد بھی اس حقیقت سے باخبر تھا کہ پاکستان کے مشرقی اور مغربی خطے جغرافیائی، ثقافتی معاشی، سیاسی اور انتظامی لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔وہ جانتا تھا کہ مغربی پاکستان کا وسیع وعریض علاقہ 3069777 مربع میل پر مشتمل ہے لیکن اس کی آبادی صرف 30258000

افراد کی ہے۔اس کے برعکس مشرقی پاکستان کا کل رقبہ صرف 54030 مربع میل ہے لیکن اس کی
آبادی 41845000 نفوس کی ہے۔ بالفاظ دیگر مشرقی پاکستان علاقے کے لحاظ سے پاکستان
کے کل رقبہ کا ساتواں حصہ ہے جبکہ اس کی آبادی کل سات افراد میں سے تقریباً چار کی ہے۔مغربی
پاکستان کے چاروں صوبوں اور ریاستوں کی کل آبادی صوبہ مشرقی بنگال کی آبادی کا دوتہائی ہے
ان دونوں خطوں کے درمیان سمندری فاصلہ تقریباً 2500 میل ہے یعنی اتنا ہی جتنا کہ کراچی اور
سویز کے درمیان ہے۔ پاکستان کا دارالخلافہ مغربی پاکستان میں ہے جس کی آبادی مشرقی پاکستان
سے کم ہے لیکن یہ فوجی اور معاشی اعتبار سے زیادہ اہم ہے۔ ان جغرافیائی عوامل کو پیش نظر رکھا
جائے تو ہماری پوزیشن دنیا کے سارے ممالک سے منفرد دکھائی دیتی ہے۔ ایک یونٹ یعنی مشرقی
بنگال، جہاں تک پہنچنے کے لئے سمندری راستے سے آٹھ دن کا سفر کرنا پڑتا ہے، آبادی کے لحاظ
سے بقیہ سارے ملک پر غالب ہے اور یہ حقیقت جمہوری آئین میں نہایت اہمیت کی حامل ہونی
چاہیے۔مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے درمیان جغرافیہ، آب وہوا اور نسلی اعتبار سے کوئی
مماثلت نہیں ہے۔مشرقی پاکستان بہت حد تک ایک جغرافیائی وحدت ہے جبکہ مغربی پاکستان کے
مختلف میدانی اور پہاڑی علاقے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان علاقوں کی لمبائی تقریباً ایک
ہزار میل ہے اور ان میں نہ صرف آب وہوا اور جغرافیائی خدوخال مختلف النوع کے ہیں بلکہ ان کے
معاشرتی اور معاشی حالات بھی یکساں نہیں ہیں۔مغربی اور مشرقی پاکستان کے ثقافتی عوامل میں
سب سے اہم حقیقت یہ ہے کہ مغربی پاکستان کی بہت بھاری اکثریت مسلمان ہے جبکہ مشرقی
پاکستان کی 30 فیصد آبادی غیر مسلموں کی ہے۔ اگرچہ مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کا مذہبی
عقیدے اور تاریخ کے لحاظ سے ہمارے ساتھ گہرا ربط ہے لیکن وہ لسانی لحاظ سے اور کسی حد تک
ثقافتی لحاظ سے مغربی پاکستان سے مختلف ہیں۔مغربی پاکستان کی خشک سرزمین اپنی فالتو گندم،
کپاس اور کھالوں کی وجہ سے معاشی لحاظ سے مشرقی پاکستان کی نمدار سرزمین کی کمی پوری کرتی ہے
جہاں پٹ سن، چائے، کھالوں اور تمباکو کی فراوانی ہے۔لہٰذا ملک کے آئین میں اس بات کو یقینی
بنانا چاہیے کہ دونوں خطے اپنی قدرتی آب وہوا سے پوری طرح مستفید ہوں اور نتیجتاً ان کے
درمیان معاشی توازن پیدا ہو...... اگر مشرقی پاکستان کی خصوصی پوزیشن کا مناسب لحاظ نہ رکھا گیا تو
اس امر کا امکان ہے کہ وہاں علیحدگی کے رجحانات پیدا ہو جائیں۔" [2]

مشرقی پاکستان کے ممتاز سیاسی لیڈر، ڈپلومیٹ اور دانشور قمر الدین احمد کے نقطۂ نگاہ سے تو پاکستان قومی تعمیر کی تاریخ میں ایک انوکھے تجربے کی حیثیت رکھتا تھا کیونکہ اس کے دونوں علاقوں کے درمیان پندرہ سو میل کا غیر ملکی علاقہ تھا اور ان میں کوئی چیز بھی مشترک نہیں تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ ''آب وہوا اور زندگی کے دوسرے حالات کے مختلف ہونے کے باعث مشرقی بنگال کے عوام سارے معاشرتی پہلوؤں کے لحاظ سے مغربی خطے کے عوام سے بالکل مختلف ہیں۔ دونوں میں سے ہر علاقے کی خوراک، ان کا لباس اور ان کے مکانات مخصوص نوعیت کے ہیں۔ مغرب کی پہاڑی اور خشک سرزمین اور مشرق کی برساتی سرزمین کے مابین آب وہوا اور ارضی ہیئت کے اختلاف کے باعث دونوں خطوں کی ذہنی صلاحیتوں اور دنیاوی نظریے کی نشوونما بھی مختلف طریقے سے ہوئی ہے۔ معاشی لحاظ سے مشرقی خطہ مغربی خطے سے مختلف ہے۔ مغربی خطے کے سارے معاشی ڈھانچے کی بنیاد قرون وسطیٰ کے نیم جاگیرداری نظام پر ہے جبکہ مشرقی خطے میں نوآبادیاتی طاقت نے 1793ء میں دائمی بندوبست اراضی کے ذریعے جو نیم جاگیرداری نظام نافذ کرنے کی کوشش کی تھی اس کی یہاں کے درمیانہ طبقہ نے ابتدا ہی سے مزاحمت کی تھی۔ آزادی کے وقت مشرقی بنگال ایک ترقی پذیر زرعی ملک تھا جس میں صنعت کاری شروع ہو چکی تھی جبکہ مغربی خطے کی معیشت دیہی تھی اور اس کا زرعی نظام ترقی پذیر تھا۔ مشرقی خطے کی زرعی پیداوار زیادہ تر پٹ سن، چاول اور چائے پر مشتمل تھی اور سالہا سال تک یہ واحد علاقہ تھا جہاں سے ساری دنیا کو پٹ سن برآمد ہوتی تھی۔ مغرب میں کپاس، گندم اور مکئی پیدا ہوتی تھی۔ چونکہ دونوں علاقوں کے معاشی ڈھانچے ایک دوسرے سے مختلف تھے اور ان کی زرعی پیداوار بھی ایک جیسی نہیں تھی اس لئے یہ ناگزیر تھا کہ دونوں میں مختلف معاشی مسائل پیدا ہوں اور ان کے معاشی ڈھانچے بھی مختلف ہوں...... مشرقی بنگال میں ایک چھوٹا سا جوشیلا اور درمیانہ طبقہ ہے جو روایت پسند ملاؤں اور پیروں کے علاوہ رشوت خور، سازشی اور مجمع گیر سیاسی لیڈروں اور قدرتی ذرائع اور صنعتوں کا استحصال کرنے والوں کی گرفت سے نجات حاصل کر کے اپنے معاشرے کو جدید سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ جہاں کے اہل علم ودانش بھی اردو بولنے والے مغربی پاکستان میں ضم نہ ہونے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں اور وہ اپنی بنگالی زبان کو جدید بنانا چاہتے ہیں۔ انہیں اپنی تاریخ، ادب اور فن پر ناز ہے۔ آزادی سے پہلے مغربی پاکستان اور شمالی ہندوستان کے دوسرے علاقے تقریباً ایک سو سال

تک برطانوی راج کو مسلح افواج مہیا کرتے رہے تھے۔ ان علاقوں کے امیر وغریب، سبھی لوگ مسلح افواج سے تنخواہوں، پنشنوں اور دوسرے مختلف قسم کے انعامات سے مستفید ہوتے رہے ہیں۔ ان میں سے بیشتر لوگ بیرکوں میں زندگی گذارنے کے عادی تھے اس لئے ان میں غور وفکر کی ایسی صلاحیت نہیں تھی جیسی کہ ایشیا کے دوسرے علاقوں کے لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ انہوں نے یورپی عادات اور آداب کو اپنا لیا ہوا تھا اور وہ غور وفکر کے مقابلے میں عمل کی جانب زیادہ مائل تھے۔ فوجی تربیت کے باعث ان میں نظم وضبط زیادہ تھا اور وہ اپنے مستقبل کو سنوارنے پر یقین رکھتے تھے۔ افکار ونظریات ان کے مقصد کی راہ میں حائل نہیں ہوتے تھے۔ دنیا کے سارے غیر ہندو ممالک میں مشرقی بنگال میں ہندوؤں کی آبادی کا تناسب سب سے اونچا ہے اور سارے غیر بدھ ملکوں میں سے یہاں بدھوں کی آبادی کا تناسب بلند ترین ہے لیکن مغربی پاکستان میں مذہبی اقلیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ مغربی پاکستان کے صوبے 1921ء تک نان ریگولیٹڈ تھے یعنی ان میں سارے انتظامی اور عدالتی اختیارات ڈپٹی کمشنر کی ذات میں مرتکز تھے۔ جبکہ بنگال ریگولیٹڈ صوبہ تھا جہاں شہریوں کے حقوق کی پوری طرح توضیح کی گئی تھی اور افسروں کے اختیارات پر پابندی عائد تھی۔"[3]

قمر الدین احمد کی طرح مشرقی بنگال سے پاکستان دستور ساز اسمبلی کا ایک ممتاز رکن ابوالمنصور احمد بھی اس رائے کا حامل تھا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے لوگوں کے مابین جغرافیائی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی اختلافات کی خلیج اس قدر وسیع ہے کہ انہیں ایک قومیت کی لڑی میں پرونا تقریباً ناممکن ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ "قرارداد لاہور کی بنیاد مخصوص جغرافیائی پوزیشن پر تھی۔ یہ جغرافیائی پوزیشن کیا ہے؟ پاکستان ایک منفرد ملک ہے جس کے دونوں حصوں کے درمیان تقریباً ایک ہزار میل کا فاصلہ ہے۔ دنیا میں کوئی ایسا ملک نہیں ہے جس کا اس قسم کا مخصوص جغرافیہ ہو۔ صرف یہی نہیں۔ یہ دونوں خطے سارے معاملات میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ بجز دو چیزوں کے یعنی یہ کہ مشرقی پاکستان کے لوگوں کے ایک حصے کے سوا ان کا مذہب مشترکہ ہے اور یہ کہ ہم نے مشترکہ جدوجہد کے ذریعے آزادی حاصل کی ہے۔ صرف یہی دونوں چیزیں ہیں جو پاکستان کے دونوں حصوں کے مابین مشترک ہیں۔ ان دونوں چیزوں کے سوا باقی سارے عوامل یعنی زبان، روایت، ثقافت، لباس، رسم ورواج، خوراک، کیلنڈر اور سٹینڈرڈ ٹائم وغیرہ مختلف ہیں۔ درحقیقت ان دونوں خطوں کے درمیان کوئی چیز بھی مشترک نہیں ہے۔ بالخصوص وہ سارے عوامل

ناپید ہیں جن کا وجود ایک قوم کی تشکیل کے لئے لازمی ہوتا ہے...... یہ ایک ایسا ملک ہے جو دراصل ایک ملک نہیں ہے۔ ہم دو ملکوں پر مشتمل ایک ریاست بنا رہے ہیں اور ہم دو قوموں کو ملا کر ایک قوم بنا رہے ہیں۔"[4]

لیکن ان سب باتوں کے باوجود قائداعظم محمد علی جناح کو یقین تھا کہ ان دونوں دور افتادہ علاقوں میں مشترکہ مذہب کی وجہ سے حکومت کی وحدت قائم رہ سکے گی۔ انہوں نے 19رفروری 1948ء کو آسٹریلیا کے عوام کے نام ایک نشری تقریر میں کہا کہ "مغربی پاکستان کو ہندوستان کے تقریباً ایک ہزار میل علاقے نے مشرقی پاکستان سے علیحدہ کر رکھا ہے۔ باہر کے ملک کے ہر طالب علم کے ذہن میں جو پہلا سوال پیدا ہوسکتا ہے وہ یہ ہے کہ...... یہ کیونکر ممکن ہے؟ اس قدر علیحدہ اور دور افتادہ علاقوں میں حکومت کی وحدت کیسے قائم رہ سکتی ہے؟ میں اس سوال کا صرف ایک لفظ سے جواب دے سکتا ہوں۔ یہ "یقین" ہے۔ قادر مطلق پر، اپنے آپ پر اور اپنے مقدر پر یقین۔ ہم میں سے بھاری اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ ہم اپنے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں۔ ہم ایسی اسلامی برادری کے رکن ہیں جس میں حق، وقار اور عزت نفس کے اعتبار سے سب برابر ہیں۔ نتیجتاً ہم میں اتحاد کا بہت گہرا اور خصوصی شعور ہے لیکن اس بنا پر کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ پاکستان میں ملائیت یا اس قسم کی کوئی چیز نہیں ہے۔ اسلام ہمیں دوسرے مذاہب کے بارے میں رواداری سکھاتا ہے اور ہم یہاں ہر مذہب کے ایسے لوگوں سے قریب ترین رابطہ کا خیر مقدم کرتے ہیں جو پاکستان کے سچے اور وفادار شہری کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کرنا چاہتے ہیں۔ مزید برآں صرف یہی نہیں کہ ہم میں بھاری اکثریت مسلمانوں کی ہے بلکہ ہماری اپنی تاریخ، رسومات و روایات ہیں اور ایسے افکار، نظریات اور طبعی رجحانات ہیں جن سے ایک قومیت کے شعور کی تشکیل ہوتی ہے۔"[5]

سہروردی کے بجائے ناظم الدین کا بطور وزیراعلیٰ تقرر یا انتخاب؟ خودمختاری کی تحریک کا نقطہ آغاز

قائداعظم جناح کو یہ یقین اس حقیقت کے باوجود تھا کہ جب انہوں نے اپنی یہ تقریر ریکارڈ کروائی تھی اس سے کئی ماہ پہلے مشرقی بنگال میں خودمختاری کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ اس

تحریک کی بنیاد دراصل قیام پاکستان کے قیام سے ہفتہ عشرہ قبل 5 اگست 1947ء کو کلکتہ میں ہی رکھ دی گئی تھی جبکہ متحدہ بنگال کے وزیر اعلیٰ حسین شہید سہروردی کی بجائے خواجہ ناظم الدین کا مشرقی بنگال کی مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے قائد کے طور پر انتخاب ہوا تھا اور پھر قیام پاکستان کے بعد سہروردی کے 9 جولائی 1948ء کے بیان کے مطابق قائد اعظم نے ''نہ صرف خواجہ ناظم الدین کو مشرقی بنگال کی گدی پر پوری طرح مسلط کر دیا تھا بلکہ اس کی اپوزیشن کا خاتمہ کر دیا تھا۔''

ایس۔ ایم۔ اکرام کہتا ہے کہ تحریک پاکستان میں حسین شہید سہروردی کی گراں قدر خدمات کے باوجود خواجہ ناظم الدین کے اس انتخاب کی ایک وجہ یہ تھی کہ مولانا اکرم خان کے علاوہ قائداعظم کے رفیق خاص ایم۔ اے۔ ایچ۔ اصفہانی نے سہروردی سے سیاسی عناد کی بنا پر خواجہ ناظم الدین کو کامیاب کرانے کے لئے اپنے پورے ذرائع استعمال کئے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ سلہٹ کے 17 ارکان اسمبلی نے خواجہ ناظم الدین کے حق میں ووٹ دیئے تھے حالانکہ خواجہ 1945ء کے بعد عملی سیاست سے کنارہ کش ہو چکا تھا اور وہ صوبائی اسمبلی کا رکن بھی نہیں تھا اور تیسری وجہ یہ تھی کہ سہروردی نے اپنی بے تدبیری کی وجہ سے اپنی کابینہ کے دو ارکان فضل الرحمان اور حمید الحق چودھری کو ناراض کر رکھا تھا اور جب 5 اگست 1947ء کو انتخاب ہوا تھا تو ان دونوں کے ووٹ کی حیثیت فیصلہ کن عنصر کی ہو گئی ہوئی تھی۔ قائداعظم اس انتخاب میں بالکل غیر جانبدار تھے اور انہوں نے اپنے 28 جولائی 1947ء کے بیان میں صوبائی اسمبلی کے ارکان کو پورا حق دیا تھا کہ وہ جسے چاہیں اپنا لیڈر منتخب کریں۔''[7] تاہم سہروردی اور اس کے گروپ کو صحیح یا غلط طور پر یہ شکایت تھی کہ خواجہ ناظم الدین کو لیگ ہائی کمان نے مشرقی بنگال کی وزارت اعلیٰ کی گدی پر مسلط کیا تھا۔

ناظم الدین کو وزارت کی تشکیل میں دشواری اور غذائی قلت کے مسئلہ کا سامنا

مذکورہ شکایت کا پہلا نتیجہ 15 اگست 1947ء کو ہی برآمد ہو گیا جبکہ ڈھاکہ میں خواجہ ناظم الدین کی سہ رکنی کابینہ نے حلف وفاداری اٹھایا۔ وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین کے علاوہ دو وزراء نور الامین اور حمید الحق چودھری تھے۔ نور الامین کو سول سپلائیز کا محکمہ دیا گیا تھا جبکہ حمید الحق چودھری کے سپرد تعلیم، تجارت، محنت اور مواصلات کے محکمے کئے گئے تھے۔ باقی سارے محکمے خواجہ ناظم الدین نے اپنے پاس ہی رکھے تھے کیونکہ اسے اپنی کابینہ مکمل کرنے میں مشکل پیش آ

رہی تھی۔ وزارت کے امیدوار زیادہ تھے اس لئے خواجہ کو خدشہ تھا کہ جن امیدواروں کو کابینہ میں شامل نہیں کیا جائے گا وہ سہروردی گروپ کے ساتھ مل کر اس کی مخالفت کریں گے۔ ان کی یہ مخالفت ابتدا ہی میں بڑی مؤثر ہوسکتی تھی کیونکہ نواکھلی، چٹاگانگ اور بعض دوسرے علاقوں میں سیلاب کے باعث پورے مشرقی بنگال میں غذائی صورتحال اتنی خطرناک ہوگئی تھی کہ خواجہ ناظم الدین کو حلف وفاداری اٹھانے کے چند دن بعد ہی چاول کی درآمد کا فوری بندوبست کرنے کے لئے کراچی جانا پڑا تھا۔ 25/ اگست کو اسی کا کراچی میں بیان یہ تھا کہ ''اس سیلاب سے تقریباً 500 مربع میل علاقے کی فصل تباہ ہوگئی ہے اور اس طرح مشرقی بنگال میں اناج کی جو خطرناک کمی ہو گئی ہے اسے دور کرنے کے لئے تقریباً ایک لاکھ ٹن چاول کی فوری طور پر ضرورت ہے۔'' اس نے مزید بتایا کہ ''پٹ سن کا نرخ بھی 35 روپے سے کم ہو کر 20 روپے فی من ہو گیا ہے۔'' اس کے اس بیان کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان قائم ہوتے ہی مشرقی بنگال کے غریب کسانوں کی معاشی حالت بہت ابتر ہوگئی تھی۔

قدرتی طور پر مشرقی بنگال کی اس قسم کی سیاسی اور معاشی صورتحال کے باعث وزیراعلیٰ خواجہ ناظم الدین کو خاصی پریشانی لاحق تھی۔ اس کی اس پریشانی میں اسی دن یعنی 25/ اگست کو ہی مزید اضافہ ہوگیا جبکہ پاکستان کی مرکزی حکومت کے وزیر تعلیم فضل الرحمان نے ڈھاکہ میں ایک تقریر کے دوران یہ کہا کہ ''پاکستان میں ایک سنٹرل ایڈمنسٹریٹو سروس قائم ہوگی اور اس میں صوبہ پرستی کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ کسی کو کسی وزیر پر انحصار نہیں کرنا چاہیے بلکہ ہر ایک کو ملک کے لئے اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔ مختلف صوبوں میں ذریعہ تعلیم صوبائی زبان ہوگی لیکن بین الصوبائی مواصلات کے لئے ایک زبان ہوگی۔ ابھی اس زبان کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہوا لیکن میرا خیال ہے کہ یہ زبان اردو ہوگی۔'' [8]

انتظامیہ اور مسلح افواج میں بنگالیوں کے لئے گنجائش پیدا کرنے کے بجائے تمام اعلیٰ عہدوں پر غیر بنگالیوں کا تقرر

فضل الرحمان کی مذکورہ تقریر نے مشرقی بنگال کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کے کان کھڑے کر دیئے۔ انہیں اس ایک تقریر سے تین خدشے لاحق ہوگئے۔ ایک خدشہ تو یہ تھا کہ انہیں

مرکزی ملازمتوں میں حصہ نہیں ملے گا اور اگر وہ اپنے حصہ کا مطالبہ کریں گے تو ان پر صوبہ پرستی کا الزام عائد کیا جائے گا۔ دوسرا خدشہ یہ تھا کہ اردو زبان کو قومی زبان قرار دے دیا جائے گا جبکہ وہ اس زبان کی ابجد سے بھی ناواقف تھے اور تیسرا خدشہ یہ تھا کہ پاکستان کی مسلح افواج میں بھی ان کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ 21 راگست 1947ء کے ایک اعلان کے مطابق کراچی کو پاکستان کی بحری فوج کا ہیڈ کوارٹرز بنا دیا گیا تھا جبکہ مشرقی بنگال میں کوئی فوجی کالج قائم کرنے کی بھی کوئی تجویز زیر غور نہیں تھی۔

ستمبر کے اوائل میں ان کے ان خدشات میں بڑھ کر شدت پیدا ہوگئی کہ صوبائی حکومت کے سارے محکموں کی تقریباً ساری کلیدی آسامیوں پر غیر بنگالیوں کا تقرر ہوا ہے۔ چیف سیکرٹری انڈین سول سروس کا ایک پنجابی افسر عزیز احمد تھا جس نے پہلے ہی دن سے اپنی فرعون مزاجی اور سامراجی ذہنیت کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ محکمہ سول سپلائیز کا سیکرٹری ایک اور پنجابی افسر این۔ ایم۔ خان تھا جس کی ہر بات اور ہر حرکت سے پنجابی شاونزم کا اظہار ہوتا تھا۔ ان کے علاوہ جی۔ اے۔ فاروقی، ایچ۔ ایس۔ ایم۔ اسحاق، حامد علی، ایم۔ اے۔ اصفہانی اور اسی قسم کے دوسرے بہت سے غیر بنگالی افسر بڑی بڑی کرسیوں پر براجمان تھے۔ ان افسروں میں سے کوئی ایک بھی بنگالی زبان نہیں جانتا تھا اس لئے ان کا مشرقی بنگال کے عوام سے کوئی رابطہ نہیں ہوسکتا تھا۔

بنگالیوں کی جانب سے غیر بنگالی تقرریوں کے خلاف ایجی ٹیشن کا آغاز اور کراچی و پنجاب کے حکمران طبقوں کی بے حسی اور بیگانگی پر مبنی دلیلیں

ڈان کی 9 ستمبر 1947ء کی ایک رپورٹ کے مطابق ڈھاکہ میں یہ تاثر پیدا ہو گیا تھا کہ مشرقی بنگال عہدوں کے متلاشیوں کے لئے ایک شکار گاہ بن گیا ہے۔ رپورٹ میں مزید کہا گیا تھا کہ ”آج کل پبلک سروس کمیشن کے سیکرٹری کے عہدہ پر ایک نوجوان پروفیسر کے تقرر کے خلاف ایجی ٹیشن ہو رہی ہے۔ قبل ازیں اس عہدہ پر ہمیشہ بنگالی سول سروس یا بنگال ایجوکیشن سروس کے کسی سینیئر رکن کا تقرر ہوا کرتا تھا۔ مثلاً اس عہدے پر خان بہادر فخر الدین جیسی شخصیتیں فائز رہی ہیں لیکن اب یہ عہدہ ایک نہایت نوعمر پروفیسر کو دیا جا رہا ہے جس کا جواز صرف یہ ہے کہ وہ غیر

بنگالی ہے۔ بدقسمتی سے غیر بنگالی حکام مقامی عوام میں پیدا شدہ اس قسم کے شکوک وشبہات کو دور کرنے کے لئے کچھ نہیں کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس وہ اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھ کر بنگالیوں کی بیگانگی کے احساس میں اضافہ کر رہے ہیں۔"[9]

قیام پاکستان کے صرف ایک ماہ بعد ڈان میں اس قسم کی رپورٹ سے کراچی کے ارباب اقتدار اور پنجاب کے حکمران طبقوں کو فوراً چوکنا ہو جانا چاہیے تھا مگر ان کے ذاتی، علاقائی اور طبقاتی مفادات کی وجہ سے ان کے کانوں میں جوں تک نہ رینگی۔ جب بھی ان کی توجہ مشرقی بنگال کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کی اس شکایت کی طرف مبذول کرائی جاتی تھی تو وہ اسے بے جا قرار دینے کے لئے یہ کہتے تھے کہ تقسیم کے وقت انڈین سول سروس میں مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والا صرف ایک افسر تھا۔ انڈین پولیس میں چند افسر تھے اور ان سے بھی کم تر دوسری اعلیٰ سروسوں میں۔ باقی مسلمان افسر یا مغربی پاکستان سے تعلق رکھتے تھے یا مسلم اقلیتی صوبوں سے آئے تھے۔ اگرچہ اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو مشرقی یا مغربی پاکستان میں جانے کا مساوی حق حاصل تھا لیکن ان میں سے زیادہ تر مغربی پاکستان میں آباد ہوئے اور بہت جلد عام آبادی میں گھل مل گئے۔ ہر دور میں مغربی پاکستان کو برصغیر کے دروازہ کی حیثیت حاصل رہی تھی۔ باہر سے لوگ یہاں کثیر تعداد میں آتے رہے ہیں اور نسلوں اور ثقافتوں کی اس کٹھالی میں مدغم ہوتے رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان برصغیر کے پرلے سرے پر ہونے کے باعث نسبتاً محفوظ تھا اور اس لئے الگ تھلگ تھا۔ اس طرح مشرقی پاکستان نے بنگال سے باہر کے علاقوں سے آنے والے ہر شخص کو...... خواہ وہ سرکاری افسر تھا یا تاجر...... مغربی پاکستانی قرار دیا۔ چنانچہ مغربی پاکستان اور ہندوستان کے اقلیتی صوبوں کے افسروں کو ایک ہی کھاتے میں جمع کر دیا گیا۔"[10] لیکن ان مفاد پرست عناصر نے کبھی ان سوالات پر خلوص نیت سے غور نہیں کیا تھا کہ مشرقی بنگال کے مخصوص جغرافیائی، تاریخی، سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی حالات کے پیش نظر چھوٹے بڑے غیر بنگالی افسروں کی وساطت سے وہاں نظم ونسق کب تک قائم رکھا جا سکتا تھا؟ وہاں کے غریب عوام کو کس طرح ترقی کی راہ پر ڈالا جا سکتا تھا؟ محض اسلام و مسلم قومیت کے سہارے ملک کے ان دونوں دور افتادہ علاقوں کے مابین قومی یک جہتی کتنی دیر تک قائم رکھی جا سکتی تھی؟ اور وہاں کے سیاسی طور پر باشعور عوام برطانوی راج کی جگہ پنجابی راج کو کب تک برداشت کر سکتے تھے؟

کراچی میں حکومت کی سر پرستی میں انجمن ترقی اردو کا قیام، اس کے ردعمل میں ڈھاکہ میں ''تمدن مجلس'' کا قیام اور بنگالیوں پر اردو ٹھونسنے کی مخالفت

جس دن روزنامہ ''ڈان'' کے دفتر میں متذکرہ خبر موصول ہوئی تھی اس سے دو ایک دن پہلے کراچی میں انجمن ترقی اردو کا قیام عمل میں آ چکا تھا اور اس سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ مشرقی پاکستان کے درمیانہ طبقہ کے خدشات بے بنیاد نہیں تھے۔ سندھ کے وزیر تعلیم پیر الٰہی بخش کی زیر صدارت اس انجمن کے قیام کی تقریب میں تقریباً 50 سرکاری حکام اور دوسرے ممتاز شہریوں نے شرکت کی تھی جن میں سندھ یونیورسٹی کا وائس چانسلر پروفیسر حلیم بھی شامل تھا۔ اس انجمن کا واحد مقصد یہ بیان کیا گیا تھا کہ یہ پورے پاکستان میں اردو زبان کا پرچار کرے گی اور اس مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے پیر الٰہی بخش، پروفیسر حلیم، بیگم حبیب الرحمان، محمد دین تاثیر اور وقار عظیم پر مشتمل ایک سب کمیٹی قائم کی گئی تھی۔ وزیر اعظم لیاقت علی خان کا اس انجمن کے کار پردازان کے نام پیغام یہ تھا کہ ''یہ امر بالکل مناسب ہے کہ کراچی کو پاکستان کی انجمن ترقی اردو کا مرکز بنایا جائے کیونکہ قیام پاکستان کے بعد اس شہر کو ایک نئے سیاسی اور معاشی مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ اب وقت کا تقاضا یہ ہے کہ کراچی ہمارے ثقافتی مرکز کا بھی کردار ادا کرے۔ اردو زبان ہمارے ثقافتی ورثہ کی محافظ رہی ہے اور اس سے بین الاقوامی رابطہ کی تشکیل ہوئی ہے۔ صدیوں سے عرب، مصر اور ایران ہماری اس روایت کا سرچشمہ رہے ہیں جس کی امرا نے تعمیر کی ہے۔ میری دعا ہے کہ یہ انجمن اردو کی تبلیغ کر کے پاکستان اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کے درمیان رابطہ کو تقویت پہنچائے۔'' پاکستان کے وزیر مواصلات سردار عبدالرب نشتر کا پیغام یہ تھا کہ ''اردو زبان کی تبلیغ اور اس کی نشوونما کو یقینی بنانے کے پروگرام کو ان تعمیری سرگرمیوں کا حصہ ہونا چاہیے جو قیام پاکستان کے بعد شروع ہوئی ہیں۔'' سندھ کے گورنر سر غلام حسین ہدایت اللہ نے بھی اپنے پیغام میں پاکستان میں انجمن ترقی اردو کے قیام کی پرزور حمایت کی۔''[11]

جب اس انجمن کے قیام اور اس کے نام وزیر اعظم لیاقت علی خان کے عجیب و غریب پیغام کی خبر ڈھاکہ میں پہنچی تو وہاں کی یونیورسٹی کے بعض اسلام پسند اساتذہ نے اپنی ایک ''تمدن مجلس'' قائم کر لی جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ بنگالی زبان کے تحفظ و فروغ کے لئے مناسب اقدامات

کرے گی۔ پروفیسر مطاہر حسین اس مجلس کی روح رواں تھا۔ ان مسلمان اساتذہ کو وزیر اعظم لیاقت علی خان کے اس موقف سے اتفاق نہیں تھا کہ اردو زبان پاکستان کے عوام کے ثقافتی ورثہ کی محافظ رہی ہے اور اس سے بین الاقوامی رابطہ کی تشکیل ہوئی ہے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ پاکستان کی آبادی میں اردو بولنے والوں کا تناسب 7.2 فیصد سے زیادہ نہیں ہے اس لئے اس زبان کو پاکستانی عوام کے ثقافتی ورثہ کی محافظ قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔ ملک میں بنگالی بولنے والوں کا تناسب 54.6 فیصد ہے۔ ان سب پر اسلام اور پان اسلام ازم کے نام پر اردو زبان ٹھونسی نہیں جاسکتی۔

اناج کی قلت اور گرانی کے خلاف نوجوانوں کی ڈیموکریٹک یوتھ لیگ کا قیام، ناظم الدین وزارت میں توسیع

ڈھاکہ کے سیاسی مبصرین کو حیرت تھی کہ کراچی کے افسروں اور دوسرے ''ممتاز'' شہریوں کی جانب سے ایسے وقت میں اردو زبان کی ترویج کے مسئلہ کو ایک اہم قومی مسئلہ بنایا جارہا تھا جبکہ مشرقی بنگال کے کئی علاقوں میں اناج کی شدید قلت پیدا ہو چکی تھی۔ لاہور کے اخبار پاکستان ٹائمز کی 12 ستمبر کی رپورٹ یہ تھی کہ ''جیسور کے شہر میں چاول کا بھاؤ بہت مہنگا ہو گیا ہے اور اس ضلع کے دوسرے علاقوں میں اس کی قیمت عوام کی قوت خرید سے باہر چلی گئی ہے۔ کئی علاقوں میں بھاؤ 30 روپے فی من تک پہنچ گیا ہے جس کے نتیجے میں بہت سے لوگ دو وقت کا کھانا نہیں کھاسکتے۔ وہ آج کل 24 گھنٹے میں صرف ایک مرتبہ کھانے پر اکتفا کرتے ہیں۔ راج باڑی (فرید پور) میں چاول کا بھاؤ 42 روپے من تک پہنچ گیا ہے اور سب کھیرا (چالنا) میں اس کا بھاؤ 22 روپے من ہے۔ اس مہنگائی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ آڑھتی اپنا مال منڈی میں نہیں لاتے'' اور پھر 13 ستمبر کو ڈان میں ایک صوبائی وزیر حمید الحق چودھری نے متنبہ کیا کہ اگر انٹرنیشنل فوڈ بورڈ نے 31 اکتوبر سے پہلے 25 ہزار من اناج مہیا نہ کیا تو مشرقی پاکستان میں قحط پڑ جائے گا۔ اس نے اپنے انٹرویو میں مزید کہا کہ آج کل مشرقی بنگال میں 65 ہزار من اناج کی کمی ہے۔ ''قیمتیں بہت بڑھ گئی ہیں اور بعض اضلاع میں تو چاول 50 روپے فی من کے حساب سے بک رہا ہے۔''

اس صورت حال کے پیش نظر ڈھاکہ کے نوجوانوں نے 8 ستمبر کو ایک نوجوان صدیق احمد کی زیر صدارت ایک غیر فرقہ وارانہ جماعت ڈیموکریٹک یوتھ لیگ قائم کی تھی جس کا نصب

العین یہ تھا کہ وہ بلا لحاظ مذہب و ملت مشرقی بنگال کے عوام کی معاشی، سیاسی اور تعلیمی ترقی کے لئے کام کرے گی۔"[12] نوجوانوں کی اس جماعت کا قیام اس امر کی علامت تھا کہ چاول اور پٹ سن کا بحران عنقریب سیاسی بحران کو جنم دے گا۔ چنانچہ وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین نے اس خطرے کا سد باب کرنے کے لئے 12 ستمبر کو اپنی سہ رکنی کابینہ میں چار نئے وزراء کا اضافہ کر دیا۔ اب اس کی کابینہ کے سات وزراء کے نام اور محکمے یہ تھے۔

1۔ خواجہ ناظم الدین (وزیر اعلیٰ)	=	داخلہ، پلاننگ اور قانون سازی
2۔ نور الامین	=	سول سپلائیز اور تعلقات عامہ
3۔ حمید الحق چودھری	=	خزانہ، مال، تجارت، محنت اور صحت
4۔ عبد الحمید	=	تعلیم
5۔ حسن علی	=	مواصلات، تعمیرات اور آبی گزرگاہیں
6۔ سید محمد افضل	=	زراعت، امداد باہمی اور ریلیف
7۔ حبیب اللہ بہار	=	صحت عامہ اور لوکل سیلف گورنمنٹ

اس نئی کابینہ کے ارکان میں محکموں کی تقسیم 16 ستمبر کو مکمل ہوئی تو اس کے تقریباً ایک ہفتہ بعد ڈھاکہ میں ڈیموکریٹک یوتھ لیگ کے زیر اہتمام تقریباً دس ہزار نوجوانوں کا ایک جلسہ ہوا۔ جس میں یہ اعلان کیا گیا کہ "مشرقی بنگال میں چاول اور پٹ سن کا بحران مصنوعی ہے اور سارے نوجوان اس بحران پر قابو پانے کے لئے ذخیرہ اندوزی، چور بازاری اور منافع خوری کے علاوہ دوسری معاشرتی بدعنوانیوں کے خلاف جدوجہد کریں گے۔ جو لوگ اس قسم کی سماج دشمن کارروائیاں کرتے ہیں وہ ہمارے عوام کو بھوکے، ننگے، بیمار اور ان پڑھ رکھنے کے لئے ذمہ دار ہیں۔ ہم ایسے لوگوں کو اپنے معاشرے میں بھی برداشت نہیں کریں گے۔ یہ لوگ غدار ہیں۔ ہم ان کا صفایا کر کے اپنے وطن کو نیلے آسمان کی طرح صاف ستھرا رکھنا چاہتے ہیں۔"[13] نوجوانوں کے اس جلسہ کی محرک یہ خبریں تھیں کہ چٹا گانگ اور نواکھلی میں غریب عوام اناج نہ ملنے کی وجہ سے بھوکوں مر رہے ہیں۔ بعض علاقوں میں ہیضہ کی وبا بھی پھیل گئی ہے اور چاول ایک روپے میں صرف بارہ چھٹانک ملتا ہے۔ گومنڈی سٹیشن کے نزدیک ایک عورت نے ریل گاڑی کے نیچے آ کر خودکشی کرنے کی کوشش کی کیونکہ وہ اپنے بھوکے بچوں کی حالت زار برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

کراچی میں اردو زبان کے پجاریوں اور ڈھاکہ میں جمعیت العلمائے اسلام کے مولویوں کی حقیقی مسائل کے بارے میں بے حسی

لیکن کراچی میں اردو زبان کے پجاریوں اور ڈھاکہ میں جمعیت العلمائے اسلام کے مولویوں کو بظاہران خبروں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ چنانچہ کراچی کے ''اہل زبان'' نے اپنے 8ر ستمبر کے فیصلے کے مطابق 12ر اکتوبر کو یہ اعلان کیا کہ پورے پاکستان میں اردو زبان کے فروغ کے لئے نئے دو رسالے ''نورنگ'' اور ''بچوں کی دنیا'' شائع کئے جائیں گے اور 20ر اکتوبر کو میمن سنگھ میں جمعیت العلمائے اسلام کی کانفرنس میں ایک قرارداد میں مطالبہ کیا گیا کہ پاکستان میں شیخ الاسلام کا عہدۂ جلیلہ قائم کر کے اس پر جمعیت العلمائے اسلام کے منتخب صدر کا تقرر کیا جائے۔ مزید یہ کہ ملک کے ہر صوبے میں بھی ایک صوبائی شیخ الاسلام کا عہدہ ہونا چاہیے۔ کانفرنس میں ایک اور قرارداد میں مطالبہ کیا کہ شراب نوشی، رشوت ستانی، اور سود خوری پر پابندی عائد کی جائے۔

جس دن کراچی کے ''ڈان'' میں جمعیت العلمائے اسلام کی اس کانفرنس کی رپورٹ شائع ہوئی اسی دن ایک شخص میزان الرحمان کا ایک مضمون بھی چھپا جس میں کہا گیا تھا کہ ''اسلام مدرلینڈ یا فادرلینڈ کے شعور کو تسلیم نہیں کرتا۔ اسلامی نظریہ جغرافیائی حدود سے بالاتر ہے جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے وہ صرف انٹرنیشنلسٹ ہی ہوسکتا ہے کیونکہ وہ رنگ و نسل اور ممالک کا امتیاز کئے بغیر سب مسلمانوں کو اپنا بھائی تصور کرتا ہے۔ اسلام نام نہاد نیشنلزم کو قطعی طور پر مسترد کرتا ہے اور پراونشلزم کی باتیں تو اسلام کو ٹکڑے کرنے کے مترادف ہیں۔ علاقہ پرستی قطعی طور پر اسلام کے منافی ہے۔''[14] ''ڈان'' میں اس قسم کے پروپیگنڈے سے ظاہر تھا کہ جب مشرقی بنگال کے مختلف علاقوں سے قحط کی دلخراش خبریں آرہی تھیں اس وقت اردو والے اپنے ثقافتی ورثہ کے نام پر، جمعیت العلمائے اسلام والے اسلام کے نام پر اور میزان الرحمان جیسے عناصر پان اسلام ازم کے نام پر مشرقی بنگال اور پاکستان کے دوسرے پسماندہ صوبوں کے عوام کے بنیادی حقوق غصب کرنے کے درپے تھے اور ان سب کو کراچی اور پنجاب کے حکمران طبقوں کی پشت پناہی حاصل تھی۔

ناظم الدین کو مولوی فضل الحق اور حسین شہید سہروردی سے خطرہ

مشرقی بنگال کے جس لیڈر نے اس صورت حال سے سب سے پہلے سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اس کا نام مولوی ابوالقاسم فضل الحق تھا۔ اس تجربہ کار لیڈر کو اچھی طرح علم ہو گیا تھا کہ مشرقی بنگال کی حکومت کی تقریباً ساری کلیدی آسامیوں پر غیر بنگالی افسروں کے تقرر سے صوبے کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ میں سخت غم وغصہ پایا جاتا ہے، چاول اور پٹ سن کے بحران کی وجہ سے غریب کسانوں میں بے چینی پھیل رہی ہے، ذرائع روزگار نا پید ہونے کی وجہ سے صوبہ کے نوجوان عناصر پریشان ہیں اور خواجہ ناظم الدین نے 12 ستمبر کو اپنی کابینہ میں جو توسیع کی ہے اس کی وجہ سے صوبائی اسمبلی میں اس کی مخالفت بڑھ گئی ہے۔ چنانچہ اس نے 5 نومبر کو ایک بیان میں مطالبہ کیا کہ "مشرقی بنگال اسمبلی کا اجلاس بلا تاخیر طلب کیا جائے تا کہ عوام کے نمائندے پاکستان کے موجودہ اہم مسائل پر بحث کر سکیں۔ اس نے کہا کہ اسمبلی کے اس مطلوبہ اجلاس میں (1) سپیکر اور ڈپٹی سپیکر کا انتخاب ہونا چاہیے۔ (2) دائمی بندوبست اراضی کی فوری تنسیخ کا فیصلہ ہونا چاہیے۔ (3) اور بنگال میں جو باہر کے لوگ آ گئے ہیں ان کی وجہ سے پیدا شدہ مسائل اور ان کے حل پر بحث ہونی چاہیے۔ اگر خواجہ ناظم الدین نے اس ایجنڈے پر بحث کے لئے اسمبلی کا اجلاس جلدی نہ بلایا تو میں اس مطالبہ کی تکمیل کے لئے فیصلہ کرنے کی خاطر پارٹی کے ارکان کی کانفرنس بلاؤں گا۔"[15] مولوی فضل الحق کا یہ بیان مشرقی بنگال میں خواجہ ناظم الدین کی وزارت کے لئے پہلے چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا۔

ان دنوں حسین شہید سہروردی کلکتہ میں تھا۔ قائداعظم جناح نے ستمبر 1947ء میں اسے مرکز میں وزارت بحالیات کا عہدہ پیش کیا تھا مگر وہ اس پیش کش کو نامنظور کر کے واپس کلکتے چلا گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ چونکہ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں لیگ پارٹی کے قائد چودھری خلیق الزماں نے اپنے رشتہ داروں کے ہمراہ ہندوستان سے فرار ہو کر پاکستان میں مستقل طور پر رہائش اختیار کر لی ہے اس لئے وہ خود وہاں کے بے سہارا مسلمانوں کو منظم کر کے ہندوستان کے ایوان اقتدار میں کوئی نہ کوئی مقام حاصل کر سکے گا۔ اسی خیال کے تحت اس نے نومبر کے دوسرے ہفتے میں کلکتہ میں ہندوستان کے مسلمان لیڈروں کی کانفرنس بلائی جس میں حکومت ہندوستان کو

یقین دلایا گیا کہ ''ہندوستان کے مسلمان انڈین یونین کے وفادار ہیں اور اس بنا پر وہ پنڈت جواہر لال نہرو کی حکومت کی خلوص دل سے حمایت کرتے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان یہ نہیں چاہتے کہ پاکستان ان کے لئے لڑے۔ وہ امید کرتے ہیں کہ حکومت ان کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت فراہم کرے گی اور ان کی ثقافت کو تباہ کرنے کی کوشش نہیں کرے گی۔''[16]

لیکن ہندوستان میں سہروردی کے اس اعلان وفاداری کے باوجود وہ مشرقی پاکستان کی سیاست سے بالکل بے تعلق نہیں تھا۔ صوبائی اسمبلی میں اس کا گروپ موجود تھا اور اس بنا پر وہ کسی وقت بھی خواجہ ناظم الدین کے لئے مشکلات پیدا کر سکتا تھا۔ خواجہ کی حکومت کی حیثیت ایک ایسے غبارے کی سی تھی جس میں کراچی سے ہوا بھری جاتی تھی۔ خواجہ صوبائی اسمبلی کا رکن نہیں تھا اور قیام پاکستان کے تین ماہ بعد بھی اسے کسی حلقہ سے انتخاب لڑنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی کیونکہ چاول کی کمیابی و مہنگائی اور پٹ سن کی فراوانی و کساد بازاری کی وجہ سے پورے صوبے کی سیاسی فضا اس کے لئے موافق نہیں تھی۔ بالخصوص شہروں کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کو روز افزوں بے روزگاری اور بنگالی ثقافت کے تحفظ کے مسئلہ نے خاصا پریشان کر رکھا تھا۔

بنگالی ثقافت کے تحفظ کا مسئلہ اس لئے سنگین صورت اختیار کر گیا تھا کہ کراچی اور پنجاب کے مفاد پرست عناصر جلدی سے یہ فیصلہ کروانا چاہتے تھے کہ پاکستان میں صرف اردو کو قومی زبان کا درجہ حاصل ہوگا۔ انہوں نے اپنی اس خواہش کے تحت 12 رنومبر کو یہ اعلان کر دیا تھا کہ 26 رنومبر کو کراچی میں ایک آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ہوگی جس میں پاکستان کے سارے صوبوں کے وزرائے تعلیم کے علاوہ علی گڑھ یونیورسٹی اور عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلرز بھی شرکت کریں گے اور دہلی کی جامعہ ملیہ کے سربراہ ڈاکٹر ذاکر حسین کو دعوت نامہ بھیجا گیا ہے۔

کراچی میں اردو کو قومی زبان بنانے کے لئے باقاعدہ مہم اور بنگالی وزیروں سمیت چار کروڑ بنگالیوں کو اردو سیکھنے کی تلقین، ڈھاکہ میں اس کے خلاف مظاہرے

مشرقی بنگال کے وزیر صحت حبیب اللہ بہار نے 15 رنومبر کو مرکزی حکومت کے اس اعلان کا نوٹس لیا جبکہ اس نے ڈھاکہ میں ایک جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ بنگالی اور اردو

دونوں زبانوں ہی کو پاکستان کی قومی زبانوں کا درجہ حاصل ہونا چاہیے۔ بنگالی زبان پاکستان کی آبادی کی اکثریت کی زبان ہے اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس زبان کو پاکستان کی قومی زبان کیوں نہیں بننا چاہیے۔ مشرقی بنگال میں اردو کی تعلیم بھی ہونی چاہیے تاکہ یہاں کے عوام کا مغربی پاکستان کے عوام سے رابطہ قائم رہے۔ اس نے مزید کہا کہ ''اگر بنگالی کو قومی زبان نہ بنایا گیا اور مشرقی پاکستان میں یہ زبان ذریعہ تعلیم نہ بنائی گئی تو یہ امر عوام الناس سے غداری کے مترادف ہوگا۔'' مشرقی بنگال کے وزیر سول سپلائیز نورالامین نے بھی اس جلسہ میں تقریر کی اور یہ امید ظاہر کی کہ ''بنگالی زبان کو مشرقی پاکستان کی قومی زبان بنانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ اگر آج کل کی بنگالی زبان اسلامی ثقافت اور روایات کی آئینہ دار نہیں تو اس میں اس زبان کا کوئی قصور نہیں۔ یہ قصور مصنفین کا ہے۔ پاکستان کے مصنفین کا فرض ہے کہ وہ بنگالی ادب کو اسلامی ثقافت اور روایات کا آئینہ دار بنائیں۔''[17] اس جلسہ میں کسی ہندو لیڈر یا خواجہ ناظم الدین کے مخالف کسی مسلمان لیڈر نے تقریر نہیں کی تھی۔

26 / نومبر کو حسب اعلان پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ہوئی تو وزیر تعلیم فضل الرحمان نے اپنی افتتاحی تقریر میں اردو زبان کو پاکستان کی قومی زبان بنانے کا ذکر کیا اور یہ بھی بتایا کہ اس کانفرنس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ملک میں تعلیم بالغاں کی مہم کے ذریعے ناخواندگی کا انسداد کرنے کا فیصلہ کیا جائے گا۔ یہ کانفرنس تین دن تک جاری رہی اور اس میں جو قراردادیں منظور کی گئیں ان میں ایک قرارداد یہ بھی تھی کہ سکولوں اور کالجوں میں مسلمان طلبا کے لئے مذہبی تعلیم کو لازمی قرار دینا چاہیے۔ یہ کانفرنس ابھی جاری ہی تھی کہ 28 / نومبر کو علامہ عزیز ہندی کی زیر صدارت کراچی کے مسلمانوں کا ایک جلسہ ہوا جس میں ایک قرارداد کے ذریعے اردو کو قومی زبان بنانے کا مطالبہ کیا گیا۔ 2 / دسمبر کو یہ کانفرنس ختم ہوئی تو ایک خبر میں بتایا گیا کہ کانفرنس میں دستور ساز اسمبلی کو سفارش کی گئی ہے کہ اردو کو قومی زبان بنایا جائے اور سکولوں میں پرائمری کے بعد اردو زبان کی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے۔''[18]

ڈان نے اس تعلیمی کانفرنس کے فیصلوں پر جو ادارتی تبصرہ کیا اس میں پہلے تو یہ تسلیم کیا کہ مشرقی پاکستان کے بیشتر عوام اردو زبان نہیں سمجھتے یہاں تک کہ وہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ بھی اردو جاننے کا دعویٰ نہیں کرتا اور پھر یہ تجویز پیش کی کہ ''ہر تین ماہ کے بعد ایک ''قومی زبان کا ہفتہ'' منانا

چاہیے جس کے دوران حکومت اور معاشرے میں اہم مقامات کے حامل بالغوں کو اردو کی جماعتوں میں شریک ہو کر اپنے آپ کو اس زبان سے زیادہ سے زیادہ آشنا کرنا چاہیے اور اس طرح انہیں دوسروں کے لئے ایک مثال قائم کرنی چاہیے۔ مثلاً وزیر تعلیم کو خود کراچی میں پہل کر کے ان مجوزہ ''ہفتوں'' کے دوران میں رسمی طور پر اردو کی تعلیم حاصل کرنی چاہیے اور اسی قسم کی مثال مشرقی پاکستان کے دارالحکومت میں بنگالی افسروں اور وزراء کو قائم کرنی چاہیے۔ اس طرح اردو زبان بہت مقبول ہو گی اور مشرقی بنگال کے تعلیم یافتہ طبقوں میں یہ زبان سیکھنے کا جوش وجذبہ پیدا ہو گا۔ ہم نے یہ تجویز یونہی پیش نہیں کر دی اور ہمیں امید ہے کہ اسے یونہی مسترد نہیں کر دیا جائے گا۔''[19]

تعلیمی کانفرنس کے اس فیصلے اور اس پر ڈان کے اس تبصرے کا مطلب یہ تھا کہ مشرقی بنگال کے تقریباً چار کروڑ تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ عوام کو (بشمول وزراء اور سرکاری اہلکار) اردو زبان سیکھنا پڑے گی اور جب تک وہ ایسا نہیں کریں گے انہیں مرکز کے کاروبار حکومت میں کوئی حصہ نہیں مل سکے گا۔ قدرتی طور پر یہ صورت حال ڈھاکہ کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کے لئے نہایت اشتعال انگیز اور ناقابل برداشت تھی۔ چنانچہ جب صوبہ کے وزیر صحت حبیب اللہ بہار اور وزیر تعلیم عبدالحمید چودھری نے 6 دسمبر کو واپس ڈھاکہ پہنچ کر اخبار نویسوں کو بتایا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہو گی تو اس کے اگلے دن سینکڑوں نوجوانوں نے صوبائی سیکرٹریٹ کے سامنے مظاہرہ کر کے صوبائی وزرا سے مطالبہ کیا کہ وہ انہیں قومی زبان کے بارے میں اصلی صورت حال سے آگاہ کریں۔ اس پر وزیر زراعت ایس۔ ایم۔ افضل نے پہنچ کر مظاہرین کو یقین دلایا کہ بنگالی کو قومی زبان بنانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ اس نے اعلان کیا کہ ''اگر ہماری یہ کوشش ناکام ہوئی تو میں مستعفی ہو جاؤں گا۔'' اس پر مطمئن ہو کر مظاہرین پر امن طریقے سے منتشر ہو گئے۔[20]

اس طرح یہ بلا ٹلی تو سرکاری حلقوں نے خدا کا شکر ادا کیا کیونکہ ڈان کی 4 دسمبر کی اطلاع کے مطابق چٹاگانگ کے علاقے میں زبردست سیلاب کے باعث تقریباً 13 لاکھ لوگ خانماں برباد ہو گئے ہوئے تھے اور ان کے پاس زندہ رہنے کے لئے روٹی، کپڑے اور مکان کی کوئی سہولت موجود نہیں تھی اور 6 دسمبر کو صوبائی حکومت کے ایک سرکاری اعلان کے مطابق وطن دشمن عناصر خواجہ ناظم الدین کی حکومت کے بعض وزراء کی رشوت ستانی اور دوسری بدعنوانیوں کے بارے میں بے بنیاد افواہیں پھیلا رہے تھے۔ اس سرکاری اعلان کا مطلب یہ تھا کہ اگرچہ خواجہ

نے اپنی کابینہ میں توسیع کرنے کے بعد 28 رنومبر کو 15 پارلیمانی سیکرٹریوں کا تقرر کیا تھا تاہم اسمبلی کے اندر اور باہر اس کی حکومت کی مقبولیت میں بڑی تیزی سے کمی آرہی تھی۔ اس نے گزشتہ چار ماہ کے دوران نہ تو اسمبلی کا کوئی سیشن بلایا تھا اور نہ ہی خود اسمبلی کا رکن منتخب ہونے کے لئے کوئی ضمنی انتخاب کرانے کی جرأت کی تھی۔ لہٰذا اسے بجا طور پر خدشہ تھا کہ اگر قومی زبان کے مسئلہ پر تعلیم یافتہ نوجوانوں کی کوئی ایجی ٹیشن شروع ہوگئی تو اس کی گدی محفوظ نہیں رہے گی۔ علاوہ بریں بنگالی اور غیر بنگالی کا مسئلہ بھی اس کے لئے سنگین خطرات سے بھرپور تھا اور بیشتر پنجابی اور تلیئر افسروں کی فرعونیت اور سامراجی ذہنیت ان خطرات میں روز افزوں اضافہ کر رہی تھی۔ تاہم 10 ردسمبر کو روزنامہ ڈان کا مشورہ یہ تھا کہ خواجہ ناظم الدین کو پانی کے بہاؤ کے ساتھ تیرنے کی بجائے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے خواہ اس کا نتیجہ کچھ ہی ہو۔

اردو اور انگریزی کو دستور ساز اسمبلی کی سرکاری زبان قرار دیئے جانے پر ڈھاکہ میں بنگالی نوجوانوں کا پرتشدد ایجی ٹیشن

خواجہ ناظم الدین کو ''ڈان'' کا یہ مشورہ کراچی اور پنجاب کے حکمران طبقوں کے اس عزم کی بنیاد پر تھا کہ وہ مشرقی بنگال کے چار کروڑ عوام کے سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی حقوق کو پامال کرکے تلیئروں کے مذہبی نعرے اور پنجابی فوج کی بندوق کے زور پر اس علاقے کو اپنی نوآبادی بنائیں گے۔ ان کے اس عزم کا اظہار 12 ردسمبر 1947ء کو بھی ہوا جبکہ یہ خبر شائع ہوئی کہ پاکستان دستور ساز اسمبلی کی رولز اینڈ پروسیجر کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ ''جہاں تک اسمبلی کی سرکاری زبان کا تعلق ہے اردو اور انگریزی کو مساوی پوزیشن حاصل ہونی چاہیے۔ جو ارکان اسمبلی ان دونوں زبانوں میں سے کسی زبان میں تقریر نہیں کرسکتے وہ صدر کی اجازت سے اپنی صوبائی زبان میں بول سکیں گے۔''[21] گویا کمیٹی کی رائے یہ تھی کہ پاکستان کی 54 فیصد آبادی کی بنگالی زبان کا درجہ محض صوبائی تھا اور سات فیصد آبادی کی اردو زبان کا درجہ قومی زبان کا تھا اور انگریزی زبان بھی قومی زبان کی حیثیت رکھتی تھی حالانکہ ملک میں یہ غیر ملکی زبان جاننے والوں کا تناسب ایک فیصد سے زیادہ نہیں تھا۔ جب کمیٹی کی اس سامراجی سفارش کی خبر ڈھاکہ پہنچی تو وہاں کے تعلیم یافتہ بنگالی نوجوان بہت مشتعل ہوئے اور ان کے ایک ہجوم نے پلاسی بیرکس میں انجمن ترقی اردو

کے دفتر پر حملہ کر کے کئی ایک افراد کو زخمی کر دیا۔[22] اور اس طرح قومی زبان کے مسئلہ کی وجہ سے ڈھاکہ میں پر تشدد ایجی ٹیشن کی ابتدا ہو گئی۔ ایک اور رپورٹ کے مطابق اس دن صوبائی سیکرٹریٹ کے غیر بنگالی عملہ اور بہاری مہاجرین نے اردو کے حق میں مظاہرہ کیا تو بنگالیوں اور غیر بنگالیوں میں تصادم ہو گیا جس میں 20 افراد زخمی ہوئے۔

ڈھاکہ میں پنجابی اور تلیئر بیوروکریسی اور کراچی کے ارباب اقتدار کا غیر حقیقت پسندانہ ردعمل...... بنگالیوں پر وطن دشمنی کا الزام

صوبائی حکومت نے اس واقعہ کے بارے میں اسی شام جو سرکاری اعلان جاری کیا اس میں کہا گیا تھا کہ یہ فساد وطن دشمن عناصر نے کروایا ہے جو ہمہ وقت صوبے کے مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ سرکاری اعلان میں مزید بتایا گیا کہ ''آج صبح جب کچھ لوگوں نے ایک بس میں شہر کا چکر لگا کر اردو کو قومی زبان بنانے کی وکالت کی تو یہ جھوٹی خبر پھیلا دی گئی کہ پولیس کی فائرنگ اور لاٹھی چارج سے دو تین افراد ہلاک ہو گئے ہیں۔''[23]

جس دن یہ فساد ہوا تھا اس دن وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین اپنے تین وزراء نور الامین، حمید الحق چودھری اور حبیب اللہ بہار کے ہمراہ کراچی میں مقیم تھا کیونکہ یہاں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہو رہا تھا اور مرکز کے وزیر صنعت آئی۔ آئی۔ چندریگر نے ایک پاکستان انڈسٹریز کانفرنس کا بھی بندوبست کیا ہوا تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں جن عناصر نے متذکرہ سرکاری اعلان جاری کیا وہ اس احساس وشعور سے عاری تھے کہ تعلیم یافتہ بنگالی نوجوانوں کے لئے قومی زبان کے مسئلہ کا ان کے مستقبل سے گہرا تعلق تھا۔ اس سلسلے میں ان کی ایجی ٹیشن مصنوعی نہیں تھی اور اسے محض وطن دشمن عناصر کی سازش قرار دے کر دبایا نہیں جا سکتا تھا۔ وہ اس حقیقت کو بھی نظر انداز کرتے تھے کہ ان دنوں ہندوستان کے مغربی، جنوبی اور مشرقی علاقوں میں بھی ہندی زبان کے خلاف ایجی ٹیشن کی ابتدا ہو چکی تھی۔ ڈھاکہ میں قومی زبان کے مسئلہ پر ایجی ٹیشن میں وطن دشمنی کا کوئی عنصر شامل نہیں تھا۔ البتہ اس سلسلے میں 13 دسمبر کو جو سرکاری اعلان جاری کیا گیا تھا اس میں وطن دشمنی کی بو آتی تھی۔ بظاہر اس کی ذمہ داری پنجابی اور تلیئر بیوروکریسی پر عائد ہوتی تھی۔

13 دسمبر کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے شہر میں جلسوں اور جلوسوں پر پابندی لگا دی اور

15 دسمبر کو کلکتہ کے بعض اخبارات کا مشرقی بنگال میں داخلہ بند کر دیا گیا۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ یہ اخبارات غیر بنگالی مسلمانوں کے خلاف بے بنیاد الزامات کی تشہیر کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہ الزام بھی عائد کرتے ہیں کہ غیر بنگالی مسلمان حکام اردو کو قومی زبان بنانے کی سفارش کر رہے ہیں۔"[24]

تاہم اسی دن کراچی میں پاکستان کی وزارت تعلیم نے ایک سرکاری اعلان جاری کیا جس میں بتایا گیا کہ ڈھاکہ میں جن لوگوں نے قومی زبان کے مسئلہ پر تحریک شروع کی ہے انہوں نے وزیر تعلیم فضل الرحمان سے غلط بیانات منسوب کئے ہیں۔ اس قرارداد کو بھی غلط رنگ میں پیش کیا ہے جو پاکستان کی تعلیمی کانفرنس نے منظور کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مسٹر فضل الرحمان نے کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ہمیں پاکستان میں تمام صوبائی زبانوں کو نشوونما کا پورا موقع بہم پہنچانا چاہیے۔ یہ زبانیں نہ صرف ذریعہ تعلیم رہیں گی بلکہ مشترکہ تمدن کی یک جہتی کو نقصان پہنچائے بغیر صوبائی تہذیب و تمدن کو مضبوط بنانے کا موجب بنیں گی۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ بین الصوبائی رابطہ واتحاد کی خاطر ایک مشترکہ زبان ہو۔ اس سلسلے میں اردو کا فائق حق خاص طور پر مستحق توجہ ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اردو بجا طور پر پاکستان کی قومی زبان بن سکتی ہے۔" پاکستان کی تعلیمی کانفرنس کی منظور کردہ قرارداد کا مضمون یہ تھا کہ "یہ کانفرنس دستور ساز اسمبلی سے سفارش کرتی ہے کہ اردو کو پاکستان کی قومی زبان کے طور پر تسلیم کیا جائے۔ طے پایا کہ اردو کو سکولوں میں لازمی مضمون کی حیثیت حاصل ہو۔ پرائمری سکولوں میں کس مرحلہ پر اردو کی تعلیم شروع کی جائے؟ یہ سوال صوبائی اور ریاستی حکومتوں کے فیصلہ پر چھوڑ دیا جائے۔ متعلقہ صوبائی اور ریاستی حکومتیں طے کریں گی کہ سکولوں میں ذریعہ تعلیم کیا ہو...... سرکاری زبان کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا گیا۔ وزارت اس امر کی متوقع ہے کہ مذکورہ بالا حقائق، زبان کے بارے میں تمام تنازعہ اور مباحثہ کو ختم کر دیں گے اور پاکستان کی یکجہتی کو ختم کرنے کے ہر رجحان کا قلع قمع کرنے میں کامیاب ہوں گے۔"[25]

اس سرکاری اعلان میں دو تین باتیں بالکل واضح تھیں اور وہ بجا طور پر مشرقی بنگال کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کے اشتعال کا باعث بن سکتی تھیں۔ اول یہ کہ کراچی کے ارباب اقتدار عملاً اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے تھے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان تقریباً ایک ہزار میل کا فاصلہ ہے اور ملک کے ان دونوں خطوں کے درمیان جغرافیائی، تاریخی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی لحاظ سے ایسا ہی فرق ہے جیسا کہ دو مختلف قوموں میں ہوتا ہے۔ دوئم یہ کہ بنگالی زبان ملک کی

اکثریت کی زبان ہے۔لہٰذا اسے محض ایک صوبائی زبان کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔وہ مشرقی پاکستان کو ملک کا محض ایک صوبہ قرار دیتے تھے اور اسے اردو، اسلام اور بندوق کے زور پر اپنے زیر تسلط رکھنا چاہتے تھے۔

مغربی پاکستان کے اخبارات نے زبان کے مسئلہ پر بنگالیوں کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا

روزنامہ ڈان نے وزارت تعلیم کے اس اعلان پر جو ادارتی تبصرہ کیا اس نے ڈھاکہ میں جلتی پر تیل کا کام کیا۔اس اداریے کا خلاصہ یہ تھا کہ بنگالی ایک صوبائی زبان ہے اور اسے اس حیثیت سے پھلنے پھولنے کا موقع ملنا چاہیے۔بنگالی مسلمانوں کو اسلامی فکر، ثقافت اور علوم سے آشنا ہونے کے لئے اردو زبان سیکھنی چاہیے۔تعلیمی کانفرنس نے محض اس مقصد کے لئے سکولوں میں اردو کو لازمی مضمون قرار دینے کی سفارش کی تھی۔ملک کے غداروں اور دشمن کے جاسوسوں نے اس قرارداد کو کچھ اس طرح توڑا مروڑا کہ اس سے بنگالی اور اردو کا تنازعہ کھڑا ہو گیا جس میں نعرے بازی ہوئی اور سر بھی پھوٹے۔خواجہ ناظم الدین کی حکومت کو ایسے شر پسند عناصر کے خلاف سخت ترین اقدام کرنا چاہیے اور بنگالی عوام کو اصل صورت حال سے آگاہ کرنا چاہیے کہ بنگال کی زبان بنگالی اور پاکستان کی زبان اردو کے درمیان کسی تنازعہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔[26] گویا ڈان کی رائے میں جو شخص اردو زبان نہیں جانتا تھا وہ اسلامی فکر، ثقافت اور علوم سے آشنا نہیں ہو سکتا تھا اور یہ کہ پاکستان کی زبان صرف اردو ہی ہو سکتی تھی۔اس عجیب و غریب منطق کا دائرہ وسیع کرنے سے اس کا یہی مطلب نکل سکتا تھا کہ دنیا میں جو مسلمان صرف چینی، انڈونیشی، ملائی، سیامی، برمی، ترکی اور انگریزی زبان جانتے تھے وہ اسلامی فکر، ثقافت اور علوم سے نا آشنا تھے کیونکہ انہوں نے اردو زبان نہیں سیکھی تھی۔اردو زبان کو مذہب سے وابستہ کرنے کا حربہ کراچی اور پنجاب کے حکمران طبقوں نے 1947ء میں ہی اختیار کرنا شروع کر دیا تھا اور انہیں نہیں معلوم تھا کہ اس کا بالآخر کیا نتیجہ نکلے گا۔

لاہور کے اخبار نوائے وقت نے بھی اپنے ادارتی کالموں میں بنگالی زبان کے علمبرداروں کو ہدف تنقید بنایا۔اس اخبار کا اداریہ یہ تھا کہ ''اردو اور بنگالی کی بحث نے گزشتہ تعلیمی کانفرنس کے بعد زیادہ تند شکل اختیار کر لی ہے۔لیکن ہمیں تقسیم ہند سے پہلے اردو اور بنگالی

جھگڑے کی بات بالکل نہیں سننے میں آئی تھی بلکہ اس وقت بنگالیوں میں اردو کے لئے بڑی ہمدردی پائی جاتی تھی......اس موضوع پر فساد کا ہونا سخت حیرت انگیز بات ہے......(کیونکہ) زبان کے مسئلہ سے صرف خواندہ بلکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں، پروفیسروں، معلموں یا ادیبوں اور فنکاروں کو دلچسپی ہوتی ہے۔ بنگال کی زبان میں بنگالی ادب کو جو اہمیت ہے ہمیں اس سے انکار نہیں......اور بنگالی ادب کا پایہ پاکستان کی دوسری صوبائی زبانوں سے کہیں بلند ہے......لیکن کیا بنگال کے لوگ اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں کہ باوجود ان ترقیوں کے بنگالی کو وہ بین المملکتی اور بین الاقوامی حیثیت حاصل نہیں جو اردو کو ہے۔"[27] نوائے وقت کے اس اداریے کا مطلب یہ تھا کہ چونکہ تقسیم ہند سے پہلے اردو اور بنگالی جھگڑے کی بحث بالکل نہیں سننے میں آئی تھی اس لئے پاکستان میں یہ بحث بے بنیاد، بے حقیقت اور مصنوعی ہے لیکن اس اخبار نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اگرچہ تقسیم ہند سے پہلے ہندی، بنگالی، مراٹھی اور تامل زبانوں کی بحث بالکل نہیں سننے میں آئی تھی پھر بھی ہندوستان میں آزادی کے فوراً بعد یہ بحث کیوں چھڑ گئی تھی۔ جہاں تک اس اخبار کی اس دلیل کا تعلق تھا کہ اردو کو بین المملکتی اور بین الاقوامی حیثیت حاصل ہے تو اس میں کوئی وزن نہیں تھا۔ بنگالی زبان کی یہ حیثیت اردو سے زیادہ نمایاں تھی۔ اردو زبان پاکستان میں صرف 7 فیصد لوگ بولتے تھے اور شمالی ہندوستان میں یہ زبان بولنے والوں کا تناسب بیس پچیس فیصدی سے زیادہ نہیں تھا۔ اس کے مقابلے میں بنگالی زبان مغربی بنگال، آسام اور بہار کے بعض علاقوں کے علاوہ برما کے صوبہ اراکان کے بعض اضلاع میں بھی بولی جاتی تھی۔

تاہم مرکزی وزارت تعلیم کی توضیحات اور مغربی پاکستان کے اخبارات کی نکتہ چینیوں اور غداری کے الزامات کے باوجود ڈھاکہ میں بنگالی زبان کے حق میں مظاہروں کا سلسلہ جاری رہا جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شہر میں راشن کی دکانوں پر چاول کی سپلائی کا سلسلہ یکا یک بند ہو گیا تھا اور کھلی منڈی میں چاول کا بھاؤ 16 روپے فی من کی بجائے چالیس پچاس روپے فی من تھا۔ 22 دسمبر 1947ء کو مولانا شبیر احمد عثمانی نے ڈان سے ایک انٹرویو میں بنگالی اور اردو کے تنازعہ کا ذکر کرتے ہوئے اس رائے کا اظہار کیا کہ "یہ تنازعہ اس امر کی افسوس ناک مثال ہے کہ کس طرح مسلمان اپنے دشمنوں کے ہاتھوں میں کھیل سکتے ہیں۔ مولانا نے کہا کہ پاکستان کی سرکاری زبان کا فیصلہ دستور ساز اسمبلی کرے گی جو عوام کے سارے حلقوں کی نمائندہ ہے۔ اس لئے اس معاملہ

پر کوئی مباحثہ نہ صرف بالکل قبل از وقت ہے بلکہ یقینی طور پر مسلم قوم کی یکجہتی کے لئے نقصان دہ ہے۔''[28] لیکن مولانا نے اپنے اس انٹرویو میں یہ نہ بتایا کہ اگر فیصلہ دستور ساز اسمبلی نے ہی کرنا تھا تو پھر کراچی میں وزیر اعظم لیاقت علی خان سے لے کر ادنیٰ ترین سرکاری اہلکار کی جانب سے اردو زبان کو قومی زبان قرار دینے کے اعلانات کیوں کئے جا رہے تھے اور اردو زبان کو اسلامی فکر اور ثقافت کے ساتھ نتھی کیوں کیا جا رہا تھا اور ہر اس شخص کو اسلام دشمن اور وطن دشمن کیوں کہا جا رہا تھا جو کراچی کے اس سرکاری موقف کی مخالفت کرتا تھا۔

مولانا عثمانی کے برعکس مشرقی بنگال کا وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین ایک حقیقت پسند یا موقع پرست سیاسی لیڈر کی حیثیت سے قومی زبان کے مسئلے کو اتنا معمولی اور آسان نہیں سمجھتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ خود اس کی کابینہ اور اسمبلی میں بھی اس مسئلہ پر شدید جذبات موجود ہیں۔ چنانچہ جب وہ کراچی سے واپس ڈھاکہ پہنچا تو اس نے 25 دسمبر کو قائداعظم کے یوم پیدائش کے موقع پر اپنی نشری تقریر میں قومی زبان کے تنازعہ کا کوئی ذکر نہ کیا۔ البتہ اس نے تسلیم کیا کہ ''چاول کی کمیابی کے باعث لوگوں کو بے پناہ مشکلات درپیش ہیں اور ان کے سروں پر ہمہ وقت قحط کا خطرہ منڈلا رہا ہے۔ اس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ حکومت پاکستان نے 13 نومبر 1947ء کو سڑکوں کے راستے ہندوستان کو پٹ سن کی برآمد پر جو ڈیوٹی عائد کی تھی اس کی وجہ سے اس زر آور فصل کے نرخوں میں اور بھی کمی ہوگئی ہے اور کسانوں کو نقصان پہنچا ہے۔''

ناظم الدین کو لسانی مسئلہ اور چاول کے بحران کے ساتھ ساتھ محمد علی بوگرا گروپ کی بغاوت کا سامنا

خواجہ ناظم الدین کی اس تقریر کا پس منظر یہ تھا کہ اس کی ڈھاکہ سے تقریباً دو ہفتے کی غیر حاضری کے دوران صوبائی لیگ اسمبلی پارٹی کے چار ممتاز ارکان نے محمد علی بوگرا کی زیر قیادت اس کے خلاف ایک پروپیگنڈا مہم شروع کر دی تھی جس میں یہ مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ لیگ اسمبلی پارٹی کا اجلاس بلا کر سپیکر اور ڈپٹی سپیکر کا انتخاب کیا جائے اور مشرقی بنگال میں چاول کی نقل و حرکت اور خرید و فروخت پر سے کنٹرول اٹھایا جائے۔ ان کی اس مہم کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ خواجہ ناظم الدین نے ستمبر 1947ء میں جس سات رکنی کابینہ کی تشکیل کی تھی اس میں ان کے گروپ کا کوئی وزیر

شامل نہیں تھا اور پھر نومبر میں جو پندرہ پارلیمانی سیکرٹری مقرر کئے گئے تھے ان میں بھی ان کا کوئی آدمی نہ تھا۔ محمد علی بوگرا متحدہ بنگال میں سہروردی کی کابینہ میں وزیر خزانہ تھا۔ وہ بہت اقتدار پرست اور جاہ پسند آدمی تھا، اس لئے اسے ناظم الدین کا بینہ میں اپنی عدم شمولیت پر بہت رنج تھا۔ چنانچہ اس نے خواجہ کی وزارت کو درپیش مشکلات سے فائدہ اٹھانے کی مہم شروع کر دی۔ اسمبلی کا اجلاس بلانے کے مطالبہ کی وجہ یہ تھی کہ خواجہ ناظم الدین خود صوبائی اسمبلی کا رکن نہیں تھا اور پوری اسمبلی میں اس کا گروپ اقلیت میں تھا۔ اگر اسمبلی کے مجوزہ اجلاس میں سہروردی گروپ اور فضل الحق گروپ کا کانگرس پارٹی سے اتحاد ہو جاتا تو خواجہ کی وزارت قائم نہیں رہ سکتی تھی۔

چاول کی نقل و حمل اور خرید و فروخت پر کنٹرول اٹھائے جانے کے مطالبہ کی وجہ یہ تھی کہ مشرقی بنگال کے 17 اضلاع میں سے سات اضلاع ایسے تھے جن میں چاول کی پیداوار فالتو ہوتی تھی۔ پانچ اضلاع ایسے تھے جو چاول کی پیداوار میں خود کفیل تھے اور بقیہ پانچ اضلاع میں چاول کی قلت ہوتی تھی۔ چونکہ صوبائی حکومت فالتو چاول پیدا کرنے والے اضلاع میں سے تیرہ چودہ روپے فی من کے حساب سے چاول خریدتی تھی جبکہ کھلی منڈی میں بھاؤ چالیس پچاس روپے تھا اس لئے ان اضلاع کے کاشت کاروں کو بہت نقصان اٹھانا پڑتا تھا اور اس بنا پر وہ اور اسمبلی میں ان کے نمائندے خواجہ کی حکومت کے سخت خلاف ہو گئے تھے۔ تاہم خواجہ ناظم الدین کو ڈر تھا کہ اگر چاول پر سے کنٹرول اٹھالیا گیا تو نہ صرف چاول کی قلت والے اضلاع میں سنگین غذائی قلت پیدا ہو جائے گی بلکہ ڈھاکہ اور مشرقی بنگال کے دوسرے شہروں میں بھی چاول کی مہنگائی عوام کے لئے ناقابل برداشت ہو جائے گی۔ ڈھاکہ اور دوسرے شہروں میں پہلے "قومی زبان" کے مسئلے پر خواجہ ناظم الدین کی کمزور حکومت کے خلاف سخت غم و غصہ پایا جاتا تھا اور راشن ڈپوؤں پر چاول کی سپلائی میں مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ اگر ایسی حالت میں ڈھاکہ میں چاول کی چور بازاری اور منافع خوری میں اضافہ ہو جاتا تو اس کی حکومت برقرار نہیں رہ سکتی تھی۔ زبان کے مسئلہ کی تحریک ابھی جاری تھی حالانکہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے شہر میں جلسوں اور جلوسوں پر پابندی عائد کر رکھی تھی۔

جب 31 دسمبر 1947ء کو محمد علی بوگرا اور اس کے تین ساتھیوں نے ایک مشترکہ بیان میں اعلانیہ طور پر متذکرہ مطالبات کئے تو صوبائی لیگ اسمبلی پارٹی کی اندرونی دھڑے بندی کھل کر سامنے آ گئی۔ اس پر خواجہ ناظم الدین نے 4 جنوری 1948ء کو ایک جوابی بیان میں بتایا کہ

''صوبائی گورنر بعض مجبوریوں کی بنا پر فوری طور پر اسمبلی کا اجلاس بلانے سے معذور ہے اور چاول کی خرید وفروخت پر سے کنٹرول نہ اٹھانے کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس مقصد کے لئے مرکزی حکومت سے مشورہ کرنا ضروری ہے اور دوسری وجہ اس خطرے میں مضمر ہے کہ اس طرح 1943ء جیسا تباہ کن قحط پڑ جائے گا۔''[29]

6رجنوری کو صوبائی کابینہ کے حلقوں کے حوالے سے یہ خبر شائع کی گئی کہ صوبائی اسمبلی کا اجلاس نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مرکزی حکومت نے ریڈ کلف ایوارڈ کے اعلان کے بعد ابھی تک نئے انتخابی حلقوں کا تعین نہیں کیا۔ امید کی جاتی ہے کہ تقریباً ایک ہفتے میں مرکز سے مطلوبہ حکم موصول ہو جائے گا تو اس کے بعد اسمبلی کے سیشن کی تاریخ مقرر کر دی جائے گی۔ لیکن اس خبر کے ساتھ ہی روزنامہ ڈان میں اس مضمون کا نہایت اشتعال انگیز معلوماتی اداریہ بھی شائع ہوا کہ ''پاکستان پبلک سروس کمیشن کے نصاب کے 31 مضامین میں نو زبانیں...... فرانسیسی، جرمن، لاطینی، اردو، ہندی اور سنسکرت وغیرہ...... شامل کی گئی ہیں لیکن پاکستان کی دو تہائی آبادی کی بنگالی زبان شامل نہیں ہے۔''[30]

محمد علی بوگرا نے 9رجنوری 1948ء کو خواجہ ناظم الدین کے متذکرہ بیان کا جواب دیا جس میں کہا گیا تھا کہ اگر مغربی بنگال کی حکومت اور دونوں پنجابوں کی حکومتیں خواجہ کی بیان کردہ تکنیکی مشکلات دور کر کے اپنی اسمبلیوں کے اجلاس منعقد کر سکتی ہیں تو مشرقی بنگال کی حکومت بھی بہت پہلے ایسا ہی کر کے اسمبلی کا اجلاس بلا سکتی تھی۔ خواجہ ناظم الدین کی حکومت نا اہل ہے اور وہ اپنی اس نا اہلی کا سہارا لے کر اسمبلی کا اجلاس بلانے میں تاخیر کرتی آ رہی ہے۔

جس دن محمد علی بوگرا کا یہ بیان شائع ہوا اسی دن کلکتہ میں ایم۔ اے۔ ایچ۔ اصفہانی کے اخبار مارننگ نیوز نے اپنے اداریے میں بوگرا اور اس کے تین ساتھیوں...... تفضّل علی، نصر اللہ اور ڈاکٹر ملک پر سخت نکتہ چینی کی اور بتایا کہ ڈاکٹر ملک کے سوا باقی تینوں ارکان اسمبلی زمینداروں کے مفادات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اگر ان کے مطالبہ کے مطابق چاول پر سے کنٹرول ختم کر دیا گیا تو مشرقی پاکستان میں لاکھوں لوگ بھوکے مر جائیں گے۔ اداریے میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا گیا کہ ''حالیہ سالوں میں مسلم بنگال کی سیاسی زندگی اندرونی اختلافات اور اقتدار کے لئے جھگڑوں کا شکار رہی ہے۔ گروہی سیاست، ذاتی وجوہ کی بنا پر دھڑے بندی اور ارکان اسمبلی کی

اخلاقی زبوں حالی کے شرمناک مظاہرے ہوتے رہے ہیں۔جس طریقے سے فضل الحق نہایت بے ضمیری کے ساتھ پہلو بدلتا ہے وہ اب بجائے خود ایک تاریخ کی حیثیت رکھتا ہے اور اسی طرح 1945ء میں پرانی بنگال اسمبلی کے بعض مسلم ارکان نے قلابازی کھائی تھی۔ جبکہ ناظم الدین۔ سہروردی حکومت نے کپڑے کی چور بازاری کے خلاف مہم شروع کی تھی۔ بظاہر نئی مسلم مملکت میں بھی یہ پرانی بیماری بدستور موجود ہے۔مشرقی بنگال کے مسلمانوں اور بالخصوص نوجوانوں کا فرض ہے کہ وہ آگے بڑھ کر اس صورت حال کا سد باب کریں۔آخر بے ضمیر ارکان اسمبلی کو کب تک مشرقی پاکستان کے عوام کی تقدیر سے کھیلنے کی اجازت دی جائے گی۔خواجہ ناظم الدین کی حکومت اپنے مخالفین کے بارے میں بڑی کمزوری کا مظاہرہ کرتی رہتی ہے۔اس کے لئے لازمی ہے کہ وہ وہی کرے جسے وہ صحیح سمجھتی ہے۔اگر بعض ارکان اسمبلی اناج پر سے کنٹرول اٹھانے کا مطالبہ کرتے ہیں تو اس مطالبے کو حقارت سے مسترد کر دینا چاہیے۔ پارلیمانی جمہوریت میں عوامی نمائندوں کو جو مواقع ملتے ہیں بنگال کے مسلم ارکان اسمبلی ان سے بہت ناجائز فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔انہوں نے ہمیشہ بڑی بے شرمی کے ساتھ حکومت کے تعمیری پروگراموں کی حمایت کی قیمت مانگی ہے۔اب پاکستان کی آزاد مملکت میں ایسی باتوں کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔''[31]

تاہم مارننگ نیوز کا یہ مشورہ رائیگاں گیا۔مشرقی بنگال کے عوام نے آگے بڑھ کر خواجہ ناظم الدین کے مخالفین کے ناپاک عزائم کا سد باب نہ کیا اور نہ ہی خواجہ ناظم الدین نے اپنے مخالفین کے بارے میں کسی سختی کا مظاہرہ کیا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ خواجہ کی حکومت گزشتہ چار پانچ ماہ میں چاول اور پٹ سن کے بحران اور قومی زبان کے مسئلہ کو عوامی خواہش وضرورت کے مطابق حل کرنے میں ناکام رہی تھی اور اس بنا پر وہ بہت حد تک عوامی حمایت کھو بیٹھی تھی۔

ناظم الدین کی کمزور حکومت جو غیر بنگالیوں کی بیساکھیوں پر قائم تھی، اسے مستحکم کرنے کی خاطر ناظم الدین کو ایک ضمنی انتخاب میں بلا مقابلہ منتخب کروانے کے لئے مرکزی حکومت نے کیا پاپڑ بیلے

خواجہ ناظم الدین بذات خود ایک نا اہل اور آرام پسند زمیندار تھا اور اس کی حکومت کی باگ ڈور عملی طور پر اس غیر بنگالی بیوروکریسی کے ہاتھوں میں تھی جس کا نہ تو بنگالی عوام سے کوئی

رابطہ تھا اور نہ ہی اس سے کوئی ہمدردی تھی۔ چنانچہ جب صوبائی حکومت کے بارے میں عوامی مخالفت زور پکڑتی چلی گئی تو کراچی کے ارباب اقتدار نے یکے بعد دیگرے تین مرکزی وزراء...... سردار عبدالرب نشتر، پیرزادہ عبدالستار اور آئی۔ آئی۔ چندریگر کو مشرقی بنگال بھیجا۔ ان تینوں وزراء نے ڈھاکہ اور بعض دوسرے شہروں میں جلسے کر کے اسلام اور حب الوطنی کے نام پر خواجہ ناظم الدین کے لئے عوامی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی مگر انہیں کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی تو صوبائی حکومت کی مقبولیت میں کمی ہوتی ہی چلی گئی کیونکہ چاول اور پٹ سن کی سپلائی کے بحران کے ساتھ اب چینی کا بحران بھی شروع ہو گیا تھا اور ڈھاکہ کی انجمن ترقی اردو نے صوبائی حکومت کی مشکلات میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا جبکہ اس نے ایک قرارداد میں حکومت پاکستان سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ اردو کو پورے پاکستان کی سرکاری زبان قرار دینے کا اعلان کیا جائے اور اعلیٰ تعلیمی اداروں میں بھی انگریزی کی جگہ اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔"[32] کومیلا کے نزدیک دھرم پورہ کے مقام پر ایک مذہبی اجتماع میں بھی اس مضمون کی قرارداد منظور کی گئی۔ اس اجتماع کی صدارت مولانا شاہ غلام قادر جیلانی پیر آف اڑیا باری نے کی اور اس میں چٹا گانگ، نواکھلی اور کومیلا کے ممتاز علما نے شرکت کی۔[33]

وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین کے لئے ایک مشکل یہ بھی تھی کہ اسے بذریعہ ضمنی انتخاب صوبائی اسمبلی کا رکن بننے کے لئے کوئی مناسب حلقہ نہیں ملتا تھا۔ چنانچہ مشرقی بنگال میں تین مرکزی وزراء کی موجودگی میں اس مشکل کو اس طرح حل کیا گیا کہ شمالی تانگیل کے دیہی محمڈن حلقہ سے ایک رکن اسمبلی ابراہیم خان سے استعفیٰ دلوایا گیا اور پھر 15 رجنوری 1948ء کو اعلان کیا گیا کہ اس حلقہ میں ضمنی انتخاب 21 رفروری کو ہوگا۔ ایسا کرنا اس لئے ضروری تھا کہ مارچ میں صوبائی اسمبلی کا بجٹ سیشن ہونے والا تھا۔ اگر اس سے پہلے خواجہ ناظم الدین اسمبلی کا رکن منتخب نہ ہوتا تو اسے وزارت اعلیٰ کے عہدے سے الگ ہونا پڑتا۔

ضمنی انتخاب کے اس اعلان کے ساتھ ہی مرکزی وزیر خوراک پیرزادہ عبدالستار کا یہ بیان بھی شائع ہوا کہ صوبائی لیگ پارلیمانی بورڈ نے متفقہ طور پر خواجہ ناظم الدین کی زیر صدارت ایک کمیٹی مقرر کی ہے جو چاول کی فراہمی اور تقسیم کی تفصیلات کا جائزہ لے گی۔ پیرزادہ نے کہا کہ پارٹی کے اجلاس میں بتایا گیا تھا کہ مشرقی بنگال کے سول سپلائیز محکمے کی انتظامیہ کی بڑی خستہ

حالت ہے۔ اس میں رشوت ستانی کا بازار گرم ہے۔ عوام اس محکمے سے بہت تنگ ہیں کیونکہ چور بازاری کرنے والے اس محکمے کے عملے سے ساز باز کر کے بہت منافع کماتے ہیں اور ہندوستان کو اناج کی سمگلنگ بھی ہوتی ہے۔ اس کمیٹی میں پارٹی کے دوسرے ممتاز ارکان کے علاوہ محمد علی بوگرا بھی شامل تھا۔ اس کمیٹی نے دو دن تک اس مسئلہ پر غور کرنے کے بعد یہ رائے ظاہر کی کہ مشرقی بنگال میں غذائی حالت غیر یقینی ہونے اور دنیا میں غذائی قلت ہونے کے پیش نظر اناج پر کنٹرول اٹھانا انتہائی خطرناک ہوگا۔ 1943ء کے تجربے کے بعد کوئی ذمہ دار جماعت یہ خطرہ مول نہیں لے سکتی۔ پھر تقریباً ایک ہفتہ بعد کراچی سے یہ اعلان کیا گیا کہ مزید 24 ہزار ٹن چاول بھیجے جائیں گے۔ یہ چاول ان 70 ہزار ٹن چاول کے علاوہ ہوں گے جن کا پہلے وعدہ کیا جا چکا ہے۔ گویا اس طرح خواجہ ناظم الدین کے ضمنی انتخاب کے لئے زمین ہموار کی جارہی تھی۔ مسلم لیگ کا مرکزی پارلیمانی بورڈ قبل ازیں 19 رجنوری کو اس انتخاب کے لئے لیگ کا ٹکٹ دے چکا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی مرکزی وزارت خزانہ نے جب سمندری راستے سے نمک کی درآمد پر اڑھائی روپے فی من کے حساب سے محصول عائد کر دیا تو پیرزادہ عبدالستار کے کئے کرائے پر پانی پھر گیا۔ قبل ازیں نومبر 1947ء میں جب پٹ سن کی برآمد پر ٹیکس عائد کیا گیا تھا تو مشرقی بنگال کے کسانوں نے بہت واویلا کیا تھا اور اب جب نمک کی درآمد پر ٹیکس عائد کیا گیا تو پورے مشرقی بنگال میں اس کے خلاف احتجاج ہونا ناگزیر ہو گیا۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ مغربی بنگال میں تقریباً ایک سال پہلے نمک کی درآمد پر سے ڈیوٹی ختم کر دی گئی تھی۔

تاہم 25 رجنوری کو خواجہ ناظم الدین کے بلا مقابلہ انتخاب کا اعلان کر دیا گیا کیونکہ اس کے مقابل تمام امیدواروں نے اپنے کاغذات نامزدگی واپس لے لئے تھے۔ ان دنوں مرکزی وزیر تعلیم فضل الرحمان مشرقی بنگال میں تھا اور اس کی موجودگی میں خواجہ ناظم الدین کے بلا مقابلہ انتخاب کا انتظام محض اس لئے کیا گیا تھا کہ ووٹنگ کے ذریعے اس کے منتخب ہونے کا امکان نہیں تھا۔

باب:2

مشرقی بنگال کے فوجی، معاشی، سیاسی اور ثقافتی حقوق کے مطالبوں پر کراچی اور پنجاب کے ارباب اقتدار کا معاندانہ رویہ

بنگالیوں پر مسلح افواج میں بھرتی کے دروازے بند کئے گئے اور اس سلسلے میں برطانوی سامراجی عہد کی تاویلیں پیش کی گئیں

مشرقی بنگال کے عوام کو خواجہ ناظم الدین کی حکومت سے بہت سی شکایتیں تھیں جن میں سے ایک بڑی شکایت یہ بھی تھی کہ اس کی حکومت بنگالی نوجوانوں کے لئے پاکستان کی مسلح افواج میں بھرتی کے دروازے کھلوانے میں ناکام رہی ہے۔ اس بے انصافی کا تازہ ترین ثبوت یہ تھا کہ 12 رجنوری 1948ء کو راولپنڈی میں پاکستان ایئر ہیڈ کوارٹرز کی طرف سے اعلان میں بتایا گیا تھا کہ جو امیدوار ایئر مین کی حیثیت سے رائل پاکستان ایئر فورس میں بھرتی ہونا چاہتے ہیں وہ براہ راست ایئر ہیڈ کوارٹرز کو درخواستیں نہ بھیجیں بلکہ وہ اس مقصد کے لئے جہلم، لاہور، ملتان، پشاور، راولپنڈی، سرگودھا یا سیالکوٹ میں اسسٹنٹ ریکروٹنگ افسر سے رابطہ پیدا کریں۔[1] گویا اس اعلان کے مطابق مشرقی بنگال سے ایئر مینوں کی بھرتی کی کوئی گنجائش نہیں تھی کیونکہ اس مقصد کے لئے وہاں کے کسی ایک شہر میں بھی بھرتی کا مرکز نہیں کھولا گیا تھا۔ چنانچہ اس اعلان کے ہفتہ عشرہ بعد ''ڈان'' میں ایک احتجاجی مراسلہ شائع ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ ''مشرقی بنگال سے ایئر مینوں کی بھرتی کے لئے دانستہ طور پر کوئی ریکروٹنگ آفس نہیں کھولا گیا۔ پاکستان کی تینوں مسلح افواج میں بنگالیوں کی تعداد پہلے ہی مایوس کن حد تک کم ہے۔ ہمیں مسلح افواج میں بنگالیوں کی یہ کمی سابقہ

انڈین آرمی سے ورثہ میں ملی ہے لیکن اب جبکہ مشرقی بنگال کی آبادی پاکستان کی کل آبادی کے نصف سے زیادہ ہے اس کے متعلق جہاں تک سرکاری ملازمتوں کا تعلق ہے کوئی بھی اس حقیقت پر سنجیدگی سے غور نہیں کرتا۔ جس شخص میں بھی غور وفکر کی قدرے متوازن صلاحیت موجود ہے اس کو بآسانی یہ احساس ہو جائے گا کہ مشرقی بنگال میں ہر سال چھ ماہ سے زائد عرصے کے جو مخصوص موسمی حالات رہتے ہیں، ان کے پیش نظر فوجی تنظیم اور اس علاقے کے دفاع کا کام خود بنگالی ہی کر سکتے ہیں۔ قبل ازیں تینوں مسلح افواج میں افسروں کی جو بھرتی ہو چکی ہے اس میں کوئی ایک بنگالی بھی شامل نہیں کیا گیا۔ اب ان افواج میں ماتحت عملہ کی بھرتی کے لئے بھی اسی پالیسی پر عمل ہوگا۔ اس غلط اور شر انگیز لائحہ عمل کو فوری طور پر ترک کرنا چاہیے بصورت دیگر پاکستان کو بالعموم اور مشرقی بنگال کو بالخصوص نقصان پہنچے گا۔ چونکہ مسلح افواج میں بنگالیوں کی نمائندگی بہت کم ہے اس لئے آئندہ نہ صرف وہاں بھرتی کے مرکز کھولنے چاہئیں بلکہ نئی بھرتی فی الحال صرف بنگال ہی سے کرنی چاہیے۔ ایسا کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ چونکہ پاکستان کے دونوں حصوں کے درمیان مواصلاتی فاصلہ بہت طویل اور مشکل ہے اس لئے مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان میں فوجیں بھیجنے سے سرکاری خزانے پر بہت بوجھ پڑے گا اور جب یہ فوجی سال میں کم از کم ایک مرتبہ چھٹی پر جائیں گے تو ان پر سرکاری خرچ ہوگا۔ ایسی صورت میں عقل وکفایت کا تقاضا یہ ہے کہ کچھ سولجرز، سیلرز اور ایئرمین مشرقی بنگال ہی سے بھرتی کئے جائیں اور پاکستان کے اس حصے کے دفاع کے لئے انہیں وہیں تربیت دی جائے اور ان کا وہیں تقرر کیا جائے۔"[2]

لیکن یہ احتجاج صدا بصحرا ثابت ہوا کیونکہ وزیر اعظم لیاقت علی خان کی 6 رجنوری 1948ء کی پریس کانفرنس کے مطابق پاکستان کی مسلح افواج میں بھرتی کے لئے کوئی نئے قواعد نہیں بنائے گئے تھے بلکہ یہ کام پرانے قواعد کے تحت ہی جاری تھا اور برطانوی سامراجیوں کے وضع کردہ پرانے قواعد کے مطابق بنگالی، سندھی اور بلوچی، نسلی، تعلیمی اور جسمانی لحاظ سے مسلح افواج میں بھرتی کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ اس مقصد کے لئے مطلوبہ اہلیت صرف پنجاب اور صوبہ سرحد کے بعض علاقوں تک ہی محدود تھی۔

اس زمانے میں بریگیڈیئر محمد ایوب خان کا مشرقی بنگال میں بطور جنرل آفیسر کمانڈنگ تقرر ہو چکا تھا حالانکہ اسے وہاں کی آب و ہوا بالکل پسند نہیں تھی۔ یہ شخص پکا صاحب تھا اور اس کے

نزدیک فوج میں بھرتی کے لئے انگریزوں کے وضع کردہ پرانے قواعد وضوابط کی پابندی ''مذہبی فریضہ'' کی حیثیت رکھتی تھی۔ اسے مشرقی بنگال میں یہ دیکھ کر پریشانی ہوتی تھی کہ وہاں کی اتنی بڑی آبادی میں سے مطلوبہ معیار کے اتنے کم لوگ نکلتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ ''میں نے صوبائی حکومت سے اس معاملے پر بات چیت کی۔ میں نے اس سے پرزور درخواست کی کہ صوبے میں اچھے اچھے اسکول کھولے جائیں۔ جہاں ذہین نوجوانوں کو اپنے دل ودماغ، جسم وکردار کی مناسب تربیت مل سکے۔ میں نے اس سلسلے میں خواجہ ناظم الدین سے بار بار درخواست کی اور نورالامین سے بھی میری لمبی لمبی بحثیں ہوئیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ حضرات میرے مدعا کو تو اچھی طرح سمجھتے ہیں مگر یا تو وہ اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھانا ہی نہیں چاہتے یا ایسا قدم اٹھانا ان کی طاقت سے باہر ہے۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ ان کو ڈر کس بات کا تھا۔ شاید وہ سمجھتے تھے کہ پبلک اسکول کے قیام سے عوام جو اثر لیں گے وہ ان کے حق میں مفید ثابت نہیں ہوگا۔ مجھے یاد ہے کہ مولانا اکرم خان کے اخبار ''آزاد'' میں ایک مضمون چھپا تھا جس میں اسکول کھولنے کی تجویز پر حکومت کی مذمت کی گئی تھی کیونکہ ان کے خیال میں یہ اسکول غریبوں کے خرچ پر امیروں کے بچوں کے لئے کھولے جارہے تھے۔ مشرقی پاکستان میں تقریباً چار کروڑ مسلمان بستے تھے۔ اتنے چھوٹے سے رقبے میں مسلمانوں کی اتنی زیادہ آبادی دنیا کے کسی اور حصے میں نہ تھی۔ مگر پھر بھی یہاں اس قابلیت اور صلاحیت کے پیدا کرنے میں، جس کی ایک آزاد ملک کے انتظام کے لئے ضرورت تھی، کوئی کوشش نہیں کی جارہی تھی۔ میں برابر تعلیمی وتربیتی اداروں کے قیام کی ضرورت پر زور دیتا رہا مگر بعض سیاستدان سمجھتے تھے کہ وہ عوام میں بے اعتمادی اور شک وشبہ پھیلا کر بہتر اور فوری نتائج حاصل کرسکتے ہیں۔ مجھے اس بات پر بھی تعجب ہوتا تھا کہ اس خطے میں ایسے افراد کی کمی کیوں ہے جو رہبری وراہنمائی کی صفات رکھتے ہوں۔''[3]

لیکن جب یہ نیم تعلیم یافتہ اور برخود غلط شخص (ایوب خان) مشرقی بنگال کے باشعور عوام کے بارے میں یہ باتیں سوچتا اور کرتا تھا اسے یہ حقیقت یاد نہیں آتی تھی کہ دوسری جنگ عظیم سے قبل برطانوی سامراجیوں کو بھی تعجب ہوتا تھا کہ اتنے بڑے برصغیر میں ایسے افراد کی کمی کیوں ہے جو رہبری وراہنمائی کی صفات رکھتے ہوں۔ برطانوی سامراج نے سیاسی وجوہ کی بنا پر فوجی بھرتی کے لئے برصغیر کو مارشل اور نان مارشل نسلوں میں تقسیم کررکھا تھا۔ وہ بنگالیوں، مدراسیوں،

سندھیوں اور بلوچوں وغیرہ کو نان مارشل قرار دیتے تھے کیونکہ ان کی وفاداری مشکوک ہوتی تھی۔ ان کے برعکس وہ گورکھوں اور پنجابیوں کو مارشل نسل قرار دیتے تھے کیونکہ وہ 18 روپے ماہانہ تنخواہ پر ہر جگہ گولی چلانے پر ہمہ وقت آمادہ ہوتے تھے اور ان کی وفاداری شک وشبہ سے بالاتر ہوتی تھی۔ دوسری جنگ عظیم سے قبل جب کبھی ہندوستانی لیڈروں کی طرف سے ہندوستانی نوجوانوں کی مسلح افواج میں افسران کی حیثیت سے بھرتی کا مطالبہ کیا جاتا تھا تو بالعموم جواب یہ ملتا تھا کہ ہندوستانی نوجوانوں میں ابھی تک مطلوبہ تعلیم وتربیت اور رہبری ورہنمائی کی صفات کی کمی ہے لیکن دراصل انگریزوں کی جانب سے اس منفی جواب کی وجہ کچھ اور ہی ہوتی تھی اور وہ یہ تھی کہ وہ ہندوستانیوں کی ایک ایسی مکمل فوج کی تشکیل نہیں کرنا چاہتے تھے جو کسی وقت بھی ان کے اقتدار کو چیلنج کرسکتی ہو۔ ان کی اس سامراجی پالیسی کی بنیاد 1857ء کی جنگ آزادی پر تھی لیکن جب دوسری جنگ عظیم کے دوران طوعاً وکرہاً ہندوستانی نوجوانوں کو کمیشنڈ افسروں کے طور پر بھرتی کیا گیا تو 1943ء میں سنگاپور میں جاپانیوں کے زیر سایہ آزاد ہند فوج بن گئی۔ پھر 1946ء میں ہندوستانی بحریہ نے بغاوت کردی اور 1947ء میں یہ خطرہ لاحق ہوگیا کہ برصغیر کی تینوں مسلح افواج میں ہندستانیوں کا چھوٹا بڑا عملہ تحریک آزادی میں شامل ہوکر مسلح جدوجہد شروع کردے گا۔ تاہم جب اگست 1947ء میں برطانوی سامراج بڑی عجلت کے ساتھ برصغیر سے دستبرار ہوا اور ہندوستان اور پاکستان کی دوآزاد مملکتوں کا قیام عمل میں آیا تو کراچی کے ارباب اقتدار نے اپنی افواج بھرتی کرنے کے لئے انگریزوں کے پرانے قواعد وضوابط کی پابندی ضروری سمجھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ کراچی اور پنجاب کے مفاد پرست عناصر بزور قوت مشرقی بنگال، سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد پر غلبہ قائم رکھنا چاہتے تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اگر بنگالیوں، سندھیوں اور بلوچوں کو مسلح افواج میں بھرتی کے مواقع مہیا کئے جاتے تو انہیں زیادہ دیر تک ان کے سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی حقوق سے محروم نہیں رکھا جاسکتا تھا۔

لیکن وزیراعلیٰ خواجہ ناظم الدین اور اس کی کابینہ کے ارکان مشرقی بنگال میں اس سامراجی پالیسی کی وکالت نہیں کرسکتے تھے۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ چونکہ بنگالی نوجوانوں میں مطلوبہ تعلیم وتربیت اور رہبری ورہنمائی کی صفات کی کمی ہے اس لئے پاکستان کی افواج میں ان کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ مشرقی بنگال میں قیام پاکستان کے فوراً ہی بعد چاول کی کمیابی، مہنگائی

اور پٹ سن کی فراوانی و کساد بازاری نے غریب کسانوں میں بہت بے چینی پھیلا دی تھی۔شہروں میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے روزگار کا کوئی دروازہ کھلا نہیں تھا۔صنعت ناپید تھی، تجارت پر ہندوؤں کا غلبہ تھا، سول انتظامیہ پر پنجابیوں اور دوسرے غیر بنگالیوں نے قبضہ کرلیا تھا۔ مسلح افواج میں پنجاب اور صوبہ سرحد کے بعض علاقوں کی نام نہاد مارشل نسل کے علاوہ کسی اور کی بھرتی کا بظاہر کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا اور بنگالی ثقافت کو اردو، حب الوطنی اور اسلام کے نام پر ختم کرنے کے اعلانات ہورہے تھے۔ڈھاکہ اور دوسرے شہروں میں جو کوئی اس صورتحال کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا تھا اس پر صوبہ پرستی، غداری اور اسلام دشمنی کے الزامات عائد کئے جاتے تھے۔

صوبائی وزیر خزانہ حمید الحق چودھری کی جانب سے عوام کی بھلائی کے اقدامات کی کوشش مگر غیر بنگالی سول و فوجی بیوروکریسی، غیر بنگالی سرمایہ دار اور مقامی زمیندار اس کے آڑے آئے

خواجہ ناظم الدین کی کابینہ کے بعض وزراء مثلاً حمید الحق چودھری اور حبیب اللہ بہار کو یہ احساس تھا کہ مشرقی بنگال کے دیہاتی اور شہری عوام میں روز افزوں بے چینی کا سد باب محض کھوکھلے نعروں سے نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس مقصد کے لئے کوئی نہ کوئی ٹھوس ثبوت مہیا کرنا ہوگا کہ حکومت ان کی فلاح و ترقی کے لئے واقعی کوئی تعمیری کام کرنے کا عزم رکھتی ہے۔حمید الحق چودھری یہ چاہتا تھا کہ صوبہ کی تجارت، صنعت اور سرکاری ملازمتوں کے دروازے بنگالی نوجوانوں کے لئے کھولے جائیں مگر غیر بنگالی سرمایہ دار اور پنجابی بیوروکریسی اس کی اس خواہش کی تکمیل کے راستے میں حائل تھی۔اس بنا پر چیف سیکرٹری عزیز احمد اور حمید الحق چودھری کے درمیان تضاد کی نمود پہلے دن ہی سے شروع ہوگئی تھی اور کمانڈنگ آفیسر ایوب خان بھی حمید الحق کو پسند نہیں کرتا تھا۔ایوب خان کا خیال تھا کہ ”حمید الحق ترقی کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرتا تھا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ باہر کا کوئی مسلمان اس کے صوبے میں آکر کوئی صنعتی کارخانہ قائم کرے......حمید الحق ان مسلمانوں کو ہر طرح بددل کرنے کی کوشش کرتا تھا جو باہر سے آکر اس کے صوبے میں سرمایہ لگانا چاہتے تھے ان مسلمانوں میں سے کچھ تو واپس ہندوستان چلے گئے اور کچھ کراچی آگئے۔“[4]
گویا ایوب خان کے بقول حمید الحق ایک تنگ دل، تنگ نظر اور صوبہ پرست شخص تھا اور اس وجہ

سے وہ ترقی کے راستے میں حائل تھا۔

تاہم حمید الحق نے ایک حقیقت پسند یا موقع پرست سیاسی لیڈر کی حیثیت سے مقامی رائے عامہ کے رخ کو صحیح طور پر پہچان کر مشرقی بنگال کے شہری اور دیہاتی عوام کی بے چینی کا کچھ نہ کچھ سد باب کرنے کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ ان میں سے اس کی ایک کوشش کا اعلان 14 رجنوری کو ہوا جب کہ اس نے ایک پبلک جلسہ میں زمینداری نظام کے خاتمہ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ''صوبائی اسمبلی کے آئندہ سیشن میں ایک قانون منظور کیا جائے گا جس کے تحت مالیہ وصول کرنے والے زمینداروں کے مفادات کو سرکاری تحویل میں لینے کا کام دو سال میں مکمل ہو جائے گا۔''[5]

مگر جب یکم فروری کو ڈھاکہ میں ایسٹ بنگال لینڈ لارڈز ایسوسی ایشن کا اجلاس ہوا تو معلوم ہوا کہ حمید الحق چودھری کے لئے اس وعدے کو پورا کرنا آسان نہیں ہوگا۔ اس اجلاس میں مہاراجہ بھوپندرا چندرا سنہا کو انجمن کا صدر منتخب کیا گیا اور نائب صدارت کے لئے نواب خان حبیب اللہ خان آف ڈھاکہ، خان بہادر چودھری حبیب الدین احمد صدیقی، کمار رام نارائن رائے چودھری اور بابو جگدیش چندرا چکرورتی کا انتخاب ہوا۔ رائے چندرا بینرجی، اعزازی سیکرٹری، بابو سچند رموہن رائے جوائنٹ سیکرٹری، بالو دیبندرا چندرا رائے خزانچی اور بابو دیو جیش چندرا رائے چودھری و بابو تارک ناتھ نائب سیکرٹری منتخب ہوئے۔''[6] زمینداروں کے اس جلسہ سے یہ معلوم ہوا کہ مشرقی بنگال کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ اور دوسرے غریب عوام کے خلاف غیر بنگالی سول اور فوجی بیوروکریسی، غیر بنگالی سرمایہ دار اور مقامی زمیندار سب کے سب متحد تھے۔ زمینداروں کے اس غیر فرقہ وارانہ گٹھ جوڑ کا مقصد صرف یہی نہیں تھا کہ وہ حمید الحق چودھری کے مجوزہ قانون کی منظوری کو روکنا چاہتے تھے بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ بے زمین مزارعین سے سرکاری ذرائع سے مالیہ وصول کیا جائے۔ کراچی کے روزنامہ ''ڈان'' میں 15 رجنوری 1948ء کے ایک نیوز لیٹر کے مطابق ضلع سلہٹ میں مزارعین نان کار سسٹم کے تحت زمینداروں کو مالیہ نہیں دیتے اور جن تین مسلم لیگی لیڈروں نے اس علاقے کا دورہ کیا ہے ان کی رائے یہ ہے کہ اس سسٹم کو منسوخ کر دینا چاہیے۔ یہ سسٹم انگریزوں کے زمانے میں رائج ہوا تھا جس کے تحت مزارعین زمینداروں کی زمین پر کام کرتے تھے اور زمیندار اس کے معاوضہ کے طور پر ان مزارعین کو کاشت کے لئے تھوڑی سی

زمین دے دیتے تھے بالفاظ دیگر زمیندار محض دو وقت کی روٹی کے عوض مزارعوں سے اپنی زمین پر کام کرواتے تھے۔

لیکن عوام دشمن قوتوں کے اس ناپاک گٹھ جوڑ کے باوجود مشرقی بنگال کے دیہاتی اور شہری عوام کی جانب سے حقوق کا مطالبہ زور پکڑتا چلا گیا حالانکہ ان دنوں حکومت ہندوستان نے اپنے صوبہ آسام اور مشرقی بنگال کے درمیان سرحدی تنازعہ کھڑا کر کے بین المملکتی قومی تضاد کی شدت میں اضافہ کر دیا تھا۔ 12رفروری کو چٹاگانگ کی میونسپل کونسل نے مرکزی وزیر تعلیم فضل الرحمان کے اعزاز میں ایک دعوت دی تو اس میں بنگالی نوجوانوں کے لئے سرکاری ملازمتوں کا مطالبہ زیر بحث آیا۔ کونسل کے چیئرمین نور احمد نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں چٹاگانگ کی بندرگاہ کو ترقی دینے، شہر میں ایک یونیورسٹی قائم کرنے اور عورتوں کی تعلیم کے لئے ایک کالج کھولنے کے مطالبات کے ساتھ یہ مطالبہ بھی کیا کہ ''مشرقی بنگال کے سارے ہائی سکولوں اور کالجوں میں لازمی فوجی تربیت کا انتظام کیا جائے اور ضلع چٹاگانگ میں ایک جدید فوجی کالج اور نیول اسکول قائم کیا جائے۔''[7]

صوبائی وزیر حبیب اللہ بہار نے بنگال میں اردو رائج کرنے کی مخالفت اور بنگالی کو ذریعہ تعلیم اور سرکاری زبان بنانے کی وکالت کی مگر مغربی پاکستان کے ارباب اقتدار بدستور اردو کو مسلط کرنے کی پالیسی پر گامزن رہے

13رفروری کو چٹاگانگ میں ایک جلسہ عام ہوا تو اس میں قومی زبان کا مسئلہ تقریروں کا موضوع بنا۔ صوبائی وزیر صحت حبیب اللہ بہار نے اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ''اگرچہ قومی زبان کے مسئلہ کے بارے میں ابھی تک سرکاری طور پر کوئی قطعی اعلان نہیں ہوا تاہم میری رائے میں اس سلسلے میں اختلافی بحث کی کوئی گنجائش نہیں۔ میری پختہ رائے ہے کہ بنگالی زبان کے مشرقی پاکستان کی سرکاری زبان بننے کے بارے میں جو دعویٰ کیا جا رہا ہے اس پر کوئی تنازعہ نہیں ہوسکتا۔ بنگالی زبان اس علاقے کے 99 فیصد سے زائد لوگوں کی زبان ہے۔ بنگالی بولنے والوں کی تعداد پاکستان کے دوسرے علاقوں کی کل آبادی سے زیادہ ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ملک کے ہر صوبہ کے لوگ اپنی مادری زبان میں بات چیت کرتے ہیں۔ اردو ہمارے ملک کے

بالائی طبقہ کے معدودے چند لوگوں کی زبان ہے۔ یہ کسی علاقے کی بھی مادری زبان نہیں ہے۔ بنگال میں اردو بولنے والوں کی تعداد اتنی تھوڑی ہے کہ ہم انہیں انگلیوں پر گن سکتے ہیں۔ اردو کی نمود سب سے پہلے بنگال میں ہوئی تھی لیکن بنگال نے کبھی اسے اپنی زبان کی جگہ نہیں لینے دی۔ مشرقی بنگال میں اردو رائج کرنے کے لئے جو سیاسی مشکلات درپیش ہوں گی انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس مقصد کے لئے ابتدائی اخراجات تقریباً ایک کروڑ روپے ہوں گے اور تقریباً 30 ہزار اساتذہ کی ضرورت ہوگی۔ ہمارے لوگ عام طور پر صرف چار سال تک تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اگر اس مختصر عرصے میں انہیں دو زبانیں سیکھنے کے لئے کہا جائے تو ان کی توانائی ضائع ہوگی۔''[8]

لیکن حبیب اللہ بہار کے مذکورہ دلائل بالکل لاحاصل ثابت ہوئے کیونکہ کراچی میں مرکزی ارباب اقتدار نہ صرف اردو زبان کو پورے پاکستان میں ٹھونسنے کا تہیہ کئے ہوئے تھے بلکہ وہ مختلف علاقوں کے مختلف حالات کو نظر انداز کر کے سارے ملک میں ایک ہی قسم کا قومی نظام تعلیم رائج کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے اسی دن مرکزی وزیر تعلیم کی زیر صدارت قومی تعلیم کے لئے ایک مشاورتی بورڈ کی تشکیل کی تھی جس کی ایک ذمہ داری یہ تھی کہ وہ تعلیمی معاملات میں صوبائی اور ریاستی حکومتوں کو مشورہ دے گا۔ گویا اس طرح تعلیم کا محکمہ عملی طور پر مرکزی حکومت کی تحویل میں رکھنے کی ابتدا کر دی گئی تھی۔ اس بورڈ کی تشکیل کے اعلان کے اگلے دن پنجاب یونیورسٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ 26، 27 اور 28 مارچ کو ایک اردو کانفرنس منعقد کی جائے گی جس میں یہ مطالبہ کیا جائے گا کہ اردو کو بلا تاخیر پاکستان کی واحد سرکاری زبان قرار دیا جائے[9] اور 17 رفروری کو مولانا اسماعیل ذبیح اور مولانا عبدالقیوم نے حیدرآباد (سندھ) میں اعلان کیا کہ وہ مسلم لیگ کونسل کے آئندہ اجلاس میں ایک قرارداد پیش کریں گے جس میں دوسری باتوں کے علاوہ یہ تجویز بھی پیش کی جائے گی کہ ''پاکستان کی تمام زبانیں نشوونما حاصل کریں گی مگر ایک واحد مشترکہ اور سرکاری زبان صرف اردو ہوگی جس کو مرکز اور صوبوں میں بلا تاخیر رواج دینا چاہیے۔''[10]

پنجابی افسروں پر مشتمل ایسٹ بنگال رجمنٹ اور رضا کاروں کی انصار فورس کی تشکیل

قومی زبان کے مسئلہ پر اس عوامی بحث کے دوران 16 رفروری 1948ء

کو ایسٹ بنگال رجمنٹ کی پہلی بٹالین کا قیام عمل میں آیا۔ صوبائی گورنر سر فریڈرک بورن (Fredric Bourne) نے اس نئے فوجی یونٹ سے سلامی لی اور اس موقع پر اپنی تقریر میں کہا کہ ''ماضی میں مشرقی بنگال کے لوگ بری فوج کے سپاہی نہیں ہوا کرتے تھے لیکن اس رجمنٹ کی تشکیل سے مشرقی پاکستان میں مارشل نسل کے مستقبل کی بنیاد رکھ دی گئی ہے'' لیکن پنجابی افسروں کے ماتحت بنگالی نوجوانوں کے اس چھوٹے سے فوجی یونٹ کے قیام کا مطلب یہ نہیں تھا کہ حکومت نے مسلح افواج میں بھرتی کے پرانے قواعد وضوابط میں کوئی تبدیلی کر دی ہے بلکہ اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ صوبہ میں امن و امان قائم رکھنے، سمگلنگ کے سد باب اور قبائلیوں و کسانوں کی سرکشی کے خاتمہ کے لئے فوج میں کچھ مقامی لوگوں کا ہونا ضروری تھا۔ قبل ازیں 13 رفروری کو حکومت بنگال یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ تقریباً ڈیڑھ لاکھ افراد پر مشتمل انصار کی ایک رضا کار فورس کی تشکیل کی جائے گی۔ اس فورس کی تشکیل کا ایک مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ ''میمن سنگھ کے پہاڑی علاقوں میں بعض قبائل نے فوجی خطوط پر ایک تنظیم بنا رکھی ہے اور ان قبائلیوں کو بعض داخلی و خارجی عناصر حکومت پاکستان کے خلاف اشتعال دلا رہے ہیں۔ حکومت مشرقی بنگال ان کی سرگرمیوں سے آگاہ ہے۔ انصار فورس ان کا سد باب کر کے علاقہ میں امان و امان قائم رکھے گی۔''[11]

میمن سنگھ کے پہاڑی علاقوں کے علاوہ ہندوستان کے صوبہ آسام کی سرحد پر اس رضا کار فورس کی ضرورت تھی کیونکہ ہندوستان کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے پارلیمنٹ میں یکا یک یہ دعویٰ کر دیا تھا کہ سلہٹ اور آسام کی سرحد کے نزدیک پتھاریہ کا جنگل ہندوستان کی ملکیت ہے[12] اور کلکتہ کے اخبار ''ہندوستان سٹینڈرڈ'' میں یہ پروپیگنڈا ہو رہا تھا کہ حکومت پاکستان نے آسام کی سرحد پر گوریلا سرگرمیاں شروع کروا دی ہیں اور وہ پاکستانی باشندوں کو چوری چھپے آسام میں بھیج رہی ہے تا کہ ہندوستان کے مشرقی علاقے میں دوسرا محاذ کھولا جائے۔ چونکہ ہندوستان سٹینڈرڈ میں یہ پروپیگنڈا ہندوستانی وزیر داخلہ سردار پٹیل کے گوہاٹی کے دورہ کے موقع پر شروع ہوا تھا اس لئے پاکستان کی وزارت دفاع نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ حکومت ہندوستان نے مشرقی بنگال میں کوئی شرارت کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔''[13]

انہی دنوں ہندوستان کے صوبہ مغربی بنگال کی حکومت نے 15 ہزار افراد پر مشتمل ایک فوج کی تشکیل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں کلکتہ سے جو اعلان جاری ہوا تھا اس میں کہا گیا تھا

کہ یہ فوج مشرقی بنگال کے ساتھ 600 میل لمبی سرحد پر سمگلنگ اور تخریبی سرگرمیوں کا سد باب کرے گی۔ اس فوج کے علاوہ ایک خاص بٹالین کی بھی تشکیل ہوگی جو دریائے گنگا کی 50 میل لمبی قدرتی سرحد کی نگرانی کرے گی۔[14]

جناح نے ایوب خان کو بطور سزا مشرقی بنگال کا جی۔او۔سی بنا کر بھیجا تھا

ہندوستان سٹینڈرڈ کا متذکرہ پروپیگنڈا بے بنیاد تھا کیونکہ 1948ء کے اوائل تک حکومت پاکستان نے مشرقی بنگال کے دفاع کے لئے واقعی ٹھوس اقدام نہیں کیا تھا۔ اس علاقے کی کمان بریگیڈئیر محمد ایوب خان کے پاس تھی جسے بظاہر بطور سزا یہاں بھیجا گیا تھا اور جسے اس علاقے کے دفاعی انتظامات میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنی رسمی تقرری پر اس قدر ناخوش تھا کہ وہ مقامی سیاسی لیڈروں سے کہا کرتا تھا کہ تم میرے خلاف تحریک شروع کر کے مجھے یہاں سے نکلوا کیوں نہیں دیتے۔ یقین جانو میں اپنی صفائی میں ایک لفظ تک نہ کہوں گا۔ اس نے پنجاب باؤنڈری فورس کے بریگیڈئیر کی حیثیت سے جو سنگدلانہ اور گھناؤنا کردار ادا کیا تھا اس کی وجہ سے قائداعظم جناح اس سے سخت ناراض تھے اور انہوں نے دو جونیئر بریگیڈئیر افتخار اور بریگیڈئیر نذیر کو میجر جنرل بنا کر ایوب کو بطور بریگیڈئیر مشرقی بنگال بھیج دیا تھا۔

آسام کی سرحد پر کشیدگی اور ہندوستان کو خدشہ کہ پاکستان آسام اور ناگالینڈ کے علیحدگی پسندوں کی مدد اور تربیت کر کے ہندوستانی افواج کو مشرقی محاذ پر الجھا دے گا

سردار پٹیل گوہاٹی اس لئے نہیں گیا تھا کہ حکومت پاکستان نے سلہٹ۔ آسام سرحد پر گوریلا سرگرمیاں شروع کر دی تھیں بلکہ اس کے دورۂ آسام کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں آسام میں مقامی شاونزم اپنے عروج پر تھا اس لئے بعض آسامی عناصر کی کوشش یہ تھی کہ بنگالی بولنے والے جو مسلمان کسان اس صوبہ میں رہ گئے ہیں انہیں بھی پاکستانی تخریب کار قرار دے کر وہاں سے نکال باہر کیا جائے۔ آسام میں مقامی شاونزم کی انتہا یہ تھی کہ ایک نہایت متعصب ہندو اخبار نویس جیوتی سین گپتا کے بیان کے مطابق جولائی 1947ء میں سلہٹ میں استصواب کا نتیجہ

پاکستان کے حق میں اس لئے برآمد ہوا تھا کہ بعض آسامی ہندو لیڈر سلہٹ کو الگ کر کے اپنے صوبہ میں بنگالیوں کی بالادستی کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ انہی عناصر نے بعد میں اس مقصد کے تحت گول پاڑا اور دوسرے علاقوں میں بنگالی ہندوؤں کے خلاف بھی فسادات کرائے تھے۔[15]

سردار پٹیل کے دورۂ آسام کی دوسری وجہ غالباً یہ تھی کہ صوبہ آسام سے ملحقہ ناگالینڈ میں ناگا قبائلیوں کی آزادی کی تحریک خطرناک حد تک شدید ہوگئی تھی۔ ان ناگاؤں کے ایک وفد نے 20/اگست 1947ء کو نئی دہلی میں ہندوستانی وزیراعظم جواہرلال نہرو سے ملاقات کر کے اپنے علاقے کی مکمل آزادی وخودمختاری کا مطالبہ کیا تھا مگر نہرو نے ان کا یہ مطالبہ بڑی سختی سے مسترد کر دیا تھا اور کہا تھا کہ ہندوستان کی کسی چھوٹی یا بڑی ریاست کو آزاد رہنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ ہم اس قسم کے رجحانات کو دبانے کے لئے اپنا سارا زور اور اپنی ساری قوت استعمال کریں گے[16] لیکن نہرو کی اس دھمکی کے باوجود ناگالینڈ میں یہ رجحان ختم نہیں ہوا تھا بلکہ اس میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا گیا تھا۔ دسمبر 1947ء کے دوسرے ہفتے میں اس رجحان کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ ناگا نیشنل کونسل کی مجلس عاملہ نے ہندوستان کی حکومت کے ناگا ملازمین کو ہدایت کی تھی کہ وہ اپنے عہدوں سے مستعفی ہوجائیں کیونکہ ان کی خدمات ان کی اپنی آزاد مملکت کو درکار ہیں۔ جو ناگا ملازمین اس ہدایت پر عمل نہیں کریں گے انہیں ناگا مملکت کا دشمن تصور کیا جائے گا۔[17] ناگاؤں کی یہ سرزمین چٹاگانگ کے پہاڑی علاقے سے متصل تھی اس لئے حکومت ہندوستان کو خدشہ تھا کہ حکومت پاکستان ہندوستانی افواج کو مشرقی علاقے میں ملوث کرنے کے لئے ناگا باغیوں کو فوجی تربیت دے گی اور انہیں اسلحہ سپلائی کرے گی۔

مشرقی حصے کے دفاع کی خاطر بنگالی رہنماؤں کی جانب سے فوجی، سیاسی اور صنعتی مراعات کے مطالبوں میں اضافہ

مشرقی بنگال کے لیڈروں کو حکومت ہندوستان کی ان مشکلات اور اپنی ہمہ گیر پسماندگی وکمزوری کا پوری طرح احساس وشعور تھا۔ چنانچہ پاکستان دستور ساز اسمبلی کے ایک بنگالی رکن نوراحمد کا مسلسل مطالبہ یہ تھا کہ ''پاکستان میں قومی ملیشیا یا علاقائی فوج کی تشکیل کی جائے۔ چٹاگانگ کی بندرگاہ کی توسیع کی جائے اور اس شہر میں ایک فوجی کالج اور ایک نیول سکول کھولا جائے۔''[18]

بنگال صوبائی لیگ کے سیکرٹری حبیب اللہ بہار کا مطالبہ یہ تھا کہ ''مشرقی بنگال کو حق خود اختیاری کے اصولوں کی بنیاد پر مکمل خودمختاری دی جائے۔''[19] اور مشرقی بنگال کا وزیر خزانہ حمید الحق چودھری یہ مطالبہ کرتا تھا کہ اس کے صوبہ میں صنعتی ترقی کے لئے صوبائی حکومت کو مقامی طور پر قرضہ حاصل کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس کا اندازہ یہ تھا کہ تین سال کے صنعتی منصوبہ کے لئے 17 کروڑ روپے کی ضرورت ہوگی۔ مگر مرکزی حکومت نے مطلوبہ اجازت نہ دی اور یہ تجویز پیش کی کہ ''مشرقی بنگال کی حکومت کو اس مقصد کے لئے مرکزی حکومت سے قرضہ حاصل کرنا چاہیے۔''[20]

دستور ساز اسمبلی کا سال میں ایک اجلاس ڈھاکہ میں منعقد کرانے کی تجویز پر اسمبلی میں بحث، لیاقت نے مخالفت کی اور تجویز مسترد کر دی گئی، بنگالی ارکان کا احساس محرومی کے بارے میں اظہار

23رفروری 1948ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا تو اس سے اگلے دن 24رفروری کو قائداعظم محمد علی جناح کی زیر صدارت اسمبلی کے رولز آف پروسیجر کی منظوری کی تحریک پر بحث ہوئی تو پہلے ہی دن یہ حقیقت منظر عام پر آ گئی کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان اختلافات کی خلیج بہت وسیع ہے۔ یہ بحث مشرقی بنگال کے پروفیسر راجکمار چکرورتی کی مجوزہ قاعدہ نمبر 14 میں اس ترمیم پر ہوئی کہ اسمبلی کا اجلاس کم از کم ایک مرتبہ ڈھاکہ میں ہونا چاہیے۔ پروفیسر چکرورتی نے اپنی اس ترمیم کے حق میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''پاکستان ایک جمہوری ملک ہے اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم عوام کی اکثریت اور خواہشات کا احترام کریں۔ مشرقی پاکستان سارے ملک کی دو تہائی آبادی پر مشتمل ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر وہاں اسمبلی کے کچھ اجلاس منعقد ہونے چاہئیں...... پاکستان کے نئے نظام میں یہ احساس پایا جاتا ہے کہ مشرقی پاکستان کو نظرانداز کیا جا رہا ہے...... تقسیم سے پہلے مرکزی اسمبلی کا اجلاس دہلی اور شملہ میں ہوا کرتا تھا...... بلاشبہ ڈھاکہ میں اجلاس منعقد کرانے میں کچھ مشکلات ہیں لیکن اگر کوئی کام کرنے کا ارادہ کر لیا جائے تو اس کے لئے کوئی نہ کوئی راستہ نکل ہی آتا ہے۔''[21]

بیگم شائستہ اکرام اللہ نے اس ترمیم کی تائید کی اور کہا کہ ''مغربی پاکستان کے ارکان کو مشرقی پاکستان جانے کے لئے جو عملی مشکلات درپیش ہوں گی وہ ان مشکلات سے زیادہ نہیں ہوں

گی جوآج کل مشرقی پاکستان کے ارکان کو مغربی پاکستان آنے میں پیش آتی ہیں......مشرقی پاکستانیوں میں یہ احساس بڑھ رہا ہے کہ مشرقی پاکستان کو نظرانداز کیا جارہا ہے اور اس سے مغربی پاکستان کی ایک نوآبادی کا سا سلوک ہورہا ہے۔ ہمیں اس احساس کو دور کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے...... جائز یا ناجائز طور پر ہمیں کسی صوبہ میں یہ احساس پیدا ہونے کا موقع نہیں دینا چاہیے کہ اسے نظرانداز کیا جارہا ہے۔ میں نے مغربی پاکستانیوں کے ساتھ بہت سے سال گزارے ہیں اور مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ مشرقی پاکستان کے عوام کے بارے میں بہت ہی بے خبر ہیں۔''[22]

تاہم وزیراعظم لیاقت علی خان نے اس ترمیم کی مخالفت کی اور اس نے اپنے اس مخالفانہ موقف کی ایک وجہ یہ بتائی کہ ''اگر اسمبلی کا اجلاس ڈھاکہ میں ہوا تو سرکاری عملے اور ریکارڈ کی نقل وحمل براستہ سمندر ہوگی۔ ایک مہینہ جانے میں لگے گا اور ایک مہینہ آنے میں لگے گا اور اس دو ماہ کے عرصے میں حکومت کا سارا کام معطل رہے گا۔ کیونکہ سرکاری کام ایک جگہ سے دوسری جگہ تک براستہ سمندر سفر کے دوران تو نہیں کیا جاسکتا۔''[23] وزیراعظم کی اس تقریر کے بعد چکرورتی کی مجوزہ ترمیم کثرت رائے سے مسترد کردی گئی لیکن اس بحث کا یہ فائدہ ہوا کہ بعض ایسے تلخ حقائق بے نقاب ہوگئے جن پر اس وقت تک اسلام، مسلم قومیت اور حب الوطنی کے پردے ڈالے جارہے تھے۔

بیگم شائستہ سہروردی اکرام اللہ انڈین سول سروس کے ایک بنگالی افسر (جس کے آباؤ اجداد غیر بنگالی تھے) سر اکرام اللہ کی بیوی تھی اور اس بنا پر اس کے کراچی اور پنجاب کے بالائی طبقوں کے لوگوں سے گہرے معاشرتی تعلقات تھے۔ اس کا شوہر پاکستان کے محکمہ خارجہ کا سیکرٹری تھا اور وہ مستقل طور پر کراچی میں مقیم تھی۔ تاہم اس نے ان سب باتوں کے باوجود اس تلخ حقیقت کی نشاندہی کی کہ مشرقی پاکستان میں یہ احساس بڑھ رہا ہے کہ مشرقی پاکستان کو نظرانداز کیا جارہا ہے اور اس سے مغربی پاکستان کی ایک نوآبادی کا سا سلوک کیا جارہا ہے اور یہ کہ مغربی پاکستان کے لوگ مشرقی پاکستان کے عوام کو بالکل نہیں جانتے۔ دوسری تلخ حقیقت جس کی اس بحث کے دوران نشاندہی ہوئی، یہ تھی کہ اگرچہ وزیراعظم لیاقت کو یہ احساس تھا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان تقریباً 3 ہزار میل کا سمندری فاصلہ ہے لیکن اس کے باوجود، اسلام، مسلم

قومیت اور حب الوطنی کے نام پر نہ صرف اردو زبان کو تقریباً 55 فیصد بنگالیوں پر ٹھونسنا چاہتا تھا بلکہ وہ مشرقی پاکستانیوں کے صوبائی خودمختاری کے مطالبہ کے بھی خلاف تھا۔ وہ سال میں صرف ایک مرتبہ ڈھاکہ میں اسمبلی کا اجلاس منعقد کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔

دستور ساز اسمبلی میں بنگالی کو اردو اور انگریزی کے ساتھ تیسری زبان کے طور پر اختیار کرنے کی تجویز پر تاریخی بحث...... لیاقت اور حکومتی ارکان کا غیر حقیقت پسندانہ رویہ اور تجویز مسترد

25 رفروری کو دستور ساز اسمبلی کا اجلاس ہوا تو اس میں قومی زبان کے مسئلہ پر کچھ ایسی بحث ہوئی کہ جس نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان اختلافات کو اور بھی واضح اور شدید کر دیا۔ اس مسئلہ پر دراصل عوامی سطح کی بحث قیام پاکستان کے فوراً ہی بعد شروع ہو گئی تھی جب کہ کراچی میں انجمن ترقی اردو کے قیام کے موقع پر یہ اعلان کیا گیا تھا کہ اردو زبان کو پورے پاکستان میں رائج کیا جائے گا اور پھر ستمبر۔ نومبر 1947ء میں کراچی اور پنجاب میں اردو کو واحد قومی زبان بنانے کے اعلانات ہونے لگے تھے۔ مشرقی بنگال میں ان اعلانات کے خلاف ابتدائی احتجاج کسی ہندو لیڈر کی طرف سے نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی ابتدا تحریک پاکستان اور اسلام کے علمبرداروں کی جانب سے ہوئی تھی اور ان میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے اسلام پسند اساتذہ اور بعض صوبائی وزراء بھی شامل تھے لیکن اب مرکزی اسمبلی میں اس مسئلہ پر بحث کو یہ رنگ دے دیا گیا کہ جیسے اس کا تعلق محض ہندو۔ مسلم تنازعہ سے ہے۔ بظاہر اس کی وجہ یہ تھی کہ مرکزی اسمبلی میں قومی زبان کا مسئلہ مشرقی بنگال کے کسی مسلمان رکن نے نہیں اٹھایا تھا حالانکہ قبل ازیں صوبائی وزیر صحت حبیب اللہ بہار اور متعدد دوسرے بنگالی مسلمان زعما اس کے بارے میں غیر مبہم الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے تھے۔ مرکزی اسمبلی میں ان کی خاموشی کی وجہ ان کی سیاسی موقع پرستی میں پنہاں تھی۔ ان پر مرکزی حکومت کا سخت دباؤ تھا اور ان کی سیاسی و معاشی مصلحتیں انہیں اس دباؤ کی مزاحمت کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ خواجہ ناظم الدین کی صوبائی حکومت بہت کمزور ہے اور یہ دراصل غیر بنگالی بیوروکریسی کے سہارے چل رہی ہے اور یہ کہ اس کٹھ پتلی صوبائی حکومت نے 14 راگست 1947ء کے بعد کوئی کام بھی مرکزی حکومت

کی منظوری اور اجازت کے بغیر نہیں کیا۔ جب صوبائی وزیر خزانہ حمید الحق چودھری نے دو ایک کام از خود کرنے کی کوشش کی تھی تو مشرقی پاکستان میں متعینہ پنجابی بیورو کریسی اور مرکزی حکومت نے اس کی یہ کوشش ناکام بنا دی تھی۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ مرکزی حکومت نے اس اسمبلی کا اجلاس شروع ہونے سے صرف دس بارہ دن پہلے 13 ر فروری 1948ء کو ایک آرڈیننس کے ذریعے ایک سپیشل سنٹرل فورس قائم کرنے کا اختیار حاصل کر لیا تھا اور یہ اعلان کیا تھا کہ ''یہ مرکزی پولیس وزراء اور ارکان اسمبلی سمیت سارے چھوٹے بڑے سیاسی لیڈروں کے خلاف تفتیش کر سکے گی۔''[24]

اس پس منظر میں ایک بنگالی ہندو رکن اسمبلی دھندر اناتھ دتہ کو یہ امر مجبوری قومی زبان کے مسئلہ پر بحث چھیڑنی پڑی۔ اس نے اپنی بحث کا آغاز اسمبلی کے مجوزہ رول نمبر 27 میں اس مضمون کی ترمیم کے ذریعے کیا کہ اس ایوان میں اردو اور انگریزی کے علاوہ بنگالی زبان میں تقریر کرنے کی اجازت ہوگی۔ دتہ نے اپنی اس ترمیم کے حق میں جو تقریر کی وہ خاصی متوازن اور مدلل تھی اور اس میں ہندو۔ مسلم تنازعہ کی رنگ آمیزی نہیں تھی۔ اس نے کہا کہ ''میں نے یہ ترمیم صوبہ پرستی کے جذبہ کے تحت پیش نہیں کی۔ مجھے معلوم ہے کہ بنگالی ایک صوبائی زبان ہے لیکن یہ ہماری ریاست کے عوام کی اکثریت کی زبان ہے اور اس بنا پر اس کی حیثیت دوسری صوبائی زبانوں سے مختلف ہے۔ پاکستان کے 6 کروڑ 90 لاکھ کی آبادی میں سے چار کروڑ چالیس لاکھ لوگ بنگالی زبان بولتے ہیں۔ اس صورت حال میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ملک کی قومی زبان کونسی ہونی چاہیے۔ میری رائے میں قومی زبان کا درجہ اس زبان کو حاصل ہونا چاہیے جو ملک کے عوام کی اکثریت کی زبان ہے۔ چونکہ پاکستان کے عوام کی اکثریت بنگالی زبان بولتی ہے اس لئے اس بنگالی کو قومی زبان ہونا چاہیے...... مشرقی پاکستان میں اس مسئلہ پر شدید جذبات پائے جاتے ہیں کیونکہ وہاں کے عوام کو اس بنا پر اپنی روزانہ زندگی میں بہت مشکلات پیش آتی ہیں۔ مثلاً منی آرڈر فارم اردو اور انگریزی میں چھپے ہوئے ہیں۔ چنانچہ جب کبھی کسی غریب کاشت کار کو ڈھاکہ یونیورسٹی میں زیر تعلیم اپنے بیٹے کو پیسے بھیجنے ہوتے ہیں تو اسے منی آرڈر فارم کا ترجمہ کرانے کے لئے کسی قصبے میں جانا پڑتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی غریب کاشت کار کو زمین کے کسی ٹکڑے کی خرید وفروخت کرنا ہوتی ہے تو اسے پتہ نہیں چلتا کہ اشٹام فروش اسے کتنی قیمت کا اشٹام دے رہا ہے کیونکہ اشٹاموں پر قیمت کا اندراج صرف اردو اور انگریزی میں ہوتا ہے۔ بنگالی عوام کی یہ

مشکلات حقیقی ہیں۔ لہٰذا قومی زبان ایسی ہونی چاہیے جو عوام کی سمجھ میں آ جائے۔ اگر اس ایوان کے قواعد میں انگریزی کو عزت کا مقام دیا جا سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ بنگالی زبان کو اس مقام سے محروم رکھا جائے۔ بنگالی زبان سے محض ایک صوبائی زبان کا سا سلوک نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے ایک قومی زبان تصور کرنا چاہیے۔''[25]

مشرقی بنگال کے ایک اور ہندو رکن پریم ہری برمانے دھندرا ناتھ دتہ کی اس ترمیم کی پرزور تائید کی۔ اس نے کہا کہ ''اس ترمیم کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اردو یا انگریزی کو خارج کرنا چاہتے ہیں بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ بنگالی زبان کو بھی قومی زبان کا درجہ دیا جائے...... اس ایوان میں بنگالی زبان میں جو تقریریں ہوں انہیں بنگالی زبان میں ریکارڈ کرنا چاہیے۔ اگر بنگالی زبان اس ایوان کی زبانوں میں شامل نہیں ہوگی تو بنگالی تقریریں ریکارڈ نہیں ہوں گی بلکہ ایوان کی کاروائی کے ریکارڈ میں ان کا ترجمہ شامل کیا جائے گا۔''[26]

تاہم وزیر اعظم لیاقت علی خان نے اس ترمیم کے خلاف بڑی سخت تقریر کی اور الزام عائد کیا کہ دھندرا ناتھ دتہ نے یہ ترمیم پیش کر کے ملک کے مختلف حصوں کے درمیان غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے اپنی لچھے دار تقریر میں کہا کہ ''بنگالی زبان کو درحقیقت پاکستان کی قومی زبان ہونا چاہیے۔ بالفاظ دیگر وہ صرف یہی نہیں چاہتا کہ یہاں بنگالی زبان میں تقریر کرنے کی اجازت ہونی چاہیے بلکہ اس نے بہت اہم سوال اٹھا دیا ہے۔ اسے یہ احساس کرنا چاہیے کہ پاکستان برصغیر کے دس کروڑ مسلمانوں کے مطالبہ کی وجہ سے ظہور میں آیا ہے اور ان دس کروڑ مسلمانوں کی زبان اردو ہے۔ اسے ایسی صورت حال پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے کہ پاکستان کے عوام کی اکثریت ایک حصے سے تعلق رکھتی ہے اس لئے وہاں جو زبان بولی جاتی ہے اسے پاکستان کی قومی زبان بننا چاہیے۔ پاکستان ایک مسلم ریاست ہے اور اس کی قومی زبان وہ زبان ہونی چاہیے جو مسلم قوم کی زبان ہے...... اس سلسلے میں صرف آبادی کا ہی لحاظ نہیں رکھنا چاہیے بلکہ بہت سے دوسرے عوامل بھی ہیں۔ صرف اردو ہی ایسی زبان ہو سکتی ہے جو ایسٹ بنگال یا ایسٹرن زون کے عوام اور ویسٹرن زون کے عوام کو اکٹھا رکھ سکتی ہے۔ قوم کے لئے ایک زبان کا ہونا ضروری ہے اور وہ زبان صرف اردو ہی ہو سکتی ہے۔ کسی دوسری زبان کو یہ درجہ حاصل نہیں ہو سکتا...... جب اس ترمیم کا نوٹس دیا گیا تھا تو میرا خیال تھا کہ اس کا مقصد بے ضرر ہے یعنی یہ کہ جو

ارکان اسمبلی انگریزی یا اردو میں تقریر نہیں کر سکتے انہیں اپنی بنگالی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی اجازت دی جائے لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ میرا خیال غلط تھا۔ اس ترمیم کا اصلی مقصد پاکستان کے عوام میں تفرقہ ڈالنا ہے۔ اس ترمیم کا مقصد مسلمانوں کو انہیں متحد کرنے والی ایسی قوت سے محروم کرنا ہے جو ان میں یکجہتی پیدا کرتی ہے۔

دھندرا ناتھ دتہ: یقیناً نہیں۔ حقیقت یہ نہیں ہے۔

لیاقت علی خان: میرے معزز دوست اپنی بقیہ ساری زندگی میرے اس موقف پر اعتراض کر سکتے ہیں۔ انہوں نے اعتراض کر دیا ہے لیکن میں پوچھتا ہوں کہ آیا بنگالی بولنے والے سارے لوگوں کے لئے متحد رہنا ضروری نہیں تھا؟ جواب یہ ہے کہ نہیں۔ کیونکہ یہ ریاست ایسے علاقوں کی ہونی تھی جہاں مسلمان اکثریت میں تھے۔ لہٰذا بنگال کا تقسیم ہونا لازمی تھا۔ اس وقت بنگالی زبان اور بنگالی ثقافت کو ملحوظ خاطر رکھنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا میرا خیال ہے کہ اب میرے معزز دوست کو یہاں یہ سوال نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ یہ واقعی بہت ہی اہم سوال ہے۔ یہ نہ صرف پاکستان بلکہ پورے برصغیر میں مسلم قوم کی زندگی و موت کا سوال ہے۔"[27]

لیاقت علی خان کی اس تقریر کے جواب میں مشرقی بنگال کے ایک اور ہندو رکن بھوپندرا کمار دتہ نے کہا کہ " قائدایوان نے ایک ایسی تقریر کی ہے جس کے دوسری جگہ نتائج اچھے نہیں ہوں گے۔ پاکستان کے بعض حلقوں پر بھی اس کا برا اثر پڑے گا۔ اس لئے اس ترمیم کو منظور کرنا بہت ضروری ہے۔ میں ملک کے اس علاقے کا اکثر دورہ کرتا ہوں جہاں کا میں رہنے والا ہوں۔ مجھے اس مسئلہ پر وہاں کے جذبات کی شدت کا علم ہے۔ بنگالی اس علاقے کی بہت بھاری اکثریت کی زبان ہے۔ صرف یہی زبان وہاں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہ زبان پاکستان کی کل آبادی کی اکثریت کی بھی زبان ہے...... ہندوستان میں ایک ایسی زبان کو قومی زبان بنایا جا رہا ہے جو وہاں کے عوام کی اکثریت کی زبان ہے لیکن ہم یہاں اردو کو اپنا رہے ہیں۔ اردو پاکستان کے کسی بھی صوبہ کی زبان نہیں ہے۔ یہ مغربی پاکستان کے طبقہ اولیٰ کے معدودے چند افراد کی زبان ہے۔ مجوزہ ترمیم کی جس طریقے سے مخالفت کی جا رہی ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پاکستان کے معدودے چند امرا ملک پر اپنا غلبہ قائم کرنے کی زبردست کوشش کر رہے ہیں...... پورے برصغیر میں جتنے الفاظ بنگالی زبان میں ہیں اتنے کسی اور زبان میں نہیں ہیں۔ بنگالی عوام کو ہر طریقے سے خسارے میں رکھا جا رہا

ہے۔ملک کا دارالحکومت اس علاقے سے بہت دور ہے جہاں عوام کی اکثریت رہتی ہے اور اب عوام کی اکثریت کے خلاف زبان کی دیوار کھڑی کی جا رہی ہے۔ یہ رجحان یقیناً جمہوری نہیں ہے۔ یہ رجحان ملک کے ایک مخصوص علاقے کے طبقہ اولیٰ کے معدودے چند افراد کے غلبہ کی طرف ہے۔ ہم ابھی بنگالی کو ملک کی قومی زبان بنانے پر زور نہیں دے رہے ہیں۔ ہمارا مطالبہ صرف یہ ہے کہ بنگالی کو اس ایوان کی تین تسلیم شدہ زبانوں میں شامل کیا جائے۔''[28]

لیکن راجہ غضنفر علی خان ان دلائل سے بالکل متاثر نہ ہوا اور اس نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ ''بھوپندرا کمار دتہ نے اپنی تقریر میں ''بنگالی سٹیٹ'' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ دراصل بنگالی سٹیٹ کے نام کی کوئی سٹیٹ نہیں ہے۔ یہاں صرف ایک ہی سٹیٹ ہے اور وہ صرف پاکستان کی سٹیٹ ہے اور سارے صوبے پاکستان کی سٹیٹ کے مختلف صوبے ہیں۔ یہاں صرف ایک ہی سٹیٹ ہے اور اس میں ایک ہی زبان ہوگی اور وہ قومی زبان اردو زبان ہوگی...... مجھے یقین ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب کہ پاکستان کا ہر شہری اپنی قومی زبان اردو سے آشنا ہوگا۔اردو پنجاب کی زبان یا بولی نہیں ہے۔ یہ سندھ اور صوبہ سرحد کی بولی بھی نہیں ہے لیکن یہ مسلم ثقافت اور مسلم تہذیب کی زبان ہے۔اس لئے یہ ہماری قومی زبان ہے۔

سردار عبدالرب نشتر: اس سلسلے میں احکامات پہلے ہی جاری کئے جا چکے ہیں۔

راجہ غضنفر علی خان: مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی ہے کہ احکامات جاری ہو چکے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ حکومت بنگال کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہے اور وہ سکولوں میں اردو کو رائج کرنے کے لئے فوری اقدامات کرے گی۔اس طرح دس پندرہ سال کے بعد کوئی ایسا بنگالی نہیں رہے گا جو ملک کی قومی زبان سے واقف نہیں ہوگا۔کوئی قوم یا ریاست اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتی جب تک کہ اس کی زبان مشترکہ نہ ہو۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جسے کوئی شخص چیلنج نہیں کر سکتا...... مجھے یہاں یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ہے کہ مشرقی بنگال کی اکثریت کے نمائندوں کو اس امر کا احساس ہے کہ اگر انہوں نے اس قسم کے تنازعات چھیڑ دیئے یا انہوں نے سارے صوبوں اور پاکستان کی آبادی کے سارے حلقوں کے نمائندہ اس ایوان پر اپنا نقطہ نگاہ ٹھونسنے کی کوشش کی تو وہ پاکستان کی جڑوں پر ضرب لگائیں گے۔''[29]

راجہ غضنفر علی خان کی تقریر کے اس آخری حصہ پر وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین کے سوا

مشرقی بنگال کے کسی اور مسلم رکن نے کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا۔خواجہ ناظم الدین کا خیال یہ تھا کہ ''جہاں تک مرکز اور صوبوں کے درمیان مواصلات کا تعلق ہے اس مقصد کے لئے اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جسے اپنایا جاسکتا ہے۔تاہم مشرقی بنگال میں بنگالی کو ذریعہ تعلیم بنانے کے حق میں بہت ہی زوردار جذبہ پایا جاتا ہے اور یہ کہ جہاں تک صوبوں کی انتظامیہ کا تعلق ہے اسے چلانے کے لئے بھی بنگالی زبان کا استعمال ہونا چاہیے۔میں مناسب وقت پر یہ سوال اٹھاؤں گا اور اس موقف پر زور دوں گا کہ جہاں تک صوبائی سطح پر جنرل ایڈمنسٹریشن اور سرکاری کام کا تعلق ہے اس کے لئے بنگال میں بنگالی کا ہی استعمال ہونا چاہیے۔''[30]

خواجہ ناظم الدین کی اس تقریر میں نمایاں تضاد تھا اور یہ اس کی سیاسی موقع پرستی اور کمزوری کی آئینہ دار تھی۔وہ ایک طرف تو مرکزی ارباب اقتدار کے تحت اردو زبان کو صوبوں اور مرکز کے درمیان مواصلاتی زبان ماننے پر مجبور تھا لیکن دوسری طرف اپنے صوبہ کی رائے عامہ سے بھی ڈرتا تھا اور اس وجہ سے اس امر پر زور دیتا تھا کہ مشرقی بنگال میں سرکاری اور تعلیمی زبان بنگالی ہوگی لیکن اس کے اس دوغلے پن سے اس حقیقت کی پردہ پوشی نہیں ہوتی تھی کہ تعلیم یافتہ بنگالی نوجوان اردو کو مرکز اور صوبوں کے درمیان مواصلاتی زبان یا پاکستان کی قومی زبان بنانے کے لئے اس لئے خلاف تھے کہ اس طرح ان پر نہ صرف مرکزی ملازمتوں کے دروازے بند ہوجاتے تھے بلکہ ان کے ہر اس کام میں رکاوٹ حائل ہوجاتی تھی جس کا مرکزی حکومت سے تعلق ہوسکتا تھا۔

خواجہ ناظم الدین کے بعد سریش چندرا چٹو پادھیا نے اپنی تقریر میں اس امر پر دکھ کا اظہار کیا کہ ''قائد ایوان نے پاکستان کو ایک مسلم ریاست قرار دیا ہے۔میرا خیال تھا کہ پاکستان ایک عوامی ریاست ہے اور یہ مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کی ہی ملکیت ہے۔اگر آج قائد ایوان کے اس بیان کو تسلیم کرلیا جائے تو غیر مسلموں کو اس سوال پر بڑی سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا کہ انہیں آئین سازی میں حصہ لینا چاہیے یا نہیں۔قائد ایوان کو اس سلسلے میں اپنی پوزیشن کی وضاحت کرنی چاہیے تاکہ ہم اپنا لائحہ عمل متعین کرسکیں اور ملک میں اپنی پوزیشن کو پہچان سکیں...... دھندرا ناتھ دتہ کی ترمیم میں یہ مطالبہ نہیں کیا گیا کہ بنگالی کو قومی زبان قرار دیا جائے۔اس کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ اس ایوان میں اردو اور انگریزی کے علاوہ بنگالی زبان میں اظہار خیال کا حق دیا جائے۔ فی الحال فیصلہ اس سوال پر ہونا چاہیے نہ کہ اس سوال پر کہ ملک کی قومی زبان کونسی ہونی

چاہیے۔"[31] لیکن چٹو پادھیا کی یہ دلیل بھی بے اثر ثابت ہوئی کیونکہ بنگالی زبان کو مرکزی اسمبلی کی تیسری تسلیم شدہ زبان نہ بنانے کا فیصلہ ہو چکا تھا اور سردار عبدالرب نشتر کے بیان کے مطابق اس امر کے احکامات بھی جاری ہو چکے تھے کہ اردو پاکستان کی واحد قومی زبان ہوگی۔

وزیر اعظم لیاقت علی خان اردو زبان کو گنگا اور جمنا کی وادی میں وسطی ایشیا کے مسلمان حملہ آوروں اور مقامی ہندوؤں کی ثقافتوں کے امتزاج کی پیداوار تصور نہیں کرتا تھا۔ بلکہ وہ اس گنگا جمنی زبان کو برصغیر کے دس کروڑ مسلمانوں کی زبان قرار دیتا تھا۔ وہ پاکستان کو ایک مسلم ریاست کہتا تھا جس کے لئے ایک قومی زبان کا ہونا لازمی تھا اور یہ زبان مسلم قوم کی زبان ہی ہوسکتی تھی۔ وہ مزید کہتا تھا کہ اردو زبان مشرقی بنگال اور مغربی پاکستان کے درمیان اتحاد کے ایک رشتہ کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ کہ جو لوگ بنگالی زبان کو اردو زبان کے برابر درجہ دینے کا مطالبہ کر رہے تھے وہ دراصل ملک کے ان دونوں حصوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے کے درپے تھے۔ لیاقت علی خان کا یہ موقف کس قدر کوتاہ اندیشانہ اور سیاسی بصیرت سے عاری تھا، اس کا اندازہ بعد میں چند سال کی خرابی بسیار کے بعد ہوا جبکہ بنگالی اور اردو کو قومی سطح پر مساوی درجہ دینے کا اصول آئینی طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ جب لیاقت علی خان یہ کہتا تھا کہ اردو زبان برصغیر کے دس کروڑ مسلمانوں کی زبان ہے تو وہ دراصل برصغیر کے تاریخی اور ثقافتی حقائق کو جھٹلاتا تھا۔ اردو زبان کبھی بھی برصغیر کے سارے علاقوں کے مسلمانوں کی زبان نہیں تھی۔ مغربی، جنوبی اور مشرقی ہندوستان کے مسلمانوں کی بہت بھاری اکثریت اس زبان سے بالکل ناواقف تھی۔ خود قائد اعظم محمد علی جناح کو بھی اس زبان پر کوئی دسترس حاصل نہیں تھی۔ لہٰذا لیاقت علی خان کے اس غلط دعویٰ سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ بنگالی اور پاکستان کی دوسری زبانیں مسلمانوں کی زبانیں نہیں ہیں اور یہ بات بنگالی مسلمانوں کے لئے نہایت اشتعال انگیز تھی۔

لیاقت علی خان جب اس قسم کی باتیں کرتا تھا تو وہ اس حقیقت کو بھی نظر انداز کرتا تھا کہ اس زمانے میں ہندوستان کے ارباب اقتدار کو بھی گنگا اور جمنا کی وادی کی ہندی زبان پورے ہندوستان پر ٹھونسنے میں بڑی مشکل آ رہی تھی۔ مغربی، جنوبی اور مشرقی ہندوستان میں ہندی زبان کے خلاف زبردست ایجی ٹیشن شروع ہو گئی تھی حالانکہ شمالی ہندوستان کے بعض ہندو عناصر ہندی زبان کو ہندو مذہب سے اسی طرح وابستہ کرتے تھے جس طرح کہ لیاقت علی خان اردو کو اسلام کے

ساتھ منسلک کرتا تھا۔ جنوبی ہندوستان میں شمالی ہندوستان کے ہندی بولنے والے عناصر کے غلبہ کے خلاف جذبات اس قدر شدید تھے کہ 15 رفروری 1948ء کو مدراس میں ایک آل تامل کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں ایک خودمختار تامل ناڈو کی ریاست قائم کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا اور اس موقع پر ایک تامل جھنڈا بھی لہرایا گیا تھا جو زمانہ قدیم کے جنوبی ہندوستان کے دراوڑ حکمرانوں کے اقتدار کی علامت تھا۔''[32] اسی طرح بمبئی، مغربی بنگال اور آسام کے ہندو اور ناگالینڈ کے عیسائی باشندے بھی گنگا جمنی ہندی بولنے والوں کے غلبہ کو کسی صورت قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے اور جگہ جگہ ہندی زبان کے خلاف احتجاجی مظاہرے ہو رہے تھے۔

لیکن لیاقت علی خان بظاہر ان سارے حقائق سے باخبر ہونے کے باوجود اس سنگین غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ اسلام اور مسلم قومیت کے نعروں کے زور سے مشرقی بنگال کے چار کروڑ چالیس لاکھ عوام پر اردو زبان کو ٹھونسا جا سکے گا۔ اس کا یہ موقف سراسر غلط تھا کہ اردو زبان مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان اتحاد کے رشتہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی اور وہ یہ تھی کہ دسمبر 1947ء میں مشرقی بنگال میں جو پہلا خونریز اختلافی مظاہرہ ہوا وہ اردو زبان کے مسئلہ پر ہی تھا۔ گویا اردو زبان قومی اتحاد کی علامت نہیں تھی بلکہ اس کی وجہ سے قوم میں تفرقہ پڑنے کی ابتدا ہو گئی تھی۔

لیاقت علی خان کی طرح پنجاب کے رکن راجہ غضنفر علی خان کو بھی یہ حقائق نظر نہیں آتے تھے اور اس نے دس پندرہ سال میں اردو زبان کو بنگالیوں پر ٹھونسنے کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اردو مسلم ثقافت اور تہذیب کی زبان ہے اس لئے صرف یہی زبان پاکستان کی قومی زبان بن سکتی ہے۔ یہ شخص سیاسی لحاظ سے بہت ابن الوقت تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے جب یہ یونینسٹ پارٹی میں تھا تو پنجابی شاونزم کا علمبردار تھا لیکن اب اردو شاونزم اس کا طرۂ امتیاز بن گیا تھا۔ اس کے کراچی میں گنگا جمنی تہذیب کے علمبرداروں کے ساتھ گٹھ جوڑ کی بنیاد یہ تھی کہ قیام پاکستان کے بعد کراچی اور پنجاب کے مراعات یافتہ عناصر باہمی اتحاد قائم کر کے نہ صرف مشرقی بنگال پر بلکہ مغربی پاکستان کے چھوٹے اور پسماندہ صوبوں پر بھی اپنا غلبہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ تلیئر کی زبان کے تیر اور پنجابی کی بندوق کی گولیوں سے ان کا یہ مشترکہ نصب العین پورا ہو جائے گا۔

زبان کے مسئلہ پر ڈھاکہ اور دوسرے شہروں میں طلبا کے احتجاجی مظاہرے اور ناظم الدین اور سہروردی کا دوغلا رویہ

حسب توقع پاکستان دستور ساز اسمبلی کی یہ تاریخی بحث مشرقی بنگال کے سیاسی حالات پر فوری طور پر اثر انداز ہوئی۔ 27رفروری کو ڈھاکہ کے بہت سے طلبا نے شہر میں زبردست مظاہرہ کر کے اسمبلی کے اس فیصلے کے خلاف احتجاج کیا کہ بنگالی زبان ایوان کی سرکاری زبانوں میں شامل نہیں ہوگی۔ طلبا نے رمنا کے علاقے میں جلوس نکال کر اس فیصلے کے خلاف نعرے لگائے اور پھر یونیورسٹی کمپاؤنڈ میں ایک احتجاجی جلسہ کیا۔ اس جلسہ میں قراردادوں کے ذریعے خواجہ ناظم الدین کی تقریر اور اسمبلی کے مسلم ارکان کے رویے پر نکتہ چینی کی گئی۔[33]

28رفروری کو ڈھاکہ اور مشرقی بنگال کے بعض دوسرے شہروں میں طلبا کے مزید مظاہرے ہوئے تو متحدہ بنگال کے سابق وزیر اعلیٰ حسین شہید سہروردی نے کلکتہ میں ایک بیان کے ذریعے خواجہ ناظم الدین کے اس موقف کی تائید کی کہ اردو زبان بین الصوبائی رابطہ کی زبان ہوگی اور بنگالی زبان مشرقی بنگال کی تعلیمی اور سرکاری زبان ہوگی۔ سہروردی کی رائے یہ تھی کہ ''اردو زبان کے اس لحاظ سے قومی زبان ہونے کے بارے میں کوئی تنازعہ نہیں ہوسکتا کہ یہ مشترکہ بین الصوبائی زبان ہوگی۔ لہٰذا یہ زبان مشرقی بنگال کے اسکولوں میں ثانوی زبان ہونی چاہیے لیکن اس امر سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بنگالی زبان بنگالیوں کی ثقافت کا حصہ ہے اور اس بنا پر اسے مشرقی پاکستان کی سرکاری زبان ہونا چاہیے اور تعلیم کے تمام مراحل میں اسی زبان کو ذریعہ تعلیم ہونا چاہیے۔ مزید برآں اگر مغربی پاکستان کے سکولوں میں بنگالی زبان کی تعلیم کی حوصلہ افزائی کی جائے تو پاکستان کے سارے حصوں کے درمیان اتحاد و یکجہتی کا تحفظ ہوگا۔'' سہروردی نے اپنے بیان میں اس اعتماد کا اظہار کیا کہ ''حکومت مشرقی پاکستان کا رویہ یہی ہے کیونکہ یہ حالات کے حقائق اور عوام کے مطالبات سے مطابقت رکھتا ہے۔ اگر صوبائی حکومت اس سلسلے میں کوئی سرکاری بیان جاری کر دے تو عوام اس کا خیر مقدم کریں گے اور وہ غلط فہمی دور ہو جائے گی جو پاکستان دستور ساز اسمبلی کی کاروائی کی ناکافی رپورٹوں کی بنا پر پیدا ہوئی ہے۔''[34]

سہروردی کے اس بیان سے بالکل واضح تھا کہ اس نے اس وقت تک پاکستان کی قومی

زبان کے بارے میں کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی تھی۔ وہ کراچی میں اردو کے حامیوں کو بھی ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ڈھاکہ میں بنگالی زبان کے علمبرداروں کی بھی خفگی مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس کے اس دوغلے رویے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس نے اس وقت تک اپنے سیاسی مستقبل کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ وہ یہ طے نہیں کر پایا تھا کہ اسے مستقل طور پر ہندوستان میں رہنا چاہیے یا پاکستان میں۔ 30 رجنوری 1948ء کو گاندھی کے قتل کے بعد اسے ہندوستان میں اپنا کوئی سیاسی مستقبل نظر نہیں آتا تھا لیکن پاکستان میں بھی اسے اپنے لئے کوئی ایسا سیاسی مقام دکھائی نہیں دیتا تھا جس کا وہ اپنے آپ کو مستحق سمجھتا تھا۔ قائداعظم جناح نے ستمبر 1947ء میں اسے مرکزی وزارت بحالیات کا عہدہ پیش کیا تھا مگر یہ عہدہ اس کے لئے قابل قبول نہیں تھا۔ پاکستان کی وزارت عظمیٰ اسے مل نہیں سکتی تھی کیونکہ اس عہدہ پر لیاقت علی خان فائز تھا۔ وہ مشرقی بنگال کا وزیر اعلیٰ بھی نہیں بن سکتا تھا کیونکہ اس گدی پر خواجہ ناظم الدین براجمان تھا اور مرکزی حکومت اس قسم کے فرمانبردار وزیر اعلیٰ کو ہٹا کر اس کی جگہ سہروردی جیسے سرکش سیاسی لیڈر کو بٹھانے پر آمادہ نہیں ہو سکتی تھی۔

حسین شہید سہروردی کے اس مشورے کے مطابق مشرقی بنگال کے وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین نے یکم مارچ کو کراچی سے ایک بیان جاری کیا جس میں کہا گیا تھا کہ ''تمام پاکستان ایک ہی مملکت ہے جس کے لئے قومی زبان کا ہونا اشد ضروری ہے اور وہ زبان اردو ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جب انگریزی کی بجائے قومی زبان کے استعمال کا فیصلہ ہوگا تو مرکزی حکومت کی زبان اردو ہوگی لیکن مشرقی بنگال کی زبان بنگالی ہی رہے گی اور وہ بدستور صوبہ کے تعلیمی اداروں میں ذریعہ تعلیم ہوگی۔''[35] 3 رمارچ کو روزنامہ ڈان کا ادارتی خیال تھا کہ خواجہ ناظم الدین کے اس توضیحی بیان سے قومی زبان کا تنازعہ ختم ہو جائے گا لیکن ڈھاکہ میں یہ خیال باطل ثابت ہوا۔ اسی دن ڈان کے نامہ نگار نے جو نیوز لیٹر بھیجا اس میں لکھا تھا کہ یہاں قومی زبان کے مسئلہ پر بد امنی کا امکان بدستور موجود ہے۔ ڈھاکہ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے 2 رمارچ سے شہر میں ایک ہفتہ کے لئے دفعہ 144 نافذ کر دی ہے کیونکہ اندیشہ ہے کہ جب صوبائی وزراء کراچی سے واپس پہنچیں گے تو گڑبڑ ہوگی۔''[36]

ڈھاکہ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو لاحق شدہ اس اندیشے کی وجہ یہ تھی کہ مشرقی بنگال کے

دوسرے شہروں میں طلبا کے مظاہرے بدستور جاری تھے۔ یکم مارچ کو کومیلا میں طلبا کا ایک زبردست مظاہرہ ہوا تھا جس کے بعد ایک جلسہ میں وزیراعلیٰ خواجہ ناظم الدین کے اس بیان کے خلاف احتجاج کیا گیا تھا کہ مشرقی پاکستان کی اکثریت اردو زبان کے حق میں ہے۔ اسی دن اسی طرح کا ایک مظاہرہ تپرہ کے قصبہ برہمن باڑیہ میں بھی ہوا تھا جہاں طلبا نے ایک جلوس کی صورت میں بازاروں کا چکر لگا کر احتجاجی نعرے لگائے تھے۔[37]

4 مارچ 1948ء کو حسین شہید سہروردی نے کلکتہ سے کراچی پہنچ کر دستور ساز اسمبلی میں حلف وفاداری اٹھایا تو اس کے اگلے دن خواجہ ناظم الدین بذریعہ ہوائی جہاز ڈھاکہ روانہ ہو گیا۔ اس نے کلکتہ کے ہوائی اڈے پر اپنے مختصر قیام کے دوران اپنے اس اشتعال انگیز بیان کا اعادہ کیا کہ ”مشرقی بنگال میں صرف مٹھی بھر لوگ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ پاکستان کی مرکزی حکومت کی سرکاری زبان بنگالی ہونی چاہیے اور صوبوں کے درمیان خط و کتابت کا ذریعہ بھی اسی زبان کو ہونا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ ہر صحیح الخیال شخص پر یہ بات واضح ہے کہ اردو زبان کو ہم سے پہلے ہی مسلم قوم کی زبان تسلیم کیا چکا تھا اور اب کوئی اور زبان اس کی جگہ نہیں لے سکتی۔“[38]

اسی دن لاہور کے اخبار نوائے وقت کا تبصرہ یہ تھا کہ ”مشرقی بنگال میں بعض تخریبی عناصر نے اردو۔ بنگالی کے مصنوعی جھگڑے کی آڑ لے کر قوم میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو اور بنگالی میں کوئی جھگڑا نہیں اور اردو بنگالی کی جگہ نہیں لینا چاہتی۔ صوبائی زبانوں سے اسے کوئی تعرض نہیں۔ یہ زبانیں اپنی اپنی جگہ رہیں گی اور پھلیں پھولیں گی...... اس سے بھی کسی کو انکار نہیں ہوگا کہ کوئی صوبائی زبان قومی زبان بننے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ بنگالی واقعی ساڑھے چار کروڑ بنگالیوں کی زبان ہے۔ مگر اسے پاکستان کی قومی و سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ مضحکہ خیز حد تک ناقابل عمل ہے کیونکہ مشرقی بنگال کے باہر اسے کوئی نہیں سمجھتا۔ اردو ہی ایسی زبان ہے جو پاکستان کی قومی زبان بننے کی اہل ہے۔“[39]

نوائے وقت کے اس تبصرے میں حقیقت پسندی کا کوئی شائبہ تک نہیں تھا۔ تبصرہ نگار کا یہ دعویٰ تو صحیح تھا کہ بنگالی زبان کو مشرقی بنگال کے باہر پاکستان کے دوسرے حصے میں کوئی نہیں جانتا تھا لیکن وہ اس حقیقت کو سراسر نظر انداز کرتا تھا کہ پاکستان میں اردو بولنے والوں کی تعداد 7 فیصد سے زیادہ نہیں تھی اور مشرقی بنگال کے ساڑھے چار کروڑ عوام میں سے 99 فیصد لوگ یہ گنگا

جمنی زبان نہیں جانتے تھے۔ اردو کو قومی زبان بنانے کا مطلب یہ تھا کہ مرکزی ملازمتوں کے دروازے بنگالیوں کے لئے بند رہیں گے۔ مغربی پاکستان میں اردو زبان کے سات فیصد فدائین مشرقی بنگال کے ساڑھے چار کروڑ عوام سے تو یہ توقع کرتے تھے کہ وہ دس پندرہ سال میں اردو زبان سیکھ لیں گے لیکن وہ خود بنگالی زبان سیکھنے پر آمادہ نہیں تھے۔ دراصل ان کے اس سامراجی موقف کی بنیادی وجہ بیگم شائستہ اکرام اللہ کے اس بیان میں نمایاں تھی کہ یہ لوگ مشرقی بنگال سے ایک نو آبادی کا سا سلوک کرتے تھے۔ یہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان اڑھائی تین ہزار میل کے سمندری فاصلے کو نظر انداز کر کے اس علاقے کو اپنی سلطنت کا محض ایک صوبہ قرار دیتے تھے اور ان کی زبان کو محض صوبائی زبان قرار دیتے تھے۔ ان کا یہ موقف ان فرانسیسی سامراجیوں کے موقف جیسا تھا جو ہند چینی اور الجیریا کو فرانسیسی یونین کے آئینی حصے قرار دیتے تھے۔ اگر یہ لوگ پاکستان کے دونوں حصوں کے جغرافیائی، تاریخی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی اختلافات کو وسیع القلبی اور دور اندیشی کے ساتھ تسلیم کر لیتے تو ان کے درمیان مساوی درجہ کے برادرانہ اور دوستانہ رشتے مشترکہ مذہب اور مشترکہ جدوجہد آزادی کی پائیدار بنیاد پر استوار ہو سکتے تھے۔

ناظم الدین کے خلاف ایجی ٹیشن کی تیاریاں اور اس کی طرف سے نئے ملک کو درپیش انتظامی مسائل اور سیلاب کا بطور ڈھال استعمال

وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین کراچی اور کلکتہ میں قومی زبان کے مسئلہ پر اشتعال انگیز بیانات دینے کے بعد 5 / مارچ کو ڈھاکہ پہنچا تو وہاں وسیع پیمانے پر ایجی ٹیشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور خواجہ کے سیاسی مخالفین نے اس مسئلہ پر تعلیم یافتہ طبقہ کے مشتعل جذبات سے پورا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ان سیاسی مخالفین میں محمد علی بوگرا، تفضّل علی، ڈاکٹر اے۔ ایم۔ مالک اور مولوی ابوالقاسم فضل الحق پیش پیش تھے۔ خواجہ کے لئے یہ صورت حال خاصی پریشان کن تھی کیونکہ آئینی طور پر اس کے لئے یہ لازمی تھا کہ وہ مارچ کے مہینے میں صوبائی اسمبلی کا بجٹ سیشن بلائے اور عوامی دباؤ کے تحت اس بجٹ سیشن میں اس کی حکومت کا تختہ الٹے جانے کا خطرہ تھا۔

اس خطرے کے سدباب کے لئے اس کی حکومت نے جو حربے استعمال کئے ان میں سے ایک حربہ کے طور پر 8 / مارچ کو ایک طویل رپورٹ شائع کی گئی جس میں بتایا گیا تھا کہ کس

طرح مشرقی بنگال کی حکومت نے گزشتہ چھ ماہ میں موئثر اور منظم انتظامیہ کی عدم موجودگی میں بے پناہ مشکلات پر قابو پانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق 15 راگست 1947ء کو جب ڈھاکہ میں خواجہ ناظم الدین کی حکومت نے حلف اٹھایا تھا تو صوبائی خزانہ بالکل خالی تھا چنانچہ سب سے پہلا کام یہ کیا گیا کہ مالی امداد کے لئے ایک خصوصی ایلچی کو بذریعہ ہوائی جہاز کراچی بھیجا گیا کیونکہ ڈھاکہ اور کراچی کے درمیان کوئی اور مواصلاتی رابطہ نہیں تھا۔ انتظامی مشینری کی تشکیل کے لئے جو عملہ ڈھاکہ پہنچا تھا وہ متحدہ بنگال کی حکومت کے عملہ کی ایک چوتھائی سے کم تھا اور اس تھوڑے سے عملہ سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ بنگال کے 60 فیصد حصے کا نظم ونسق چلائے گا۔ 15 راگست کو صوبہ میں کوئی ٹرانسپورٹ سسٹم نہیں تھا اور تار، ٹیلی فون وغیرہ کا مواصلاتی نظام بھی مفلوج تھا۔ صوبائی کابینہ کا 15 راگست 1947ء کو حلف وفاداری اٹھانے کے بعد جو پہلا اجلاس ہوا اس کے ایجنڈے کی پہلی مد یہ تھی کہ چٹاگانگ اور نواکھلی کے اضلاع میں فقید المثال سیلاب آیا ہوا ہے۔ چنانچہ متاثرہ علاقوں کے لئے اناج، کپڑے، ادویات اور زرعی قرضوں کا انتظام کیا گیا۔ ابھی اس مصیبت سے پوری طرح نجات حاصل نہیں ہوئی تھی کہ اکتوبر میں ایک سمندری طوفان نے صوبہ کے وسیع ساحلی علاقے میں تباہی مچادی۔ اگست میں سرکاری گوداموں میں جو اناج تھا اس سے ایک ماہ تک بھی گزارا نہیں ہوسکتا تھا اور بازار میں قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ بایں ہمہ پے در پے غذائی بحرانوں یا قحط پر قابو پالیا گیا اور اب غذائی صورت حال پر قابو میں ہے۔ بلاشبہ ڈھاکہ میں مکانات کی بہت قلت ہے لیکن حکومت اس مسئلہ سے بے خبر نہیں ہے اور اس مسئلہ کے حل کے لئے دو انگریز ماہرین کی امداد سے مناسب اقدامات کئے جارہے ہیں۔"[40]

مرکزی بجٹ میں دفاع پر خطیر رقم رکھی گئی مگر اس میں بنگال کے دفاع کا کوئی منصوبہ شامل نہیں تھا

لیکن خواجہ ناظم الدین کا یہ سیاسی حربہ کارگر نہ ہوا اور اس کی حکومت کے خلاف پمفلٹوں اور اشتہاروں وغیرہ کے ذریعے وسیع پیمانے کی ایجی ٹیشن کی تیاریاں زور شور سے جاری رہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ قومی زبان کے مسئلہ پر شہروں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں جائز طور پر بہت ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ مرکزی وزیر خزانہ غلام محمد نے 28 رفروری کو

مرکزی قانون ساز اسمبلی میں 48-1947ء (15/اگست 1947ء تا 31/مارچ 1948ء) اور 49-1948ء کا جو بجٹ پیش کیا تھا اس سے مشرقی بنگال کے باشعور حلقوں کا یہ تاثر پختہ ہو گیا تھا کہ کراچی اور پنجاب کا حکمران طبقہ مشرقی بنگال کو اپنی نوآبادی سمجھتا ہے۔ اس بجٹ کا خاکہ یوں تھا:

آمدنی (لاکھوں روپے میں)	48-1947ء	49-1948ء
بڑی مدیں	1737	3120
ریلوے، ڈاک وتار	2010	3689
دوسرے ذریعے	532	1148
میزان	4279	7957
اخراجات (لاکھوں روپے میں)		
دفاعی سروسز	3424	3711
	2215	3715
	981	1542
میزان	6620	8968
خسارہ	2341	1011

اس خاکہ کے مطابق 48-1947ء کے پہلے ساڑھے سات مہینوں کے بجٹ کا خسارہ تو جوں کا توں رہا البتہ 49-1948ء کے پورے سال کے بجٹ کو متوازن کرنے کے لئے ریلوے کے عام محاصل کو آمدنی میں شامل کر لیا گیا۔ سیلز ٹیکس اور اسٹیٹ ڈیوٹی کو مرکزی تحویل میں لے لیا گیا۔ حالانکہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کے تحت یہ صوبوں کی آمدنی کا ایک ذریعہ تھے۔ تمباکو، نمک، چھالیہ اور مٹی کے تیل پر نئے ٹیکس عائد کئے گئے تھے۔

49-1948ء کے بجٹ میں 37.11 کروڑ روپے دفاعی امور کے لئے اور دفاع کے ترقیاتی منصوبوں کے لئے 8.3 کروڑ روپے مخصوص کئے گئے تھے۔ مسلح افواج کے لئے اتنی بڑی رقم وزیر خزانہ غلام محمد کے اس نظریے کی وجہ سے مختص کی گئی تھی کہ "آج پاکستان کے سامنے اولین مسئلہ یہ نہیں ہے کہ عوام کا معیار زندگی کیسے بلند کیا جائے بلکہ یہ ہے کہ اتنی مشکل سے جو آزادی حاصل کی گئی ہے اسے برقرار کیسے رکھا جائے۔ ملک کے دفاع کو اولیت دینا ضروری ہے اور ہم

سب کو مشترکہ طور پر اس کی فکر کرنی چاہیے......آزادی سے قبل دفاع کی ذمہ داری برطانیہ پر عائد ہوتی تھی لیکن اب پاکستان پر ہندوستان کی دو تہائی فوج کی ذمہ داری عائد ہو گئی ہے اور اتنے محدود وسائل کے ساتھ اتنی بڑی فوج کو برقرار رکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔"[41]

غلام محمد نے جب یہ بجٹ پیش کیا تھا اس وقت کشمیر میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ جاری تھی لیکن وہ اس جنگ کے بارے میں اتنا فکر مند نہیں تھا۔ اسے فکر تھی تو صرف یہ کہ شمال مغربی سرحدوں کا دفاع کیسے کیا جائے۔ گویا اسے لارڈ کرزن کی طرح سوویت یونین کی توسیع پسندی سے بہت خطرہ محسوس ہوتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی بجٹ تقریر میں اس کا ذکر بھی کیا۔ اس نے کہا کہ "ساری تاریخ میں پاکستان کی شمالی اور مغربی سرحدیں ایسی سرگرمیوں کا مرکز رہی ہیں جو تاریخ ساز نتائج کی حامل تھیں۔ آج کل بھی یہ سرحدیں وسیع مضمرات سے بھرپور ہیں اور پاکستان اور اس کی مسلح افواج پر نہ صرف ہماری اپنی سرزمین پر امن قائم رکھنے کا فرض عائد ہوتا ہے بلکہ ان پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ یہ عالمی امن قائم رکھنے میں اپنا کردار ادا کریں۔ ہم اتنی اہم ذمہ داری اٹھانے پر فخر محسوس کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی امید کرتے ہیں کہ ہمارے کام کی اہمیت کی قدر کی جائے گی۔"[42]

لیکن مشرقی بنگال کے عوام کو برصغیر کی شمال مغربی سرحد پر سوویت یونین کے حملے کے بارے میں کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ انہیں پہلا خطرہ تو یہ تھا کہ کلکتہ کے مارواڑی درندے شمال مشرق اور مغرب کی طرف سے اپنے خونخوار جبڑے کھول کر چنگھاڑ رہے تھے اور جنوب کی طرف سے سمندری طوفان انہیں کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ انہیں دوسرا خطرہ یہ تھا کہ انہیں دو وقت کی روٹی نہیں ملتی تھی۔ تن ڈھانپنے کو کپڑا نہیں تھا اور رہنے کے لئے کوئی ایسی جھونپڑی نہیں تھی جس میں آرام کی نیند سو سکیں۔ اناج کمیاب اور مہنگا تھا۔ کپڑا ان کی دسترس سے باہر تھا اور پٹ سن کی کساد بازاری تھی۔ وزیر خزانہ غلام محمد نے اپنے پہلے بجٹ میں مشرقی بنگال کے مفلوک الحال عوام کے ان مسائل کو قابل توجہ نہ سمجھا کیونکہ اس کا اولین مسئلہ یہ تھا کہ شمال مغربی سرحدوں پر تاریخی حملہ آوروں کا سد باب کیسے کیا جائے؟ چنانچہ اس نے مشرقی بنگال کے دفاع کے لئے کوئی رقم مخصوص نہ کی۔ وہاں کسی فوجی کالج یا نیول سکول کھولنے کا منصوبہ پیش نہ کیا اور نہ ہی وہاں کے عوام کی کچھ فلاح وترقی کے لئے کسی قابل ذکر تعمیراتی پروگرام کا ذکر کیا۔ اس کے برعکس اس نے سیلز ٹیکس اور اسٹیٹ

ڈیوٹی کومرکزی تحویل میں لے کراور نمک، تمباکو، چھالیہ اور مٹی کے تیل پر نئے ٹیکس عائد کر کے ان کی زندگی کے بوجھ کواور بھی نا قابل برداشت بنا دیا۔ اس طرح اس نے مشرقی بنگال کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کواس کی اگست 1947ء سے پہلے کی توقع کے برعکس واضح طور پر یہ بتا دیا کہ پاکستان میں خودمختار یونٹوں پر مشتمل ایک ڈھیلا ڈھالا وفاقی نظام قائم نہیں ہوگا بلکہ کراچی اور پنجاب کے حکمران طبقوں کی استبدادی آمریت کے تحت ایک ایسا وحدانی نظام قائم ہوگا جس میں ملک کے صوبوں یا یونٹوں کی حیثیت میونسپلٹیوں سے زیادہ نہیں ہوگی۔

بنگال کے مسلم لیگی ارکان مرکزی اسمبلی کا مطالبہ کہ بنگالیوں کوفوج میں بھرتی کیا جائے اور وہاں فوج اور بحریہ کے ادارے قائم کئے جائیں

قدرتی طور پر مشرقی بنگال کے بیشتر ہندو اور مسلمان ارکان اسمبلی کی طرف سے اس بحث پر شدید نکتہ چینی کی گئی اور متنبہ کیا گیا کہ اگر مرکزی ارباب اقتدار کا رویہ یہی رہا تو مشرقی بنگال میں اس کے نہایت افسوس ناک نتائج برآمد ہوں گے۔ سب سے پہلے حزب اختلاف کے پروفیسر راجکمار چکرورتی نے یکم مارچ کو اپنی تقریر میں اس امر پر احتجاج کیا کہ ''مرکزی حکومت نے سیلز ٹیکس اور اسٹیٹ ڈیوٹی کو اپنی تحویل میں لے کر صوبائی حکومتوں کے دائرہ اختیار میں ناجائز مداخلت کی ہے۔ ان ٹیکسوں سے وفاقی یونٹوں کی خودمختاری کی جڑوں پر ضرب لگائی گئی ہے۔ اس لئے صوبائی حکومتیں اس قسم کے اقدامات کومرکزی وزیر خزانہ کی افتتاحی ٹھوکر تصور کریں گی۔''[43]

عبدالمتین چودھری نے اپنی تقریر میں کہا کہ ''موجودہ غیر مستحکم حالات میں دفاعی اخراجات کو اولیت دینی ہی چاہیے تھی کیونکہ پاکستان کے وجود کو قائم رکھنے کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ محکمہ دفاع نے بری فوج کی تنظیم نو کا کام جوش وجذبہ کے ساتھ شروع کر دیا ہے۔ میری استدعا ہے کہ مشرقی پاکستان میں ایک آرڈیننس فیکٹری قائم کی جائے اور پاکستان کی بری، بحری اور ہوائی فوج میں بھرتی کے وقت مشرقی پاکستان کو اس کا جائز حصہ دیا جائے۔ دفاع ملک سارے شہریوں کی ذمہ داری ہے۔ مشرقی پاکستان میں بری فوج میں افسروں کی بھرتی کے لئے موزوں امیدواروں کی کوئی کمی نہیں۔ میں یہ بات صوبہ پرستی کے جذبہ کے تحت نہیں کہتا۔ میرے نزدیک ملک کا مفاد علاقائی یا صوبائی مفادات سے بالاتر ہے۔ ہمیں زندگی کے ہر شعبے میں انتشار

انگیز رجحانات کو کچل دینا چاہیے کیونکہ پاکستان صرف اسی صورت میں یکجہتی اور ہم آہنگی کے ساتھ زندہ رہ سکتا ہے لیکن ہم اس بنا پر ملک کے اس علاقے کی شکایات کا ذکر کرنے سے باز نہیں رہ سکتے جسے ہم جانتے ہیں اور جس کے حالات کے بارے میں ہمیں خصوصی علم ہے۔ مشرقی پاکستان کے سلہٹ، چٹا گانگ، نواکھلی، کومیلا، ڈھاکہ، میمن سنگھ اور فرید پور کے اضلاع میں ملاحوں کی بہت آبادی ہے۔ سالہا سال سے ان اضلاع سے کلکتہ اور بمبئی وغیرہ کی بندرگاہوں کے لئے بحری جہازوں کا عملہ مہیا ہوتا رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ پاکستان نیوی کی تربیت کے لئے ان لوگوں کی خدمات سے پورا فائدہ اٹھایا جائے گا۔ لیکن اس مقصد کے پورا ہونے میں رکاوٹ یہ ہے کہ نیوی کا تربیتی ادارہ کراچی میں قائم ہے۔ مجھے امید ہے کہ محکمہ دفاع تربیتی مراکز قائم کرتے وقت اس حقیقت کو پیش نظر رکھے گا...... مزید برآں میری تجویز یہ ہے کہ چٹا گانگ کی بندرگاہ کی توسیع و ترقی کے پروگرام کو جنگی سطح پر مکمل کیا جائے۔''[44] عبدالمتین چودھری مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کا رکن تھا اور اس کی فرمانبرداری کا یہ عالم تھا کہ اس نے 25 رفروری کو قومی زبان کے مسئلہ پر بحث میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا لیکن بجٹ پر بحث کے دوران وہ خاموش نہ رہ سکا اور دبے دبے الفاظ میں مشرقی بنگال کی اس شکایت کا اظہار کرنا ہی پڑا کہ پاکستان کی مسلح افواج اور بالخصوص پاکستان کی بحری فوج میں وہاں کے لوگوں کی بھرتی اور تربیت کا کوئی انتظام نہیں کیا جارہا۔

مشرقی بنگال کے ایک اور مسلم لیگی رکن مولوی ابراہیم خان نے اپنی تقریر میں نواکھلی کی اس شکایت کا ذکر کیا۔ اس نے کہا کہ وزیر خزانہ کی تقریر میں نہ تو اس بات کا ذکر ہے کہ چٹا گانگ کی بندرگاہ کی توسیع وترقی کے لئے کیا کیا جائے گا اور نہ ہی یہ بتایا گیا ہے کہ مشرقی پاکستان کی دفاعی پوزیشن بہتر بنانے کے لئے کیا کیا جائے گا...... بنگال کے نوجوان اب اپنے مغربی پاکستانی بھائیوں کے ساتھ مل کر فوجی ذمہ داریاں نبھانے کے متمنی ہیں۔ ہمارے سامراجی آقاؤں نے تقریباً دوسو سال تک بنگالی نوجوانوں کو نظر انداز کئے رکھا تھا اور انہیں فوجی تربیت نہیں دی تھی لیکن اب وقت آگیا ہے کہ انہیں پاکستانی مسلح افواج میں ان کا جائز مقام دیا جائے۔''[45]

مشرقی بنگال کے ایک تیسرے لیگی رکن عزیز الدین احمد نے یہی بات ذرا اور کھل کر کہی۔ اس نے اس امر پر مایوسی کا اظہار کیا کہ اس بجٹ میں پاکستان کے دورافتادہ علاقے یعنی مشرقی بنگال کے دفاع کے لئے کچھ نہیں ہے۔ حالانکہ اس علاقے کو تین اطراف سے ہندوستان

نے گھیر رکھا ہے اور اس کے جنوب کی طرف خلیج بنگال ہے۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ موجودہ منصوبہ بندی میں مشرقی بنگال کو فی الحقیقت بہت زیادہ نظر انداز کیا گیا ہے۔ ہمارے جو احباب یہاں سندھ، سرحد، بلوچستان اور پنجاب کے متصل علاقے یعنی مغربی پاکستان میں رہتے ہیں ان کے پاس مشرقی بنگال کے اس دور افتادہ علاقے کی حالت پر غور کرنے کا وقت نہیں ہے جو یہاں سے کم از کم 1500 میل کے فاصلے پر واقع ہے اور چاروں طرف سے ہندوستان اور خلیج بنگال سے گھرا ہوا ہے...... چٹا گانگ کی بندرگاہ کی ترقی کے لئے کوئی رقم مختص نہیں کی گئی اور نہ ہی ان لوگوں کی فلاح کے لئے کوئی رقم رکھی گئی ہے جو پٹ سن اگاتے ہیں۔ وہ صرف حقہ پی کر عیاشی کرتے ہیں اور اب اس پر بھی ٹیکس لگا دیا گیا ہے۔" اس نے نمک ٹیکس پر بھی شدید نکتہ چینی کی۔ اس نے کہا کہ "1941ء میں بھی نمک سازی پر ٹیکس عائد کیا گیا تھا لیکن اس وقت جب لوگوں نے ایجی ٹیشن کی تو یہ ٹیکس منسوخ کر دیا گیا تھا لیکن اب نمک پر جو ٹیکس عائد کیا گیا ہے اس کی شرح برطانوی راج میں مقرر کردہ شرح سے بھی زیادہ ہے۔ اگر اب ہم برطانوی راج کی سخت کاروائی کا ہی اعادہ کریں گے تو مشرقی پاکستان کے عوام پاکستان کے بارے میں بہت پست رائے قائم کریں گے۔ نمک ٹیکس کی وجہ سے پاکستان مشرقی بنگال کے کروڑوں غریب کاشت کاروں کی ہمدردیوں سے محروم ہو جائے گا۔ اس بات کا اطلاق چھالیہ ٹیکس پر بھی ہوتا ہے۔ اگر عوام الناس کو نمک ٹیکس کی وجہ سے اس طرح کی تکلیف اٹھانا پڑی تو متحدہ بنگال کے مطالبہ کو تقویت ملے گی۔"[46]

مشرقی بنگال کے چوتھے مسلم لیگی رکن عبد الحمید نے اپنی تقریر میں اپنے علاقے کے لئے معقول دفاعی انتظام نہ ہونے کا رونا رویا اور پھر غیاث الدین پٹھان نے تو اس مسئلہ پر طویل تلخ نوائی کی۔ اس نے پاکستان کی مسلح افواج میں بنگالی نوجوانوں کی عدم موجودگی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "برطانوی راج سے قبل کی تاریخ شاہد ہے کہ بنگالی مارشل نسل سے تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے بہت سے معرکوں میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھائے تھے لیکن برطانوی حکمرانوں نے ایک شر انگیز پالیسی کے تحت فوج میں بنگالیوں کی بھرتی بند کر دی تھی کیونکہ بنگال نے ان کے خلاف جنگ آزادی کی ابتدا کی تھی لیکن اب آزادی کے بعد پرانے آقاؤں کے اس پرانے نظریے میں تبدیلی آنی چاہیے۔ گزشتہ جنگ عظیم میں مارشل اور نان مارشل نسلوں میں کوئی امتیاز نہیں کیا گیا تھا۔ جہاں تک بحری فوج کا تعلق ہے مشرقی بنگال کو ملاحوں کی قوم ہونے کا فخر حاصل

ہے۔اس لئے حکومت پاکستان کا فرض ہے کہ وہ بلاتاخیر چٹا گانگ میں بحری فوج کا تربیتی مرکز قائم کرے۔ہوائی فوج میں بھرتی کے معاملے میں بھی مشرقی بنگال سے سوتیلی ماں کا سا سلوک کیا جارہا ہے۔مغربی پاکستان میں اس فوج میں بھرتی کے لئے چھ یا سات مراکز قائم ہیں جبکہ مشرقی پاکستان میں صرف ایک ہی مرکز ہے۔اس سے ظاہر ہے کہ پاکستان کے سارے شہریوں کو مساوی سہولتیں مہیا نہیں ہیں۔مشرقی بنگال میں ہوائی فوج کی تربیت کا کوئی ایک مرکز بھی نہیں ہے چنانچہ جن لڑکوں کو وہاں سے بھرتی کیا جاتا ہے انہیں ابتدائی تربیت حاصل کرنے کے لئے دو ہزار میل کا سفر کرنا پڑتا ہے۔مشرقی بنگال پاکستان کا ایک حصہ ہے۔اسے ایک خود کفیل یونٹ کی حیثیت سے ترقی دینی چاہیے کیونکہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں فاصلہ بہت زیادہ ہے۔مشرقی بنگال میں فوج کے استعمال کے لئے کوئی سڑکیں بھی نہیں ہیں اور وہاں ایک آرڈیننس فیکٹری کی بھی فوری ضرورت ہے۔ یہ خیال احمقانہ ہے کہ جنگ کی صورت میں مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان کا دفاع ہو سکے گا۔وزیر خزانہ کی ساری تقریر میں یہ احساس ناپید ہے کہ مشرقی بنگال کے دفاع کی اشد ضرورت ہے۔حکومت پاکستان دفاعی مقاصد کے تحت 49-1948ء میں متعدد تربیتی مراکز کھول رہی ہے۔ان مراکز میں ملٹری اکیڈمی، ٹیکنیکل اینڈ ایڈمنسٹریٹو سکولز، الیکٹریکل اینڈ مکینیکل سنٹرز شامل ہوں گے۔ان کے علاوہ ضروری مشینیں بنانے کے لئے فیکٹریاں بھی قائم کی جائیں گی۔ان میں یقیناً اسلحہ اور بارود سازی کی فیکٹریاں بھی ہوں گی۔ان میں سے چند ایک فیکٹریاں لازمی طور پر مشرقی بنگال میں قائم ہونی چاہئیں۔میری رائے میں اس قسم کا اقدام دور اندیشی اور سیاسی بصیرت کا اقدام ہوگا۔اگر مشرقی بنگال کو ان سے محروم رکھنے کی لئے مشکلات، بہانوں اور دوسری فضولیات کا ذکر کیا گیا تو سیاسی طور پر یہ بات اچھی نہیں ہوگی کیونکہ اس طرح پاکستان کی نصف سے زیادہ آبادی میں مایوسی کا احساس جنم لے سکتا ہے۔دراصل یہ احساس پہلے ہی موجود ہے۔ارباب اقتدار جتنی جلدی اس کا تدارک کریں اتنا ہی سب کے لئے بہتر ہوگا۔"[47]

چٹا گانگ کے مسلم لیگی رکن اسمبلی نور احمد نے مشرقی بنگال کے عوام کی اس مایوسی کا ذکر کرتے ہوئے اس علاقے کی پسماندگی اور مفلوک الحال کا بڑا ہولناک نقشہ کھینچا۔اس نے بتایا کہ "مشرقی بنگال کے صرف 53 ہزار مربع میل کے رقبہ میں ساڑھے چار کروڑ لوگ رہتے ہیں۔ 1941ء کی مردم شماری کے مطابق ڈھاکہ میں فی مربع میل آبادی 1542، کومیلا میں 1525 اور

نواکھلی میں 1347 ہے جبکہ مشرقی بنگال کے دوسرے علاقوں میں کسی جگہ بھی فی مربع میل آبادی 800 نفوس سے کم نہیں ہے۔اس نے مزید بتایا کہ 1941ء کی مردم شماری کے مطابق مشرقی بنگال میں خواندگی کا تناسب مردوں میں 16 فیصد اور عورتوں میں 3 فیصد ہے۔60 فیصد آبادی مضرِ صحت غذا کھاتی ہے جبکہ پنجاب میں ایسی آبادی کا تناسب 20 فیصد ہے۔مشرقی بنگال کی دو تہائی آبادی کو دو وقت کا کھانا نہیں ملتا۔ ہر سال تقریباً 17 لاکھ ملیریا اور دوسری اسی قسم کی بیماریوں سے مرتے ہیں جن کا سدباب ہوسکتا ہے۔ناخواندگی کی بیماری ملیریا کی بیماری سے زیادہ تیزی کے ساتھ پھیل رہی ہے...... جب پاکستان قائم ہوا تھا تو لوگوں کو توقع تھی کہ ان کے حالات بہتر ہو جائیں گے لیکن اب انہیں یہ جان کر مایوسی ہوئی ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔"[48]

2/مارچ کو دھندرا ناتھ دتہ نے بجٹ پر لب کشائی کی تو اس نے مشرقی بنگال کے مسلم لیگی ارکان اسمبلی کے مطالبات کی پرزور تائید کی۔اس نے کہا کہ "یہ بجٹ کیا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ 90 کروڑ روپے کے اس بجٹ میں سے 37 کروڑ روپے دفاع کے لئے رکھے گئے اور بقیہ رقم حکومت پاکستان کے ان سول ملازمین کے لئے مختص ہے جو کراچی میں رہتے ہیں......اس نے متنبہ کیا کہ مرکزی حکومت سارے اختیارات اپنے ہاتھوں میں لینے کی کوشش کر رہی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔صوبوں کی آمدنی غصب کی جا رہی ہے۔مثال کے طور پر جہاں تک انکم ٹیکس کا تعلق ہے اس میں سے صوبوں کو کوئی رقم نہیں دی گئی اور سیلز ٹیکس کو مرکزی ٹیکس بنا لیا گیا ہے۔"[49] دتہ کے اس موقف سے سندھ کے وزیر اعلیٰ محمد ایوب کھوڑو نے اتفاق کیا لیکن مشرقی بنگال کے وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین نے غلام محمد کے بجٹ کی خوب تعریف کی اور اس طرح اس نے ڈھاکہ کے تعلیم یافتہ عناصر کو یقین دلایا کہ یہ شخص واقعی کراچی کے حکمرانوں کا پٹھو ہے اور اسے مشرقی بنگال کے عوام کے مفاد کا کوئی خیال نہیں۔خواجہ ناظم الدین کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ مرکزی حکومت کو دفاعی اخراجات میں ہرگز کمی نہیں کرنی چاہیے۔اگر اس نے ایسا کیا تو وہ ایسی ہی غلطی کرے گی جیسی کہ 1939ء سے قبل انگلستان نے جنگ کے خلاف پروپیگنڈا کر کے کی تھی۔تاہم خواجہ نے رائے ظاہر کی کہ ملک کے سارے صوبوں کو ایک ساتھ ترقی کرنی چاہیے کیونکہ اگر کوئی ایک صوبہ بھی اقتصادی لحاظ سے پسماندہ رہا تو اس کا سارے ملک پر اثر پڑے گا۔اس نے اس مقصد کے لئے بعض تجاویز پیش کیں جن میں سے پہلی تجویز یہ تھی کہ جہاں

تک مشرقی پاکستان کا تعلق ہے اسے پاکستان کی مسلح افواج میں اس کا جائز اور مناسب حصہ ملنا چاہیے۔ یہ بہت ضروری ہے۔ ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ مشرقی پاکستان کو مختلف وجوہ کی بنا پر مسلح افواج سے الگ رکھا گیا تھا۔ اگر اب ہمیں نئی بھرتی میں محض ایک حصہ ملے گا تو ہمیں مناسب نمائندگی کے حصول میں بہت دیر لگے گی...... مشرقی بنگال میں سڑکوں اور ریلوے کے نظام کو بھی بہتر کرنا چاہیے اور وہاں اعلیٰ پایہ کے تکنیکی اور ریسرچ ادارے بھی قائم کرنے چاہئیں۔ اگر مشرقی بنگال کے لوگ تربیت کے لئے مغربی پاکستان آسکتے ہیں تو یہاں کے لوگوں کو بھی اس مقصد کے لئے مشرقی پاکستان جانے میں کوئی عذر نہیں ہونا چاہیے۔،،[50]

لیاقت علی خان کے بقول بنگالیوں میں افواج کے لئے موزوں افراد نہیں تھے،

بنگالی ارکان کے مطالبوں پر ان پر صوبہ پرستی کا الزام اور مطالبات مسترد

وزیر اعظم لیاقت علی خان نے جس کے پاس دفاع کا محکمہ بھی تھا، دفاعی اخراجات کے لئے مختص کردہ کثیر رقم کو پرزور الفاظ میں جائز قرار دیا۔ اس نے کہا کہ جنگ کو روکنے کا سب سے مؤثر طریقہ یہ ہے کہ جنگ کے لئے تیاری کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے دفاعی اخراجات کے لئے زیادہ رقم رکھی ہے...... اگر ضرورت پڑی تو ہم اس سے زیادہ بھی خرچ کریں گے۔ میں عوام کو بھوکا رکھوں گا، انہیں ننگا رکھوں گا لیکن انہیں ان کی آزادی سے محروم ہونے نہیں دوں گا...... اس نے کہا کہ تقسیم سے پہلے ساری پاکستانی فوج میں کوئی ایک بنگالی یونٹ بھی نہیں تھا لیکن جب سے پاکستان کی حکومت قائم ہوئی ہے۔ میں مسلح افواج کے سربراہوں پر زور دیتا رہا ہوں کہ وہ مشرقی بنگال سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو بھرتی کریں لیکن ہمارے مشرقی پاکستان کے دوستوں کو ایک بات نہیں بھولنی چاہیے کہ ہم افواج میں صرف بہترین افرادی مواد کو ہی لے سکتے ہیں۔ ہم محض تعداد کی خاطر فوج کی کارکردگی کے معیار کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ مشرقی بنگال ایسا مواد پیش کرے گا جو ہماری مسلح افواج کو درکار ہے...... مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا ہے کہ ہمارے بعض ارکان مشرقی بنگال، پنجاب، سندھ اور سرحد کی اصطلاحات میں باتیں کرتے ہیں۔ ہمیں صوبہ پرستی کو ہمیشہ کے لئے کچل دینا چاہیے...... جب تک ہم صوبہ پرستی کے بھوت کو زندہ رکھیں گے اس وقت تک ہمارا ملک کمزور رہے گا اور ہم اپنے ملک کو کمزور نہیں رکھ سکتے۔ ہم سب پاکستانی

ہیں۔ہم سب پاکستان کے شہری ہیں ہم میں سے ہر ایک پاکستان کو ایک ایسی ریاست بنانے کا تہیہ کئے ہوئے ہے جس کے پاکستانی عوام مستحق ہیں......ایک ایسی ریاست جو آزاد رہے گی۔نہ صرف اپنے عوام کے لئے بلکہ یہ آزادی کا پیغام ساری دنیا میں پہنچائے گی۔"[51]

آخر میں وزیر خزانہ غلام محمد نے اپنی جوابی تقریر میں مشرقی بنگال کے وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین کی بہت تعریف کی کیونکہ اس نے ایک کلاسیکل تقریر کی تھی اور کہا تھا کہ "مرکز کا استحکام صوبوں کی ترقی کے لئے شرط رہے گی"......غلام محمد نے کہا کہ "ہمیں بنگالی، پنجابی، سندھی اور پٹھان کے تصورات کو دفن کر دینا چاہیے۔ہم سب پاکستانی ہیں۔ہم پاکستانی کی حیثیت سے زندہ رہیں گے اور پاکستانی کی حیثیت سے ہی مریں گے۔جو لوگ یہ بات نہیں مانتے ان کی پوزیشن مختلف ہے اور ان کا مقام کسی اور جگہ ہے۔"[52] غلام محمد کی اس تقریر کے بعد بجٹ کے تخمینہ جات کی مختلف مدات پر تین چار دن تک بحث ہوئی جس کے دوران تمباکو، چھالیہ، نمک اور مٹی کے تیل پر عائد کردہ ٹیکسوں کی مخالفت کی گئی۔تاہم یہ بجٹ 8/مارچ کو بغیر کسی ترمیم کے منظور کر لیا گیا اور پھر دس مارچ کو وزیر تجارت وصنعت کی یہ قرارداد زیر بحث آئی کہ حکومت پاکستان مزید ایک سال کے لئے آٹھ ضروری اشیا پر اپنا کنٹرول قائم رکھے گی۔اس قرارداد کی سخت مخالفت کی گئی تاہم یہ 6 ووٹوں کے مقابلے میں 19 ووٹوں سے منظور کر لی گئی۔

اس طرح مرکزی قانون ساز اسمبلی میں مرکزی بجٹ پر گیارہ روزہ بحث سے مشرقی بنگال میں یہ تاثر وسیع سے وسیع تر ہو گیا کہ (1) پاکستان کی مسلح افواج میں بنگالیوں کو مناسب نمائندگی نہیں ملے گی کیونکہ بریگیڈیئر محمد ایوب خان کے بقول یہاں بہترین افرادی مواد کی کمی ہے اور یہاں کے لوگوں میں رہبری ورہنمائی کی صلاحیت نہیں ہے۔(2) مشرقی بنگال میں کوئی فوجی کالج یا نیول سکول نہیں کھولا جائے گا۔(3) پاکستان نیوی کا ہیڈ کوارٹر کراچی میں ہی رہے گا اور پاکستان نیوی میں مشرقی بنگال کے لوگوں کی بھرتی کے امکانات محدود رہیں گے۔(4) ہوائی فوج کی تربیت کے لئے مشرقی بنگال میں کوئی ادارہ قائم نہیں ہوگا۔(5) پاکستان کے دونوں حصوں میں ہزاروں میل کا فاصلہ ہونے کے باوجود مشرقی بنگال کو کوئی خودمختاری حاصل نہیں ہوگی اور کراچی اور پنجاب کے حکمران طبقے اس علاقے کے مادی ذرائع کا استحصال کرتے رہیں گے۔ (6) مشرقی بنگال میں جو کوئی شخص بنگالیوں کے حقوق کا ذکر کرے گا اس پر صوبہ پرستی کا الزام عائد

کر کے اسے غدار قرار دیا جائے گا۔(7) پاکستان دستور ساز اسمبلی کے مسلم لیگی ارکان اور مشرقی بنگال کی حکومت کے وزراء موقع پرست اور مفاد پرست ہیں اس لئے ان سے توقع نہیں کی جاسکتی کہ یہ بنگالیوں کے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق کے لئے ثابت قدمی سے جدوجہد کریں گے۔

باب:3

بنگلہ کے حق میں صوبہ کے عوام الناس کی بھرپور ایجی ٹیشن اور قائداعظم کا دورۂ مشرقی بنگال

بنگالی کو مشرقی پاکستان کی سرکاری زبان قرار دینے کے مطالبہ کے حق میں عام ہڑتال اور مظاہرے

مایوسی اور محرومیت کا تاثر مشرقی بنگال کی سیاسی صورت حال کو خراب سے خراب تر کرنے کے لئے بہت کافی تھا کیونکہ لسانی تنازعہ نے وہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں پہلے ہی خاصا ہیجان پیدا کر رکھا تھا۔ غریب کسان چاول کی کمیابی اور مہنگائی اور پٹ سن کی کساد بازاری سے پہلے ہی تنگ آئے ہوئے تھے اور اب مزید ٹیکسوں کا بوجھ ان کے لئے تقریباً نا قابل برداشت تھا۔ چنانچہ 10 رمارچ 1948ء کو مرکزی اسمبلی کا اجلاس ختم ہونے کے اگلے دن جب مشرقی بنگال کے نمائندے کراچی سے واپس ڈھاکہ پہنچے تو ڈھاکہ اور دوسرے سارے شہروں میں سیاسی بدامنی کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اس ایجی ٹیشن کی قیادت ایک مجلس عمل کے ہاتھ میں تھی جو مارچ کے اوائل میں قائم کی گئی تھی۔ لاہور کے اخبار پاکستان ٹائمز میں ایسوسی ایٹڈ پریس کی ایک مختصر رپورٹ کے مطابق 11 رمارچ کو ایسٹ پاکستان مسلم سٹوڈنٹس لیگ کی قائم کردہ سٹیٹ لینگویج سب کمیٹی کے اعلان کے مطابق ڈھاکہ میں عام ہڑتال ہوئی۔ سرکاری دفاتر کے سامنے مظاہرہ ہوا۔ پولیس نے مظاہرین پر لاٹھی چارج کیا جس سے تقریباً 50 افراد زخمی ہوئے۔ ان زخمیوں میں بنگال کا سابق وزیراعلیٰ مولوی ابوالقاسم فضل الحق بھی شامل تھا۔ مظاہرین کا مطالبہ یہ تھا کہ ''بنگالی زبان کو نہ صرف مشرقی پاکستان کی سرکاری زبان قرار دیا جائے بلکہ اسے پورے پاکستان کی سرکاری

زبانوں کی فہرست میں شامل کیا جائے۔"[1]

لیکن کلکتہ میں اصفہانی کے اخبار مارننگ نیوز کی رپورٹ اتنی مختصر نہیں تھی۔ اس اخبار کی اطلاع یہ تھی کہ ڈھاکہ میں عام ہڑتال کا اعلان جائنٹ سٹیٹ لینگوئج کمیٹی نے کیا تھا جو تمدن مجلس، طلبا کی بعض تنظیموں، متعدد کمیونسٹوں اور سارے ہندو طلبا اور شہریوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ تمدن مجلس کے کارکنوں کے بیان کے مطابق ہڑتالیوں کے مطالبات یہ تھے کہ (1) پاکستان دستور ساز اسمبلی کو مجبور کیا جائے کہ وہ اردو اور انگریزی کے علاوہ بنگالی زبان کو بھی ملک کی سرکاری زبان قرار دے۔ (2) بنگالی زبان کو مشرقی بنگال کی سرکاری زبان قرار دیا جائے۔ (3) منی آرڈر، پوسٹل سٹیمپ، کرنسی اور ریلوے ٹکٹ بنگالی زبان میں چھاپے جائیں کیونکہ یہ زبان پاکستان کی آبادی کی اکثریت کی زبان ہے۔ اس لینگوئج کمیٹی میں انتہا پسند گروپ تمدن مجلس کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس گروپ کے ارکان قومی زبان کے بارے میں خواجہ ناظم الدین کے بیان کو نہیں مانتے اور اصرار کرتے ہیں کہ بنگالی زبان کو اردو زبان کے ساتھ حکومت پاکستان کی سرکاری زبان کے طور پر اپنایا جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ چونکہ پاکستان کی آبادی کی اکثریت بنگالی زبان بولتی ہے اس لئے اسے مغربی پاکستان میں بھی پڑھانا چاہیے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں فزکس کے پروفیسر قاضی مطاہر حسین نے، جو تمدن مجلس کا سرکردہ رکن ہے، اس موقف کی حمایت میں ایک پمفلٹ لکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پاکستان ایک سہ زبانی مملکت ہونی چاہیے اور اس میں بیک وقت اردو، انگریزی اور بنگالی کو سرکاری زبانیں قرار دینا چاہیے۔ اس کی بنگالی زبان کو سرکاری زبان بنانے کے حق میں دلیل یہ ہے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو بنگالی ثقافت محفوظ نہیں رہے گی اور اس پر پنجابی ثقافت کا غلبہ قائم ہو جائے گا۔ جب مارننگ نیوز کے نامہ نگار نے قاضی مطاہر حسین سے یہ استفسار کیا کہ وہ پنجابی اور بنگالی ثقافتوں کو تسلیم کرتا ہے یا مسلم ثقافت کا علمبردار ہے تو اس نے کہا کہ اس صوبہ کے ہندو اور مسلمان ثقافتی لحاظ سے ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ ان میں بڑا فرق صرف مذہب کا ہے۔ انہوں نے مشترکہ طور پر جس ثقافت کو پروان چڑھایا ہے اس کے تحفظ کے لئے مشترکہ زبان کا تحفظ ضروری ہے۔ قاضی مطاہر حسین نے بات چیت کے دوران مشرقی بنگال اور پاکستان کے وزرائے اعظم پر عدم اعتماد کا اظہار کیا اور اس سلسلے میں قائد اعظم کے رویے کے بارے میں شک وشبہ کا اظہار کیا۔ وہ اردو کو اختیاری زبان کے سوا اور درجہ دینے پر آمادہ نہیں تھا۔ تاہم وہ یہ تسلیم کرتا تھا کہ "اردو کی اہمیت کی وجہ سے طلبا

کی اکثریت یہ اختیاری زبان سیکھے گی۔'' مارننگ نیوز کی اس رپورٹ کے آخر میں لکھا تھا کہ ''بعض حلقوں میں ''پاکستان سے نکلنے'' اور ''خودمختار بنگال کی تھیوری کی بحالی'' کے بارے میں بھی کانا پھوسی ہو رہی ہے۔ زبان کا مسئلہ ایک بڑا سیاسی مسئلہ بن رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا مشرقی بنگال آئیر لینڈ کے نقش قدم پر چلے گا؟ مستقبل کی سیاست کے رخ کا تعین اس سوال کے جواب کی روشنی میں ہونا چاہیے۔ زبان ایک ذریعہ ہے۔ یہ خود کوئی نصب العین نہیں ہے۔''[2]

حکومت نے ہڑتال اور مظاہروں کو چند تخریب کاروں اور ہندوؤں کی سازش قرار دے کر بددیانتی کا ثبوت دیا

مارننگ نیوز کی اس خبر کے برعکس اسی دن صوبائی حکومت کے سرکاری اعلان میں اس مسئلہ کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی گئی تھی۔ سرکاری اعلان میں کہا گیا تھا کہ چند تخریب کاروں اور طلبا کے گروہ نے اس فیصلے کے خلاف عام ہڑتال کا اعلان کیا تھا کہ بنگالی زبان مرکز کی سرکاری زبان نہیں ہوگی۔ لیکن ان کے اس اعلان کا کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ شہر کے سارے مسلم علاقوں اور غیر مسلموں کے علاقوں میں زیادہ تر دکانداروں نے ہڑتال کرنے سے انکار کر دیا۔ ہندوؤں کی صرف چند دکانیں بند رہیں لیکن شہر میں کاروبار جاری رہا اور عدالتوں میں بھی کام ہوتا رہا۔ البتہ رمنا کے علاقے میں چند ہڑتالیوں نے سرکاری ملازمین کو دفتروں میں جانے سے کامیابی سے روکا۔ طلبا کے چھوٹے چھوٹے گروہ سیکرٹریٹ، ہائی کورٹ اور دوسرے دفاتر کے سامنے مظاہرہ کرتے رہے۔ ان میں سے بیشتر مظاہرین کو پرامن طریقے سے منتشر کر دیا گیا لیکن چند ایک مظاہرین مشتعل ہو گئے اور انہوں نے سنگ باری شروع کر دی تاکہ سرکاری ملازمین اپنے کام پر نہ جا سکیں۔ انہوں نے پولیس پر بھی پتھر پھینکے۔ چنانچہ پولیس کو مجبوراً لاٹھی چارج کرنا پڑا اور ایک موقع پر اس نے ہوا میں دو گولیاں بھی چلائیں۔ ان گولیوں سے کوئی زخمی نہ ہوا البتہ لاٹھیوں سے 14 افراد کو چوٹیں آئیں۔ ان میں سے کسی کا زخم گہرا نہیں ہے اور کسی کے جسم پر گولی کا زخم نہیں ہے۔ حکومت نے حال ہی میں جو تلاشیاں لی تھیں ان کے نتیجہ میں حکومت کو ایسی واضح شہادت ملی ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس صوبہ کے مسلمانوں میں تفرقہ ڈلوانے اور پاکستان کی بیخ کنی کے لئے انتظامی افراتفری پھیلانے کی گہری سازش کی گئی ہے۔[3]

وزیراعلیٰ خواجہ ناظم الدین بظاہر دیندار شخص تھا اور اس بنا پر اس سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ اس کی حکومت کسی معاملے میں بھی سچائی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑے گی۔ لیکن اس کا یہ سرکاری اعلان غلط بیانی پر مبنی تھا۔ 11 رمارچ کو ڈھاکہ میں کامیاب ہڑتال ہوئی تھی اور شہر کے تعلیم یافتہ عناصر نے قومی زبان کے مسئلہ پر زبردست مظاہرے کئے تھے۔ یہ ہڑتال اور یہ مظاہرے چند تخریب کاروں اور ہندوؤں کی گہری سازش کا نتیجہ نہیں تھے بلکہ یہ مشرقی بنگال کے عوام کی ان مایوسیوں، محرومیوں اور شکایات کا منطقی نتیجہ تھے جن کا گزشتہ سات آٹھ ماہ میں انبار لگ چکا تھا۔ یہ انبار اتنا بڑا تھا کہ پاکستان دستور ساز اسمبلی کے مسلم لیگی رکن عزیز الدین احمد کو مرکزی ارباب اقتدار کو متنبہ کرنا پڑا تھا کہ ''مشرقی بنگال کے عوام کی شکایات کا فوری طور پر ازالہ نہ کیا گیا تو متحدہ بنگال کے مطالبہ کو تقویت ملے گی۔'' قومی زبان کا مسئلہ کسی ہندو لیڈر کی پیداوار نہیں تھا بلکہ اس مسئلہ پر تحریک کی ابتدا ستمبر 1947ء میں تمدن مجلس کے اسلام پسند اساتذہ نے کی تھی۔ اس مجلس نے دسمبر 1947ء میں بھی اس مسئلے پر مظاہرے کئے تھے اور 11 رمارچ کے مظاہروں میں بھی اس مجلس کے کارکن پیش پیش تھے۔

چونکہ مرکزی حکومت کو اپنے ذرائع سے یہ علم ہو گیا تھا کہ ہڑتالوں اور مظاہروں کے بارے میں صوبائی حکومت نے غلط بیانی کی ہے اور یہ کہ یہ ہڑتالیں اور مظاہرے صرف ڈھاکہ تک ہی محدود نہیں تھے بلکہ ان کا سلسلہ مشرقی بنگال کے تقریباً سارے شہروں میں پھیلا ہوا تھا اس لئے اسی دن کراچی سے یہ اعلان کیا گیا کہ گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح 20 رمارچ کو مشرقی بنگال کا دورہ کریں گے۔ وہ وہاں اپنے سات روزہ قیام کے دوران ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبا کو خطاب کرنے کے علاوہ ڈھاکہ ریڈیو پر تقریر بھی کریں گے اور دو ایک دن کے لئے چٹاگانگ بھی جائیں گے۔ مگر مرکزی حکومت کے اس اعلان کا مشرقی بنگال کے تعلیم یافتہ عناصر پر کوئی خوشگوار اثر نہ پڑا۔ چنانچہ 12 رمارچ کو پھر ہڑتال ہوئی اور مظاہرے ہوئے اور مولوی فضل الحق نے ایک بیان میں 11 رمارچ کو نہتے طلبا پر پولیس کے تشدد کی مذمت کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ ''مشرقی بنگال اسمبلی کے سارے ارکان کو اس واقعہ کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے مستعفی ہو جانا چاہیے۔'' 13 رمارچ کو بھی مظاہرے جاری رہے تو صوبائی حکومت نے کلکتہ کے ہندو اخبارات کا مشرقی بنگال میں داخلہ بند کر دیا اور اس طرح اپنے اس الزام کا بالواسطہ طور پر اعادہ کیا

کہ قومی زبان کے مسئلہ پر ایجی ٹیشن ہندوؤں کی سازش کا نتیجہ ہے۔

ان دنوں پاکستان دستور ساز اسمبلی میں حزب اختلاف کا قائد سریش چندرا چٹو پادھیا کراچی میں ہی مقیم تھا۔ چنانچہ اس نے اسی دن ایک بیان میں اس الزام کی پرزور تردید کرتے ہوئے اس حقیقت کی نشاندہی کی کہ ''ڈھاکہ میں بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کے درمیان قومی زبان کے مسئلے پر جو تنازعہ پایا جاتا ہے وہ دستور ساز اسمبلی میں زبان کا مسئلہ اٹھانے کی وجہ سے پیدا نہیں ہوا بلکہ یہ تنازعہ اس سے پہلے ہی موجود تھا۔ کچھ عرصہ ہوا جب بنگالی مسلمانوں نے اس سلسلے میں سیکریٹریٹ کے سامنے مظاہرہ کیا تھا تو دو صوبائی وزراء کو ان کی تشفی کرنا پڑی تھی۔ بنگالی ہندوؤں نے اس ایجی ٹیشن میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ مجھے یہ معلوم کر کے دکھ ہوا ہے کہ 11 / مارچ کے مظاہرے میں مولوی فضل الحق کو بھی چوٹیں آئی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مظاہرہ ان بنگالی مسلمانوں نے کیا تھا جو اردو زبان سے ناواقف ہونے کے باعث اپنی بنگالی زبان کو پاکستان کی سرکاری زبانوں کی فہرست میں شامل کروانا چاہتے ہیں۔ بلاشبہ بنگالی ہندوؤں کی بھی یہی خواہش ہے لیکن وہ اپنی اس خواہش کی بنا پر بنگال کے مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوانے کے متمنی نہیں ہیں اور نہ ہی وہ کوئی انتظامی دشواری پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ مشرقی بنگال کے مسلمانوں میں زبان کے مسئلہ پر اور انتظامیہ کے طور طریقوں کے مسئلہ پر پہلے ہی پھوٹ پڑی ہوئی ہے۔ بنگالی مسلمانوں کا خیال ہے کہ انہیں نظر انداز کیا جا رہا ہے اور ان کی بہتری کے لئے ان کی مطلوبہ حوصلہ افزائی نہیں ہوتی۔ حکومت پاکستان کو چاہیے کہ وہ بنگالیوں کے احساسات پر غور کر کے بروقت کوئی صحیح اقدام کرے۔''[4]

لیکن روزنامہ ''ڈان'' چٹو پادھیا کی اس صحیح بیانی سے قائل نہ ہوا اور اس نے 14 / مارچ کو مشرقی بنگال کی حکومت کی اس غلط بیانی سے اتفاق کیا کہ ''زبان کے مسئلہ پر وہاں جو ایجی ٹیشن جاری ہے وہ تخریب کاروں کی انگیخت کا نتیجہ ہے۔ اس ایجی ٹیشن کو مزید برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ اسے دبانے کے لئے سخت اقدام کی ضرورت ہے اور امید ہے کہ صوبائی حکومت پر اس سلسلے میں جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ اسے نبھانے میں کوتاہی نہیں کرے گی...... یہ عجیب بات ہے کہ ضعیف العمر فضل الحق نے بھی اپنے آپ کو اس تنازعہ میں ملوث کر لیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی تک اس کی ذات میں شرارت کا کافی عنصر موجود ہے۔'' ''ڈان'' کا یہ اداریہ دراصل سرکاری

لائن کے مطابق لکھا گیا تھا اور اس میں سیاسی حقیقت پسندی اور دور اندیشی کا کوئی عنصر نہیں تھا۔

ناظم الدین نے حکومت بچانے کی خاطر اور قائد اعظم کے متوقع دورہ مشرقی بنگال کے پیشِ نظر ہڑتالیوں اور مظاہرین کی مجلس عمل کے سامنے وقتی طور پر گھٹنے ٹیک دیئے

وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین اپنی فرمانبردارانہ ذہنیت کے باوجود ان دنوں کراچی کی اس سرکاری لائن پر عمل نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ ایجی ٹیشن چند تخریب کاروں کی انگیخت کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ اس کی بنیاد عوام الناس کی بے شمار مایوسیوں اور محرومیوں پر تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ خواجہ کو لیگ اسمبلی پارٹی کی پوری حمایت حاصل نہیں تھی۔ سہروردی، محمد علی بوگرا اور فضل الحق گروپ کے متعدد ارکان اس ایجی ٹیشن کے زور پر اس کا تختہ الٹنے کی دھمکی دے رہے تھے۔ بجٹ سیشن ہونے والا تھا اور صوبائی بجٹ ان کی حمایت کے بغیر منظور نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ جب 14 رمارچ کو لیگ اسمبلی پارٹی کا اجلاس ہوا تو محمد علی بوگرا وغیرہ کی تقریروں سے پتہ چل گیا کہ خواجہ کی حکومت کی کشتی ڈانواں ڈول ہے۔ اس دن پورے مشرقی پاکستان کے چھوٹے بڑے شہروں میں ہڑتالیں ہوئی تھیں اور زور دار مظاہرے ہوئے تھے جن میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے خلاف نعرے لگائے گئے تھے۔ ڈھاکہ میں بھی جس جگہ اسمبلی پارٹی کا اجلاس ہوا تھا وہاں طلبا نے پرجوش مظاہرے کر کے ان طلبا کی رہائی کا مطالبہ کیا تھا جنہیں 11 رمارچ کو گرفتار کیا گیا تھا۔ یہ مظاہرہ شہر میں دفعہ 144 کے نفاذ کے باوجود کیا گیا تھا۔

15 رمارچ کو جب صوبائی اسمبلی میں بجٹ سیشن شروع ہوا تو اسمبلی ہال کے سامنے طلبا کا زبردست مظاہرہ ہوا جسے منتشر کرنے کے لئے پولیس نے آنسو گیس استعمال کی، پھر لاٹھی چارج کیا اور پھر ہوا میں گولیاں چلائیں۔ پندرہ طلبا زخمی ہوئے جنہیں برائے علاج ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ ان میں سے کسی ایک کے جسم پر گولی کا زخم نہیں تھا۔ خفیہ پولیس کا ایک افسر بھی زخمی ہوا اور بعض پولیس والوں کو بھی معمولی چوٹیں آئیں۔ وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین نے اس واقعہ کے بعد محمد علی بوگرا کو مجلس عمل کے پاس بھیجا۔ قمر الدین احمد کے بیان کے مطابق یہ مجلس عمل پیپلز فریڈم لیگ، تمدن مجلس، سلیم اللہ مسلم ہال، فضل الحق مسلم ہال اور سٹوڈنٹس لیگ کے دو دو نمائندوں پر

مشتمل تھی اور وہ خود اس کا کنوینر تھا۔ 15 ر مارچ کو محمد علی بوگرا کی تحریک پر سلیم اللہ مسلم ہال میں اس مجلس کا اجلاس ہوا جس میں مندرجہ ذیل مطالبات مرتب کئے گئے:

1۔ مشرقی بنگال اسمبلی ایک قرارداد منظور کرے گی جس کے تحت بنگالی زبان کو مشرقی بنگال کی سرکاری زبان بنایا جائے گا اور تمام مراحل میں ذریعہ تعلیم بنگالی زبان ہوگی۔

2۔ مشرقی بنگال اسمبلی ایک اور قرارداد میں مرکزی حکومت سے سفارش کرے گی کہ وہ اردو اور انگریزی کی طرح بنگالی زبان کو بھی قومی زبان بنائے۔

3۔ تحریک کے دوران گرفتار شدہ سارے سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا جائے گا اور مشرقی بنگال اور کلکتہ کے ان سارے اخبارات پر سے پابندی ہٹالی جائے گی جنہوں نے تحریک کی حمایت کی تھی اور اس کی تشہیر کی تھی۔

4۔ ایک اعلیٰ اختیاراتی کمیشن مقرر کیا جائے گا جو پولیس اور اس کے افسروں کی زیادتیوں کی تحقیقات کرے گا۔

5۔ وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین ڈھاکہ ریڈیو سے یہ اعلان کرے گا کہ یہ تحریک حب الوطنی کے اعلیٰ مقاصد اور جذبات کے تحت شروع کی گئی تھی۔

6۔ تحریک میں حصہ لینے والے جن سیاسی کارکنوں کے خلاف گرفتاری کے وارنٹ جاری کئے گئے ہیں وہ واپس لے لئے جائیں گے۔

7۔ وزیر اعلیٰ اپنا وہ بیان واپس لے لیگا جس میں اس نے کہا تھا کہ ایجی ٹیشن کرنے والے کمیونسٹ اور ملک کے دشمنوں کے ایجنٹ ہیں۔

قمر الدین احمد مزید لکھتا ہے کہ جب اس معاہدے کے بارے میں گفت وشنید ہو رہی تھی تو وزیر اعلیٰ نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اس موقع پر چیف سیکرٹری (عزیز احمد) بھی موجود ہو لیکن اس نے حاضر ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ تاہم وزیر اعلیٰ نے یہ سارے مطالبات منظور کر لئے اور اس نے اور مجلس عمل کے کنوینر نے اس معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ اس کے بعد مجلس عمل کا کنوینر ڈسٹرکٹ جیل گیا اور وہاں اس نے ان لوگوں سے مشورہ کیا جو اس تحریک کی وجہ سے نظر بند تھے۔ جب انہوں نے بھی اس معاہدے کی منظوری دے دی تو انہیں اسی شام رہا کر دیا گیا جبکہ صوبائی اسمبلی خواجہ ناظم الدین کی تحریک پر مجلس عمل کی مطلوبہ قرارداد منظور کر چکی تھی۔ [5]

حکومت نے بہاریوں اور جمعیت العلمائے اسلام کی طرف سے چند جلسے اور کانفرنسیں منعقد کروا کر قائداعظم کے دورہ سے پہلے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ ساری رائے عامہ بنگلہ ایجی ٹیشن کے ساتھ نہیں ہے

وزیراعلیٰ خواجہ ناظم الدین کی طرف سے یہ ''ہتک آمیز'' معاہدہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح 19 ر مارچ کو ڈھاکہ پہنچنے والے تھے اور خواجہ نہیں چاہتا تھا کہ بابائے قوم کے مشرقی بنگال میں پہلے سات روزہ دورے کے دوران کوئی ایجی ٹیشن ہو۔ اسی مقصد کے تحت اس نے 9 ر مارچ کو سید پور کے جناح میدان میں بہاریوں اور اسلام پسند بنگالیوں کا ایک جلسہ عام کروایا تھا جس میں اردو کے حق میں تقریریں ہوئی تھیں۔ کلکتہ کے مارننگ نیوز کی اطلاع کے مطابق ''اس جلسہ میں چند بنگالی مسلمانوں نے بھی اردو کے حق میں تقریریں کی تھیں اور صوبہ پرستی کی مذمت کی تھی۔ اس جلسہ کے بعد تقریباً ایک ہزار طلبا نے ایک جلوس نکالا تھا جس میں اردو زندہ باد، ناظم الدین زندہ باد اور ففتھ کالمنسٹ مردہ باد کے نعرے لگائے گئے تھے۔''[6] پھر 12 ر مارچ کو اس نے ضلع میمن سنگھ کے قصبہ سترہ باڑی میں مولانا ظفر احمد عثمانی کی زیر صدارت ایک کانفرنس میں متفقہ طور پر یہ قرارداد منظور کرائی تھی کہ لسانی تحریک کی وجہ سے جو افسوس ناک واقعات ہوئے ہیں ان کی ذمہ داری ہندوؤں اور کمیونسٹوں پر عائد ہوتی ہے اور ایک قرارداد میں حکومت پاکستان سے یہ گزارش کروائی تھی کہ ''عربی رسم الخط میں اسلامی بنگالی'' کو مشرقی پاکستان کی سرکاری زبان بنایا جائے۔''[7] اس کانفرنس کے بعد اس نے اسی دن یہ اعلان بھی کروایا تھا کہ ''جمعیت العلمائے اسلام کی دو روزہ کانفرنس 25 اور 26 ر مارچ کو چٹاگانگ میں ہو گی جس کا افتتاح مولانا امین محمد خان کرے گا اور صدارت مولانا ظفر احمد کرے گا۔ توقع ہے کہ وزیراعلیٰ خواجہ ناظم الدین اور دوسرے صوبائی وزراء بھی اس کانفرنس میں شرکت کریں گے۔''[8] 15 ر مارچ کو اس نے صوبائی حکومت کی مقرر کردہ استقبالیہ کمیٹی سے یہ اعلان کرایا تھا کہ قائداعظم کے مشرقی پاکستان میں قیام کے دوران ڈھاکہ کے شہر میں کوئی شخص بھوکا نہیں رہے گا۔ غریب راشن کارڈ ہولڈروں کو کوپن دیئے جائیں گے جن پر انہیں ایک ہفتہ تک مفت راشن ملے گا جس کا سارا خرچ استقبالیہ کمیٹی برداشت کرے گی۔''[9] اور پھر 15 ر مارچ کو ہی ایسوسی ایٹڈ پریس کی وساطت سے

یہ خبر شائع کروائی گئی کہ ''چٹا گانگ میں 25 ؍مارچ کو جمعیت العلمائے اسلام کی جو کانفرنس ہو رہی ہے اس کا بڑا مقصد مشرقی بنگال میں مسلم ملت کی اخلاقی اصلاح، روحانی احیا اور ثقافتی بحالی ہوگا اور اس تجویز پر بھی غور ہوگا کہ پاکستان کو ایک مثالی اسلامی کامن ویلتھ کے طور پر کس طرح مستحکم کیا جائے۔ کانفرنس میں مسلمانوں کے تمام حلقوں پر زور دیا جائے گا کہ وہ دھڑے بندی اور فرقہ پرستی سے گریز کریں اور اپنی ساری توانائیاں پاکستان اور اسلام کے دفاع کے لئے مجتمع کریں۔ کانفرنس میں ہندوستانی مسلمانوں کے تحفظ کے سوال پر بھی غور ہوگا۔''[10] لیکن ان کے یہ سارے سیاسی، معاشی اور اسلامی حربے کارگر نہیں ہوئے تھے اور 15 ؍مارچ کو ایجی ٹیشن نے بہت شدت اختیار کر لی تھی۔

بجٹ سیشن کے دوران طلبا کا صوبائی اسمبلی بلڈنگ کے باہر مظاہرہ کنٹرول کرنے کے بارے میں جی۔او۔سی۔ایوب خان کی کہانی، اس کی اپنی زبانی

تاہم اس معاہدے کے باوجود جب 16 ؍مارچ کو صوبائی اسمبلی میں پانچ کروڑ تہتر لاکھ روپے کے خسارے کا بجٹ پیش ہوا تو بعض لوگوں نے اسمبلی بلڈنگ کے سامنے مظاہرہ کیا جس میں تقریباً 30 افراد زخمی ہوئے۔ خواجہ ناظم الدین طلبا کے اس مظاہرے سے بہت پریشان ہوا چنانچہ اس نے جنرل آفیسر کمانڈنگ محمد ایوب خان کو بلوایا اور اس سے کہا کہ وہ ''اسمبلی میں صرف چار ممبروں کی مشکوک اکثریت رکھتا ہے۔ اسے فکر ہے کہیں ان ممبروں کو توڑ نہ لیا جائے کیونکہ فضل الحق نے طلبا کو اکسا رکھا ہے اور وہ ان کے حامیوں کو ڈرا دھمکا رہے ہیں۔'' ایوب خان لکھتا ہے کہ ''خواجہ صاحب چاہتے تھے کہ میں طلبا کو اسمبلی ہال پر دھاوا بولنے سے باز رکھوں۔ مجھے اس معاملے میں دخل دینے سے انکار کر دینا چاہیے تھا کیونکہ دراصل یہ کام پولیس کا تھا لیکن مجھے یہ خیال پریشان کرتا تھا کہ اگر حکومت کا نظام درہم برہم ہو گیا تو ممکن ہے دور دور تک فتنہ فساد اور غنڈہ گردی پھیل جائے۔ چنانچہ میں نے میجر پیرزادہ کے ماتحت ایک انفنٹری کمپنی کو اسمبلی ہال کے پاس تعینات کر دیا تا کہ ضرورت پڑے تو وہ پولیس کی مدد کر سکے۔ اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا اور وزیر اعلیٰ نے اپنی تقریر شروع کی جس کے متعلق انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ ''بے حد اہم'' ہے۔ باہر طلبا چیخ چیخ کر دیوانے ہو رہے تھے۔ فضل الحق اپنے آدمیوں سے کام لینا خوب جانتے تھے۔

وہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اسمبلی ہال سے برآمد ہوتے اور طلبا کے کان میں ایک نیا نعرہ پھونک کر پھر اندر چلے جاتے اور طلبا اس تازہ نعرے سے آسمان سر پر اٹھا لیتے۔ یہ کاروائی شام کے پانچ بجے تک ہوتی رہی۔ اسی وقت مجھے یہ پیغام ملا کہ طلبا فوج کے بہت قریب پہنچتے جا رہے ہیں اور ان سے جھڑپ ہو جانے کا خطرہ ہے۔ یہ سردیوں کے دن تھے اور اندھیرا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ مجھے فکر تھی کہ اگر طلبا فوج کی طرف بڑھے تو وہ ضرور ان پر گولی چلا دے گی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ صورت پیش آئے۔ چنانچہ میں نے اسمبلی میں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے وہاں اس قدر ابتری دیکھی کہ زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اندر وزیر اعلیٰ غصے میں بھرے ہوئے اور لڑنے مرنے پر تیار مجمع کے سامنے ایک ولولہ انگیز تقریر کر رہے تھے اور باہر طلبا کو کھلی چھٹی تھی کہ جو ان کے جی میں آئے کریں۔ اس وقت سپرنٹنڈنٹ پولیس عبیداللہ ڈیوٹی پر تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ تم کچھ کاروائی کر کے لڑکوں کو پیچھے کیوں نہیں ہٹاتے؟ انہوں نے کہا ''جناب اگر آپ مجھے حکم دیں تو میں ابھی کاروائی کرنے کو تیار ہوں لیکن میں ان سیاست دانوں کے لئے کوئی کام کرنے کو تیار نہیں۔'' مجھے سخت حیرت ہوئی۔ میں نے پوچھا کیوں؟ انہوں نے بیان کیا ''یہ لوگ آج طلبا کو منتشر کرنے کا حکم دیں گے اور کل اس بات کی تحقیقات کرائیں گے کہ ایسا کیوں ہوا اور سارا الزام مجھ پر ڈال دیں گے اور خود کبھی اس کی ذمہ داری نہیں لیں گے۔ میں تحریری حکم چاہتا ہوں۔'' ظاہر ہے کہ پولیس کا نظم وضبط بڑی پست حالت میں تھا۔ میں اسمبلی میں گیا اور وزیر اعلیٰ سے مل کر انہیں بتایا کہ اندھیرا ہوتا جا رہا ہے اور طلبا فوج کے بہت قریب پہنچ چکے ہیں۔ انہوں نے پوچھا ''مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' میں نے مشورہ دیا ''اجلاس برخاست کر دیں اور گھر چلے جائیں۔'' گھبرا کر بولے۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں اپنی اس اہم تقریر کو آدھ بیچ کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔'' شاید انہوں نے میرے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ دیکھ لی تھی اس لئے انہوں نے فیصلہ کیا: ''اچھی بات ہے مجھے پانچ منٹ کی مہلت دو۔'' وہ اجلاس میں گئے اور کسی سے کچھ کہہ سن کر واپس آ گئے۔ کہنے لگے ''میں گھر جانے کو تیار ہوں لیکن یہاں سے نکلوں کیسے؟'' میں نے میجر پیرزادہ سے کہا کہ وہ وزیر اعلیٰ کی کار اسمبلی کے پچھواڑے لے آئیں۔ پھر میں نے اور پیرزادہ نے جیسے تیسے وزیر اعلیٰ کو باورچی خانے کے راستے اسمبلی ہال سے نکالا۔ جب ہم اس کام سے نمٹ چکے تو میں نے طلبا سے کہا ''سونے کی چڑیا تو اڑ گئی!'' طلبا نے زور زور سے قہقہے لگائے اور وہاں کی فضا جو لمحہ بھر پہلے

بڑی گمبھیر اور خطرے سے پر معلوم ہوتی تھی ہنسی مذاق اور خوش دلی میں بدل گئی۔ فضل الحق، محمد علی بوگرا کے ساتھ، جو اس وقت مخالف پارٹی میں شامل تھے، اسمبلی ہال سے باہر آئے۔ انہوں نے طالب علموں کو پھر اکسانا چاہا۔ میں نے محمد علی کے شانے پر تھپکی دی اور کہا ''آپ کو کسی گولی کی جستجو ہے؟'' انہوں نے پلٹ کر جواب دیا ''آپ کا برتاؤ بڑا ناشائستہ ہے۔'' میں نہیں چاہتا تھا کہ پھر سے ہنگامہ شروع ہو جائے اس لئے میں نے ان سے زور دے کر کہا کہ ''آپ گھر چلے جائیں۔ محمد علی کے پانچ ووٹ تھے۔ وہ فوراً وزیر اعلیٰ کے پاس پہنچے اور ان کو دھمکی دی کہ میں اپنی حمایت سے پھر جاؤں گا۔ اس پر وزیر اعلیٰ نے مجھے بلوایا۔ پہلے صورتحال کو سنبھالنے پر میرا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد مجھ سے کہا کہ آپ نے محمد علی کو ناراض کر دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مجھے حکومت سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔'' میں نے کہا کہ آپ انہیں بلوایئے تاکہ میں ان پر صورت حال واضح کر دوں۔ جب محمد علی آئے تو میں نے انہیں گلے سے لگا لیا اور کہا ''میں تو آپ سے مذاق کر رہا تھا آپ کو اسے سچ نہیں سمجھ لینا چاہیے تھا۔'' میں اس معاملے سے سخت بیزار ہو چکا تھا اور چاہتا تھا کہ ان کی آپس کی چپقلش میں خود کو زیادہ نہ الجھاؤں۔ غرض محمد علی کا غصہ اتر گیا اور ہم دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔''[11]

ناظم الدین کی یقین دہانیوں پر طلبا نے قائداعظم کے دورہ مشرقی بنگال کے پیش نظر مظاہروں کا سلسلہ موقوف کر دیا

جب یہ سارا ڈرامہ ختم ہو گیا تو خواجہ ناظم الدین نے اسی رات ایک بڑا سخت بیان جاری کر کے متنبہ کیا کہ ''اب لاقانونیت کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ صوبائی حکومت تخریب پسند عناصر کو اس امر کی اجازت نہیں دے گی کہ وہ لسانی تحریک کی آڑ لے کر پاکستان کی بیخ کنی کے لئے انتظامی مشینری کو درہم برہم کریں۔ میں نے اس سوال کے بارے میں ہمدردی و وسیع القلبی کا جو رویہ اختیار کئے رکھا ہے یہ لوگ اسے میری کمزوری سمجھتے ہیں لیکن اب میں انہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ حکومت کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ تخریب کاروں سے ملک کے مفادات کا تحفظ کرے۔ حکومت نے مجلس عمل سے جو معاہدہ کیا تھا وہ اس کی پابند ہے اور اس نے اس پر عملدرآمد کرنے میں کوئی تاخیر نہیں کی۔ لیکن بعض وطن دشمن لوگوں نے اس معاہدے کی خلاف ورزی کر کے پھر

مظاہرہ کیا طلبا ہے جس کے دوران بعض ارکان اسمبلی کو گالیاں دی گئی ہیں اور ان کی کاروں کو نقصان پہنچایا گیا ہے۔"[12]

خواجہ ناظم الدین کے اس بیان کے اگلے دن طلبا کے ایک جلسے میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ "قائداعظم کے دورۂ مشرقی پاکستان کے پیش نظر فی الحال کوئی ہڑتال یا مظاہرہ نہیں کیا جائے گا۔ مزید فیصلہ کیا گیا کہ لسانی تحریک چلانے والی مجلس عمل میں بعض دوسری تنظیموں کو بھی نمائندگی دی جائے اور قومی زبان کا ہفتہ منانے کے انتظامات کئے جائیں۔"[13] طلبا کے اس فیصلے کے بعد اسمبلی بلڈنگ کے سامنے مظاہروں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ طلبا نے یہ فیصلہ خواجہ ناظم الدین کے اس دھمکی آمیز بیان کی وجہ سے نہیں کیا تھا بلکہ ان کے اس فیصلے کی بنیاد اس کا وہ صلح پسندانہ بیان تھا جو اس نے 16/مارچ کو صوبائی اسمبلی میں دیا تھا۔ اس بیان میں خواجہ ناظم الدین نے یقین دلایا تھا کہ اپریل کے پہلے ہفتے میں ایک خصوصی تحریک کے ذریعے سفارش کی جائے گی کہ بنگالی زبان کو بھی سرکاری زبان بنایا جائے اور اسے وہی درجہ دیا جائے جو پاکستان اسمبلی میں اور مرکزی حکومت کے امتحانات میں اردو کو دیا گیا ہے۔ مشرقی بنگال میں بنگالی کی حیثیت کے بارے میں پہلے پارٹی میٹنگ میں بحث ہو گی اور پھر اسمبلی میں ایک سرکاری قرارداد پیش کی جائے گی جس میں یہ تجویز کیا جائے گا کہ جب کبھی اس صوبہ میں انگریزی کا بطور سرکاری زبان استعمال ترک کیا جائے گا تو اس کی جگہ بنگالی زبان لے گی۔ ذریعہ تعلیم بنگالی زبان ہو گی لیکن اسکولوں اور کالجوں میں طلبا کی اکثریت کی مادری زبان کو ترجیح دی جائے گی۔ خواجہ ناظم الدین کی اس یقین دہانی سے پہلے اسمبلی کی کاروائی کے دوران سارے کانگریسی اور بہت سے مسلم لیگی ارکان نے بنگالی زبان میں تقریریں کیں اور ان کا اصرار تھا کہ باقی سب ارکان بھی بنگالی میں بولیں۔

لیکن مغربی پاکستان میں اس کے باوجود اردو کے حق میں مہم جاری رہی۔ 18/مارچ کو لاہور کے اخبار پاکستان ٹائمز کی خبر یہ تھی کہ 26/مارچ کو لاہور میں جو سہ روزہ پنجاب یونیورسٹی اردو کانفرنس ہو رہی ہے اس میں تعلیمی، ادبی اور صحافتی انجمنوں کے 80 سے زائد مندوبین کی شرکت متوقع ہے۔ 19/مارچ کو کلکتہ کے غیر بنگالی صنعت کار اور سوداگر ایم۔ اے۔ اچ۔ اصفہانی کے اخبار مارننگ نیوز میں لندن کے ماہنامے "اسلامک ریویو" کے ادارتی شعبہ کے ایک بنگالی رکن آفتاب الدین احمد کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں اس نے اسلام کا واسطہ دے کر بنگالی

مسلمانوں سے اپیل کی تھی کہ وہ قومی زبان کے مسئلہ پر ایجی ٹیشن نہ کریں۔اس کی رائے یہ تھی کہ اسلام قومی زبان بلکہ ساری مسلم قوم سے عظیم تر ہے۔قوموں اور زبانوں کا عروج وزوال ہوتا رہا ہے لیکن اسلام خدائے واحد کی عظمت کی شہادت کے طور پر ابھی تک زندہ ہے۔اس مضمون میں مزید کہا گیا تھا کہ زبان کے مسئلہ پر بنگالی مسلمانوں کی ایجی ٹیشن کی تین وجوہ ہوسکتی ہیں۔(1) بنگالی مسلمانوں کو اپنی بنگالی زبان سے محبت ہے اوران کی اس محبت میں ان کے ہندو ہم وطن بھی شریک ہیں۔(2) بنگالی مسلمانوں کا یہ دعویٰ ہے کہ بنگالی زبان بھی اسی طرح مسلمانوں کی تخلیق ہے جیسے کہ اردو ہے۔انگریزوں سے پہلے ایک پٹھان بادشاہ نے بنگالی زبان کو اسلامی رنگ میں رنگا تھا اوراس زبان میں تصنیف کا کام سب سے پہلے مسلمانوں نے کیا تھا۔(3) یہ بھی ممکن ہے کہ بنگالی مسلمانوں کے ذہن میں اردو بولنے والے مسلمانوں کی اس رعونت کا ردعمل ہو جو مذہبی ثقافت کے لحاظ سے اپنے آپ کو بنگالی مسلمانوں سے برتر تصور کرتے ہیں۔[15]

قائداعظم کا دورۂ مشرقی بنگال،...... بنگالی زبان کی مجلس عمل کی طرف سے وضاحت کہ ان کی ایجی ٹیشن کا کسی سیاسی جماعت یا مفاد پرست سے کوئی تعلق نہیں ہے

19 ؍مارچ کو گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح کراچی سے بذریعہ ہوائی جہاز شام کو چھ بجے ڈھاکہ پہنچے تو ہوائی اڈے پر گورنر سر فریڈرک بورن، وزیراعلیٰ خواجہ ناظم الدین اور ایریا کمانڈر میجر جنرل محمد ایوب خان کے علاوہ صوبائی وزراء، ارکان اسمبلی، سرکردہ سیاسی زعما اور دوسرے ممتاز شہریوں نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔ویمن نیشنل گارڈ اور پنجاب رجمنٹ کے ایک دستے نے گارڈ آف آنر پیش کیا۔قائداعظم کی رہائش کا انتظام چیف سیکرٹری عزیز احمد کے گھر میں کیا گیا تھا جو اس مقصد کے لئے خاص طور پر خالی کروایا گیا تھا۔

قائداعظم کے ڈھاکہ پہنچنے سے پہلے متحدہ بنگال کا سابق وزیر خزانہ محمد علی بوگرا بعض حلقوں میں یہ تاثر پیدا کر چکا تھا کہ لسانی تحریک اس کے کنٹرول میں ہے وہ جب چاہے اسے شروع کرا سکتا ہے اور جب چاہے اسے ختم کرا سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے 19 ؍مارچ کو بھی صوبائی اسمبلی میں جو تقریر کی تھی اس میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ وہ بنگالی عوام کے

مفادات کا عظیم ترین علمبردار ہے۔ اس کی اس تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ گزشتہ ساڑھے سات ماہ میں مشرقی بنگال کے عوام کی معاشی حالت میں کوئی بہتری نہیں ہوئی لہٰذا ان میں مایوسی کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ صوبائی بجٹ میں ترقیاتی منصوبوں کے لئے 17 کروڑ روپے کی جس مرکزی امداد کی توقع کی گئی ہے وہ پوری نہیں ہوگی کیونکہ مرکز کی جانب سے مشرقی بنگال سے منصفانہ سلوک نہیں کیا جارہا ہے۔[16]

20 مارچ کو جائنٹ سٹیٹ لینگوئج سب کمیٹی کی مجلس عمل نے محمد علی بوگرا کی اس کوشش کا نوٹس لیا جو وہ لسانی تحریک سے سیاسی فائدہ اٹھانے کے لئے کر رہا تھا۔ مجلس عمل کا بیان یہ تھا کہ ''ہماری عوامی تحریک کا کسی سیاسی لیڈر سے کوئی تعلق نہیں لہٰذا مفاد پرست لیڈروں کو اس سے کوئی سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ ہماری اس تحریک کے تین مقاصد ہیں: (1) حکومت پاکستان اور پاکستان دستور ساز اسمبلی کی سرکاری زبانوں میں بنگالی زبان بھی شامل ہونی چاہیے۔ (2) مشرقی پاکستان میں بنگالی کو سرکاری زبان بنانے کے لئے فوراً قانون سازی کرنی چاہیے۔ اور (3) مشرقی پاکستان میں بنگالی کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لئے بھی قانون سازی ہونی چاہیے۔ ہمارے پہلے مطالبے کا تعلق مرکزی حکومت پاکستان سے ہے اور دوسرے دونوں مطالبوں کا تعلق صوبائی اسمبلی سے ہے۔ صوبائی حکومت نے رائے عامہ کے دباؤ کے تحت ہمارے مطالبات تسلیم کر لئے ہیں۔ لیکن جب تک مطلوبہ قانون سازی نہیں ہوتی اس وقت تک ہماری ایجی ٹیشن جاری رہے گی۔ ہمارا ماضی کا تجربہ شاہد ہے کہ حکومت نے ماضی میں رائے عامہ کے دباؤ کے تحت بہت مرتبہ وعدے کئے تھے لیکن ایجی ٹیشن کے ختم ہوتے ہی وہ اپنے وعدوں سے منحرف ہو گئی تھی لیکن اب ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے اور اپنے مطالبات پورے ہونے تک ایجی ٹیشن جاری رکھیں گے...... ماضی میں ہم نے جب کبھی عوامی جدوجہد کی ہے تو بعض پیشہ ور سیاسی لیڈروں نے اپنی ذات یا اپنی پارٹی کے لئے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے اور اس بنا پر ہماری ایجی ٹیشن ناکام رہی ہے لیکن اب طلبا اور نوجوان لسانی تحریک کی ابتدا ہی سے تحریک کی رفتار پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہیں۔ اس ایجی ٹیشن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس سے کسی پیشہ ور سیاسی لیڈر کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کے باوجود بعض مفاد پرست افراد نے اسمبلی میں ایک پارٹی کے مفاد کے لئے اس ایجی ٹیشن سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے لہٰذ طلبا کا خیال ہے کہ ایسے

مفاد پرست لیڈروں کو متنبہ کرنا لازمی ہے۔'' بظاہر مجلس عمل نے یہ بیان قائداعظم پر یہ حقیقت واضح کرنے کے لئے جاری کیا تھا کہ مشرقی بنگال کی لسانی تحریک معدودے چند تخریب کاروں، ففتھ کالمنسٹوں، وطن دشمن ہندوؤں، کمیونسٹوں اور مفاد پرست سیاسی لیڈروں کی سازش کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک عوامی تحریک ہے اور اس کے مطالبات عوامی مطالبات ہیں اس لئے سیاسی حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ ان مطالبات کو منظور کر لیا جائے۔

قائداعظم کا اعلان کہ صرف اردو قومی زبان ہوگی، صوبہ پرستی زہر ہے اور ففتھ کالم، تخریب کار اور کمیونسٹ اس زہر کو ملک کے خلاف استعمال کر رہے ہیں

21 مارچ کو مجلس عمل کو سخت مایوسی ہوئی جبکہ قائداعظم نے ڈھاکہ میں ایک عظیم الشان جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ''پاکستان کی قومی زبان اردو ہوگی اور کوئی اور زبان نہیں ہوگی۔ جو کوئی بھی اس سلسلے میں تمہیں گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ دراصل پاکستان کا دشمن ہے۔ اگر کسی قوم کی قومی زبان ایک نہ ہو تو وہ استحکام کے ساتھ یکجا رہ کر کوئی کام نہیں کر سکتی۔ دوسرے ممالک کی تاریخ پر نظر ڈالو۔ جہاں تک قومی زبان کا تعلق ہے پاکستان کی زبان اردو ہوگی لیکن اسے رائج کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔'' اس جلسہ عام کی صدارت نواب حبیب اللہ خان بہادر آف ڈھاکہ نے کی تھی اور اس نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں بابائے قوم سے استدعا کی تھی کہ مشرقی پاکستان کے عوام کی تعداد کے مطابق انہیں حکومت کے سارے شعبوں میں حصہ دیا جائے۔ خطبہ میں کہا گیا تھا کہ ''بعض لوگوں کی یہ رائے صحیح نہیں ہے کہ مشرقی پاکستان کے لوگ نان مارشل ہیں اور اس علاقے میں اول درجہ کے فوجی یونٹس پیدا نہیں ہو سکتے۔ ہم دوسری جگہوں اور نسلوں کے لوگوں سے اپنا موازنہ کرنا مناسب نہیں سمجھتے لیکن ہم یہ دعویٰ پورے وثوق سے کر سکتے ہیں کہ جہاں تک جرأت، پہل کرنے کی صلاحیت، طاقت اور قوت برداشت کا تعلق ہے ہم کسی سے کم نہیں ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ ہمارے ہزاروں مجاہدین نام نہاد وہابی بغاوت کے دوران نقل وحمل کی جدید سہولتوں کی عدم موجودگی کے باوجود صوبہ سرحد گئے تھے۔ ہم استدعا کرتے ہیں کہ ہمارے نوجوان مردوں اور ہماری نوجوان عورتوں کو مسلح افواج میں شامل ہونے کی سہولتیں مہیا کی جائیں اور انہیں بری، بحری اور ہوائی جنگ کی جدید تربیت دی جائے تاکہ وہ ملک

کے اس دور افتادہ حصے کے دفاع اور تحفظ کے کام میں پوری طرح حصہ لے سکیں۔''[18]

قائداعظم نے اس خطبہ استقبالیہ کے جواب میں اپنی تقریر میں پہلے تو حاضرین کو یقین دلایا کہ حکومت پاکستان اس صوبہ کے نوجوانوں کو ملک کی باقاعدہ مسلح افواج میں اور پاکستان نیشنل گارڈز میں بطور رضا کار تربیت کی سہولتیں مہیا کرنے کے لئے پوری مستعدی کے ساتھ اقدامات کر رہی ہے اور اس امر کی بھی مسلسل کوشش کر رہی ہے کہ مشرقی پاکستان کو حکومت کے ہر شعبہ میں جلد از جلد اس کا پورا درجہ حاصل ہو جائے۔ پھر قائداعظم نے مشرقی بنگال کے وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین کی حکومت اور اس کے وفادار اور محنتی اہلکاروں کو اس بنا پر مبارک باد دی کہ انہوں نے گزشتہ ساڑھے سات ماہ میں نہایت غیر موافق حالات کے باوجود صوبہ کی انتظامیہ کی تشکیل کی ہے اور بہت سی مشکلات پر قابو پا کر اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے اور پھر انہوں نے قومی زبان اور صوبہ پرستی کے مسائل پر تبصرہ کرتے ہوئے مزید کہا کہ ''بنگالی اس صوبہ کی سرکاری زبان ہوگی یا نہیں اس سوال کا فیصلہ اس صوبہ کے منتخب نمائندے کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ فیصلہ مناسب وقت پر یہاں کے عوام کی خواہشات کے مطابق کیا جائے گا اور اس سے تمہاری معمول کی زندگی متاثر نہیں ہوگی بالآخر اس بات کا فیصلہ تم ہی نے کرنا ہے کہ تمہارے صوبے کی سرکاری زبان کونسی ہوگی۔ قائداعظم نے عوام کو متنبہ کیا کہ پاکستان میں ففتھ کالم، تخریب پسند عناصر اور کمیونسٹ گروہ پاکستان کی بنیادوں پر ضرب کاری لگانے اور یہاں افتراق پیدا کرنے میں کوشاں ہیں۔ انہیں غیر ملکی روپیہ مل رہا ہے۔ ہم پاکستان کے ان دشمنوں، غداروں اور ففتھ کالمنسٹوں کو برداشت نہیں کریں گے۔ اگر انہوں نے اپنی تخریبی سرگرمیاں بند نہ کیں تو حکومت ان کے خلاف سخت کاروائی کرے گی۔ ان کا مقصد پاکستان کی تباہی و بربادی ہے۔ تم ان لوگوں کی سازشوں سے آگاہ رہو۔ ان کے بظاہر دل پذیر نعروں اور چکنی چپڑی باتوں میں نہ آؤ۔ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ حکومت پاکستان اور مشرقی پاکستان کی موجودہ حکومت آپ کی زبان ختم کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ آج تک اس سے خوفناک جھوٹ کسی نے نہیں کہا تھا۔ میں آپ کو صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ تم میں چند کمیونسٹ اور غیر ملکی ایجنٹ ایسے ہیں جنہیں غیر ملکی سرمایہ مہیا کیا جاتا ہے۔ اگر تم محتاط نہ رہے تو یہ لوگ تمہاری صفوں میں انتشار پیدا کر دیں گے۔ ان لوگوں کی یہ زبردست خواہش ہے کہ مشرقی بنگال ایک بار پھر ہندوستانی یونین میں شامل ہو جائے...... ان لوگوں نے

بہت کوشش کی تھی کہ پاکستان قائم نہ ہو لیکن اب جبکہ انہیں اپنی اس کوشش میں ناکامی ہو چکی ہے تو اب یہ اس کوشش میں ہیں کہ اس ملک کے مسلمانوں میں تفرقہ ڈلوا کر اس ملک کو تباہ کیا جائے۔ ان کی اس کوشش نے خاص طور پر صوبہ پرستی کی حوصلہ افزائی کی شکل اختیار کر رکھی ہے۔ جب تک تم اپنے جسد سیاست سے اس زہر کو نکال باہر نہیں پھینکو گے اس وقت تک حقیقی معنوں میں ایک مستحکم قوم نہیں بن سکو گے۔ تمہیں بنگالی، پنجابی، سندھی، پٹھان وغیرہ کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ تمہیں تیرہ سو سال پہلے کا سبق نہیں بھولنا چاہیے۔ ہم بنگالی یا سندھی یا پٹھان نہیں ہیں۔ ہم سب مسلمان ہیں۔ اگر تم ایک قوم کی حیثیت سے اپنی تعمیر کرنا چاہتے ہو تو خدا کے لئے صوبہ پرستی چھوڑ دو۔ صوبہ پرستی، شیعہ سنی فرقہ پرستی کی طرح ایک لعنت ہے۔ اگر تم صوبہ پرستی کو ترک نہیں کرو گے تو تم کبھی بھی ایک طاقتور قوم نہیں بن سکو گے۔ صوبہ پرستی ایک انتہائی نقصان دہ چکر ہے۔ اس سلسلے میں جب کسی بنگالی سے بات کی جاتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ ''ہاں بات صحیح ہے لیکن پنجابی بہت مغرور ہے'' اور جب کسی پنجابی یا غیر بنگالی سے بات کی جاتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ ''ہاں یہ بات ٹھیک ہے لیکن یہ لوگ ہمیں یہاں نہیں چاہتے۔ یہ چاہتے ہیں کہ ہم یہاں سے باہر نکل جائیں۔ اب بتایئے اس چکر کو ختم کرنے کے لئے کون زیادہ دانشمندی اور تدبر کا ثبوت دے گا۔ آج تم اس مسئلہ کا فیصلہ کرو اور اس دھڑے بندی کو ختم کرو۔''[19]

قائداعظم کے اعلان سے مشرقی بنگال کے عوام کی امنگوں اور آرزؤں کو شدید دھچکا لگا......ڈھاکہ یونیورسٹی کانووکیشن میں ان کے خلاف مظاہرہ ہوا

چونکہ قائداعظم کے اس جلسہ عام میں بعض نوجوانوں نے ان کی تقریر کے بعض حصوں پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا اس لئے انہوں نے اس جلسہ کے بعد سہ پہر کو طلبہ کی مجلس عاملہ کے ارکان سے ملاقات کی اور انہیں بتایا کہ اگر ملک کی قومی زبان ایک نہیں ہو گی تو پورے ملک میں مستحکم حکومت قائم نہیں ہو گی اور ملک کے دونوں حصوں میں اتحاد قائم نہیں رہے گا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ چونکہ اردو ملک کے کسی بھی صوبہ کی زبان نہیں ہے اس لئے یہ سارے صوبوں کے لئے قابل قبول ہونی چاہیے۔ لیکن مجلس عمل کے ارکان مطمئن نہ ہوئے اور انہوں نے اپنے میمورنڈم میں اپنے اس مطالبہ پر اصرار کیا کہ بنگالی زبان کو بھی قومی زبان کا درجہ دیا جائے۔ ان کا موقف یہ

تھا کہ اگر سوویت یونین، سوئٹزرلینڈ، کینیڈا، جنوبی افریقہ اور بلجیئم میں ایک سے زیادہ سرکاری زبانیں ہوسکتی ہیں تو پاکستان میں واحد قومی زبان پر اصرار کیوں کیا جاتا ہے جبکہ اس کے دونوں حصوں کے درمیان اتنا زیادہ فاصلہ ہے۔ طلبا کی رائے یہ تھی کہ ملک کا اتحاد محض قومی زبان کے ایک ہونے سے قائم نہیں رکھا جاسکتا۔ بلکہ اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ ملک کا ایک حصہ دوسرے حصے کا معاشی استحصال نہ کرے۔ تاہم قائداعظم نے مجلس عمل کے ارکان سے اتفاق نہ کیا اور یہ ملاقات بے نتیجہ ثابت ہوئی۔

22 مارچ کو بابائے قوم نے ایسٹ پاکستان رائفلز کے جوانوں کی ایک پریڈ کو خطاب کرتے ہوئے اس امر پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا کہ بنگالی جوان اس نیم فوجی تنظیم میں پنجابیوں کی موجودگی کو پسند نہیں کرتے۔ انہوں نے کہا کہ ''مجھے یہ بات پسند نہیں کہ تم لوگ بنگالی اور پنجابی کے حوالے سے باتیں کرتے ہو۔ تم سب پاکستانی اور مسلمان ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے آپ کو محض پاکستانی تصور کرو اور خود کو ملک وقوم کا ایک جز وسمجھ کر کام کرو۔'' ایسٹ پاکستان رائفلز کی یہ نیم فوجی تنظیم 1100 افسروں اور سپاہیوں پر مشتمل تھی جن میں سے 600 پنجابی تھے۔ اس فورس کی بھرتی ابھی جاری تھی اور خیال تھا کہ اس کی کل تعداد 2500 تک پہنچ جائے گی۔ اس کا کمانڈر ایک انگریز فوجی افسر لیفٹیننٹ کرنل بونرز (Boners) تھا۔[20]

23 مارچ کو قائداعظم نے مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کی ایک خصوصی میٹنگ میں شرکت کی۔ اگرچہ یہ اجلاس بند کمرے میں ہوا تھا اور اس کے خاتمہ پر کوئی اعلان جاری نہیں کیا گیا تھا۔ تاہم روزنامہ ڈان کے خصوصی نامہ نگار کی اس میٹنگ کے بعد خبر یہ تھی کہ ''یہاں کے سیاسی حلقوں کا قیاس ہے کہ مشرقی بنگال کی کابینہ میں عنقریب ردوبدل ہوگا۔ باور کیا جاتا ہے کہ قائداعظم نے لیگ اسمبلی پارٹی کی میٹنگ میں مسلم لیگی ارکان سے صاف صاف باتیں کی ہیں اور انہیں بتایا ہے کہ جب ایک مرتبہ انہوں نے اپنے قائد کا انتخاب کرلیا ہے تو انہیں اس کی حمایت کرنی چاہیے اور قائد کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنی پارٹی کے ارکان کے حقوق اور دعاوی کو نظر انداز نہ کرے۔ قائداعظم نے اس میٹنگ میں قطعی طور پر یہ بھی کہا ہے کہ جو وزراء اسمبلی کے رکن نہیں ہیں انہیں مزید توسیع نہیں دی جائے گی۔ انہیں اپنے عہدوں کی توسیع شدہ معیاد کے ختم ہونے سے پہلے یا تو اسمبلی کے رکن منتخب ہونا چاہیے یا پھر اپنے عہدوں سے الگ ہوجانا چاہیے۔ قائداعظم کے اس

رولنگ سے وزیر خزانہ حمید الحق چودھری اور وزیر مواصلات حسن علی متاثر ہوں گے۔ قائداعظم نے پارٹی کے ارکان کو سوالات پوچھنے کی بھی اجازت دی اور جن ارکان نے اس موقع پر ان سے شکایات کا اظہار کیا انہیں انہوں نے ہدایت کی کہ وہ ان کے ازالہ کے لئے اپنے قائد کی طرف رجوع کریں۔"[21]

ڈان کی اس خبر میں کوئی بات بھی مقامی سیاسی حلقوں کے لئے غیر متوقع نہیں تھی کیونکہ انہیں قائداعظم کی 21 رمارچ کی تقریر سے ہی یقین ہو گیا تھا کہ (1) حکومت پاکستان خواجہ ناظم الدین کی صوبائی حکومت کی بہر صورت پشت پناہی کرتی رہے گی۔ (2) پنجابی بیوروکریسی کا غلبہ قائم رہے گا۔ (3) مرکزی سول انتظامیہ اور مسلح افواج میں بنگالیوں کے بھرتی کے دروازے بند رہیں گے۔ (4) بنگالی زبان کو قومی زبان بنانے کا مطالبہ تسلیم نہیں کیا جائے گا اور جو عناصر خواجہ ناظم الدین کی حکومت کی مخالفت اور قومی زبان کے بارے میں اپنے مطالبہ پر اصرار کریں گے ان پر صوبہ پرستی، اشتراکیت، وطن دشمنی اور اسلام دشمنی کے ٹھپے لگا کر انہیں مردود قرار دے دیا جائے گا۔ (5) جو مسلم لیگی ارکان اسمبلی پس پردہ یا کھلم کھلا خواجہ ناظم الدین کی حکومت کی بیخ کنی کرنے کی کوشش کریں گے انہیں تحریص یا تخویف سے راہِ راست پر لایا جائے گا۔ (6) چونکہ وزیر خزانہ حمید الحق چودھری کا پنجابی بیوروکریسی سے تضاد تھا اور وہ اس تضاد کو اپنے حق میں حل کرنے کے لئے اپنے آپ کو بنگالی مفادات کا علمبردار ظاہر کرتا تھا اس لئے اس کا صوبائی حکومت میں زیادہ دیر تک شامل رہنا ممکن نہیں تھا۔

اس صورت حال پر سب سے پہلے احتجاجی آواز متحدہ بنگال کے سابق وزیر اعلیٰ مولوی ابوالقاسم فضل الحق نے اٹھائی۔ قائداعظم نے جس دن لیگ اسمبلی پارٹی کی خصوصی میٹنگ میں شرکت کی تھی اس دن مولوی فضل الحق کلکتہ میں تھا۔ چنانچہ اس نے وہیں سے ایک بیان میں قائداعظم کی 21 رمارچ کی تقریر پر سخت نکتہ چینی کی اور کہا کہ "گورنر جنرل نے اپنے بلند مقام سے نیچے آ کر ایسی وزارت کی حمایت کی ہے جو واضح طور پر زوال پذیر ہے۔ اس وزارت نے ابھی تک دائمی بندوبست اراضی کو منسوخ نہیں کیا۔ بنگالی زبان کو عدالتوں میں رائج نہیں کیا اور مدرسوں کے تعلیمی نظام کو کلی طور پر نظر انداز کر دیا ہے۔ قائداعظم نے یہ بھی اعلان کیا ہے کہ اردو پاکستان کی سرکاری زبان ہوگی۔ یہ متقمانہ مطلق العنانیت ہے۔ گورنر جنرل کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ

یہ بتائے کہ ملک کی سرکاری زبان کونسی ہوگی۔ اس سلسلے میں فیصلہ عوام الناس کو کرنا چاہیے۔ میری رائے یہ ہے کہ چونکہ پاکستان ڈومینین کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ کامل جمہوریت کے اسلامی اصولوں کی بنیاد پر قائم ہے اس لئے اس کی سرکاری زبان کا فیصلہ کرنے کے لئے استصواب رائے کروانا چاہیے۔''[22]

لیکن قائداعظم محمد علی جناح نے مولوی فضل الحق کی اس بیان بازی کا کوئی نوٹس نہ لیا اورانہوں نے 24 رمارچ کو ڈھاکہ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد سے خطاب کرتے ہوئے صوبہ پرستی اور قومی زبان کے بارے میں اپنے 21 رمارچ کے موقف کا اعادہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ ''ہمارے دشمن...... جن میں مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ابھی تک چند مسلمان بھی شامل ہیں...... اس امید میں صوبہ پرستی کی سرگرمی سے حوصلہ افزائی کررہے ہیں کہ پاکستان کمزور ہو اور اس طرح اس صوبہ کی انڈین یونین میں شمولیت میں سہولت ہو۔ جو لوگ یہ کھیل کھیل رہے ہیں وہ احمقوں کی جنت میں رہ رہے ہیں لیکن وہ اس کے باوجود اپنی اس کوشش سے باز نہیں آئے، روزانہ اس مقصد کے لئے جھوٹا پروپیگنڈا کیا جارہا ہے کہ اس ملک کے مسلمانوں کی یکجہتی کی بیخ کنی کی جائے اور لوگوں کو غیر قانونی کاروائیوں پر اکسایا جائے...... کیا یہ بات پرمعنی نہیں کہ ماضی میں جن لوگوں نے مسلمانوں سے غداری کی یا پاکستان کے خلاف جنگ لڑی جبکہ پاکستان محض تمہارے حق خوداختیاری کا مظہر ہے تو اب وہی لوگ یکایک آپ کے جائز حقوق کے محافظ بن بیٹھے ہیں اور آپ کو زبان کے معاملے میں حکومت پاکستان کی مخالفت پر اکساتے ہیں۔ میں آپ کو انتباہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ دشمن کے ان آلہ کار لوگوں سے خبردار رہیں۔ میں آپ کے سامنے پاکستان کی سرکاری زبان کے بارے میں اپنے نظریات کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس صوبہ میں سرکاری دفاتر کے لئے کے لوگ جو زبان چاہیں اختیار کرسکتے ہیں اس سوال کا فیصلہ صرف اس صوبے کے لوگوں کی خواہشات کے مطابق کیا جائے گا۔ جو مناسب وقت پر ان کے مستند نمائندے پوری آزادی سے کامل اور بے لاگ غوروخوض کے بعد ظاہر کریں گے۔ لیکن باہمی اظہار خیالات یعنی مملکت کے مختلف صوبوں میں باہمی رابطہ کے لئے صرف ایک ہی زبان ہوسکتی ہے اور وہ زبان اردو ہونی چاہیے۔ کوئی دوسری زبان نہیں ہوسکتی۔ اس لئے واضح ہے کہ سرکاری زبان اردو ہی ہونی چاہیے۔ یہ وہ زبان ہے جو پاکستان کے طول وعرض میں سمجھی جاتی ہے اور سب

سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ صرف یہی زبان ہے جو دوسری ہر صوبائی زبان کے مقابلے میں اسلامی ثقافت اور مسلمانوں کی روایات کے بہترین سرمایہ کی مظہر ہے۔ یہ زبان دوسرے مسلم ملکوں کی زبانوں سے بھی قریب ترین ہے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ اردو کو ہندوستان سے نکال دیا گیا ہے اور سرکاری طور پر اردو رسم الخط کی بھی ممانعت کر دی گئی ہے۔ یہ حقائق ان لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہیں جو گڑبڑ مچانے کے لئے لسانی تنازعہ سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اس ایجی ٹیشن کا کوئی جواز نہیں تھا لیکن وہ یہ بات تسلیم نہیں کرتے تھے کیونکہ اس طرح ان کا مقصد پورا نہیں ہوتا تھا۔ ان کا واحد مقصد یہ ہے کہ وہ اس تنازعے کے ذریعے ملک کے مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کریں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے غیر بنگالی مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے کی کھلم کھلا کوششیں کی ہیں...... تمہیں قومی زبان کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ اگر اس ملک کے مختلف حصوں کو ایک ساتھ مل کر آگے بڑھنا ہے تو صرف ایک ہی قومی زبان ہوسکتی ہے اور میری رائے میں وہ زبان صرف اردو ہی ہوسکتی ہے۔'' [23]

روزنامہ ڈان میں قائداعظم کی اس تقریر کے بارے میں جو رپورٹ شائع ہوئی اس کے آخر میں لکھا تھا کہ جب قائداعظم نے اردو زبان کو پاکستان کی واحد قومی زبان قرار دینے کا اعلان کیا تو ایک ہندو نوجوان کی سرکردگی میں طلبا کے ایک چھوٹے سے گروہ نے نہیں، نہیں، نہیں کے نعرے لگائے اور جب قائداعظم ہال سے باہر نکل رہے تھے تو ہندو طلبا نے پھر مظاہرہ کیا اور بنگالی میں نعرے لگائے۔'' [24] لیکن قمرالدین احمد کے بیان کے مطابق ڈان کی اس رپورٹ میں پوری طرح حقیقت بیانی نہیں کی گئی تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ ''بدقسمتی سے جناح نے غالباً بعض غیر بنگالی سیکریٹریوں کے مشورے کے مطابق مجلس عمل اور خواجہ ناظم الدین کے درمیان 15/ مارچ کے طے شدہ معاہدے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے بعد انہوں نے ڈھاکہ ریس کورس میں اپنے پہلے پبلک جلسہ میں یہ اعلان کر دیا کہ اردو ہی پاکستان کی واحد قومی زبان ہوگی۔ اس پر بعض لوگوں نے احتجاج کیا اور وہ جلسہ سے باہر چلے گئے۔ طلبا کو اس تقریر پر اتنا غصہ آیا کہ انہوں نے تعلیمی اداروں سے جناح کی ساری تصویریں اتار دیں۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبا نے کہا کہ اگر وہ قومی زبان کے مسئلے پر اپنی رائے تبدیل نہیں کرتے تو وہ انہیں اپنے ہاں تقریر کرنے کی دعوت نہیں دیں گے۔ جب جناح نے یونیورسٹی کانووکیشن میں اپنے اس بیان کا اعادہ کیا تو اتنا ہنگامہ ہوا

کہ انہیں اپنی تحریری تقریر ختم کئے بغیر ہی یکا یک کانووکیشن ہال سے جانا پڑا۔"[25] ہوسکتا ہے کہ قمرالدین احمد کے اس بیان میں تعصب اور مبالغہ کا عنصر شامل ہو لیکن ڈان کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ حقیقت سے سراسر خالی نہیں ہے۔ کانووکیشن ہال میں قائداعظم کے خلاف مظاہرہ ضرور ہوا تھا اور وہ محض ہندو طلبا کی کارستانی نہیں تھی۔

کلکتہ کے اخبار مارننگ نیوز کے 25 / مارچ کے اداریے کے مطابق مشرقی بنگال میں غیر بنگالیوں کے خلاف نفرت کا زہر پھیلانے والوں میں مولوی فضل الحق اور کلکتہ کے دو مسلم بنگالی جریدے شامل تھے۔ ان دونوں جریدوں میں سے ایک جریدے کا تعلق صوبہ مسلم لیگ کے صدر سے تھا۔ مارننگ نیوز کا مزید تبصرہ یہ تھا کہ "فضل الحق ایک سیاسی گرگٹ ہے۔ اس نے غیر بنگالیوں کے خلاف غیر اسلامی جذبات کو مشرقی بنگال کی موجودہ وزارت کے خلاف سیاسی ہرزہ سرائی کی شکل دینے کی کوشش کی ہے۔"

پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں میں صوبائی حقوق کی تحریکیں زوروں پر تھیں، جن کی ٹھوس مادی وجوہات تھیں اور انہیں پاکستان میں مسلم قومیت اور ہندوستان میں انڈین نیشنلزم کے نعروں سے دبایا نہیں جاسکتا تھا

صوبہ پرستی یا علاقہ پرستی یا قومیتی تضاد کا زہر صرف پاکستان تک ہی محدود نہیں تھا اور نہ ہی قومی زبان کے مسئلہ پر زہر کے اثرات صرف پاکستان میں ہی ہوئے۔ مارننگ نیوز کے اس اداریے کے مطابق صوبہ پرستی یا علاقہ پرستی یا قومیتی تضاد ہندوستان میں بھی اتنا ہی شدید تھا جتنا کہ پاکستان میں تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے وزیراعظم جواہر لال نہرو نے انہی دنوں جنوبی ہندوستان کے شہر وزاگاپٹنم میں تقریر کرتے ہوئے لوگوں کو تلقین کی تھی کہ وہ علاقائی نظریہ ترک کر کے معاملات پر کل ہند سیاق وسباق میں نظر ڈالیں۔ نہرو نے کہا تھا کہ "اگر لوگوں نے صرف اپنے صوبوں کی حد تک ہی سوچا اور خود کو آندھری، بنگالی یا پنجابی ہی تصور کیا تو وہ سب کھو بیٹھیں گے جو انہوں نے گزشتہ تیس سال یا اس سے زیادہ عرصے میں حاصل کیا تھا...... اگر لوگوں کو ایک قوم کی حیثیت سے ترقی کرنا ہے تو ہر شخص کو صرف ہندوستانی شہری کی حیثیت سے ہی سوچنا ہوگا۔ اگر

ہندوستان پر کوئی تباہی آئی تو ان میں سے ہر ایک پر برابر کا اثر پڑے گا۔''[26]

پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں میں ہی صوبہ پرستی کی یہ لعنت چند تخریب پسندوں، ففتھ کالمنسٹوں اور وطن دشمنوں کی سازش کا نتیجہ نہیں تھی۔ بلاشبہ ان دونوں ملکوں میں بعض سیاسی لیڈر اس تحریک سے اپنی سیاسی مطلب براری کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ یہ تحریک بالکل مصنوعی تھی اور تعلیم یافتہ نوجوان اور دوسرے عناصر ان کے ہاتھوں میں محض کٹھ پتلی تھے۔ ہندوستان میں اس کی ٹھوس بنیاد یہ تھی کہ شمالی ہندوستان میں یو۔ پی اور ہندی بولنے والے بعض دوسرے علاقوں کے لوگ ہندوستان کے ان مغربی، جنوبی اور مشرقی علاقوں پر سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی غلبہ قائم کرنا چاہتے تھے جن کی زبان ہندی نہیں تھی۔ لہٰذا ان کے خلاف احتجاجی ایجی ٹیشن ناگزیر تھی۔ اس ایجی ٹیشن کو محض انڈین نیشنلزم کے نعرے لگا کر نہیں دبایا جاسکتا تھا۔ اسی طرح پاکستان میں بنگالیوں، سندھیوں، بلوچیوں اور پٹھانوں کو جائز طور پر یہ خطرہ تھا کہ کراچی اور پنجاب کے مفاد پرست عناصر اردو، اسلام، مسلم قومیت اور حب الوطنی کے نعرے لگا کر ان کا سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی استحصال کریں گے۔ لہٰذا سرحد، سندھ، بلوچستان اور مشرقی بنگال کے صوبہ جات میں ان کے خلاف ایجی ٹیشن بھی ناگزیر تھی۔ چونکہ پنجابی بیوروکریسی اور بہاری مہاجرین کراچی اور پنجاب کے استحصالیوں کے آلہ کار تھے اس لئے مقامی تعلیم یافتہ عناصر میں ان کے خلاف نفرت بھی ناگزیر تھی۔ پنجابی سول وفوجی افسروں اور بہاری مہاجرین کا مقامی آبادی کے بارے میں رویہ بہت حقارت آمیز بلکہ سامراجی تھا۔ وہ کھلم کھلا اور زور شور سے کراچی اور پنجاب کے استحصالیوں کا ساتھ دیتے تھے۔ اس لئے ان کے خلاف غم وغصہ کے جذبات کا پرتشدد اظہار افسوس ناک تو تھا لیکن یہ غیر متوقع اور حیرت انگیز نہیں تھا۔ بنگالیوں میں سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی خودمختاری کی تحریک کے زیادہ شدید ہونے کی ایک بڑی وجہ تو یہ تھی کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان ہزاروں میل کا فاصلہ تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ مشرقی بنگال کی تاریخ، معاشرت، ثقافت اور معیشت بھی مغربی پاکستان سے بالکل مختلف تھی۔ اس حقیقی اختلاف کو محض صوبہ پرستی کی مذمت، ہندوستان کی توسیع پسندی کے خوف اور مسلم قومیت کے نعروں کے زور سے دور نہیں کیا جاسکتا تھا۔

لسانی تحریک سے وابستہ محمد علی بوگرا سمیت چار مسلم لیگی ارکان اسمبلی کو سیاسی رشوت دے کر خرید لیا گیا جو ناظم الدین کی کمزور حکومت کی معمولی اکثریت برقرار رکھنے کے لئے اہمیت کے حامل تھے

ڈھاکہ میں تنہا مولوی فضل الحق ہی لسانی تحریک سے سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کر رہا تھا بلکہ محمد علی بوگرا، تفضّل علی، ڈاکٹر اے۔ ایم۔ مالک، خواجہ نصر اللہ اور صوبائی مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے متعدد دوسرے ارکان بھی اسی کوشش میں مصروف تھے کیونکہ فضل الحق کی طرح انہیں بھی خواجہ ناظم الدین کی حکومت میں کوئی عہدہ نہیں ملا تھا۔ چنانچہ 23/مارچ کو صوبائی اسمبلی پارٹی کی خصوصی میٹنگ کے بعد مؤخر الذکر چاروں ارکان سے سودا بازی ہوئی۔ 24/مارچ کو جب کانووکیشن ہال میں قائداعظم کے خلاف بعض طلبا نے نہیں نہیں کے نعرے لگائے تو ان کے ساتھ یہ سودا پختہ ہو گیا۔ لہٰذا 25/مارچ کو ایسوسی ایٹڈ پریس نے یہ خبر دی کہ محمد علی بوگرا کو برما میں پاکستان کا سفیر مقرر کیا گیا ہے اور وہ 17/اپریل کو رنگون میں اپنے عہدے کا چارج لے لیگا۔''[27]

اس کے کچھ عرصہ بعد تفضّل علی اور ڈاکٹر مالک صوبائی کابینہ میں شامل ہو گئے اور خواجہ نصر اللہ کو صوبائی لیگ اسمبلی پارٹی کا چیف وہپ بنا دیا گیا۔ اس کا مطلب صاف ظاہر تھا۔ خواجہ ناظم الدین یہ سمجھتا تھا کہ اگر ان چاروں کے منہ میں کسی نہ کسی عہدے کی ہڈی دے دی جائے تو یہ خاموش ہو جائیں گے اور لسانی تحریک خود بخود ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ 25/مارچ کو اس کی سفارش کے مطابق گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح نے محمد علی بوگرا کو سفارت کا عہدہ دینے کا اعلان کروا دیا اور باقی تینوں کو کچھ عرصہ بعد صوبائی حکومت میں کھپا لیا گیا۔

25/مارچ کو جب ایسوسی ایٹڈ پریس نے ڈھاکہ سے محمد علی بوگرا کے بارے میں یہ خبر دی تو اس وقت قائداعظم جناح چٹاگانگ میں تھے۔ وہاں انہوں نے سب سے پہلے گزیٹڈ افسروں کے ایک اجتماع میں تقریر کی اور انہیں ہدایت کی کہ وہ عوام الناس سے تحکمانہ رویہ اختیار نہ کریں بلکہ سیاسی پارٹیوں سے بے تعلق رہ کر عاجزی، انکساری کے ساتھ عوام کی خدمت کریں۔ 26/مارچ کو انہوں نے ایک جلسہ عام میں خطبہ استقبالیہ کا جواب دیتے ہوئے اس رائے سے اتفاق کیا کہ پاکستان کی تعمیر معاشرتی انصاف اور اسلامی سوشلزم کی مستحکم بنیادوں پر ہونی چاہیے۔

اسی دن انہوں نے مقامی علما سے بھی ملاقات کی جس کے دوران علما نے ایک خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔جس میں قائداعظم کی قیادت اور قومی زبان کے بارے میں ان کے اعلان پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا گیا تھا۔انہوں نے قائداعظم سے گزارش کی تھی کہ وہ ان بیرونی اور اندرونی دشمنوں کے خلاف سخت اقدام کریں جو تفرقہ اندازی کر کے پاکستان کو کمزور کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔علما نے قائداعظم کو ان 28 قراردادوں کی نقلیں بھی پیش کیں جو انہوں نے چٹاگانگ میں اپنی سہ روزہ کانفرنس میں منظور کی تھیں۔ان میں سے ایک قرارداد یہ تھی کہ ''مشرقی بنگال میں انجمن ترقی اردو کی شاخیں قائم کی جائیں گی تاکہ یہاں لوگ اردو زبان سیکھ سکیں۔''[28] چٹاگانگ میں علما کی یہ سہ روزہ کانفرنس وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین کی تحریک پر ہوئی تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ قومی زبان کے پرچم تلے اس کی حکومت کے خلاف جو عوامی تحریک جاری ہے اسے مذہبی نعروں کے بھاری بوجھ تلے دفن کر دیا جائے۔

پنجاب یونیورسٹی لاہور کی سہ روزہ اردو کانفرنس میں بنگلہ تحریک والوں پر وطن دشمنی کا الزام

متذکرہ کانفرنس کے بعد جب علما نے قائداعظم سے ملاقات کی اس وقت لاہور میں پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام ایک سہ روزہ اردو کانفرنس ہو رہی تھی جس میں مرکزی وزیر مواصلات سردار عبدالرب نشتر، مرکزی وزیر بحالیات راجہ غضنفر علی خان، وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی ڈاکٹر عمر حیات ملک اور مولانا ظفر علی خان کے علاوہ پورے مغربی پاکستان سے دوسرے بہت سے ممتاز عاشقان اردو شریک تھے لیکن ان میں مشرقی بنگال سے کوئی مندوب شامل نہیں تھا۔سر عبدالقادر نے اس کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ ''اردو زبان بھی تقسیم ہند کے بعد کے واقعات سے لہولہان ہوگئی ہے تاہم امید ہے کہ یہ زبان اپنے دشمنوں کی ساری سازشوں کے باوجود ہیجان سے فتحیاب ہو کر باہر نکلے گی۔ہم حکومت پاکستان کے شکر گزار ہیں کہ اس نے اس زبان کو سرکاری بنانے کا اعلان کر دیا ہے۔'' وزیر مواصلات سردار عبدالرب نشتر نے اردو کے حق میں بڑی زوردار تقریر کی اور کہا کہ صرف یہی ایک زبان ہے جو پاکستان کی قومی زبان بننے کی دعویدار ہو سکتی ہے۔اس نے کہا کہ ''قومی زبان قوم کے ثقافتی ورثہ کے تحفظ کا واحد ذریعہ

ہوتی ہے جبکہ دو زبانی ریاست قوم کے وقار کو صرف نقصان ہی پہنچا سکتی ہے۔لسانی تنازعہ مشرقی بنگال کے ان ''شر پسندوں'' کے انتشار انگیز رجحانات کی پیداوار ہے جو اپنے ملک کی بجائے ہندوستان کی طرف دیکھتے ہیں۔ان عناصر نے حب الوطنی کے لبادے پہنے ہوئے ہیں لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ یہ دراصل وطن کے دشمن ہیں۔'' سردار عبدالرب نشتر نے مزید کہا کہ ''تقسیم کے بعد اردو زبان لہولہان ہوگئی ہے۔اسے اپنے دیس سے نکال دیا گیا ہے۔اب یہ مہاجر ہے اور اس نے نوزائیدہ پاکستان میں پناہ لی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم پاکستان میں اس کا تحفظ کریں اور اسے اس کا جائز مقام دیں۔''

پاکستان کی انجمن ترقی اردو کے صدر ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے اپنے طویل خطبہ صدارت میں تاریخی حوالوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اردو زبان نے درحقیقت پنجاب میں جنم لیا تھا۔اس نے پنجاب کے عوام سے دردمندانہ اپیل کی کہ وہ اس مہاجر زبان کو بھی اسی طرح اپنائیں جس طرح کہ انہوں نے مشرقی پنجاب کے لاکھوں مہاجرین کو آباد کیا ہے۔اس نے کہا کہ یہ ''مہاجر زبان تمہارے لئے ہر چیز سے زیادہ سودمند ہوگی کیونکہ یہ صوبہ پرستی کے زہر کو ختم کر کے پاکستان کی بنیادوں کو مستحکم کرے گی اور پھر ایک دن ایسا آئے گا کہ یہ زبان نہ صرف ہندوستان کے برصغیر کی بلکہ پورے ایشیائی براعظم کی قومی زبان ہوگی۔''[29]

قائداعظم کی ڈھاکہ ریڈیو کی تقریر میں بنگلہ تحریک کے علمبرداروں پر صوبہ پرستی اور وطن دشمنی کے شدید الزامات، ان کی تحریک پاکستان کے دوران کی گئی تقریروں اور لیگ کی قراردادوں کے منافی تھے

قدرتی طور پر پنجاب یونیورسٹی کی اس اردو کانفرنس کی کاروائی مشرقی بنگال کے تعلیم یافتہ عناصر کے لئے بہت اشتعال انگیز تھی اور اس نے ملک کے دونوں حصوں کے درمیان اتحاد و یکجہتی پیدا کرنے کی بجائے نفاق اور بیگانگی کے جذبات کو مشتعل کیا تھا۔تاہم قائداعظم جناح نے اس تلخ حقیقت کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور انہوں نے 28/مارچ کو ڈھاکہ ریڈیو سے جو زوردار تقریر کی وہ ان کی 21 اور 24/مارچ کی تقریروں سے صرف اس لحاظ سے قدرے مختلف تھی کہ اس میں بنگالی زبان کے علمبرداروں کے لئے زیادہ سخت الفاظ استعمال کئے گئے تھے۔انہوں نے کہا کہ

''میں نے اس صوبے میں اپنے نو روزہ قیام کے دوران یہاں کے عوام کے بعض حلقوں میں یہ رجحان دیکھا ہے کہ آزادی نے ان کے سامنے ترقی کی جو نئی راہیں کھولی ہیں اور جو نئی ذمہ داریاں ان کے کندھوں پر ڈالی ہیں ان کو نظر انداز کر کے وہ بے لگام ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ غیر ملکی غلبہ کے خاتمہ کے بعد عوام کو اپنی تقدیر کا فیصلہ کرنے کا قطعی حق حاصل ہے۔ انہیں مکمل آزادی ہے کہ وہ آئینی ذرائع سے اپنی مرضی کی حکومت کا انتخاب کریں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ خلاف قانون طریقے استعمال کر کے حکومت وقت کو اپنی خواہشات کے تابع بنانے کی کوشش کریں۔ کوئی برائے نام حکومت بھی اس قسم کی غنڈہ گردی کو برداشت نہیں کرے گی۔ بلکہ اپنی پوری طاقت سے ایسے افراد کو کچلنے پر مجبور ہوگی۔ میں بالخصوص زبان کے تنازعہ کی طرف اشارہ کر رہا ہوں جس نے اس صوبہ کے بعض حلقوں میں بلا وجہ اشتعال اور کشیدگی پیدا کر دی ہے اور اگر اس کا سدباب نہ کیا گیا تو اس کے سنگین نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ اس صوبے کی سرکاری زبان کیا ہو گی؟ اس کا فیصلہ تمہارے نمائندے ہی کر سکتے ہیں لیکن زبان کا یہ تنازعہ درحقیقت ایک اور بہت بڑے مسئلہ کا ایک پہلو ہے اور وہ مسئلہ صوبہ پرستی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم کو اس بات کا لازماً احساس ہوگا کہ پاکستان جیسی نوزائیدہ مملکت میں جس کے دو حصے ایک دوسرے سے بہت دور واقع ہیں اس کے تمام شہریوں میں خواہ ان کا تعلق کسی حصہ سے ہو ہم آہنگی اور اتحاد نہ صرف اس کی ترقی بلکہ اس کی بقا کے لئے بھی ناگزیر ہے۔ پاکستان مسلم قوم کے اتحاد کا مجسم مظاہرہ ہے اور ہمیشہ اس کی یہی کیفیت رہنی چاہیے۔ سچے مسلمانوں کی طرح ہمیں اس اتحاد کی حمیت کے ساتھ حفاظت کرنی چاہیے اور اسے برقرار رکھنا چاہیے۔ اگر ہم نے اپنے بارے میں یہ سوچنا شروع کر دیا کہ ہم پہلے بنگالی، پنجابی، سندھی وغیرہ ہیں اور محض اتفاق سے مسلمان اور پاکستانی ہیں تو پھر پاکستان کا شیرازہ لازماً بکھر جائے گا۔ یہ مت سمجھئے کہ یہ کوئی دقیق مسئلہ ہے۔ ہمارے دشمن اس کے امکانات سے پوری طرح باخبر ہیں اور مجھے آپ کو خبردار کر دینا چاہیے کہ وہ پہلے سے ہی انہیں اپنے کام میں لانے کے لئے سرگرم عمل ہیں۔''[30]

مشرقی بنگال میں قائداعظم جناح کی یہ تقریریں ان کی دستور ساز اسمبلی میں 11 راگست 1947ء کی پالیسی تقریر کے سراسر منافی تھیں۔ انہوں نے 11 راگست 1947ء کی تقریر میں پاکستان کی قومیت کو مذہب اور رنگ و نسل سے بالاتر قرار دیا تھا اور اقلیتوں کو یقین

دلایا تھا کہ انہیں پاکستان کی قومی زندگی کے ہر شعبے میں مساوی حقوق حاصل ہوں گے لیکن اب صرف آٹھ ماہ بعد وہ اسلام اور مسلم قومیت کی باتیں کر رہے تھے۔ ان کی یہ تقریریں ان کے قیام پاکستان سے پہلے کے ان بیانات کے بھی منافی تھیں جس میں انہوں نے غیر مبہم الفاظ میں اعلانات کئے تھے کہ پاکستان ایک جمہوری وفاقی مملکت ہوگی اور اس کے سارے وفاقی یونٹوں کو مکمل خودمختاری حاصل ہوگی لیکن اب وہ ان عناصر پر صوبہ پرستی اور وطن دشمنی کے الزامات عائد کر رہے تھے جو اپنے صوبہ کے لئے سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی حقوق کا مطالبہ کرتے تھے۔ ان کا مزید الزام یہ تھا کہ ہندوستان کے توسیع پسند عناصر پاکستان میں صوبہ پرستی کی حوصلہ افزائی کر کے اس نوزائیدہ مملکت کو تباہ و برباد کرنے کے درپے ہیں۔ مگر انہوں نے اپنی ان تقریروں میں یہ نہیں بتایا تھا کہ ہندوستان میں قومی زبان کا تنازعہ کس نے پیدا کیا تھا اور وہاں صوبہ پرستی کی کون حوصلہ افزائی کر رہا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں ہی ملکوں میں لسانی تنازعہ اور صوبائی خودمختاری کے مطالبہ کی بنیاد عوام الناس کی جائز خواہشات پر مبنی تھی۔ ہندوستانی ارباب اقتدار اس تحریک کو قومی اتحاد اور انڈین نیشنلزم کے نعروں کے ذریعے دبانے کی کوشش کر رہے تھے جبکہ پاکستان میں ارباب اقتدار اسے اسلام، مسلم قومیت اور ہندوستان سے قومی تضاد کے بوجھ تلے دبانا چاہتے تھے۔ ہندوستان میں قومی زبان اور صوبائی حقوق کا مسئلہ آزادی کے فوراً ہی بعد اس لئے پیدا ہو گیا تھا کہ وہاں آئین سازی کی رفتار بہت تیز تھی۔ اس لئے جن علاقوں میں ہندی زبان نہیں بولی جاتی تھی وہ آئین سازی کا کام مکمل ہونے سے پہلے ہی اپنے حقوق منوانا چاہتے تھے۔ پاکستان میں قومی زبان کا مسئلہ اردو زبان کے کوتاہ اندیش علمبرداروں نے غیر ضروری طور پر ایسے وقت میں کھڑا کر دیا تھا جبکہ مشرقی بنگال کے لوگ بے پناہ معاشی مشکلات میں مبتلا تھے۔ جہاں آئین سازی کی کوئی ابتدا نہیں ہوئی تھی اور دور دور تک اس کا کوئی امکان بھی نظر نہیں آتا تھا۔

بلاشبہ ہندوستان میں سردار پٹیل اور ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی جیسے توسیع پسند عناصر موجود تھے جو پاکستان اور بالخصوص مشرقی پاکستان کو دوبارہ ہندوستان کے ساتھ ملحق کرنے کی کھلم کھلا باتیں کرتے تھے اور کلکتہ، دہلی اور بعض دوسرے علاقوں کے اخبارات میں بھی اس قسم کا پروپیگنڈا ہوتا تھا اور بظاہر ان سب کو یہ امید تھی کہ نوزائیدہ پاکستان لسانی تنازعہ اور صوبائی حقوق کی تحریک کا

متحمل نہیں ہو سکے گا اور اس طرح ان کے پاکستان دشمن نصب العین کی تکمیل ہو جائے گی۔ بایں ہمہ یہ کہنا صحیح نہیں تھا کہ لسانی تنازعہ اور صوبائی حقوق کی تحریک صرف ان کی یا پاکستان میں ان کے مٹھی بھر ایجنٹوں کی پیداوار تھی اور اس کی کوئی عوامی بنیاد نہیں تھی۔ پاکستانی ارباب اقتدار اس سلسلے میں اپنی کوتاہ اندیشانہ پالیسی کی وجہ سے ہندوستانی توسیع پسندوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے۔ وہ مشرقی بنگال میں قومی زبان کا غیر ضروری مسئلہ کھڑا کر کے، وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین کی نااہل و بددیانت حکومت کی پشت پناہی کر کے، پنجابی سول و فوجی بیوروکریسی کی آمریت مسلط کر کے اور تعلیم یافتہ بنگالی نوجوانوں پر سرکاری ملازمتوں اور دوسرے ذرائع روزگار کے دروازے بند کر کے از خود قومی نفاق کا بیج بو رہے تھے اور ہندوستانی توسیع پسند اس کے امکانات سے پوری طرح باخبر تھے۔

پاکستان میں قومی اتحاد محض صوبہ پرستی کی مذمت کر کے، مذہبی نعرے لگا کر اور ہندوستانی توسیع پسندوں کے ناپاک عزائم کی نشاندہی کر کے زیادہ دیر تک برقرار نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ اس مقصد کے لئے ضروری تھا کہ ملک میں موعودہ وفاقی نظام کے تحت ملک کے تمام یونٹوں کو، اور بالخصوص دور افتادہ مشرقی پاکستان کو خلوص نیت کے ساتھ ان کے مطلوبہ سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی حقوق دیئے جاتے، چونکہ ایسا نہیں کیا گیا تھا اس لئے مشرقی بنگال میں لسانی تحریک ناگزیر طور پر زندہ رہی۔ چودھری محمد علی کے بیان کے مطابق ''قائداعظم کی عظمت کے دبدبے سے کچھ عرصے کے لئے یہ تحریک دب گئی لیکن مسئلہ پھر بھی زندہ رہا۔ چند سال بعد اس نے خطرناک صورت اختیار کر لی اور بالآخر یہ تنازعہ اس وقت طے ہوا جب 1956ء کے آئین میں اردو اور بنگلہ دونوں کو پاکستان کی قومی زبانیں تسلیم کر لیا گیا۔''[31] اور اس طرح اعلانیہ طور پر یہ تسلیم کیا گیا کہ کراچی اور پنجاب کے حکمران طبقوں کے سیاسی اعمال نامے میں بصیرت و تدبیر کا خانہ خالی تھا۔ جو کام انہیں قیام پاکستان کے فوراً ہی بعد کرنا چاہیے تھا وہ انہوں نے کئی سال کی خرابیٔ بسیار کے بعد کیا۔

قائداعظم کے دورۂ مشرقی بنگال کے عارضی اثرات

کراچی اور پنجاب کے حکمران طبقوں اور ان کے بنگالی پٹھوؤں کی سیاسی بے بصیرتی کی انتہا یہ تھی کہ 29/مارچ کو جب قائداعظم جناح مشرقی بنگال کے دورے سے واپس کراچی

پہنچے تو انہیں یقین ہو چکا تھا کہ اب مشرقی بنگال میں کوئی شخص اردو زبان کی مخالفت کی جرأت نہیں کرے گا۔ اسی یقین کی بنیاد پر پنجاب یونیورسٹی کی سہ روزہ اردو کانفرنس میں ''اردو پڑھو، اردو لکھو اور اردو بولو'' کی مہم چلانے کا فیصلہ کیا گیا تھا اور اسی یقین کی وجہ سے 31/مارچ کو ڈھاکہ یونیورسٹی کے فضل الحق مسلم ہال میں ''مسلم طلبا'' ایک اجتماع میں ایشیا کے عظیم ترین انسان اور پاکستان کے معمار اور محبوب قائداعظم کی قیادت پر مکمل اعتماد کا اظہار کر کے لسانی تنازعہ کے بارے میں ان کے نظریات کی پرزور تائید کی گئی تھی۔ اس سلسلے میں جو قراردادیں منظور کی گئیں ان میں سے ایک قرارداد میں کہا گیا تھا کہ پاکستان کے اتحاد کے لئے اردو زبان کو قومی زبان بنانا مناسب ہوگا۔ اگرچہ اس طرح مشرقی بنگال کے عوام کو کچھ ابتدائی مشکلات درپیش ہوں گی۔ ایک اور قرارداد میں صوبائی حکومت سے یہ طلبا مطالبہ کیا گیا تھا کہ بنگلہ کو مشرقی پاکستان کی سرکاری زبان اور ذریعہ تعلیم بنانے کے بارے میں بلا تاخیر اعلان کیا جائے۔ لاہور کے اخبار پاکستان ٹائمز کی رپورٹ کے مطابق اس اجتماع میں طلبا نے حلف اٹھائے کہ پاکستان کی نوزائیدہ مملکت میں جو انتشار پسند عناصر سرگرم عمل ہیں انہیں بے رحمی کے ساتھ نیست و نابود کر دیا جائے گا۔ جلسہ کے بعد طلبا نے ایک جلوس نکالا جس میں یہ نعرے لگائے گئے کہ اردو زبان کو پاکستان کی قومی زبان قرار دیا جائے اور بنگلہ کو مشرقی پاکستان کی سرکاری زبان بنایا جائے۔ ان مظاہرین کا دعویٰ یہ تھا کہ یونیورسٹی کے دوسرے طلبا کو بھی قائداعظم کے نظریات کے وزنی ہونے کا رفتہ رفتہ احساس ہو رہا ہے اور ان میں بھی ان نظریات کی حمایت بڑھ رہی ہے۔[32]

اسی دن وزیراعلیٰ خواجہ ناظم الدین طلبا کی مجلس عمل کے ساتھ کئے گئے 15/مارچ کے معاہدے سے منحرف ہو گیا جبکہ اس نے مشرقی بنگال اسمبلی کے بجٹ سیشن کے خاتمہ سے پہلے اس مضمون کی موعودہ قرارداد منظور نہ کروائی کہ بنگالی زبان کو بھی پاکستان کی قومی زبان بنایا جائے۔ تاہم اس نے حزب اختلاف کے قائد دھرندر ناتھ دتہ کے اس مطالبہ کو صحیح اور جائز قرار دیا کہ ڈھاکہ گزٹ کی اشاعت بنگالی زبان میں ہونی چاہیے۔ اس نے اس امر پر مسرت کا اظہار کیا کہ حزب اختلاف نے مشکلات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی اور کہا کہ جب بنگالی زبان انگریزی زبان کی جگہ لے گی تو ڈھاکہ گزٹ کی اشاعت بھی بنگالی میں کی جائے گی۔ اس کے دو دن بعد یعنی 2/اپریل 1948ء کو صوبائی مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کا اجلاس ہوا تو متفقہ طور پر یہ فیصلہ

ہوا کہ بنگالی زبان کو مشرقی بنگال کی سرکاری زبان بنایا جائے گا البتہ پاکستان کی قومی زبان کے بارے میں مرکزی حکومت سے کوئی سفارش نہیں کی جائے گی۔ 15 رمارچ کے معاہدے کے بعد ایک مسلم لیگی رکن اسمبلی عبدالحمید نے بنگلہ کو پاکستان کی قومی زبان بنانے اور اسے اردو زبان کے برابر درجہ دینے کی سفارش پر مشتمل قرارداد پیش کرنے کا نوٹس دیا تھا مگر اس پارٹی میٹنگ کے بعد جب اسمبلی کا اجلاس ہوا تو عبدالحمید نے اعلان کر دیا کہ وہ اپنی قرارداد پیش نہیں کرے گا"[33] اور اس طرح لسانی تنازعہ وقتی طور پر قائداعظم کی اتھارٹی کے بوجھ تلے دب گیا۔

3 اپریل کو مارننگ نیوز میں سلہٹ کے ایک اسلام پسند مراسلہ نگار نے تمدن مجلس کے اس میمورنڈم کی تردید کی کہ مشرقی بنگال کے سو فیصد عوام یہ چاہتے ہیں کہ بنگلہ کو نہ صرف مشرقی پاکستان کی سرکاری زبان بنایا جائے بلکہ اسے پاکستان کے مرکز کی سرکاری زبانوں کی فہرست میں بھی شامل کیا جائے۔ اس مراسلہ نگار کا دعویٰ یہ تھا کہ "مجلس تمدن کا یہ دعویٰ نہایت شرمناک اور قابل نفرت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ضلع سلہٹ کے عوام اردو زبان کو نہ صرف پاکستان کی واحد قومی زبان بنانا چاہتے ہیں بلکہ ان کی خواہش ہے کہ اسی زبان کو مشرقی بنگال کی بھی سرکاری زبان بنایا جائے۔ کومیلا، نواکھلی، تپرہ اور چٹاگانگ کے مسلمانوں کی بھی یہی رائے ہے۔ مجلس تمدن کو کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ جھوٹے اور شرانگیز پروپیگنڈے کے ذریعے رائے عامہ کو گمراہ کرے۔"[34]

5 اپریل کو مشرقی بنگال مسلم لیگ کے صدر مولانا محمد اکرم نے پاکستان کی قومی زبان کے بارے میں قائداعظم کے نظریات کی تائید کی اور اس سلسلے میں صوبائی لیگ اسمبلی پارٹی کے 2 اپریل کے فیصلہ پر اطمینان کا اظہار کیا۔ اس نے کہا کہ بلاشبہ بنگالی زبان مشرقی بنگال کے عوام الناس کی مادری زبان ہے اور اسے صوبہ کی سرکاری زبان اور ذریعہ تعلیم بنانا چاہیے لیکن اردو زبان مسلم ثقافت اور اسلامی روایات کی علامت ہے اس لئے اسے ہماری قومی زبان کا درجہ حاصل ہونا چاہیے اور اس کے اس دعویٰ پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے کہ اسے ملک کے مختلف یونٹوں کے درمیان مواصلاتی زبان کی حیثیت حاصل ہے۔" مولانا اکرم ان دنوں ڈھاکہ میں ایک بلڈنگ کی تعمیر کروا رہا تھا جہاں سے وہ اپنا ایک بنگالی روزنامہ "آزاد" شائع کرنا چاہتا تھا۔[35]

بایں ہمہ کلکتہ میں روزنامہ ڈان کے نامہ نگار کا خیال کراچی اور پنجاب کے حکمران طبقوں اور ان کے اسلام پسند بنگالی پٹھوؤں کے خیال سے مختلف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ قائداعظم

کے دورۂ بنگال کے باوجود پاکستان کا لسانی تنازعہ ختم نہیں ہوا اور یہ کسی وقت بھی متحدہ بنگال کی تحریک کی شکل اختیار کرسکتا ہے۔ نامہ نگار نے اپنے اس خیال کی تائید میں مغربی بنگال کے گورنر راج گوپال اچاریہ کی دو تقریروں کا حوالہ دیا جو اس نے انہی دنوں داؤدی بوہرہ مرچنٹس ایسوسی ایشن اور علی گڑھ اولڈ بوائز کی انجمن کے اجتماعات میں کی تھیں۔ بوہروں کے اجتماع میں راج گوپال اچاریہ نے کہا تھا کہ ''بنگال کی تقسیم محض انتظامی لحاظ سے ہوئی ہے۔ بنگالی عوام کی فطرتیں، رسومات، آدابِ زیست اور مطالعاتی دلچسپیوں کی تقسیم نہیں ہوئی اور یہ سب چیزیں بنگال کے دونوں حصوں کو یکجا ہونے پر مائل کرتی ہیں'' اور علی گڑھ اولڈ بوائز کے جلسے میں اس نے حاضرین کو تلقین کی تھی کہ وہ ''ازسرنو ملاپ کی تحریک کی رہنمائی کریں لیکن یہ کام دونوں ملکوں کی حکومتوں کے تنازعہ میں الجھے بغیر خاموشی سے اور پس پردہ ہونا چاہیے۔'' ڈان کے نامہ نگار کی مزید رپورٹ یہ تھی کہ ''گورنر مغربی بنگال کی ان تقریروں کے بعد صوبائی کانگرس کمیٹی نے ایک الگ تنظیم کی تشکیل کی ہے جس کے زیراہتمام کارکنوں کو تربیت دی جارہی ہے جنہیں مشرقی بنگال کے مختلف علاقوں میں ''خیرسگالی مشن'' پر بھیجا جائے گا۔ ان کارکنوں میں تنخواہ دار مسلمان ایجنٹ بھی ہوں گے جو مشرقی بنگال کے عوام کو یقین دلائیں گے کہ اگر دونوں بنگال پھر متحد ہوجائیں تو اس میں مشرقی بنگال کا فائدہ ہوگا۔ اس سلسلے میں مولوی فضل الحق نے یکم اپریل کو مغربی بنگال کے گورنر سے جو ملاقات کی تھی اس کو بہت اہمیت دی جارہی ہے۔ اخباری رپورٹوں کے مطابق فضل الحق کی یہ علاقات طویل اور بہت دوستانہ تھی...... آج کل کلکتہ کے ہندو اخبارات کے پروپیگنڈا کی ایک مثال یہ ہے کہ بنگال کے ہندو اور مسلمان، خواہ وہ مشرق میں رہتے ہوں یا مغرب میں لسانی، ثقافتی اور سیاسی لحاظ سے ایک ہیں...... چار کروڑ عوام پر غیر ملکی زبان (اردو) کو ٹھونسا نہیں جاسکتا...... موجودہ عارضی رکاوٹیں معاشی قوتوں کے دباؤ سے ناپید ہوجائیں گی...... اگر مشرقی بنگال میں شمالی علاقوں کے لوگوں اور بیرونی لوگوں کی روز افزوں مداخلت نہ ہوتی تو وہاں ہندوؤں کی حالت بہت بہتر ہوتی۔''[36]

بلاشبہ ڈان کی یہ رپورٹ صداقت سے سراسر خالی نہیں تھی کیونکہ ان دنوں کلکتہ کے ہندو اخبارات میں واقعی اس قسم کا پروپیگنڈا ہوتا تھا لیکن ہندوستانی توسیع پسندوں کے پاکستان دشمن عزائم کے ساتھ مولوی فضل الحق کے ملوث ہونے کا الزام بظاہر مبنی برصداقت نہیں تھا۔ فضل الحق

کے خلاف اس الزام کا پس منظر یہ تھا کہ وہ مشرقی بنگال میں پہلا بڑا سیاسی لیڈر تھا جس نے فروری 1948ء میں بنگلہ کو قومی زبان بنانے کی حمایت کی تھی، بیرونی عناصر (یعنی پنجابیوں) کے غلبہ کے خلاف احتجاج کیا تھا اور خواجہ ناظم الدین کی حکومت کی نا اہلیت کی مذمت کی تھی۔ قائداعظم جناح نے اپنی 21 رمارچ کی تقریر میں دشمن کے تنخواہ دار مسلمان ایجنٹوں کا جو ذکر کیا تھا اس کا رخ بظاہر مولوی فضل الحق کی ہی طرف تھا۔ فضل الحق ان دنوں کلکتہ میں تھا اور اس نے وہیں سے قائداعظم کی ''مطلق العنانیت'' کی مذمت کرتے ہوئے خواجہ ناظم الدین کی حکومت کو ہدف تنقید بنایا تھا اور قومی زبان کے مسئلہ پر تمدن مجلس کے موقف کی تائید کی تھی۔ قائداعظم جناح اور مولوی فضل الحق کے درمیان یہ چپقلش کوئی نئی نہیں تھی۔ اس کی بر سر عام ابتدا در اصل ستمبر 1941ء میں ہوئی تھی جبکہ فضل الحق، آل انڈیا مسلم لیگ اور بنگال کی مسلم رائے عامہ کے دباؤ کے تحت، وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل سے مستعفی ہونے پر مجبور ہوا تھا۔ اس نے اس وقت مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری نوابزادہ لیاقت علی خان کے نام جو خط لکھا تھا اس میں بھی قائداعظم پر مطلق العنانیت اور آمریت کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ لہٰذا اس پس منظر میں ڈان کی متذکرہ رپورٹ کا مطلب یہ سمجھا گیا تھا کہ اب مولوی فضل الحق کو غدار اور وطن دشمن قرار دے کر مشرقی پاکستان کی سیاست سے نکال دیا جائے گا اور اس طرح خواجہ ناظم الدین کی حکومت کو استحکام نصیب ہو جائے گا۔ خواجہ کے ایک بااثر مسلم لیگی حریف محمد علی بوگرا کو پہلے ہی بطور سفیر برما بھیجا جا چکا تھا۔

بنگلہ کو عربی رسم الخط میں صوبائی سرکاری زبان قرار دینے کا عندیہ اور بنگلہ تحریک کا مطالبہ کہ اسے جوں کا توں دوسری قومی زبان قرار دیا جائے

خواجہ ناظم الدین کی حکومت کے استحکام کے لئے مذہب کا استعمال بھی جاری رہا۔ چنانچہ جب 8 راپریل 1948ء کو صوبائی اسمبلی میں قومی زبان کا مسئلہ پھر زیر بحث آیا تو اسی دن ڈھاکہ سے یہ خبر جاری ہوئی کہ جمعیت العلمائے اسلام کے مدرسہ اشرف العلوم میں منعقدہ ایک حالیہ جلسہ میں یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ بنگالی زبان کو سنسکرت کے الفاظ سے پاک کر کے اس کا نام ''پاک بنگلہ'' رکھا جائے اور اسے حروف القرآن یعنی عربی رسم الخط میں لکھا جائے۔ قرارداد میں کہا گیا تھا کہ مشرقی بنگال کے مسلمان جو زبان بولتے ہیں وہ سٹینڈرڈ بنگلہ سے اتنی ہی مختلف ہے جتنی کہ

اردو ہندی سے مختلف ہے۔ مسلمانوں کی بنگالی زبان میں عربی کے بہت سے الفاظ ہیں جو عرب تاجروں سے روابط کی وجہ سے رائج ہوئے تھے۔ سٹینڈرڈ بنگلہ کی بنیاد بنکم چندرا چیٹر جی اور ودیا ساگر نے رکھی تھی اور انہوں نے ہی اس زبان پر ہندو ثقافت کی مہر لگائی تھی۔ ابتداً بنگالی زبان عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی جیسے کہ مراکو سے لے کر انڈونیشیا تک مسلمانوں کی زبانیں لکھی جاتی ہیں۔ برطانوی راج میں احیائی ہندوؤں نے بنگلہ کو سنسکرت رسم الخط میں لکھنا شروع کیا تھا اور پھر مسلمانوں کو ہندوؤں اور انگریزوں دونوں کے دباؤ کے تحت یہ زبان اسی رسم الخط میں سیکھنا پڑی تھی۔ قرارداد میں حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ فوری طور پر ایک کمیٹی مقرر کرے جو بنگلہ سے سنسکرت کے الفاظ نکال کر اسے پاکستان کی معیاری زبان بنا کر اس کا نام ''پاک بنگلہ'' رکھے۔''[37]

اس قرارداد کا مطلب یہ تھا کہ مشرقی پاکستان میں مروجہ رسم الخط کی بنگالی زبان کو سرکاری زبان قرار نہیں دیا جائے گا بلکہ ایک ایسی نئی زبان صوبہ کی سرکاری زبان ہوگی جس کا رسم الخط عربی ہوگا۔ بالفاظ دیگر حروف القرآن کا نام لے کر اردو زبان بنگالی عوام پر ٹھونسی جائے گی اور وہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو ازسرنو پاکستان کی نئی سٹینڈرڈ زبان نئے رسم الخط میں سیکھنا پڑے گی۔

اگلے دن اخبارات میں جمعیت العلمائے اسلام کی اس قرارداد کے ساتھ ہی خبر شائع ہوئی کہ ''مشرقی بنگال اسمبلی نے وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین کی تحریک پر یہ قرارداد منظور کی ہے کہ بنگالی زبان کو انگریزی کی جگہ صوبہ کی سرکاری زبان ہونا چاہیے اور تعلیمی اداروں میں ذریعہ تعلیم بھی یہی زبان ہونا چاہیے ماسوا ان اداروں کے جہاں کے طلبا کی اکثریت کی مادری زبان بنگالی نہیں ہے۔'' ڈھاکہ کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ پر اس کا کوئی خوشگوار اثر نہ پڑا۔ اس خبر میں بتایا گیا تھا کہ اسمبلی میں حزب اختلاف کے ڈپٹی لیڈر دھرندرا ناتھ دتہ نے خواجہ ناظم الدین کی قرارداد میں ترمیم پیش کرنے کی کوشش کی تھی کہ ''بنگالی کو پاکستان کی قومی زبان بھی بنایا جائے اور اسے مقابلہ کے امتحانات کے لئے ایک مضمون قرار دیا جائے۔'' دتہ کی رائے یہ تھی کہ پاکستان کے دونوں دور افتادہ علاقوں میں اتحاد پیدا کرنا ہے تو پھر ملک میں دو قومی زبانیں ہونی چاہئیں۔ اگر پانچ برس کے اندر بنگالی زبان کو قومی زبان نہ بنایا گیا تو مشرقی پاکستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو مرکزی حکومت میں ملازمتیں نہیں مل سکیں گی۔ مگر سپیکر نے یہ ترمیم پیش کرنے کی اجازت نہیں دی کیونکہ وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین کا موقف یہ تھا کہ صوبائی اسمبلی میں مرکزی امور پر بحث نہیں ہو سکتی۔

خواجہ ناظم الدین کا مزید کہنا یہ تھا کہ ”قائداعظم کے اس اعلان کے بعد کہ قومی زبان کے تنازعہ سے مملکت کا شیرازہ بکھر جائے گا، 15 رمارچ کے معاہدے پر عمل نہیں ہوسکتا۔ اگر حزب اختلاف کے ارکان اس مملکت کے وفادار ہیں تو انہیں سربراہ مملکت کا بھی وفادار ہونا چاہیے۔“[38]

صوبائی اسمبلی کی اس کاروائی سے ڈھاکہ میں قومی زبان کی تحریک کے سرکردہ ارکان بہت برہم ہوئے چنانچہ ان کی مجلس عمل نے ایک قرارداد کے ذریعے اعلان کیا کہ جب تک مشرقی بنگال کا وزیر اعلیٰ 15 رمارچ کے معاہدے کی پوری طرح تعمیل نہیں کرتا اس وقت تک قومی زبان کی تحریک آئینی ذریعے سے جاری رہے گی۔ وزیر اعلیٰ اس معاہدے کی جس شق سے منحرف ہوا تھا اس کا مضمون یہ تھا کہ صوبائی اسمبلی بذریعہ قرارداد مرکزی حکومت سے سفارش کرے گی کہ بنگالی زبان کو بھی ملک کی قومی زبان قرار دیا جائے۔[39] اس قرارداد کی منظوری کے تقریباً دو ہفتے بعد ایسٹ بنگال کالج اینڈ یونیورسٹی ٹیچرز کانفرنس کا پہلا اجلاس ہوا جس میں حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا گیا کہ بنگالی زبان کو پوسٹ گریجوایٹ کلاسوں میں ذریعہ تعلیم کے طور پر فوراً رائج کیا جائے۔ اس اجلاس کی صدارت ڈھاکہ یونیورسٹی کے پروفیسر قاضی مطاہر حسین نے کی تھی[40] اور اس سے مولوی فضل الحق یا کسی اور سیاسی لیڈر کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

باب:4

بگڑتی ہوئی معاشی صورتحال اور بھاشانی، سہروردی اور کمیونسٹ پارٹی سے حکومت کو خطرہ

تنخواہوں میں کمی، تاخیر سے ادائیگی اور تنزلیوں کے خلاف سرکاری ملازمین کی ہڑتالیں

قائداعظم کے دورۂ مشرقی پاکستان کے بعد بھی قومی زبان کا تنازعہ جاری رہا تو اس کی وجہ صرف یہی نہیں تھی کہ وہاں تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ اپنی روایتی بنگالی ثقافت کا تحفظ کرنا چاہتا تھا بلکہ اس کی بڑی وجہ وہاں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی معاشی مشکلات میں بھی پنہاں تھی۔ قائداعظم کے دورۂ مشرقی پاکستان کے تقریباً ایک ہفتہ بعد ڈھاکہ میں مرکزی حکومت کے اکاؤنٹنٹ جنرل اور انکم ٹیکس کے دفتر کے ملازمین نے ہڑتال کر دی۔ ان کی ایک شکایت تو یہ تھی کہ ان کی تنخواہیں بہت تھوڑی تھیں اور اخراجات زندگی زیادہ تھے اور دوسری شکایت یہ تھی کہ وہ کلکتہ سے جولائی 1947ء میں ڈھاکہ پہنچے تھے لیکن اس کے بہت دیر بعد تک انہیں تقرر نامے نہ دیئے گئے اور ان کی تنخواہوں کی ادائیگی بھی باقاعدگی سے نہ ہوئی اور اب جبکہ تقرر نامے ملنے شروع ہوئے تھے تو ان کے ساتھ بہت سے ملازمین کی تنزلی کے احکامات بھی منسلک کئے جا رہے تھے۔

وزیراعلیٰ خواجہ ناظم الدین نے 8/اپریل کو مرکزی حکومت کے ان ہڑتالی ملازمین سے اپیل کی کہ وہ پاکستان کے مفاد کی خاطر فوراً اپنا اپنا کام شروع کر دیں۔ حکومت پاکستان نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کی شکایات کے بارے میں کوئی قطعی فیصلہ چار ہفتوں کے اندر کر دے گی۔ جب اس کی یہ اپیل بے اثر ثابت ہوئی تو پاکستان کے وزیراعظم لیاقت علی خان نے 12/اپریل

کوکراچی سے ایک بیان میں اس امر پر بڑے دکھ کا اظہار کیا کہ مشرقی بنگال میں مرکزی حکومت کے بعض ملازمین نے ففتھ کالمنسٹوں کا غیر شعوری طور پر آلۂ کار بن کر دو ایک روز سے ہڑتال کر رکھی ہے۔ اس نے کہا کہ ''حکومت پاکستان ان عناصر کی تخریبی سرگرمیوں سے باخبر رہی ہے لیکن اس نے ابھی تک ان کے خلاف اس امید میں کوئی اقدام نہیں کیا کہ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا اور یہ اپنی شرانگیز سرگرمیوں سے باز آ جائیں گے۔ بدقسمتی سے انہوں نے ہماری تحمل کی پالیسی کو ہماری کمزوری سمجھا ہے۔ لیکن اب حکومت یہ محسوس کرتی ہے کہ جو لوگ پاکستان کو مفلوج کرنے کے لئے سرکاری ملازمین میں بے اطمینانی اور بدنظمی پھیلا رہے ہیں انہیں سختی سے متنبہ کیا جائے کہ وہ اپنی مکروہ سرگرمیوں کو ترک کر دیں۔ میں سرکاری ملازمین کی مشکلات و مصائب سے واقف ہوں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ حکومت ان کی مشکلات اور ان کی جائز شکایات کے ازالہ کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرے گی اور اپیل کرتا ہوں کہ تم اپنی حکومت اور ملک کے ساتھ رہو۔ حکومت کم تنخواہ پانے والے ملازمین کی تنخواہوں میں کمی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی بلکہ ان کی امداد کے لئے ایک تنخواہ کمیشن مقرر کیا گیا ہے۔'' لیکن لیاقت علی خان کی یہ تنبیہ بھی رائیگاں گئی۔ اس کے بعد نہ صرف اکاؤنٹنٹ جنرل اور انکم ٹیکس کے دفاتر کے ملازمین کی ہڑتال جاری رہی بلکہ ریلوے ورکرز یونین نے بھی ہڑتال کا نوٹس دے دیا۔

اس صورت حال کے پیش نظر مرکزی حکومت نے وہ وعدہ واپس لے لیا جو اس نے 18 اپریل کو کیا تھا اور جس میں کہا گیا تھا کہ مرکزی سرکاری ملازمین کی شکایت کا فیصلہ چار ہفتے میں کر دیا جائے گا۔ تاہم اس سلسلے میں 23 اپریل کو جو سرکاری بیان جاری کیا گیا اس میں کہا گیا تھا کہ ''اب چار ہفتوں کی موعودہ میعاد 26 اپریل سے شروع ہو گی۔ جو سرکاری ملازمین 26 اپریل تک کام پر واپس آ جائیں گے ان کی حفاظت کی جائے گی۔ اور جو ملازمین کام پر حاضر ہو کر یہ ثابت کر دیں گے کہ ان کی غیر حاضری بہ امر مجبوری تھی تو ان کے بارے میں یہ تصور کیا جائے گا کہ وہ ہڑتال کے عرصے کے دوران باتنخواہ چھٹی پر تھے۔ البتہ جو ملازمین 26 اپریل کے بعد بھی دفتر نہیں آئیں گے انہیں غیر حاضر تصور کیا جائے گا۔ اس سرکاری بیان کے زیر اثر مرکزی سرکاری ملازمین تو 26 اپریل کو ڈیوٹی پر آ گئے لیکن اس کے تین چار دن بعد ڈھاکہ کی صورت حال میں اور طرح کی خرابی پیدا ہو گئی جبکہ ڈھاکہ اور نارائن گنج کے دکانداروں نے مرکزی حکومت

کے عائد کردہ بکری (Sales) ٹیکس کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے ہڑتال کردی تو پھر چند دن بعد نواکھلی کے دکانداروں نے بھی بکری ٹیکس کے خلاف ایک دن کی احتجاجی ہڑتال کی اور میونسپل میدان میں جلسہ کر کے اس ٹیکس کی فوری منسوخی کا مطالبہ کیا۔

مرکزی اور صوبائی وزارتوں اور سفارتوں کی شیرینی بانٹنے کے بعد غلام محمد کا مشرقی بنگال اسمبلی سے بطور رکن مرکزی اسمبلی انتخاب

حکومت پاکستان کی جانب سے ملازمین کو یہ رعایت دینے کی ایک وجہ یہ تھی کہ مرکزی وزیر خزانہ غلام محمد مشرقی پاکستان سے پاکستان دستور ساز اسمبلی کا رکن منتخب ہونا چاہتا تھا۔ وہ اب تک مرکزی اسمبلی کا رکن منتخب ہوئے بغیر ہی وزارت خزانہ کے عہدے پر فائز تھا۔ لیکن مروجہ آئین کے تحت اس عہدے پر قائم رہنے کے لئے لازمی تھا کہ وہ اسمبلی کا رکن بنے۔ چنانچہ امریکہ میں پاکستانی سفیر ایم۔ اے۔ ایچ اصفہانی نے مرکزی اسمبلی کی رکنیت سے مستعفی ہو کر مشرقی بنگال سے ایک نشست خالی کر دی تھی۔ چونکہ پروگرام کے مطابق اس نشست کا ضمنی انتخاب مئی۔ جون میں ہونا تھا اس لئے اس سے پہلے یہ انتظام کرنا ضروری تھا کہ صوبہ کی سیاسی فضا غلام محمد کے لئے غیر موافق نہ ہو اور صوبہ کی مسلم لیگ اسمبلی پارٹی دھڑے بندی کا شکار نہ ہو۔ پارٹی کا سب سے بڑا دھڑے باز رکن محمد علی بوگرا 17 ر اپریل کو بطور سفیر برما جا چکا تھا۔ مرکزی وزیر تعلیم فضل الرحمان نے یکم مئی کو ڈھاکہ یونیورسٹی کی صوبائی اسمبلی کی نشست سے مستعفی ہو کر یہ نشست صوبائی وزیر خزانہ حمید الحق چودھری کے لئے خالی کر دی تھی۔ 8 ر مئی کو کراچی میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ خواجہ شہاب الدین (خواجہ ناظم الدین کے بھائی) کو مرکزی حکومت میں وزیر داخلہ و اطلاعات مقرر کیا گیا ہے۔ 28 ر مئی کو تفضّل علی، ڈاکٹر عبد المطلب مالک اور مفیض الدین احمد کو صوبائی کابینہ میں شامل کر لیا گیا۔ یکم جون کو حمید الحق چودھری یونیورسٹی کی نشست سے صوبائی اسمبلی کا رکن منتخب ہو گیا اور اس طرح جب حالات بالکل سازگار ہو گئے تو غلام محمد مشرقی بنگال اسمبلی کے تہتر مسلم ارکان کے ووٹوں سے مرکزی اسمبلی کا رکن منتخب ہو گیا۔ یہ وہی غلام محمد تھا جس کے بارے میں مشرقی بنگال کے تعلیم یافتہ طبقہ کی رائے یہ تھی کہ یہ پاکستان میں پنجابی مفادات کا سرغنہ ہے اور اس نے گزشتہ آٹھ دس ماہ میں اس صوبہ کو کوئی مالی اختیارات سے محروم کر دیا ہے۔ تاہم وزیر اعلیٰ

خواجہ ناظم الدین نے غلام محمد کے ضمنی انتخاب کا انتظام بڑی فرمانبرداری اور محنت سے کیا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ غلام محمد اسی طرح قائداعظم جناح کا منظور نظر تھا جس طرح کہ چودھری محمد علی اور سر ظفر اللہ خان تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس کے بھائی خواجہ شہاب الدین کا مرکز میں ایک نہایت اہم وزارتی عہدے پر تقرر کیا گیا تھا۔ خواجہ شہاب الدین سیاسی جوڑ توڑ کا ماہر تھا۔ وہ ڈھاکہ میں اپنے بھائی کی وزارت کا اہم ترین غیر سرکاری ستون تھا اور اب غلام محمد کے ضمنی انتخاب کے لئے حالات سازگار کرنے میں بھی اس نے نہایت اہم کردار ادا کیا تھا۔

صوبائی مسلم لیگ میں پھوٹ ...... مولانا اکرم کے رجعت پسند دھڑے اور مولانا بھاشانی کے ترقی پسند دھڑے کے درمیان رکنیت سازی پر تضاد

جن دنوں خواجہ ناظم الدین مرکزی وزیر خزانہ غلام محمد کے ضمنی انتخاب کے لئے حالات سازگار کرنے میں مصروف تھا، ان دنوں اسمبلی کے باہر صوبائی مسلم لیگ کے لیڈروں اور کارکنوں میں ایسی پھوٹ پڑی، جو چار پانچ سال بعد بالآخر مشرقی بنگال میں مسلم لیگ کے خاتمہ کا باعث بنی۔ مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ میں پھوٹ کے آثار دراصل اپریل 1948ء کے اوائل میں نمایاں ہونے شروع ہو گئے تھے جبکہ مولانا محمد اکرم خان نے صوبائی لیگ کے آرگنائزر کی حیثیت سے رکنیت سازی کی مہم شروع کی تھی۔ اس مہم کے دوران مولانا عبدالحمید بھاشانی، عطاالرحمان اور بعض دوسرے مسلم لیگی زعما کو یہ شکایت پیدا ہوئی کہ رکنیت سازی کے فارم صرف انہی عناصر کو دیئے جا رہے ہیں جو خواجہ ناظم الدین کی حکومت کے غیر مشروط طور پر فرمانبردار ہیں۔ عذر یہ پیش کیا گیا تھا کہ چونکہ فارم چھپوانے کے لئے کاغذ کی کمی ہے اس لئے مطلوبہ فارم مہیا کرنے میں مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ لیکن دراصل وجہ یہ تھی کہ مولانا اکرم کا دھڑا ان ترقی پسند عناصر کو لیگ کی تنظیم سے باہر رکھنا چاہتا تھا جو کسی وقت بھی خواجہ ناظم الدین کی حکومت کے لئے پریشانی کا باعث بن سکتے تھے۔ پاکستان مسلم لیگ کا چیف آرگنائزر چودھری خلیق الزماں اس تنازعہ کا تصفیہ کرنے کے لئے اپریل کے دوسرے ہفتے میں مشرقی بنگال گیا مگر اس نے وہاں مولانا اکرم خان کے دھڑے کی پشت پناہی کے لئے جو کچھ کیا اس سے بھاشانی گروپ کی شکایات میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ صوبہ لیگ کے اندر اقتدار کی اس رسہ کشی نے کھلم کھلا سیاسی کشمکش کی صورت اختیار کر

لی۔ بھاشانی گروپ نے اپنے بیانات اور تقریروں میں یہ الزامات عائد کرنے شروع کر دیئے کہ خواجہ ناظم الدین کی حکومت عوام دشمن اور رجعت پسند ہے۔ اس نے صوبہ میں زمینداری نظام کے بلا معاوضہ خاتمہ کے لئے ابھی تک کچھ نہیں کیا۔ ان کے اس الزام کی بنیاد وزیر خزانہ حمید الحق چودھری کے اس مسودۂ قانون پر بھی تھی جو اس نے 19 / اپریل 1948ء کو صوبائی اسمبلی میں پیش کیا تھا۔ اس مسودہ میں ایک شق یہ تھی کہ حکومت جن زمینداروں کی زمین اپنی تحویل میں لے گی انہیں معقول معاوضہ دیا جائے گا۔ جب بعض ارکان اسمبلی نے اس شق پر اعتراض کیا تو وزیر موصوف کا جواب یہ تھا کہ زمینداری نظام کو بلا معاوضہ ختم کرنے کی تجویز قابل عمل نہیں ہے اور اگر اس تجویز پر عمل کیا گیا تو بہت سے سنگین تنازعات پیدا ہو جائیں گے۔ تاہم اس مسئلہ پر شدید مخالفت کے پیش نظر صوبائی اسمبلی کے اپریل کے سیشن میں اس مسودۂ قانون کو منظوری کے لئے پیش نہ کیا گیا۔ اس پر بھاشانی گروپ نے خواجہ ناظم الدین کی حکومت کی رجعت پسندی کے خلاف ایک مہم شروع کر دی۔ انہوں نے اپریل کے اواخر میں تانگیل میں مسلم لیگی کارکنوں کی ایک کانفرنس منعقد کی جس میں صوبہ لیگ کے صدر مولانا اکرم خان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ 20 دن کے اندر صوبہ لیگ کونسل کا اجلاس طلب کرے لیکن جب اکرم خان نے اس مطالبہ کی تکمیل کرنے سے انکار کر دیا تو مولانا بھاشانی نے رنگ پور میں مسلم لیگ نیشنل گارڈز کے ڈسٹرکٹ کمانڈروں کا ایک جلسہ منعقد کیا اور فیصلہ کیا کہ صوبائی لیگ نیشنل گارڈز کی جو تنظیم، 11 / اپریل 1948ء کو چودھری خلیق الزماں کی ڈھاکہ میں موجودگی کے موقع پر ختم کر دی گئی تھی، اسے بحال کیا جائے گا۔

جب اکرم خان گروپ، بھاشانی گروپ کی اس قسم کی سرگرمیوں سے بہت پریشان ہوا تو اس نے یہ الزام تراشی شروع کر دی کہ اشتراکی عناصر مولانا بھاشانی کی زیر قیادت خواجہ ناظم الدین کی حکومت اور مسلم لیگ کو رسوا کرنے کے درپے ہیں۔ مئی 1948ء کے اوائل میں صوبہ مسلم لیگ کے اندر یہ جھگڑا اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین نے 12 / مئی کو ڈھاکہ کے ایک جلسہ عام میں یہ الزام عائد کیا کہ جو لوگ مسلم لیگ کے اندر نام نہاد ترقی پسندانہ اور اشتراکی نعرے لگا رہے ہیں وہ دراصل قومی پلیٹ فارم کو پارہ پارہ کر کے پاکستان کی تعمیر میں رکاوٹ حائل کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے کہا کہ صوبہ میں مسلم لیگ کی حکومت مفاد پرستوں کی

اتحادی نہیں ہے۔ اس نے زمینداری نظام کے بلامعاوضہ خاتمہ کے بارے میں کمیونسٹ ایجی ٹیشن کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''کسی شخص کی جائیداد کو بلامعاوضہ حاصل کرنا غیر اسلامی ہے۔ اس نے اسلامی تاریخ میں سے کئی مثالیں دیکر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ کبھی کسی اسلامی حکومت نے مالی بحران کے تاریک ترین زمانے میں بھی کسی کی جائیداد بلامعاوضہ حاصل نہیں کی تھی۔ [1]

خواجہ ناظم الدین کو یہ ''اسلامی تقریر'' کرنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی تھی کہ مولانا بھاشانی نے اکرم خان کی مخالفت کے باوجود اپنے اس فیصلے کا اعلان کیا تھا کہ 16 رمئی کو نارائن گنج میں صوبہ مسلم لیگ کونسلروں کا ایک کنونشن منعقد ہوگا اور خواجہ کو یہ خدشہ تھا کہ اس کنونشن میں صوبہ لیگ کی قیادت کے علاوہ اس کی حکومت کے خلاف ایک نیا سیاسی محاذ قائم کیا جائے گا۔ اس نے محمد علی بوگرا کو بطور سفیر برما بھجوا کر اور مزید تین ارکان اسمبلی کو وزارتی عہدے دے کر صوبائی اسمبلی میں تو اپنے لئے حالات سازگار کر لئے تھے لیکن اسمبلی کے باہر مسلم لیگیوں کے ایک بڑے حلقے میں اس کی مخالفت روز بروز بڑھ رہی تھی۔ مولانا عبدالحمید بھاشانی کی سیاسی شخصیت بڑی زوردار تھی اور اس کے اس سیاسی زور میں متحدہ بنگال کے سابق وزیر اعلیٰ حسین شہید سہروردی کی حمایت سے بہت اضافہ ہوگیا تھا۔ سہروردی ان دنوں کلکتہ میں تھا لیکن جنوری 1948ء میں گاندھی کے قتل کے بعد وہاں اس کی سیاسی دال گلتی نظر آتی تھی وہ اس لئے پاکستان کی سیاست میں حصہ لینے کے امکانات کا متلاشی تھا۔ مئی 1948ء میں قائداعظم جناح کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی اور سب کو معلوم ہوگیا تھا کہ اب بابائے قوم زیادہ دیر تک بقید حیات نہیں رہیں گے۔

مولانا بھاشانی کا مجوزہ کنونشن حسب اعلان نارائن گنج میں منعقد ہوا تو اس میں تقریباً 200 مسلم لیگی کونسلروں نے شرکت کی۔ اکرم خان کے دھڑے نے اس کنونشن میں گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو فریقین میں تصادم ہوگیا جس میں تقریباً ایک درجن افراد زخمی ہوئے۔ تاہم کنونشن جاری رہا اور اس میں اکرم خان کی مسلم لیگ اور خواجہ ناظم الدین کی حکومت کے خلاف کئی قراردادیں منظور کی گئیں۔ ایک قرارداد میں چودھری خلیق الزماں کی زیر ہدایت اکرم خان کے اس اقدام کی مذمت کی گئی کہ اس نے صوبہ میں مسلم لیگ کی ہر سطح کی تنظیموں کو توڑ کر ان کی جگہ اپنی آرگنائزنگ کمیٹیوں کی تشکیل کر دی ہے جبکہ پاکستان کے دوسرے صوبوں میں لیگ کی پرانی تنظیموں کو بدستور سرگرم عمل رہنے کی اجازت ہے۔ اس قرارداد کے ذریعے مولانا اکرم خان اور

اس کی تنظیمی کمیٹیوں پر عدم اعتماد کا اظہار کیا گیا اور 27 کونسلروں پر مشتمل ایک سب کمیٹی مقرر کر کے چودھری خلیق الزماں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ مشرقی بنگال میں مسلم لیگ کی رکنیت سازی کی معیاد میں توسیع کر کے اس کمیٹی کو 75 لاکھ فارم مہیا کرے۔ ایک اور قرارداد میں مطالبہ کیا گیا کہ صوبہ میں زمینداری نظام کو فی الفور بلا معاوضہ ختم کیا جائے۔[2]

لیگ مرکزی قیادت نے مولانا اکرم کے رجعت پسند دھڑے کی حمایت کی اور بھاشانی وسہروردی کی حب الوطنی پر شک کیا گیا

اس کنونشن کے تقریباً دو ہفتے بعد اس گروپ کے دو رکنی وفد نے، جو انورا خاتون اور عطاالرحمان پر مشتمل تھا، کراچی میں پاکستان مسلم لیگ کے چیف آرگنائزر چودھری خلیق الزمان سے ملاقات کر کے مطالبہ کیا کہ چونکہ لیگ کی رکنیت سازی کے فارم مشرقی بنگال کے بہت سے علاقوں میں نہیں پہنچائے گئے اس لئے وہاں رکنیت سازی کی میعاد میں توسیع کر کے مطلوبہ فارم مہیا کئے جائیں لیکن ایسوسی ایٹڈ پریس کی 30 رمئی کی خبر کے مطابق چودھری خلیق الزماں نے یہ دونوں مطالبات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ خلیق الزمان کے اس انکار کی خبر یکم جون کے روزنامہ ڈان میں چھپی تو اس کے ساتھ ہی اس اخبار کے خصوصی نامہ نگار کی ایک طویل رپورٹ شائع ہوئی جس میں کہا گیا کہ ''مشرقی بنگال میں بعض مایوس عناصر مسلمانوں کی یکجہتی کو توڑنے اور پاکستان کی نوزائیدہ مملکت کی بیخ کنی کرنے کی مکروہ سازشیں کر رہے ہیں۔ یہ عناصر بعض خودغرض مسلم لیگی لیڈروں کی حمایت حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے ہیں اور ان کی پالیسی یہ ہے کہ لیگ کے اندر گھس کر اس کی تنظیم کو توڑ دیا جائے۔ اس سازش کی تحریک متحدہ بنگال کا آخری وزیر اعلیٰ حسین شہید سہروردی کر رہا ہے جو...... اس کے قریبی حلقوں کے بیان کے مطابق...... ابھی تک دونوں بنگالوں کو متحد کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ سہروردی کا خیال ہے کہ اگر وہ مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گیا تو وہ بآسانی دونوں بنگالوں کو متحد کر کے اپنے خوابوں کی سرزمین پر اپنی حکومت قائم کر سکے گا۔ چونکہ وہ ابھی دونوں بنگالوں کے اتحاد کے لئے کھلم کھلا کام نہیں کر سکتا اس لئے وہ ''امن مشن'' کی آڑ میں مشرقی بنگال کے بعض لوگوں سے رابطہ پیدا کر کے ان کی رائے کی آزمائش کر رہا ہے۔ اس نے اس مقصد کے لئے سب سے بڑا رابطہ،

اپنے دو ایلچیوں شمس الحق اور شمس الدین کے ذریعے، مولانا عبدالحمید خان بھاشانی سے پیدا کیا ہے جس نے آج کل مولانا اکرم خان اور اس کی تنظیمی کمیٹیوں کے خلاف ایک مہم شروع کر رکھی ہے۔ مغربی پاکستان میں سہروردی کا رابطہ میاں افتخار الدین کے ساتھ ہے جس کا خیال یہ ہے کہ پاکستان مسلم لیگ کی قیادت میں مشرقی بنگال کے ارکان کی حمایت فیصلہ کن ہوگی۔ قیام پاکستان سے پہلے مولانا بھاشانی کی سیاسی سرگرمیاں صوبہ آسام تک محدود تھیں اور مشرقی بنگال کے عوام پر اب بھی اس کا اثر بہت کم ہے۔ تاہم اس کا خیال ہے کہ اگر اسے سہروردی کی طرف سے مالی امداد ملتی رہی اور اس کے ساتھ ہی اسے غیر ملکی سرمایہ بھی مہیا ہوتا رہا تو وہ متحدہ بنگال کے سابق وزیر اعلیٰ کے پٹھوؤں کی امداد سے مسلم لیگ پر قبضہ کر لے گا بشرطیکہ اسے اس مقصد کے لئے کافی وقت مل جائے۔ آج کل مشرقی بنگال کے ہر ضلع میں غیر ملکی سرمایہ بڑی فیاضی کے ساتھ تقسیم کیا جا رہا ہے اور مسلم لیگ کی تنظیمی کمیٹیوں کے خلاف ایک منظم مہم جاری ہے...... مشرقی بنگال کی صورت حال دھماکہ خیز ہے اور مرکزی قیادت کو اس پر گہری نظر رکھنی چاہیے۔ اس امر کا امکان ہے کہ اگر منحرف عناصر مسلم لیگ پر قبضہ نہ کر سکے تو وہ اپنی متوازی لیگ قائم کر لیں گے۔ چونکہ اس مسئلہ کا مسلم قوم کی زندگی سے تعلق ہے اس لئے امید کی جاتی ہے کہ چودھری خلیق الزماں اس دھماکہ خیز صورت حال سے پوری طرح باخبر ہے۔"[3]

اس رپورٹ سے صاف ظاہر تھا کہ ڈان کے نام نہاد خصوصی نامہ نگار کی رائے میں حسین شہید سہروردی اور مولانا عبدالحمید بھاشانی غدار تھے اور وہ ہندوستانی سرمایہ کے زور سے پاکستان اور مسلم قوم کو تباہ و برباد کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن اس رپورٹ میں ستم ظریفی کی بات یہ تھی کہ جب ڈان میں یہ رپورٹ چھپی تھی ان دنوں ہندوستانی ارباب اقتدار کلکتہ میں حسین شہید سہروردی کے لئے زندگی اجیرن کر رہے تھے۔ وہ اس کے خلاف نہ صرف انکم ٹیکس کے مقدمات قائم کر رہے تھے بلکہ مئی کے اواخر میں حکومت مغربی بنگال کے اعلان کے مطابق اسے وہاں کی صوبائی اسمبلی کی نشست سے بھی محروم کر دیا گیا تھا۔[4] مولانا عبدالحمید بھاشانی قیام پاکستان سے قبل آسام مسلم لیگ کا صدر تھا اور سب کو معلوم تھا کہ جولائی 1947ء میں سلہٹ کے استصواب میں پاکستان کی کامیابی کا سہرا اسی کے سر تھا لیکن اب دونوں کے مقابلے میں خواجہ ناظم الدین اور چودھری خلیق الزماں جیسے عناصر محب الوطن تھے۔ خواجہ ناظم الدین 1945ء کے

انتخابات میں شکست کھانے کے بعد سیاسیات سے ریٹائر ہو گیا تھا اور وہ 22/اپریل 1947ء کو اپنے ایک بیان کے مطابق آزاد وخود مختار متحدہ بنگال کی تجویز کا زبردست حامی تھا اور بنگال کی تقسیم کو سارے بنگالیوں کے لئے مہلک تصور کرتا تھا۔[5] تاہم 15/اگست 1947ء کو وہ ایم۔اے۔ اینچ۔اصفہانی اور مولانا عبدالحمید بھاشانی کی حمایت کی بنا پر حسین شہید سہروردی کے مقابلے میں مشرقی بنگال اسمبلی کا قائد منتخب ہو گیا تھا۔ جہاں تک چودھری خلیق الزماں کا تعلق تھا یہ شخص قائداعظم جناح کے مشورے کے مطابق 13/جولائی 1947ء کو ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں لیگ پارٹی کا قائد منتخب ہوا تھا۔ 27/جولائی کو اس نے اس اسمبلی میں ایک تقریر میں حکومت ہندوستان کو اپنی اور اپنی پارٹی کی جانب سے وفاداری کا یقین دلایا تھا۔ 15/اگست 1947ء کو انتقال اقتدار کے موقع پر اس نے پہلے ہندوستانی پرچم کو سلامی دی تھی اور اپنی ایک اور تقریر میں اپنی وفاداری کا یقین دلایا تھا۔ پھر 2/اکتوبر 1947ء کو یہ شخص گاندھی اور ابوالکلام آزاد کی تجویز کے مطابق عارضی طور پر پاکستان آیا تھا اور یہ عذر کر کے مستقل طور پر یہیں رہائش پذیر ہو گیا تھا کہ قائداعظم جناح نے اس کے ایک بیان پر خفگی کا اظہار کیا تھا۔

دراصل ''ڈان'' کے اس سارے غیر ذمہ دارانہ پروپیگنڈے کی بنیاد اس خطرے پر تھی کہ اگر حسین شہید سہروردی نے مغربی بنگال اسمبلی کی رکنیت سے محروم ہونے کے بعد پاکستان میں آکر یہاں کی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا اور اس کا مولانا عبدالحمید بھاشانی اور میاں افتخار الدین سے گٹھ جوڑ ہو گیا تو نہ صرف وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین بلکہ وزیر اعظم لیاقت علی خان بھی کبھی چین کی نیند نہیں سو سکیں گے۔ جب ڈان کے نامہ نگار نے متذکرہ رپورٹ لکھی تھی اس وقت کلکتہ سے یہ خبر آچکی تھی کہ حسین شہید سہروردی 3/جون کو ڈھاکہ جائے گا اور پھر وہاں سے وہ مشرقی بنگال کے مختلف علاقوں کا دورہ کر کے فرقہ وارانہ اتحاد کا پرچار کرے گا۔ اس نے اپنے اس پروگرام کے بارے میں مشرقی بنگال کے وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین کو بذریعہ خط مطلع کر دیا تھا۔ خواجہ اس پروگرام کو دیکھ کر بہت پریشان ہوا تھا اور ڈان کی متذکرہ رپورٹ اس کی اسی پریشانی کی آئینہ دار تھی۔ چونکہ اس وقت تک پاکستان میں ارباب اقتدار کے ہر مخالف پر غداری، وطن دشمنی، کمیونزم اور اسلام دشمنی کے ٹھپے لگانے کا رواج پڑ چکا تھا اس لئے مولوی فضل الحق کے بعد حسین شہید سہروردی اور مولانا بھاشانی بھی ''ملک وقوم کے دشمن'' اور ''غیر ملکی تنخواہ

دار ایجنٹ'' قرار دیے گئے۔

پاکستان مسلم لیگ کے چیف آرگنائزر چودھری خلیق الزماں نے یکم جون 1948ء کو ''ڈان'' کی اس رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے بھاشانی گروپ کو متنبہ کیا کہ اگر انہوں نے مشرقی بنگال میں متوازی لیگ بنانے کی کوشش کی تو ان کے خلاف تادیبی کاروائی کی جائے گی۔ اس نے مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی یک جہتی کے خلاف مکروہ سازش کے الزام کو یہ کہہ کر مبنی بر صداقت قرار دیا کہ ''جب میں وہاں گیا تھا تو میں نے دیکھا تھا کہ کمیونسٹوں کا ایک گروہ نہ صرف صوبائی حکومت کے خلاف بلکہ مسلم لیگ کے خلاف بھی انتشار انگیز سرگرمیوں میں مصروف تھا۔ بدقسمتی سے بہت سے لوگ، جو پاکستان کے خیر خواہ ہیں اور جنہوں نے پاکستان کی شان وشوکت کے لئے بہت قربانیاں دی ہیں، محض انتظامیہ کے خلاف اپنی شکایات کی وجہ سے شر انگیز پروپیگنڈے کا شکار ہو گئے ہیں اور وہ اپنی مخالفت میں حکومت اور ملک کے درمیان کوئی امتیاز نہیں کرتے۔''

سہروردی کی پاکستان آتے ہی نظر بندی اور زبردستی ملک بدری

حسین شہید سہروردی ڈان کے متذکرہ پروپیگنڈے سے متاثر ہوئے بغیر اپنے پروگرام کے مطابق 3/جون 1948ء کو ڈھاکہ پہنچا تو اسے اسی دن ایسٹ بنگال پبلک سیفٹی آرڈیننس (1948ء) کی دفعہ 10 کے تحت نظر بند کر دیا گیا۔ یہ نظر بندی وزیراعلیٰ خواجہ ناظم الدین کے حکم سے عمل میں آئی جو یہی کارنامہ سرانجام دینے کے لئے قبل ازیں کراچی سے ڈھاکہ پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ سہروردی کی نظر بندی کے بارے میں صوبائی حکومت کی طرف سے جو پریس نوٹ جاری کیا گیا اس کا مضمون تقریباً وہی تھا جو کہ ڈان کی یکم جون کی رپورٹ کا تھا۔ پریس نوٹ میں کہا گیا تھا کہ ''سہروردی فرقہ وارانہ اتحاد کو فروغ دینے اور اقلیتوں کے انخلا کو روکنے کے لئے مشرقی بنگال نہیں آیا تھا بلکہ اس کا مقصد کچھ اور ہی ہے۔ اس کا اصلی مقصد یہ ہے کہ اس ریاست کے دشمنوں کے ساتھ خفیہ روابط قائم کئے جائیں اور اس صوبہ کے عوام وسرکاری ملازمین میں بے اطمینانی پھیلائی جائے تا کہ اس ریاست کا خاتمہ ہو، مغربی بنگال کے ساتھ اس کا ازسرنو اتحاد ہو اور مشرقی بنگال کا انڈین یونین کے ساتھ ادغام ہو جائے۔''[6]

تاہم سہروردی کے خلاف اس قدر سنگین الزامات کے باوجود اس پر کوئی مقدمہ نہ چلایا

گیا بلکہ اگلے دن یعنی 4رجون کو اسے ریل گاڑی میں بٹھا کر واپس کلکتہ بھیج دیا گیا۔ وہ اس وقت پاکستان دستور ساز اسمبلی کا رکن تھا لیکن اس کی یہ حیثیت اس کی جلاوطنی کے راستے میں حائل نہ ہوئی۔ سہروردی نے کلکتہ روانہ ہونے سے پہلے اخبار نویسوں سے ملاقات میں مشرقی بنگال کی حکومت کی اس کاروائی کو بالکل بے جواز قرار دیا اور کہا کہ ''میں نے مشرقی بنگال کی داخلی سیاست میں کبھی حصہ نہیں لیا بلکہ جیسا کہ ہر ایک کو معلوم ہے میں نے اپنے دوستوں کو یہ مشورہ دے رکھا ہے کہ خواجہ ناظم الدین کی حکومت سے تعاون کر کے اس کے ماتحت سرکاری عہدے قبول کر لیں۔''[7]

لیکن خواجہ ناظم الدین کی جانب سے اسی دن اس کا وہ جوابی خط شائع کر دیا گیا جو اس نے سہروردی کے ڈھاکہ پہنچنے سے ایک آدھ دن پہلے اسے لکھا تھا۔ اس جوابی خط میں الزام لگایا گیا تھا کہ ''تمہارا مشرقی بنگال کا دورہ بالکل غیر ضروری ہے۔ تمہارے پروگرام سے پتہ چلتا ہے کہ تم پبلک جلسوں سے خطاب کرنے کے علاوہ سیاسی کارکنوں سے بھی ملاقاتیں کرو گے۔ ہمارے پاس تمہاری اسی قسم کی سابقہ میٹنگوں کے بارے میں سرکاری اور غیر سرکاری رپورٹیں ہیں۔ وہ پریشان کن ہیں۔ ہر علاقے سے یہ رپورٹیں آئی ہیں جہاں کہیں بھی تم گئے ہو تم نے اپنی بات چیت میں پاکستان، پاکستان کی حکومت اور پاکستان کے قومی لیڈروں کو برا بھلا کہا ہے۔ ہماری ڈومینین (Dominion) میں انتشار پسند عناصر کی حوصلہ افزائی کی ہے اور ان لوگوں کو تھپکی دی ہے جو دونوں بنگالوں کو متحد کرنے کے حامی ہیں۔ ظاہر ہے کہ پاکستان کی حکومت ایسی صورت حال سے چشم پوشی نہیں کر سکتی۔ مزید برآں جو شخص انڈین ڈومینین کا وفادار ہے اور اس ڈومینین کا باشندہ ہے اسے دوسری ڈومینین کی داخلی سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیے۔''[8]

روزنامہ ڈان نے 5رجون کو اپنے ادارتی کالموں میں سہروردی کے خلاف مشرقی بنگال کی حکومت کی اس کاروائی پر اطمینان کا اظہار کیا اور اس الزام کا اعادہ کیا کہ یہ بن بلایا مہمان دراصل مشرقی بنگال میں ان عناصر کی پس پردہ حوصلہ افزائی کرنا چاہتا تھا جو مشرقی بنگال کو پھر مغربی بنگال کے ساتھ متحد کرنے کے متمنی ہیں۔ تازہ رپورٹوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان عناصر نے حکومت کو زیادہ سے زیادہ مسائل پر رسوا کرنے کی جو تحریک شروع کر رکھی ہے نہ صرف وہ خطرناک حد تک پہنچ گئی ہے بلکہ ان کی خفیہ سرگرمیوں کو تنظیمی شکل بھی دی جا رہی ہے۔ ان کی صوبہ گیر سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی سہروردی سے زیادہ کوئی نہیں کر رہا ہے لیکن ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبا نے سہروردی

کے خلاف اس الزام تراشی کو جھوٹا اور بے بنیاد قرار دیا۔ انہوں نے 6/جون کو یونیورسٹی کے سلیم اللہ ہال میں ایک جلسہ کیا اور سہروردی کے خلاف صوبائی حکومت کی اس کاروائی کی مذمت کی۔ [9]

حسین شہید سہروردی کا جون 1948ء کے اوائل میں مشرقی بنگال کا دورہ محض اسی لئے ''خطرناک'' نہیں تھا کہ اس زمانے میں مسلم لیگ کے اندر کی دھڑے بندی کھل کر منظر عام پر آ گئی تھی اور وہ اس سے سیاسی فائدہ اٹھا سکتا تھا بلکہ اس کا یہ دورہ اس لئے بھی ''خطرناک'' تھا کہ پاکستان دستور ساز اسمبلی کے مئی 1948ء کے سیشن میں جو قانون سازی ہوئی تھی اس سے صوبائی خودمختاری پر مزید ضرب لگی تھی۔ مرکزی وزیر بحالیات راجہ غضنفر علی خان کی طرف سے پیش کردہ قانون یہ تھا کہ اگر ملک کے کسی صوبہ کی معاشی حالت درہم برہم ہو جائے تو حکومت پاکستان کو اس کی اصلاح کے لئے ہنگامی حالات کا اعلان کرنے کا اختیار حاصل ہوگا اور وہ اس مقصد کے لئے مناسب قانون سازی کر سکے گی۔ اگرچہ اس قانون کا رخ صوبہ سندھ کی طرف تھا جہاں کی حکومت مشرقی پنجاب کے مہاجرین کو اپنے ہاں آباد کرنے میں پس و پیش کر رہی تھی لیکن مشرقی پاکستان میں اس سے یہ تاثر لیا گیا کہ اب اندھے کی یہ لاٹھی بلا امتیاز اور بلا جواز پورے پاکستان میں چلے گی اور اس طرح صوبائی خودمختاری کا تصور اور بھی ناپید ہو جائے گا۔ یہ تاثر بے بنیاد نہیں تھا کیونکہ لاہور کی ایک رکن اسمبلی بیگم شاہ نواز نے اسی سیشن میں کھلم کھلا یہ رائے ظاہر کی تھی کہ سارے صوبائی معاملات کو کل پاکستان بنیاد پر نبٹانا چاہیے۔ بالفاظ دیگر وہ وحدانی نظام حکومت کا مطالبہ کرتی تھی اور مشرقی بنگال کے باشعور عناصر کے لئے یہ مطالبہ اس قدر اشتعال انگیز تھا کہ خواجہ ناظم الدین کو بھی بیگم شاہ نواز کے اس موقف کے خلاف احتجاج کرنا پڑا۔ خواجہ کو ڈر تھا کہ ''اگر ایسا ہوا تو صوبائی خودمختاری بری طرح متاثر ہوگی اور یہ بات نہ صرف پاکستان کے ابتدائی تصور کے منافی ہو گی بلکہ یہ مختلف صوبوں کے عوام کے جذبات و احساسات کے بھی خلاف ہوگی'' [10] اور حسین شہید سہروردی کی اس قانون پر نکتہ چینی کا ماحصل یہ تھا کہ ''اب پاکستان کو فیڈریشن آف پاکستان کہنے کی بجائے یونین آف پاکستان کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔'' [11]

اس پس منظر میں اگر سہروردی کو مشرقی بنگال کا دورہ کرنے کا موقع دیا جاتا تو وہ واقعی پورے صوبہ میں مرکزی حکومت کے خلاف سیاسی آگ بھڑکا سکتا تھا۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ اسی زمانے میں مغربی بنگال میں بھی ہندوستان کے مرکزی ارباب اقتدار کے خلاف بغاوت کی

آوازیں اٹھ رہی تھیں۔ 8 رمئی 1948ء کو کلکتہ میں متعدد ادبی انجمنوں کی ایک کانفرنس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ بہار، اڑیسہ اور آسام میں بنگالی بولنے والے علاقوں کو مغربی بنگال میں شامل کیا جائے اور بنگالی زبان کو ہندوستان کے نئے آئین میں ہندی اور انگریزی کے برابر درجہ دیا جائے۔ کانفرنس نے اس سلسلے میں جو قرارداد منظور کی تھی اس میں ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی میں مغربی بنگال کے نمائندوں سے کہا گیا تھا کہ ''وہ اس مقصد کے لئے مسودۂ آئین میں مناسب ترامیم پیش کریں۔''[12] پھر 20 رمئی کو مغربی بنگال کے وزیراعلیٰ ڈاکٹر بی۔سی۔رائے کا یہ بیان شائع ہوا کہ ''حکومت مغربی بنگال نے حکومت ہندوستان سے مطالبہ کیا ہے کہ صوبہ بہار میں واقع بنگالی بولنے والے دواڑھائی اضلاع کو مغربی بنگال میں شامل کیا جائے۔ صوبائی کابینہ کے فیصلے کے مطابق اس مطالبہ پر مشتمل ایک یادداشت کچھ عرصہ ہوا مرکزی حکومت کو بھیجی گئی تھی لیکن ابھی تک اس کا جواب موصول نہیں ہوا''[13] اور پھر 9 رجون کو سرت چندر بوس نے کلکتہ میں ممتاز ڈاکٹروں، اخبار نویسوں، پروفیسروں اور وکلا کے ایک اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''صوبہ بہار میں جو بنگالی بولنے والے علاقے ہیں انہیں معاشی اور ثقافتی وجوہ کی بنا پر لازماً مغربی بنگال میں شامل ہونا چاہیے۔'' اس نے مغربی بنگال کے بارے میں کانگرس ہائی کمان اور حکومت ہندوستان پر نکتہ چینی کی اور مغربی بنگال کے ہر شہری کو تلقین کی کہ وہ اس معاملے کو پوری سنجیدگی کے ساتھ اٹھائے۔ اس معاملے میں تاخیر برداشت نہیں کی جاسکتی کیونکہ اگر تاخیر ہوئی تو اس سے صوبہ بہار کو فائدہ پہنچے گا جو پہلے ہی بنگالی بولنے والے علاقوں کو ہندی بولنے والے علاقے بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ سرت چندر بوس نے کہا کہ ''وزیراعظم جواہر لال نہرو نے صوبہ پرستی کو چھوڑنے کا مشورہ دیا ہے۔ حالانکہ مغربی بنگال کا صوبہ ہی ایک ایسا صوبہ ہے جس میں صوبہ پرستی کے جذبات نے کبھی فروغ حاصل نہیں کیا لیکن اس کے باوجود جب کبھی بنگال نے اپنے کسی معاملے کا کل ہند بنیاد پر فیصلہ کرنے کا مطالبہ کیا ہے تو اس پر فوراً صوبہ پرستی کا ٹھپہ لگا دیا گیا ہے۔''[14] مغربی بنگال میں بنگالی نیشنلزم کے ان مطالبوں کے پیش نظر وزیراعلیٰ خواجہ ناظم الدین متحدہ بنگال کے سابق وزیراعظم اور اپریل، مئی 1947ء میں آزاد و خودمختار متحدہ بنگال کی تحریک کے علمبردار حسین شہید سہروردی کو مشرقی بنگال کا دورہ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔

خوراک کی قلت، مہنگائی اور ریڈیو پاکستان کی اردونوازی پر عوام کی بے چینی اور حکمرانوں کو سہروردی سے خطرہ

لیکن سہروردی کی ملک بدری سے وزیراعلیٰ خواجہ ناظم الدین کی سیاسی مشکل حل نہ ہوئی کیونکہ بھاشانی گروپ نے صوبائی حکومت اور صوبائی مسلم لیگ کے خلاف اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ حالانکہ صوبہ اور مرکز کے مسلم لیگی قائدین مسلسل یہ الزام لگاتے رہے کہ اشتراکی عناصر مسلم لیگ میں پھوٹ ڈلوانے کی کوشش کررہے ہیں۔ 14 رجون کو بھاشانی گروپ کو اپنی اس مہم میں خاصی تقویت ملی جبکہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبا کے ایک گروہ نے ایسٹ پاکستان سٹوڈنٹس لیگ سے الگ ہو کر اپنی ایک ایسٹ پاکستان سٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کرلی۔ اس فیڈریشن کے صدر، نائب صدر اور جنرل سیکرٹری علی الترتیب اخلاق الرحمن، منیر چودھری اور سعد اللہ تھے۔ طلبا کی اس نئی تنظیم کے قیام کی سیاسی اہمیت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ 9 رجون کو پاکستان ایجوکیشن ایڈوائزری بورڈ کی اس سفارش سے کہ اسکولوں کے پوسٹ پرائمری مرحلہ میں اردو زبان کو لازمی مضمون قرار دیا جائے، مشرقی بنگال میں قومی زبان کے تنازعہ نے پھر زور پکڑنا شروع کردیا تھا۔ ڈھاکہ میں مکانات کی شدید قلت تھی، پورے صوبہ میں ریلوے ملازمین ہڑتال کی دھمکی دے رہے تھے، چاول کے نرخ میں ایک ماہ کے اندر سات روپے فی من کا اضافہ ہوگیا تھا اور پاکستان دستور ساز اسمبلی کے تین ہندو ارکان نے پروفیسر راجکمار چکرورتی کی زیرقیادت کراچی میں وزیر خوراک پیرزادہ عبدالستار سے ملاقات کرکے اس کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی تھی کہ مشرقی بنگال میں چاول کی قیمتوں میں اضافہ ہونے کے باعث وہاں قحط کی حالت پیدا ہوگئی ہے۔[15]

طلبا کی اس تنظیم کے قیام کے تقریباً دو ہفتے بعد 30 رجون 1948ء کو کمیونسٹ پارٹی نے ڈھاکہ کے کارونیشن پارک میں اپنا جلسہ عام منعقد کیا۔ مگر جب اس جلسہ میں بعض مقررین نے خواجہ ناظم الدین کی وزارت پر نکتہ چینی کی تو وزارت کے بعض حامیوں نے ہنگامہ کردیا جس کے نتیجے میں متعدد افراد زخمی ہوئے اور جلسہ کے بعد بھی پارٹی کے حامیوں پر اکادکا حملے ہوئے[16] لیکن اس واقعے سے خواجہ ناظم الدین کی وزارت کی عوامی مخالفت میں کمی ہونے کی بجائے کچھ اضافہ ہی ہوا۔ اس کا ثبوت یکم جولائی کو فینی سے صوبائی وزیر خزانہ حمید الحق چودھری کے جلسہ عام

میں ملا۔ جبکہ متعدد مقامی لیڈروں نے اناج، کپڑے اور دوسری ضروریات زندگی کی کمیابی اور مہنگائی پر تبصرہ کرتے ہوئے صوبائی حکومت کی پالیسی پر شدید نکتہ چینی کی۔ [17] چونکہ اس نوعیت کی نکتہ چینی پورے صوبہ میں ہو رہی تھی اور بھاشانی گروپ اس سے سیاسی فائدہ اٹھا رہا تھا اور 25 رجون کو کلکتہ کے اخبار مارننگ نیوز میں یہ خبر چھپ چکی تھی کہ حسین شہید سہروردی نے پاکستان کی شہریت اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اور اس نے اس سلسلے میں ابتدائی اقدام کے طور پر اپنے لئے ڈھاکہ میں ایک مکان بھی خرید لیا ہے۔ اس لئے خواجہ ناظم الدین کی حکومت نے 2 رجولائی کو اس روز افزوں نکتہ چینی کا توڑ کرنے کے لئے چاول اور دھان کے پرچون نرخ مقرر کر دیئے۔ چاول کا سرکاری نرخ 9 آنے فی سیر اور دھان کا نرخ پانچ آنے فی سیر تھا لیکن بازار میں اس کا اثر یہ ہوا کہ چور بازاری عام ہو گئی اور صارفین کو چاول خریدنے میں اور بھی دشواری پیش آنے لگی۔

لیکن ریڈیو پاکستان کے کوتاہ اندیش اور موقع پرست کار پردازان کو مشرقی بنگال کے عوام کی اس مشکل کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ ان کے لئے اہم ترین مسئلہ یہ تھا کہ کس طرح اردو زبان کو بنگالی عوام پر ٹھونسا جائے۔ چنانچہ انہوں نے انہی دنوں ڈھاکہ اسٹیشن سے ایسی جناتی زبان میں خبریں نشر کرنا شروع کر دیں جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ یہ زبان بظاہر تو بنگالی تھی لیکن اس میں فارسی کے اتنے غیر مانوس الفاظ ہوتے تھے کہ اسے نہ تو اردو زبان سے بے بہرہ بنگالی عوام سمجھ سکتے تھے اور نہ ہی یہ خالص اردو زبان کے شیدائی بہاری مہاجرین کی سمجھ میں آتی تھی۔ چنانچہ جب جولائی کے دوسرے ہفتہ میں پاکستان ریڈیو کا کنٹرولر زیڈ۔ اے۔ بخاری ڈھاکہ گیا تو یونیورسٹی کے بنگالی طلبا نے اس سے ملاقات کر کے اس سے سخت غصہ کا اظہار کیا کہ ریڈیو سے بنگالی کو اردو بنایا جا رہا ہے۔ طلبا کا یہ احتجاج اتنا پرزور تھا کہ اس ناقابل فہم زبان میں خبروں کی نشریات فوراً بند کر دی گئیں۔ [18] تاہم روزنامہ ''ڈان'' کے نامہ نگار کی اطلاع کے مطابق ریڈیو کے کار پردازوں کی اردو نوازی میں اس قدر مستعدی کی وجہ سے ''مشرقی بنگال میں زبان کے مسئلہ پر ازسرنو ایجی ٹیشن شروع ہونے کا امکان پیدا ہو گیا تھا...... اس سلسلے میں بنگالی بولنے والے لوگوں کا غصہ اتنا زیادہ تھا کہ انہوں نے مرکزی وزیر تعلیم فضل الرحمان، جو ان دنوں ڈھاکہ میں تھا، کی توجہ اس معاملے کی طرف مبذول کرائی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ڈھاکہ ریڈیو سے خبریں خالص اردو زبان میں اردو بولنے والے ان لوگوں کے فائدے کے لئے نشر کی جاتی ہیں جن کی مشرقی بنگال میں

تعداد بہت ہی کم ہے۔ بنگالی عوام کی سمجھ میں یہ زبان نہیں آتی۔ ان کے لئے بنگالی زبان میں خبریں نشر ہونی چاہئیں۔[19]

ڈان کے نامہ نگار کی اس معاملے میں برہمی کی ایک وجہ یہ تھی کہ حسین شہید سہروردی دہلی میں ہندوستان کے وزیراعظم جواہر لال نہرو سے ملاقات کرنے کے بعد جولائی 1948ء کے اوائل میں کراچی پہنچ چکا تھا اور اس کے اس شہر میں کئی دن تک قیام کی وجہ سے مارننگ نیوز کی 25/جون کی یہ خبر صحیح معلوم ہونے لگی تھی کہ یہ پاکستان کی شہریت اختیار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کی گئی تھی کہ حکومت ہندوستان نے اس پر 18 لاکھ روپے انکم ٹیکس عائد کر دیا تھا اور وزیراعظم نہرو نے اس کی اس سلسلے میں کوئی امداد کرنے سے معذوری ظاہر کر دی تھی۔[20] بظاہر حکومت ہندوستان کی جانب سے سہروردی کے خلاف اس اقدام کی اور وزیراعظم نہرو کی اس سلسلے میں مداخلت نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس کی کلکتہ میں موجودگی سے مغربی بنگال میں صوبائی عصبیت کی حوصلہ افزائی ہوئی تھی۔

سہروردی نے اپریل 1947ء میں قائداعظم جناح کی منظوری حاصل کرنے کے بعد سرت چندر بوس کے ساتھ مل کر آزاد اور خودمختار متحدہ بنگال کی تحریک چلائی تھی جسے گاندھی نے سبوتاژ کر دیا تھا لیکن جنوری 1948ء میں گاندھی کے قتل کے بعد اس تحریک کے ازسرنو شروع ہونے کے امکانات پیدا ہو گئے تھے۔ سہروردی کے سرت چندر بوس کے ساتھ دوستانہ تعلقات تھے اور مؤخرالذکر نے بنگالی نیشنلزم کو فروغ دینے کی پھر مہم شروع کر دی تھی۔ اس کی اس مہم کے نتیجہ میں مغربی بنگال میں ہندوستان کی مرکزی حکومت کے خلاف جذبات اور زیادہ شدید ہو رہے تھے اور بنگالیوں اور بہاریوں کے درمیان تضاد نے اس قدر شدت اختیار کر لی تھی کہ جون کے تیسرے ہفتے میں بہار اسمبلی کے ایک رکن نے یہ الزام عائد کیا تھا کہ اس صوبہ کی حکومت میں کام کرنے والے سارے بنگالی ملازمین ففتھ کالمنسٹ ہیں اور وہ مغربی بنگال کے بعض لوگوں کو سرکاری رازوں سے مطلع کرتے ہیں۔ دوسری طرف کلکتہ کے بنگالی اخبارات کا الزام یہ تھا کہ حکومت بہار نے 50 ہزار سنتھالیوں پر مشتمل ہٹلر کی طوفانی فوج کی طرح ایک فوج تیار کی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جب بھی کانگرس ان دونوں صوبوں کی ازسرنو حد بندی کے لئے استصواب کرائے گی تو یہ فوج بنگالیوں کو صوبہ بہار کے حق میں سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کرے گی۔[21]

جواہر لال نہرو کی طرح لیاقت علی خان کو سہروردی سے صرف یہی خطرہ نہیں تھا کہ وہ مشرقی بنگال میں بنگالی نیشنلزم کو ہوا دے گا بلکہ اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ وہ زود یا بدیر خود اس کا تختہ الٹ دے گا۔ ڈان کی سہروردی کے خلاف زہر افشانی کی وجہ اس خطرے میں مضمر تھی۔ ڈان نے اپنے 11/ جولائی کے اداریے میں حسین شہید سہروردی کو ففتھ کالمنسٹ قرار دے کر حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا کہ اس شخص کو صوبہ سرحد کے غداروں کی طرح لمبی ڈھیل نہ دی جائے بلکہ اس کے خلاف فی الفور سخت اقدام کیا جائے۔ ڈان کے بیان کے مطابق ''سہروردی کی غداری کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نے اپنی 9/ جولائی کی پریس کانفرنس میں سربراہ مملکت قائداعظم محمد علی جناح کے خلاف بے بنیاد الزام تراشی کی تھی۔ سہروردی کا اس پریس کانفرنس میں بیان یہ تھا کہ ''میں نے متعدد ضروری دعوتوں کے باوجود مشرقی پاکستان جانے سے انکار کر دیا تھا جب تک کہ قائداعظم نے ناظم الدین کو گدی پر مضبوطی سے مسلط کر دیا تھا اور اپوزیشن کو ختم کر دیا تھا۔'' 22 حسین شہید سہروردی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور زیرک بورژوا لیڈر تھا۔ اس کی ہوس اقتدار اس قدر شدید تھی کہ وہ اسے پورا کرنے کے لئے سب کچھ کرنے پر آمادہ ہو سکتا تھا۔ لہٰذا وہ نہ تو ہندوستان کے جواہر لال نہرو کے لئے قابل برداشت تھا اور نہ ہی پاکستان کے لیاقت علی خان کے لئے۔ ان دنوں 71 سالہ بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح زیارت میں زندگی و موت کی بالکل آخری کشمکش میں مبتلا ہو چکے تھے اور ایسی حالت میں پاکستان میں سہروردی جیسی زوردار شخصیت کی موجودگی نوبزادہ لیاقت علی خان کے لئے سخت خطرے کی حامل تھی۔

پولیس کی ہڑتال ...... جی۔ او۔ سی۔ ایوب خان نے فوجی کارروائی کر کے اسے کچل دیا

ڈان کے متذکرہ اداریے کے تین چار دن بعد 15/ جولائی کو ڈھاکہ سے ایک ایسی خبر آئی جس کے پیش نظر حسین شہید سہروردی کراچی کے ارباب اقتدار کو اور بھی زیادہ خطرناک دکھائی دینے لگا۔ سرکاری بیان کے مطابق خبر یہ تھی ''اس دن ڈھاکہ پولیس کے سینکڑوں سپاہیوں نے تنخواہیں نہ ملنے کے باعث ہڑتال کر دی تھی اور انہوں نے اپنی بندوقوں سمیت شہر کے بازاروں میں جلوس کی صورت میں چکر لگا کر حکومت کے خلاف پرزور نعرے لگائے تھے۔ شام کو یہ پولیس

والے اپنی لائنز میں جمع ہوئے لیکن انہوں نے سنیئر پولیس افسروں کی ترغیب کے باوجود ہتھیار ڈالنے سے انکار کر دیا۔ اس پر فوج نے پہلے انہیں الٹی میٹم دیا اور پھر گولی چلا کر ان پر قابو پالیا۔ اس واقعہ میں پولیس کے دو سپاہی ہلاک اور 9 زخمی ہوئے۔ 109 کو گرفتار کر لیا گیا۔[23]

لیکن مشرقی بنگال میں اس وقت کے جنرل آفیسر کمانڈنگ ایوب خان نے اس واقعہ کی جو تفصیل لکھی ہے وہ اس سرکاری بیان سے مختلف ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ''مجھے صوبے کے اندرونی نظم وضبط کے بارے میں بھی بڑی فکر تھی۔ پولیس والوں کی شکایتوں پر کچھ دھیان نہیں دیا جا رہا تھا اور میں جانتا تھا کہ مرکز میں بڑے پیمانے پر ہنگامے شروع ہو گئے تو ان کی روک تھام کے لئے میرے پاس کافی فوج نہ ہوگی۔ پولیس کی جمعیت میں تقریباً 60 ہزار آدمی تھے۔ اس میں بھانت بھانت کے آدمی شامل تھے۔ بعض مغربی بنگال کی پولیس سروس سے آئے تھے۔ وہ قاعدے قانون کی زیادہ پابندی نہیں کرتے تھے۔ یہی حال سینئر افسروں کا تھا۔ سیاست دانوں نے سول مسلح تنظیم کی ضروریات کے بارے میں فوری طور پر کچھ فیصلہ نہیں کیا تھا اور یہ اس کا نتیجہ تھا کہ صوبے بھر میں سخت بے اطمینانی اور بدنظمی پھیل گئی تھی۔ مواد اندر ہی اندر پک رہا تھا جو آخر 13 رجولائی 1948ء کو ڈھاکہ میں پھوٹ پڑا۔ میں ذاکر حسین کے ساتھ، جو اس وقت انسپکٹر جنرل پولیس تھے، دورے پر تھا۔ ہم میمن سنگھ کے ایک ریسٹ ہاؤس میں مقیم تھے کہ ڈھاکہ سے ٹیلیفون پر مجھے اطلاع ملی کہ پولیس نے گورنمنٹ ہاؤس اور وزیر اعلیٰ کے مکان کو گھیر رکھا ہے۔ کچھ پولیس والے سول سیکرٹریٹ کے سامنے بھی دیکھے گئے انہوں نے پولیس لائینز کے اسلحہ خانے سے اسلحہ اور گولہ بارود حاصل کر لیا تھا اور باقاعدہ مورچے بنا لئے تھے۔ میرے لئے یہ بڑی الجھن کی بات تھی۔ ایک طرف تو مجھے پولیس کے افسر اعلیٰ کو، جس کا میں مہمان تھا، مطمئن کرنا تھا دوسری طرف اس کے باغی سپاہیوں سے نمٹنا تھا۔ میں نے بٹالین کمانڈر سے کہا کہ انہیں تنبیہ کرو اور کسی کو اندھا دھند کاروائی نہ کرنے دو۔ کئی گھنٹے بحث ومباحثہ ہوتا رہا مگر وہ اپنی لائینوں میں واپس جانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اس کے بعد بٹالین کمانڈر نے مجھے بتایا کہ باغی سپاہی مصالحت پر آمادہ نہیں ہیں۔ جب ان سے کوئی اپیل کی جاتی ہے تو وہ فوج کو گالیاں دینے لگتے ہیں چنانچہ ہمارے لئے اب عملی قدم اٹھانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تھا۔ میں نے بٹالین کمانڈر سے کہا کہ کم سے کم فوج کے ساتھ باغیوں کے خلاف فوجی کاروائی کرو۔ پولیس نے جو دفاعی مورچے بنا رکھے تھے وہ شہر کے

بیچوں بیچ تھے اس لئے اس بات کا خطرہ تھا کہ کہیں عوام گولیوں کی زد میں آ کر زخمی نہ ہو جائیں۔ ہمارے پاس حملے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ یہ کام 3/8 پنجاب رجمنٹ کی ایک کمپنی کے سپرد کیا گیا۔ اسے پولیس کے مورچے تک پہنچنے کے لئے کھلے میدان میں کوئی تین سو گز کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ اس نے تیزی سے پیش قدمی کی اور مورچے پر قبضہ کیا۔ ایک یا دو آدمی جن میں اس فساد کا سرغنہ بھی تھا مارے گئے اور دس بارہ آدمی زخمی ہوئے۔ ہنگامہ فرو ہو گیا صورت حال پر قابو پا لیا گیا اور باقی صوبے میں بھی گڑبڑ کا خطرہ نہ رہا۔"[24]

اناج کی قلت اور مہنگائی پر قابو پانے میں حکومت کی ناکامی اور مشرقی بنگال کمیونسٹ پارٹی کی اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش

چونکہ عوام الناس کو ہڑتالی پولیس والوں کے مطالبات سے ہمدردی تھی اس لئے ان پر پنجابی فوج کے ہاتھوں تشدد سے بنگالی قوم پرستی کے جذبہ میں اور بھی شدت پیدا ہو گئی۔ صوبائی حکومت کے لئے یہ صورت حال بڑی خطرناک تھی چنانچہ اس نے بڑی سوچ بچار کے بعد پولیس کی اس بغاوت کی ساری ذمہ داری کمیونسٹ عناصر اور حسین شہید سہروردی پر ڈال دی۔ اس مقصد کے لئے 22 رجولائی کو مشرقی پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی، مشرقی بنگال، ریل روڈ ورکرز یونین اور ڈیمو کریٹک یوتھ لیگ کے دفاتر کی تلاشی لی گئی۔ ایسوسی ایٹڈ پریس کی اطلاع کے مطابق اس تلاشی کے دوران بنگالی ہفت روزہ فریاد کے کچھ شماروں، کچھ کتابوں اور کچھ دستاویزات پر قبضہ کر لیا گیا۔ ہفت روزہ فریاد کے ایڈیٹر فیض الدین حسین کے گھر کی بھی تلاشی لی گئی اور اس سے ان خطوط کے بارے میں استفسار کیا گیا جو حسین شہید سہروردی نے مبینہ طور پر اسے لکھے تھے۔ پولیس نے بعض چھاپہ خانوں اور گھروں میں جا کر اس پمفلٹ کی بھی تلاش کی جو کمیونسٹ پارٹی نے پولیس کی ہڑتال کے بارے میں لکھا تھا۔ اس سلسلے میں کمیونسٹ پارٹی کے کارکنوں اور مبینہ ہمدردین کو گرفتار کر لیا گیا تھا جن میں ایک عورت بھی شامل تھی۔[25] 24 رجولائی کو وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین نے ایک پریس کانفرنس کو بتایا کہ اس وقت بنگال کو دو مسائل درپیش ہیں۔ اول رہائش کا مسئلہ اور دوئم کمیونسٹوں کا مسئلہ۔ اس نے کہا کہ "صوبہ میں کمیونسٹوں نے بہت گڑبڑ پھیلا رکھی ہے اور یہ امر ہمارے لئے خاصے دردسر کا باعث ہے یہ لوگ مشرقی اور مغربی بنگال کے ازسرنو اتحاد کے لئے پس

پردہ کام کر رہے ہیں۔'' اس نے کہا کہ ''حسین شہید سہروردی کو مشرقی بنگال میں آنے کی ممانعت نہیں ہے۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ وہ پاکستان دشمن سرگرمیاں بند کر دے''[26] لیکن اس نے اپنی پریس کانفرنس میں یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ اس کی حکومت کو صوبہ میں اناج کی کمیابی اور مہنگائی کا بھی کوئی مسئلہ درپیش تھا۔

26 رجولائی کو مارننگ نیوز کی اطلاع کے مطابق ان دنوں چاول کا بھاؤ 34 روپے فی من تک پہنچ گیا تھا اور بعض علاقوں میں تو یہ 38 روپے من کے حساب سے فروخت ہو رہا تھا اور 29 رجولائی کو اسی اخبار کی خبر یہ تھی کہ مشرقی بنگال میں چاول اور دھان کے نرخ غریب اور درمیانہ طبقہ کے لوگوں کی قوت خرید سے بہت بڑھ گئے ہیں۔ جیسور میں بہت سے لوگ 24 گھنٹے میں صرف ایک مرتبہ کھانا کھاتے ہیں۔ صوبائی حکومت نے قصباتی منڈیوں میں کنٹرول نرخ پر چاول کی سپلائی بند کر دی ہے اور بعض علاقوں میں بارش کی زیادتی کے باعث اس کی فصل جزوی طور پر تباہ ہو گئی ہے'' لیکن 30 رجولائی کو محکمہ سول سپلائیز کے وزیر نورالامین کا انکشاف یہ تھا کہ ''صوبہ میں اناج کی قیمت اور سٹاک کی پوزیشن بہتر ہو گئی ہے۔'' جب نورالامین کے اس بیان پر عوامی حلقوں میں بہت غم و غصے کا اظہار کیا گیا تو کراچی کے روزنامہ ڈان نے بھی اس کا نوٹس لیا۔ اس کی میمن سنگھ سے رپورٹ میں نورالامین کے اس بیان کی تردید کی گئی اور بتایا گیا کہ اعلیٰ درجہ کا چاول 50 روپے فی من فروخت ہو رہا ہے اور درمیانہ درجہ کے چاول کا بھاؤ 36 روپے من تک ہے۔ رپورٹ میں اس حقیقت کی نشاندہی کی گئی کہ 1943ء کے قحط کے زمانہ میں بھی چاول کا بھاؤ اتنا زیادہ نہیں چڑھا تھا۔ آج کل یہاں آٹا بالکل نایاب ہے اور نواحی دیہات سے بھوکے لوگوں کا شہر کی جانب تانتا لگا ہوا ہے۔''[27]

تاہم 14 راگست کو صوبہ مسلم لیگ کے آرگنائزر مولانا اکرم خان کا ایک نشری تقریر میں عوام الناس کو مشورہ یہ تھا کہ ''موجودہ مشکلات کا ثابت قدمی سے مقابلہ کرو اور ملک کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے کسی قربانی نے دریغ نہ کرو۔'' اس کی یہ تقریر وزیراعظم لیاقت علی خان کے اس اعلان کے مطابق تھی کہ ''ہم اپنے عوام کو بھوکا رکھیں گے لیکن انہیں غلام نہیں بننے دیں گے'' اور روزنامہ ڈان کا اس اعلان پر تبصرہ یہ تھا کہ وزیراعظم کو اپنی اس ''دھمکی'' پر عمل کرنا چاہیے۔ اگر ہمیں اپنی بری، بحری اور ہوائی فوج کی تعداد اور اس کے اسلحہ میں اضافہ کرنے کے

پروگرام کو جلد از جلد جامۂ عمل پہنانے کی خاطر عوام کی کمر مزید کسنے کی ضرورت محسوس ہو تو اسے ایسا کرنا چاہیے۔"[28] مشرقی بنگال کے عوام اس قسم کی جذباتی تقریروں اور اداراتی تحریروں کا مطلب یہ سمجھتے تھے کہ "انہیں کراچی اور پنجاب کے استحصالیوں کے مفاد کی خاطر بھوکا مرنے کی تلقین کی جا رہی ہے۔"

ڈان کے اس اداریے کے چھ سات دن بعد مارننگ نیوز کی خبر یہ تھی کہ جیسور کے ڈسٹرکٹ بورڈ نے متفقہ طور پر ایک قرارداد میں حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ "اس ضلع میں دھان کی فراہمی فوراً شروع کر دی جائے کیونکہ زبردست بارش کے باعث فصلوں کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ غریب کسان بڑی مشکل میں مبتلا ہیں۔ ان میں سے اکثریت کو پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا۔ اور بہت سے بھوکے مر رہے ہیں...... چاول کا نرخ اتنا زیادہ ہو گیا ہے کہ یہ عام آدمی کی دسترس سے باہر ہے۔ مقامی منڈی میں بھاؤ 38 روپے سے لے کر 42 روپے فی من تک ہے۔ ضلع کے مختلف علاقوں سے بھوک سے مرنے والوں کی بہت سی اطلاعات آ رہی ہیں۔"[29] خود ڈان کی 24 راگست کی خبر یہ تھی کہ میمن سنگھ میں بڑی تیزی سے قحط کے حالات پیدا ہو رہے ہیں۔ اناج کی صورتحال بہت ہی خطرناک ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بہت زیادہ قیمت پر بھی ضروریات زندگی مہیا نہیں ہوتیں۔ چاول کا بھاؤ پچاس اکاون روپے فی من ہے۔ امان اور اوس کا نرخ علی الترتیب 48 روپے اور 39 روپے ہے۔ سپلائی پوزیشن بہت ہی خراب ہے اور اگر حکومت نے فوراً امداد مہیا نہ کی تو لوگ بھوکوں مر جائیں گے۔ اوس کی فصل کا تین چوتھائی حصہ بارشوں کی وجہ سے تباہ ہو گیا ہے۔ پٹ سن کی فصل بھی بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ اگلی امان فصل کے اچھا ہونے کی بھی امید نہیں ہے کیونکہ چاول پیدا کرنے والا تین چوتھائی علاقہ ابھی تک زیر آب ہے۔ ضلع میں ملیریا اور ٹائیفائیڈ اور ہیضہ جیسی وبائیں پھیل رہی ہیں اور ادویات نہیں ملتیں۔ لوگوں کا دیہات سے شہروں کی طرف اخراج شروع ہو گیا ہے۔"[30]

مارننگ نیوز اور کلکتہ کے بعض دوسرے اخبارات کی اطلاع کے مطابق اناج کی کمیابی اور مہنگائی کی یہ صورتحال صرف چٹا گانگ، جیسور اور میمن سنگھ تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ دیہی علاقوں اور چھوٹے شہروں کی صورت حال اور بھی ابتر تھی۔ سندر بن کے 90 مربع میل کے علاقے میں قحط پڑا ہوا تھا اور ہر روز بہت سے لوگ بھوکوں مر رہے تھے۔ 26 راگست کو باریسال کے شہر میں

کالجوں اور اسکولوں کے طلبا نے جلوس نکال کر مطالبہ کیا کہ ''عوام کو چاول سستے بھاؤ مہیا کیا جائے اور اس فصل سے اناج کی برآمد بند کی جائے۔'' اسی قسم کے مظاہرے اور جلسے بعض دوسرے شہروں میں بھی ہوئے اور جیسور، کھلنا، دیناج پور، رنگ پور اور بوگرا میں زمینداروں کو بٹائی دینے کے خلاف بے زمین کسانوں کی تحریک بھی شروع ہوگئی۔ صوبائی حکومت کا الزام یہ تھا کہ یہ سب کچھ مشرقی بنگال کی کمیونسٹ پارٹی کروا رہی ہے جس کا تازہ ترین موقف یہ تھا کہ بنگال کی تقسیم برطانوی سامراج کی سازش کا نتیجہ ہے اور مزدوروں، کسانوں، طالب علموں اور دوسرے انقلابی عوام کی مسلح جدوجہد کے ذریعہ مسلم لیگی رجعت پسندوں کے اقتدار کا تختہ الٹ دینا چاہیے۔

صوبائی حکومت کا یہ الزام بے بنیاد نہیں تھا۔ ان دنوں مشرقی بنگال کی کمیونسٹ پارٹی کا پروگرام واقعی یہ تھا کہ صوبہ میں اناج کی قلت و مہنگائی، غریب کسانوں کی زبوں حالی، زمینداروں کے جبر و استبداد، افسر شاہی کی رشوت خوری وتشدد اور ذخیرہ اندوزوں کی ناجائز منافع خوری کے خلاف عوام الناس کے مشتعل جذبات سے فائدہ اٹھا کر مسلح جدوجہد کے ذریعہ طبقاتی انقلاب برپا کیا جائے۔ پارٹی کو یہ لائن کلکتہ میں 21رفروری 1948ء کی ساؤتھ ایسٹ ایشیا یوتھ کانفرنس اور پھر 28رفروری کو کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی دوسری کانگرس میں ملی تھی۔ اس کانگرس میں آسٹریلیا، برما، انڈونیشیا، برطانیہ اور یوگوسلاویہ کے علاوہ بعض دوسرے ممالک کے مندوبین نے بھی شرکت کی تھی۔ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کی اس کانگرس سے چند دن پہلے کراچی میں تقریباً ایک سو کمیونسٹ مندوبین کی سہ روزہ کانفرنس کے بعد پاکستان کمیونسٹ پارٹی کا وجود عمل میں آیا تھا۔ 26رفروری 1948ء کو اس پارٹی کے جنرل سیکرٹری نے ایک بیان میں اپنی تنظیم کا اعلان کیا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ ''پاکستان کو ایک سیکولر ڈیموکریٹک سٹیٹ ہونا چاہیے، اس ملک کا آئین بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر جلد از جلد مرتب ہونا چاہیے اور لسانی بنیاد پر از سر نو تشکیل کردہ وفاقی علاقوں کو حق خود اختیاری ملنا چاہیے۔ ساری کلیدی آسامیاں سرکاری ملکیت میں ہونی چاہئیں اور درآمدی و برآمدی پالیسی اس طرح کی ہونی چاہیے کہ یہ ڈومینین خود کفیل ہو جائے۔ سارے جابرانہ قوانین منسوخ کئے جائیں، مسلم مہاجرین کو زمینوں پر آباد کیا جائے اور انہیں اس وقت تک امداد دی جائے جب تک کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں ہوتے۔''[31]

پاکستان کے تمام محب الوطن ترقی پسند عناصر کی نظر میں پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے اس پروگرام

میں کوئی برائی نہیں تھی بلکہ ان کی حب الوطنی اور ترقی پسندی کا تقاضا اس پروگرام پر عمل کرنے سے پورا ہوتا تھا۔لیکن جب چند دن بعد مشرقی بنگال سے مظفر احمد اور مغربی پاکستان سے ایرک سپرین وغیرہ کلکتہ میں ہندوستان کمیونسٹ پارٹی کی دوسری کانگرس میں شرکت کرنے کے بعد واپس آئے تو پاکستان کے دونوں علاقوں کے کمیونسٹ لیڈروں کی لائن یکا یک بدل گئی۔ان کی نئی لائن کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے نئے جنرل سیکرٹری بی۔ٹی۔رندیو کی لائن تھی اور وہ لائن یہ تھی کہ مزدوروں اور کسانوں کی مسلح جدوجہد کے ذریعے ہندوستان اور پاکستان کی رجعت پسند اور سامراج نواز حکومتوں کا تختہ الٹ کر طبقاتی انقلاب برپا کیا جائے۔

کمیونسٹ پارٹی کی سیاسی لائن مقامی تقاضوں کے بجائے بیرونی تقاضوں کے مطابق ترتیب پائی تھی...... پارٹی کی سیاسی قلابازیاں اور ناکامیاں

برصغیر کمیونسٹ تحریک کے مؤرخین کی متعدد تصنیفات اور خود کمیونسٹ لیڈروں کی تقریروں، تحریروں اور قراردادوں پر ایک نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں جنم لینے کے بعد قومی اور بین الاقوامی امور کے بارے میں کبھی بھی از خود پالیسی وضع نہیں کی۔اس پارٹی کی تشکیل برطانیہ کی کمیونسٹ پارٹی کی زیر نگرانی ہوئی تھی اور ابتداً اسے پالیسی لائن بھی لندن ہی سے ملتی تھی۔اس بیرونی لائن کے مطابق پہلے تو پارٹی نے بورژوا کانگرس اور مسلم لیگ سے الگ رہ کر برطانوی سامراج کے خلاف تشدد کی محاذ آرائی کی پالیسی اختیار کی لیکن جب میرٹھ اور کانپور کے مقدمات کے نتیجے میں یہ لائن ناکام ہوگئی اور تیسرے عشرے میں پھر سے میکڈانلڈ کی لیبر پارٹی برطانیہ میں برسر اقتدار آگئی تو لندن کی ہدایت کے مطابق ہندوستانی پارٹی کی لائن بدل گئی۔ان دنوں عالمی معاشی بحران شروع ہوگیا تھا اور یورپ میں فاشزم کے فروغ کے باعث دوسری عالمی جنگ کی تیاریاں ہوچکی تھیں۔پارٹی کی نئی لائن یہ تھی کہ بورژوا کانگرس کے ساتھ متحدہ محاذ بنا کر برصغیر کو برطانوی سامراج کے چنگل سے آزاد کرایا جائے۔ستمبر 1939ء میں جنگ شروع ہوئی تو اس کے پہلے تقریباً دو سال تک تو پارٹی کی لائن یہ تھی کہ یہ سامراجیوں کی جنگ ہے۔ہندوستانی عوام کو نہ صرف اس میں کوئی حصہ نہیں لینا چاہیے بلکہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر برطانیہ سے آزادی کی جدوجہد کرنی چاہیے لیکن جب

جون 1941ء میں نازی جرمنی نے یکا یک سوویت یونین پر حملہ کر دیا تو اس کے ابتدائی دو ایک ماہ میں تو ہندوستانی کمیونسٹوں کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کیا جائے لیکن پھر جب لندن سے رجنی پا لمے دت کی نئی لائن آ گئی تو یہ سامراجی جنگ راتوں رات عوامی جنگ بن گئی۔ چونکہ اس موقع پر انڈین نیشنل کانگرس کی بورژوا قیادت غیر مشروط طور پر برطانوی سامراج کی حمایت واعانت کرنے پر آمادہ نہیں تھی اس لئے کانگرس اور کمیونسٹ پارٹی کا متحدہ محاذ ٹوٹ گیا اور چونکہ اس وقت آل انڈیا مسلم لیگ بعض شرائط کے تحت برطانیہ سے تعاون کرنے پر آمادہ تھی اور پنجاب میں وزیر اعلیٰ سر سکندر حیات خان کی زیر نگرانی قائم شدہ صوبائی مسلم لیگ برطانیہ کی جنگی کوششوں میں بھرپور عملی امداد کر رہی تھی اس لئے کمیونسٹ پارٹی کو مسلم جاگیرداروں کی جماعت مسلم لیگ میں خوبیاں دکھائی دینے لگیں۔ حتیٰ کہ اسے مسلم لیگ کا مطالبہ پاکستان بھی جائز نظر آنے لگا۔ چنانچہ پارٹی نے ستمبر 1942ء میں مسلمانوں کے اس مطالبہ کی حمایت میں ایک ایسی قرارداد منظور کی جو ابہامات و تضادات کا مجموعہ تھی۔ اس میں ایک طرف تو مسلمانوں اور سکھوں کے حق خود اختیاری کے مطالبہ کو تسلیم کیا گیا تھا۔ مذہب کی بنیاد پر بنگال کی تقسیم کی تجویز کی تائید کی گئی تھی اور پورے برصغیر میں مسلم اکثریتی علاقوں کو اپنی خود مختار ریاستیں قائم کرنے کا حق دیا گیا تھا لیکن دوسری طرف ہندوستان کی مذہب کی بنیاد پر دو قوموں میں تقسیم کی علیحدگی پسندانہ تھیوری کو مسترد کیا گیا تھا۔ گویا جناب شیخ کا نقش قدم یوں بھی تھا اور یوں بھی۔ اگرچہ اس قرارداد کی منظوری سے ایک ڈیڑھ ماہ قبل کانگرس بورژوا قیادت گاندھی کی ''ڈکٹیٹر شپ'' کے تحت، ہندوستان چھوڑ دو، کی پر تشدد تحریک کی بنا پر جیلوں میں جا چکی تھی۔ تاہم پارٹی کی اس قرارداد کے آخر میں کہا گیا تھا کہ کانگرس۔ لیگ اتحاد مادر وطن کی نجات کا واحد راستہ ہے۔ ستمبر 1942ء سے لے کر 1945ء کے اوائل تک پوری عالمی جنگ کے دوران کانگرس کی قیادت جیلوں میں رہی جبکہ پورے ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی اور مسلم لیگ کے درمیان تعاون اور اشتراک عمل جاری رہا۔ 1945ء کے اواخر اور 1946ء کے اوائل میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کے تحت مرکزی وصوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے تو اس سے پہلے کمیونسٹوں اور ان کے ہم نواؤں کو کانگرس کی صفوں سے نکالا جا چکا تھا۔ الزام یہ تھا کہ وہ مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کی حمایت کرتے تھے۔ چنانچہ ان انتخابات میں کمیونسٹ پارٹی نے مسلم لیگ کی پرزور عملی حمایت کر کے مطالبہ پاکستان کی تکمیل میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔

لیکن جب 1947ء میں مسلم لیگ کے مطالبہ کے مطابق برصغیر کی تقسیم ہو گئی اور پاکستان قائم ہو گیا تو کمیونسٹ پارٹی کی لائن کا موڑ کانٹا پھر بدل گیا۔ اب ماسکو کے ذرائع ابلاغ کی لائن یہ تھی کہ برصغیر کی تقسیم برطانوی سامراج کی سازش کا نتیجہ ہے اور ''پاکستان سامراج کی حرامی اولاد ہے۔'' برطانیہ نے ہندوستان اور پاکستان میں جن لوگوں کو اقتدار منتقل کیا ہے وہ سامراج کے پٹھو ہیں بالخصوص ہندوستان کا وزیراعظم جواہر لال نہرو سامراج کا پالتو کتا ہے۔ اس لئے دونوں ملکوں میں ان رجعت پسندوں اور سامراجی پٹھوؤں کا مسلح جدوجہد کے ذریعے تختہ الٹ کر پورے برصغیر میں طبقاتی انقلاب برپا کرنا چاہیے۔ یہ لائن ستمبر 1947ء میں کمیونسٹ انفرمیشن بیورو (Cominform) کے پہلے اجلاس میں ایک ممتاز سوویت لیڈر اینڈری زہدانوف (Zhedanov) نے دی تھی بظاہر اس لائن کی بنیاد یہ تھی کہ چونکہ جنگ کے دوران جاپانیوں کے ہاتھوں برطانیہ کی شرمناک شکست کے نتیجہ میں اس علاقے کے عوام کے دلوں میں برطانوی سامراج کی عظمت و طاقت کا دبدبہ باقی نہیں رہا اس لئے انہیں کامیابی کے ساتھ طبقاتی انقلاب کی دعوت دی جاسکتی ہے۔ چنانچہ پہلے 21رفروری 1948ء کو ساؤتھ ایسٹ ایشیا یوتھ کانفرنس میں اور 28رفروری کو کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی دوسری کانگرس میں یہ لائن اختیار کر لی گئی اور اس لائن کو چلانے کے لئے دائیں بازو کے انتہا پسند پی۔ سی۔ جوشی کی جگہ بائیں بازو کے انتہا پسند بی۔ ٹی۔ رندیو کو پارٹی کا جنرل سیکرٹری منتخب کر لیا گیا۔

کلکتہ کے اس تاریخی اجتماع کے بعد پاکستان میں عملاً دو کمیونسٹ پارٹیاں وجود میں آئیں۔ مشرقی بنگال کی کمیونسٹ پارٹی کی قیادت ایک ہندو لیڈر رمونی سنگھ کے ہاتھ میں دی گئی جو کلکتہ سے لائن لیتا تھا۔ مغربی پاکستان کی پارٹی کی لیڈری یو۔ پی کے ایک رئیس زادے سجاد ظہیر کو سونپی گئی تھی جس کی قیام پاکستان سے پہلے اس علاقے کے عوام سے کوئی آشنائی نہیں تھی اور جو ہر مسئلہ کے بارے میں بمبئی سے لائن لیتا تھا۔ تاہم مشرقی و مغربی پاکستان کی پارٹیوں میں ایک چیز مشترک تھی اور وہ یہ تھی کہ یہ دونوں ہی کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی تازہ ترین لائن کے مطابق برصغیر کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کو برطانوی سامراج کی سازش کا نتیجہ قرار دیتے تھے۔ یہ پارٹیاں ویسے تو تاریخی مادیت کے نظریے کی علمبردار بنتی تھیں لیکن یہ برصغیر کے تاریخی عمل کو اس کسوٹی پر نہیں پرکھتی تھیں اور مارکسزم لینن ازم کا اطلاق پاکستان کے قومی ڈھانچے کے اندر رہ کر

نہیں کرتی تھیں۔ بالفاظ دیگر یہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان قومی تضاد کو تسلیم نہیں کرتی تھیں۔ اور یہ نہیں مانتی تھیں کہ برصغیر میں ہندو۔ مسلم تضاد کا ایک واضح تاریخی، سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی پس منظر تھا اور یہی تضاد بالآخر برصغیر کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کا باعث بنا تھا۔ لہٰذا پاکستان میں ان کی سیاسی سرگرمیوں کی ابتدا ہی وطن دشمنی اور عوام دشمنی سے ہوئی اور اس بنا پر ان کی ناکامی ناگزیر تھی۔ پاکستان کے رجعت پسند حکمران طبقوں نے، ان نام نہاد کمیونسٹوں کی اس سنگین غلطی سے خوب فائدہ اٹھایا اور وہ انہیں وطن دشمن، ففتھ کالمنسٹ اور اسلام دشمن قرار دے کر اپنی سامراج نوازی اور عوام دشمنی کو مستحکم سے مستحکم تر کرتے چلے گئے۔

بلاشبہ جولائی۔ اگست 1948ء میں مشرقی بنگال میں طبقاتی جدوجہد کے لئے معروضی حالات بہت سازگار تھے۔ اناج کی قلت و مہنگائی کی وجہ سے شہروں اور دیہات کے غریب اور درمیانہ طبقہ کے عوام کی زندگیاں بہت دشوار ہوگئی تھیں۔ بہت سے علاقوں میں واقعی لاکھوں لوگوں کو دو وقت کا کھانا نہیں ملتا تھا۔ کئی علاقوں میں روزانہ بیسیوں لوگ بھوک کی وجہ سے راہی ملک عدم ہو جاتے تھے۔ دیہات کی لاکھوں جھونپڑیاں بادوباراں سے محفوظ نہیں تھیں اور ان میں جو لوگ رہتے تھے ان کے پاس کھانے کو اناج کے علاوہ پہننے کے لئے کپڑا بھی نہیں ہوتا تھا۔ بچے بالکل ننگے رہتے تھے۔ مرد صرف ایک بوسیدہ سی لنگی پہنتے تھے اور عورتیں صرف ایک پھٹی پرانی ساڑھی سے اپنا تن ڈھانپنے کی کوشش کرتی تھیں۔ جب ان جھونپڑیوں میں بھوک اور بیماری کی وجہ سے کوئی اللہ کو پیارا ہو جاتا تھا تو گھر والوں کے پاس اس کی تجہیز و تدفین کے لئے کچھ نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ اس کی لاش کو کیلے کے پتوں میں لپیٹ کر دریا یا سمندر میں بہا دیا جاتا تھا۔ شہروں میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے کوئی ذریعہ روزگار نہیں تھا۔ ان کے لئے تجارت و صنعت کے مواقع تقریباً ناپید تھے اور سول و فوجی ملازمتوں کے دروازے بھی تقریباً بند تھے کیونکہ عزیز احمد جیسے سول افسروں اور ایوب خان جیسے فوجی افسروں کا خیال تھا کہ بنگالی نوجوان نسلی، جسمانی، تعلیمی اور تربیتی لحاظ سے ان ملازمتوں کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ ایوب خان کا مشورہ یہ تھا کہ پبلک سکول کھولے جائیں جہاں بنگالی بچوں کی مناسب ذہنی و جسمانی تعلیم و تربیت کا بندوبست ہو اور اس طرح دس پندرہ سال میں بنگالی نوجوانوں کی ایسی کھیپ تیار ہو جائے جو سول، فوجی ملازمتوں کے لئے مناسب صلاحیت و اہلیت کے حامل ہوں۔ شہروں کا سیاسی طور پر باشعور تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ

کراچی اور پنجاب کے حکمران طبقوں کی مرکزیت پسندی یا آمریت سے بھی بہت نالاں تھا۔ اس طبقہ کا یہ احساس روز بروز شدید ہو رہا تھا کہ مغربی پاکستان کا یہ استحصالی طبقہ مشرقی بنگال کو اپنی نو آبادی تصور کرتا ہے۔ وہ بنگالی عوام کو ان کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی حقوق دینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے اور وہ بنگالی ثقافت کو بھی اردو زبان اور اسلام کے نعروں کے زور سے ختم کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں لیکن ان سارے سازگار معروضی حالات کے باوجود مشرقی بنگال کی کمیونسٹ پارٹی نے جب جون 1948ء میں مشرقی بنگال میں کھلم کھلا اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا تو باشعور سیاسی حلقوں کو پہلے ہی دن یہ پتہ چل گیا کہ ان کی انقلابی بیل منڈھے نہیں چڑھے گی کیونکہ وہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی ستمبر 1942ء کی قرارداد کے برعکس بنگال کی تقسیم کو تسلیم ہی نہیں کرتے تھے۔ چونکہ مشرقی بنگال کے کمیونسٹوں کی اپنی کوئی لائن نہیں تھی وہ صرف کلکتہ کے آقاؤں کی ہدایت پر عمل کرتے تھے اس لئے انہیں یہ احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ بنگال کے مسلمانوں نے کلکتہ کے ہندو سرمایہ داروں اور ہندو بنگالی زمینداروں کے دو سو سالہ استحصال سے نجات حاصل کرنے کے لئے مطالبہ پاکستان کی حمایت کی تھی، اس لئے وہ دوبارہ ان استحصالیوں کے چنگل میں جانے کے لئے کبھی تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ سوویت مؤرخین گینکو وسکی (Gankovsky) اور پولنس سکایا (Polanskaya) نے اس حقیقت کو طوعاً و کرہاً بالواسطہ طور پر تسلیم کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''جب مشرقی بنگال کی کمیونسٹ پارٹی کی جاری کردہ کسان تحریک پورے زوروں پر تھی اس وقت بھی مسلمان کسانوں کی بھاری تعداد نے عملی جدوجہد سے گریز کیا تھا۔ کمیونسٹوں کی کسان یونین کا مسلمان کسانوں پر ہندو کسانوں کے مقابلے میں بہت ہی کم اثر تھا۔ پہلے 1948ء اور پھر 1950ء میں باغی دستے قبائلی گروہوں اور ہندو کسانوں پر مشتمل تھے۔ زرعی مزدوروں کی یونین بھی زیادہ تر اچھوتوں پر مشتمل تھی۔ جہاں کہیں بھی مسلمان تحریک میں شامل ہوئے تو انہوں نے اپنی الگ مقامی تنظیم بنالی۔ دیہی اور ضلعی کسان یونینوں کی تنظیم مذہبی بنیادوں پر ہوئی تھی۔ اس لئے ارباب اقتدار نے بآسانی مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف اکسا کر تحریک میں پھوٹ ڈلوا دی۔''[32] گینکو وسکی وغیرہ کا موقف یہ ہے کہ ایسا اس لئے ہوا تھا کہ مسلم لیگ نے 47-1946ء میں جو بیج بوئے تھے وہ بدستور بارآور رہے۔ ان کے اس موقف کا مارکسزم، لینن ازم یا تاریخی مادیت کے نظریے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بظاہر ان کی رائے میں برصغیر کی آزادی سے پہلے یہاں

تاریخ سازی کا کام صرف برطانوی سامراج کرتا تھا اور جب پاکستان قائم ہو گیا تو اس ملک میں تاریخ کے گھوڑے کی باگ ڈور صرف مسلم لیگی قیادت کے ہاتھ میں تھی۔ برصغیر میں ہندو۔ مسلم تضاد صرف برطانوی سامراج کی پیداوار تھا اور اس کا کوئی تاریخی، سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی پس منظر نہیں تھا۔ قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگی ارباب اقتدار نے اس مصنوعی فرقہ وارانہ تضاد سے فائدہ اٹھایا اور پاکستانی عوام الناس بلا سوچے سمجھے بھیڑ بکریوں کی طرح ان کے کہنے پر چلتے رہے۔

مشرقی بنگال کمیونسٹ پارٹی کی 48ء کی تحریک

مشرقی بنگال کی کمیونسٹ پارٹی نے اپنی سرگرمیوں کی ابتدا 30 / جون 1948ء کو ڈھاکہ میں ایک پبلک جلسہ سے کی۔ مگر حکومت کے ''آدمیوں'' نے گڑبڑ کی اور یہ جلسہ ہنگامہ کی نذر ہو گیا۔ فریقین میں دھینگا مشتی، مکا بازی، لٹھ بازی اور پتھر بازی ہوئی۔ جس کے نتیجے میں کئی افراد زخمی ہوئے۔ اس واقعہ کے بعد جب کمیونسٹ کارکن اور ان کے ہمدرد ٹولیوں کی صورت میں اپنے گھروں کو جا رہے تھے تو راستے میں بھی ان پر حملے کئے گئے جس کی بنا پر رائے صاحب بازار کے علاقے میں بہت سراسیمگی پھیل گئی اور حکومت نے کمیونسٹ پارٹی کے دفتر کی حفاظت کے لئے وہاں مسلح پولیس کا پہرہ لگا دیا۔ اگلے دن کلکتہ کے بعض ہندو اخبارات میں اس فساد کی خبریں کچھ اس طرح شائع ہوئیں کہ جیسے یہ کوئی ہندوؤں کا جلسہ تھا جس پر حکومت اور مسلم لیگ نے ایک منصوبہ کے تحت حملہ کروا دیا تھا لیکن مارننگ نیوز نے اپنے ڈھاکہ نیوز لیٹر میں اس الزام کی تردید کی اور کہا کہ ''اس فساد میں فرقہ واریت کے رنگ کی کوئی آمیزش نہیں تھی۔ مارننگ نیوز کا دعویٰ یہ تھا کہ اس جلسہ میں بعض کمیونسٹ مقررین نے حکومت پاکستان پر سخت نکتہ چینی کی تھی جس پر بعض مسلمانوں نے اعتراض کیا اور پھر ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔ اس ہنگامے میں مکا بازی ہوئی اور فریقین نے ایک دوسرے پر پتھر پھینکے۔ جب اس واقعہ کی اطلاع پولیس کو ملی تو وہ فوراً موقع پر پہنچی اور بلا تاخیر امن وامان بحال کر دیا گیا۔ اس پر کمیونسٹ چھوٹے چھوٹے جلوسوں کی صورت میں اپنے ہیڈ کوارٹرز کی طرف روانہ ہوئے اور انہوں نے راستہ میں حکومت پاکستان کے خلاف نعرے لگائے۔ چنانچہ شہر کے بعض علاقوں میں کشیدگی پھیل گئی مگر سپرنٹنڈنٹ پولیس کے بروقت اقدام کے باعث کوئی ناخوشگوار واقعہ نہ ہوا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے سارے خطرناک مقامات پر

مسلح گاردیں مقرر کر دی تھیں۔ یہ گڑ بڑ کمیونسٹوں اور دوسرے عوام کے درمیان ہوئی تھی اس میں فرقہ واریت کے رنگ کی کوئی آمیزش نہیں تھی۔''[33] مارننگ نیوز کے اس خبرنامے میں صوبائی حکومت اور صوبائی مسلم لیگ کو اس واقعہ سے بے تعلق ظاہر کیا گیا تھا لیکن اس کا یہ بیان صحیح نہیں تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس واقعہ سے پہلے چودھری خلیق الزماں، خواجہ ناظم الدین، حمید الحق چودھری، مولانا اکرم خان اور دوسرے مسلم لیگی رہنما اپنی تقریروں اور بیانات میں مسلسل یہ تاثر دیتے رہے تھے کہ مشرقی بنگال میں کمیونسٹ عناصر ہندو ہیں، اسلام دشمن ہیں، پاکستان دشمن ہیں، ہندوستان کے ایجنٹ ہیں اور وہ صوبہ میں گڑ بڑ پھیلا کر دونوں بنگالوں کو متحد کرنے کے متمنی ہیں۔ اس پروپیگنڈے کے پس منظر میں یہ امر غیر متوقع نہیں تھا کہ صوبائی حکومت اور صوبائی مسلم لیگ نے کمیونسٹ پارٹی کے اس پہلے جلسہ عام کو فرقہ واریت کے منصوبے کے ذریعہ ناکام کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان دنوں ڈھاکہ میں فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا کیونکہ اناج کی قلت ومہنگائی اور ذرائع روزگار کی عدم موجودگی میں ہندوؤں کی بحیثیت مجموعی خوش حالی، بھوکے اور بے روزگار مسلمانوں کو ہمہ وقت مشتعل کرتی تھی۔ مسلمانوں کی تنگدستی اور مفلسی کی انتہا کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا تھا کہ کمیونسٹ پارٹی کے اس ناکام جلسے کے تقریباً دو ہفتے بعد پولیس کے اہلکاروں نے محض اس وجہ سے ہڑتال اور سرکشی کی تھی کہ انہیں بروقت تنخواہیں نہیں ملتی تھیں۔ جب پنجابی فوج کے ایک دستے نے پولیس کی اس سرکشی کو بزور قوت کچل دیا تو صوبائی حکومت نے پولیس کی اس ہڑتال کی ذمہ داری بھی کمیونسٹوں پر عائد کی اور یہ الزام لگایا کہ کمیونسٹ پارٹی نے اس ہڑتال کے بارے میں ایک قابل اعتراض پمفلٹ شائع کیا ہے۔ اس سلسلے میں کئی گھروں کی تلاشی لی گئی اور دو افراد کو گرفتار کیا گیا۔

تاہم اس طرح کمیونسٹ پارٹی کی سرگرمیاں بند نہ ہوسکیں اور اس نے یہ کوشش کی کہ ریلوے ملازمین کو منظم کر کے شہروں میں انہیں اپنی سیاسی قوت کی ایک بنیاد بنایا جائے۔ مگر اس میں بھی پارٹی کو کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی کیونکہ ریلوے ملازمین کی بھاری اکثریت بہاری مہاجرین پر مشتمل تھی اور یہ مہاجرین اپنے مفادات کے تحفظ وفروغ کے لئے اسلام اور حب الوطنی کا سہارا لیتے تھے۔ کسی ہندو یا مسلمان بنگالی کمیونسٹ کے لئے اردو بولنے والے ان مہاجرین کو سیاسی طور پر متاثر کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ چنانچہ جب 4/اگست 1948ء

کو ایسٹرن بنگال ریلوے ملازمین نے اپنے مطالبات منوانے کے لئے ہڑتال کرنے کے فیصلے کا اعلان کیا تو ان کی یونین کے جنرل سیکرٹری محبوب الحق نے ایک بیان میں متنبہ کیا کہ "کمیونسٹ عناصر ریلوے ملازمین کے اس فیصلے سے سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان انتشار پسند عناصر کو معلوم ہونا چاہیے کہ پاکستان کے عوام انہیں برداشت نہیں کریں گے۔"[34]

14 راگست 1948ء کو پاکستان کا پہلا یوم آزادی منایا گیا تو بعض پاکستانی اخبارات کی خبر یہ تھی کہ اس تقریب میں ڈھاکہ کے ہندوؤں نے شرکت نہیں کی تھی۔ ڈان کی خبر یہ تھی کہ "ڈھاکہ کے بعض ہندوؤں کی اس اشتعال انگیزی کے باوجود شہر میں امن وامان رہا جبکہ اس کے اگلے دن 15 راگست کو ہندوستان میں یوم آزادی کے موقع پر باٹا نگر (مغربی بنگال) اور آگرہ میں مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا۔ 15 راگست کو ڈھاکہ میں بعض ہندوؤں نے بھی انڈین یونین کے پروگرام کے مطابق ہندوستان کا یوم آزادی منایا۔ اکھنڈ بھارت کے ان علمبرداروں نے 14 راگست کو نہ صرف پاکستان کا پرچم لہرانے اور یوم آزادی کی تقریبات میں شریک ہونے سے انکار کر دیا تھا بلکہ انہوں نے پاکستان کے بارے میں توہین آمیز باتیں کی تھیں۔"[35] ڈان کی یہ خبر کس حد تک صحیح تھی اس کا صحیح جواب دینا ممکن نہیں البتہ یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ بہت اشتعال انگیز تھی اور یہ حقیقت بھی اہمیت سے خالی نہیں تھی کہ اس خبر کی اشاعت ڈھاکہ میں 18 راگست کو بسنت کمار داس کی زیر صدارت پاکستان نیشنل کانگرس کی تشکیل کے دو تین دن بعد شائع ہوئی تھی۔

لیکن صوبہ بہار کے ریلوے ملازمین کی فرقہ پرستی و رجعت پسندی اور پاکستانی اخبارات کی اس قسم کی فرقہ وارانہ اشتعال انگیزی کے باوجود مشرقی بنگال کی کمیونسٹ پارٹی کچھ زیادہ بددل اور مایوس نہ ہوئی اس لئے کہ اسے زمینداروں کے خلاف غریب کسانوں کی تحریک میں کامیابی کے کچھ آثار نظر آ رہے تھے۔ اس کا ثبوت 20 راگست 1948ء کو ملا جبکہ صوبہ کے وزیر خزانہ حمید الحق چودھری نے پبنہ اور راجشاہی کے اضلاع کے پانچ روزہ دورے کے بعد ڈھاکہ میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے پہلے تو حکومت کی اس پالیسی کا اعادہ کیا کہ کسی زمیندار کی زمین بلا معاوضہ سرکاری تحویل میں نہیں لی جائے گی اور پھر عوام کو متنبہ کیا کہ وہ "کمیونسٹ عناصر سے ہوشیار رہیں جو اپنے سیاسی مقاصد کے تحت ملک میں بدامنی پھیلانا چاہتے

ہیں اور لوگوں کے مختلف گروہوں میں نفاق پیدا کر رہے ہیں۔ اگر عوام اپنی آزادی کو غیر ملکی غلبہ سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو انہیں کمیونسٹوں کے شرانگیز پروپیگنڈے سے خبردار رہنا چاہیے۔'' اس نے کہا کہ ''اسلام کے نظریات اور کمیونزم کے درمیان اختلاف کی اس قدر وسیع خلیج ہے کہ ان دونوں میں مفاہمت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔''[36]

چار دن بعد 24 راگست کو صوبائی حکومت نے ایسٹ بنگال کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹریٹ کی طرف سے شائع کردہ اعلامیہ نمبر 1 ضبط کر لیا کیونکہ اس میں مبینہ طور پر ''ملک کے خلاف نفرت اور بے اطمینانی پھیلانے کی کوشش کی گئی تھی۔'' اسی دن خفیہ پولیس نے شہر کے مختلف علاقوں میں دس گھروں میں چھاپے مارے اور 9 افراد کو گرفتار کر لیا۔ گرفتار شدگان میں گورنمنٹ کالجیئٹ سکول کا ایک استاد محمد دوست الزماں اور مائنارٹی ایسوسی ایشن (Minority Association) کا سیکرٹری پی۔ این موزمدار بھی شامل تھے۔ موزمدار کی گرفتاری سے غالباً مسلم عوام الناس میں یہ تاثر پیدا کرنا مقصود تھا کہ کمیونسٹ پارٹی دراصل ہندوؤں کے مفاد کے لئے سرگرم عمل ہے۔ 26 راگست کو باریسال میں ایک مقامی کمیونسٹ لیڈر، جو رکشا ڈرائیورز یونین کا سیکرٹری بھی تھا، گرفتار کر لیا گیا اور ایک اور کمیونسٹ لیڈر کے گھر کی تلاشی لی گئی مگر وہاں سے کوئی قابل اعتراض چیز برآمد نہ ہوئی۔ پولیس کی اس کاروائی کا پس منظر یہ تھا کہ باریسال میں کالج اور اسکول کے طلبا نے اناج کی قلت اور مہنگائی کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے ایک جلوس نکالا تھا۔ ان دنوں ہندوستان کے صوبہ آسام میں بھی کمیونسٹوں کی پر تشدد سرگرمیاں شروع ہو گئی تھیں اور ڈان کی 28 راگست کی اطلاع کے مطابق ان آسامی کمیونسٹوں نے برما کے کمیونسٹوں کے ساتھ روابط قائم کر کے صوبہ میں اپنے مضبوط مراکز بنا لئے تھے اور وہ برما سے اسلحہ بھی حاصل کر رہے تھے۔ قبل ازیں مستی پور کے نزدیک ہندوستان کے روپوش کمیونسٹوں اور برما کے کمیونسٹوں کی ایک خفیہ ملاقات ہوئی تھی جس میں دوررس نتائج کے حامل بہت اہم فیصلے کئے گئے تھے۔[37]

30 راگست 1948ء کو حکومت پاکستان نے پورے ملک میں ہنگامی حالت کا جو اعلان کیا تھا اگرچہ اس کا بظاہر مقصد یہ تھا کہ سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد میں مشرقی پنجاب کے مہاجرین کو آباد کیا جائے[38] لیکن غالباً اس کے پس پردہ ہندوستانی اور برمی کمیونسٹوں کے ان اہم فیصلوں اور مشرقی بنگال میں کمیونسٹوں کی جاری کردہ کسان تحریک کی بھی کچھ نہ کچھ کارفرمائی تھی اور

غالباً یہی وجہ تھی کہ ہنگامی حالت کے اس اعلان کے بعد یکم ستمبر کو ڈھاکہ میں وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین کی زیر صدارت سارے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں ''برصغیر کی تقسیم کے بعد کی عمومی سیاسی صورت حال'' کا جائزہ لیا گیا۔ اس سہ روزہ کانفرنس میں پاکستان نیشنل گارڈز اور انصار کی تنظیم کے مسائل بھی زیر غور آئے اور ترمیم شدہ آرمی ایکٹ کی پالیسی پر بھی تبادلۂ خیالات ہوا۔[39] اس کانفرنس میں اناج اور کپڑے کی کمیابی اور مہنگائی کا مسئلہ زیر غور نہ آیا حالانکہ متحدہ بنگال کے ایک سابق وزیر سید معظم حسین اور ڈھاکہ ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کے سابق سیکرٹری عبدالحمید وکرم پوری کی اطلاعات کے مطابق ان دنوں ضروریات زندگی کی کمیابی نے صوبہ میں بڑی خطرناک صورتحال پیدا کر دی تھی۔ سید معظم حسین کے بیان کے مطابق میمن سنگھ میں چاول کا بھاؤ 50 روپے فی من تک پہنچ گیا تھا۔ عبدالحمید وکرم پوری کا کہنا تھا کہ ضلع ڈھاکہ کے اندرونی علاقوں میں چاول 45 روپے فی من کے حساب سے بک رہا ہے اور ایسٹ بنگال کاٹن ملز ایسوسی ایشن کے صدر ایس۔ کے۔ باسو کا بیان یہ تھا کہ ''صوبہ کی مختلف ملوں کے گوداموں میں تقریباً ایک کروڑ روپے کی مالیت کا کپڑا پڑا ہوا ہے کیونکہ حکومت نے جو ایجنٹ مقرر کر رکھے ہیں انہوں نے ابھی تک ان گوداموں سے کوئی کپڑا نہیں اٹھایا'' اس کے علاوہ ڈان کی رپورٹ کے مطابق ''سرکاری گوداموں میں بھی بڑی دیر سے ایک کروڑ روپے کی مالیت کا کپڑا پڑا ہوا تھا جبکہ پورے صوبے میں کپڑے کی کمیابی و مہنگائی کے باعث واویلا مچا ہوا تھا اور ایک سرکاری وفد 3 کروڑ روپے کا کپڑا خریدنے کے لئے بمبئی میں بیٹھا ہوا تھا۔''

تاہم 11 ستمبر کو گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح کا انتقال ہوا تو چند دن کے لئے مشرقی بنگال کی سیاسی، معاشی بدحالی عوام الناس کی توجہ کا مرکز نہ رہی۔ اگرچہ قائداعظم جناح نے مارچ 1948ء میں بطور گورنر جنرل مشرقی بنگال کے اپنے پہلے اور آخری دورے کے دوران اردو زبان اور خواجہ ناظم الدین کی نااہل حکومت کی حمایت کر کے مقامی تعلیم یافتہ عناصر کو قدرے صدمہ پہنچایا تھا لیکن اس کے باوجود بنگالی عوام الناس کے دلوں میں بابائے قوم کی عظمت کا احساس قائم رہا تھا۔ لہٰذا جب وہ اللہ کو پیارے ہوئے تو پورے مشرقی بنگال میں ان کا سوگ منایا گیا۔

باب:5

مرکزی حکومت کا بنگالی عوام کے سیاسی، معاشی وثقافتی حقوق تسلیم کرنے سے انکار اور مسلم لیگ کی کوکھ سے عوامی مسلم لیگ کا جنم

قائداعظم کے انتقال کے بعد خواجہ ناظم الدین کو گورنر جنرل بنا کر لیاقت علی خاں نے تمام اختیارات پر خود قبضہ کرلیا......خاموش انقلاب!

14 ستمبر کو برطانیہ کے ملک معظم نے وزیراعظم لیاقت علی خان کی سفارش پر مشرقی بنگال کے وزیراعلیٰ خواجہ ناظم الدین کو قائداعظم محمد علی جناح کی جگہ ڈومینین پاکستان کا گورنر جنرل مقرر کر دیا اور اسی دن اس نے کراچی میں اپنے عہدے کا حلف اٹھا لیا۔ 54 سالہ خواجہ ناظم الدین کے جد امجد خواجہ عبداللہ نے اٹھارویں صدی میں کشمیر سے بنگال میں آ کر سلہٹ اور ڈھاکہ کے مقامات پر چمڑے کا کاروبار شروع کیا تھا۔ یہاں اس کا یہ کاروبار اتنا چلا اور اس نے اس کاروبار کے ذریعے برطانیہ کے برآمد کنندگان کی اتنی خدمت کی کہ کمپنی بہادر نے اسے نواب کا خطاب دے دیا۔ خواجہ عبداللہ فوت ہوا تو یہ خطاب اس کے بیٹے کو ملا اور پھر اس کے پڑپوتے خواجہ عبدالغنی کو حکومت برطانیہ نے اس خاندانی خطاب کے علاوہ سر کا خطاب بھی دیا۔ خواجہ عبدالغنی کے بیٹے خواجہ نظام الدین نے ڈھاکہ کے نواب سر سلیم اللہ کی بہن سے شادی کی اور پھر وہ بھی برطانیہ کی جانب سے ان خطابات سے نوازا گیا۔ اس وقت تک خواجہ عبداللہ کا خاندان مشرقی بنگال میں بہت بڑی زمینداری کا بھی مالک بن چکا تھا۔ خواجہ ناظم الدین ڈھاکہ میں 19 جولائی

1894ء کو پیدا ہوا۔ اس نے پہلے علی گڑھ اور پھر کیمبرج میں تعلیم پائی جہاں وہ سر سکندر حیات خان اور نواب چھتاری کا ہم جماعت تھا اور اس نے برطانوی سامراج کی غیر متزلزل وفاداری کا سبق بھی ان ہی کے ساتھ سیکھا تھا۔ وہ 1922ء سے لے کر 1929ء تک ڈھاکہ میونسپلٹی کا چیئرمین اور 1923ء سے لے کر 1929ء تک ڈھاکہ یونیورسٹی کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن رہا۔ 1924ء میں وہ بنگال لیجسلیٹو کونسل کا رکن بنا اور 1929ء میں وہ صوبائی گورنر مسٹر سٹینلے جیکسن (Stanley Jackson) کی نظر عنایت سے وزیر تعلیم کے عہدہ پر فائز ہوا اور 1934ء تک 1919ء کی اصلاحات کے تحت اس عہدہ کے فرائض سرانجام دیتا رہا۔ 1934ء میں وہ صوبائی گورنر سر جان اینڈرسن (John Anderson) کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن بنا اور 1937ء تک اس حیثیت سے کام کرتا رہا۔ 1937ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ (1935ء) کے تحت عام انتخابات ہوئے تو اس نے پتواکھلی کے حلقہ سے انتخاب لڑا مگر درمیانہ طبقہ کے ایک وکیل اور کسان لیڈر مولوی ابوالقاسم فضل الحق نے اسے دس ہزار ووٹوں کی اکثریت سے شکست دی۔ تاہم جب ان انتخابات کے بعد مولوی فضل الحق نے مسلم لیگ کے تعاون سے مخلوط وزارت بنائی تو اس نے خواجہ ناظم الدین کو بھی اپنی کابینہ میں شامل کیا جو کچھ عرصہ بعد حسین شہید سہروردی کی خالی کردہ ایک نشست کے ضمنی انتخابات میں صوبائی اسمبلی کا رکن منتخب ہوا تھا۔ وہ تقریباً چار سال تک فضل الحق وزارت میں وزیر داخلہ رہا حالانکہ دسمبر 1941ء میں مولوی فضل الحق کے مسلم لیگ سے اخراج کے بعد وہ بھی حسین شہید سہروردی وغیرہ کے ساتھ کابینہ سے الگ ہو گیا۔ اس کے بعد وہ تقریباً 18 ماہ تک صوبائی اسمبلی میں حزب اختلاف کا قائد رہا اور پھر جب مولوی فضل الحق نے صوبائی گورنر سے اختلافات کے باعث اپریل 1943ء میں استعفیٰ دے دیا تو اس کی جگہ وہ بنگال کا وزیر اعلیٰ بنا۔ 1943ء میں بنگال کے ہولناک قحط کا المیہ اسی کے عہد میں ہوا تھا۔ تاہم اس کی وزارت دیرپا ثابت نہ ہوئی اور اسے مارچ 1945ء میں اسمبلی کی اکثریت کی حمایت حاصل نہ ہونے کی وجہ سے استعفیٰ دینا پڑا۔ فروری 1946ء میں صوبائی اسمبلی کے عام انتخابات کے بعد لیگ اسمبلی پارٹی کے قائد کا انتخاب ہوا تو خواجہ ناظم الدین کی بجائے حسین شہید سہروردی اس عہدہ کے لئے منتخب ہو گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ 1945ء میں مرکزی اسمبلی کے عام انتخابات کے دوران اعلانیہ طور پر اس نے یہ وعدہ کر لیا تھا کہ وہ آئندہ اسمبلی کی عملی سیاست میں حصہ نہیں لے گا۔

تاہم 1937ء سے 1947ء تک آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا رکن رہا اور جولائی 1946ء میں وہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کا رکن منتخب ہو گیا۔ 15/اگست 1947ء کو جب برصغیر کی تقسیم کا کام سیاسی طور پر مکمل ہو چکا تھا، خواجہ ناظم الدین متحدہ بنگال کے وزیر اعلیٰ حسین شہید سہروردی کے مقابلے میں مشرقی بنگال کی لیگ اسمبلی پارٹی کا قائد منتخب ہو گیا۔ اس نے یہ کامیابی قائداعظم جناح، لیاقت علی خان، ایم۔ اے۔ ایچ اصفہانی اور سلہٹ کے 17 ارکان اسمبلی کے گروپ کی حمایت سے حاصل کی تھی۔ 14/اگست کو اس نے مشرقی بنگال کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے حلف وفاداری اٹھایا حالانکہ اس وقت وہ صوبائی اسمبلی کا رکن نہیں تھا۔ وہ اس عہدے پر تقریباً ایک سال تک قائم رہا جبکہ اس دوران اناج اور دوسری ضروریات زندگی کی شدید قلت، قومی زبان کے مسئلہ اور صوبائی اسمبلی میں مسلم لیگی ارکان اسمبلی کی دھڑے بندی کے باعث پورا مشرقی بنگال سنگین معاشی اور سیاسی بحرانوں میں مبتلا رہا۔ وہ جب 45-1943ء میں فقید المثال قحط کے باوجود تقریباً دو سال کے عرصے کے لئے متحدہ بنگال کا وزیر اعلیٰ تھا تو اسے صوبائی گورنر سر جان آرتھر ہربرٹ (John Arthur Herbert) کی پشت پناہی حاصل تھی اور اب 48-1947ء میں اس کے مشرقی بنگال کی وزارت اعلیٰ کی گدی پر قائم رہنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اسے قائداعظم جناح اور مرکزی حکومت کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔

14/ستمبر 1948ء کو اس کے پاکستان کے گورنر جنرل کے عہدے پر فائز ہونے کی واحد وجہ یہ تھی کہ بابائے قوم قائداعظم جناح کے انتقال کی وجہ سے ایک زبردست آئینی انقلاب آ گیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد تقریباً ایک سال کے عرصے میں پورا اقتدار گورنر جنرل کی ذات میں مرتکز رہا تھا۔ اس ایک سال کے دوران بظاہر پاکستان میں وفاقی پارلیمانی نظام حکومت رائج تھا، لیکن عملاً یہاں گورنر جنرل نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ (1935ء) کے تحت وائسرائے کے سارے اختیارات حاصل کئے ہوئے تھے۔ پاکستان کی مرکزی کابینہ کے ارکان کی حیثیت وائسرائے کے ایگزیکٹو کونسلروں سے زیادہ نہیں تھی اور لیاقت علی خان بھی محض نام کا وزیر اعظم تھا۔ صوبائی حکومتیں بھی براہ راست گورنر جنرل کی زیر نگرانی اس کی ہدایت کے مطابق چلتی تھیں اور سارے صوبوں کے گورنران صوبائی حکومتوں کی کارکردگی کے بارے میں ہر پندرھویں دن گورنر جنرل کو خفیہ رپورٹیں بھیجتے تھے لیکن اب قائداعظم کے انتقال کے بعد یہ سارے اختیارات

وزیراعظم لیاقت علی خان خود اپنی ذات میں مرتکز کرنا چاہتا تھا۔ اسے ایک ایسے گورنر جنرل کی ضرورت تھی جس کی حیثیت محض ایک آئینی سربراہ کی ہو اور جو روزمرہ کے کاروبار حکومت میں کوئی مداخلت کرنے کی جرأت نہ کرے۔ چنانچہ اس کی صحیح طور پر نگاہ انتخاب خواجہ ناظم الدین پر پڑی۔ یہ شخص اپنی نااہلی، سہل انگاری، آرام کوشی اور رجعت پسندی کے باعث مشرقی بنگال میں بہت غیر مقبول تھا۔ اور اس کے لئے وہاں کی وزارت اعلیٰ کی گدی کانٹوں کی سیج سے کم نہ تھی۔ لہٰذا جب لیاقت علی خان نے اسے گورنر جنرل کے عہدہ کی پیشکش کی تو اس نے اسے غنیمت سمجھا اور وہ فوراً ہی کراچی پہنچ کر قائداعظم کا جانشین بن گیا۔

لاہور کے اخبار پاکستان ٹائمز نے اس تقرر پر جو اداریہ لکھا اس کا عنوان تھا ''خاموش انقلاب'' اس اداریے میں لکھا تھا کہ ''قائداعظم کا جانشین پاکستان کے انتظامی ڈھانچے میں ایک واضح آئینی پوزیشن کا حامل ہوگا اور اسے جو فرائض ادا کرنے پڑیں گے وہ محدود ہوں گے۔ وہ قائداعظم کی طرح خود سارے اہم فیصلے نہیں کرے گا۔ وہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے کام کی نگرانی بھی نہیں کرے گا۔ یہ بات صحیح اور ناگزیر ہے کہ نیا گورنر جنرل محض آئینی سربراہ مملکت کی حیثیت سے کام کرے گا۔ عوام نے قائداعظم کو جو سیاسی و آئینی ذمہ داریاں سپرد کر رکھی تھیں اب ان کی مرکزیت ختم ہوگئی ہے اور وہ مناسب حلقوں میں تقسیم ہوگئی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ پاکستان کا آئین ابھی تک مرتب نہیں ہوا لیکن پہلے ہی فی الحقیقت ایک بہت بڑی آئینی تبدیلی آگئی ہے یعنی خاموش انقلاب برپا ہوگیا ہے''[1] لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ پاکستان ٹائمز کا یہ اداریہ محض جزوی طور پر صحیح تھا۔ یہ آئینی انقلاب اس حد تک نہیں آیا تھا کہ قائداعظم کے انتقال کے بعد ملک میں صحیح معنوں میں وفاقی پارلیمانی نظام حکومت قائم ہوگیا تھا یعنی مرکزی و صوبائی قانون ساز اداروں، عدلیہ، صوبائی حکومتوں اور مرکزی و صوبائی وزراء کو وہ سارے اختیارات حاصل ہوگئے تھے جو اس قسم کے بورژوا نظام حکومت میں انہیں حاصل ہوتے ہیں بلکہ یہ آئینی انقلاب صرف اس حد تک آیا تھا کہ وہ سارے اختیارات جو پہلے قائداعظم کی ذات میں مرتکز تھے، اب وزیراعظم لیاقت علی خان کی ذات میں مجتمع ہوگئے تھے۔ مرکزی اور صوبائی قانون ساز اداروں کی حیثیت بدستور محض نمائشی ہی رہی تھی اور صوبائی حکومتیں کوئی اہم فیصلہ وزیراعظم کی اجازت و منظوری کے بغیر نہیں کرسکتی تھیں۔ البتہ یہ فرق ضرور تھا کہ قائداعظم جناح نے چند ماہ تک

جس طریقے سے بلاشرکت غیرے حکومت کی تھی، ان کے خلاف بڑے پیمانے پر کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں ہوئی تھی جبکہ لیاقت علی خان کی جاگیردارانہ مطلق العنانیت کے خلاف ابتدا ہی سے پنجاب، مشرقی بنگال اور ملک کے دوسرے علاقوں میں زبردست احتجاج شروع ہو گیا تھا۔

نورالامین وزارت کا قیام اور کمیونسٹوں کی کسان تحریک کے خلاف اقدامات

خواجہ ناظم الدین نے 14 ستمبر 1948ء کو کراچی میں گورنر جنرل کا حلف اٹھانے سے پہلے ڈھاکہ میں اپنی کابینہ کے ایک رکن نورالامین کو جو محکمہ سول سپلائیز کے وزیر کی حیثیت سے بہت بدنام ہو چکا تھا، اپنا جانشین نامزد کر دیا تھا اور اس نے بھی 14 ستمبر کو بطور وزیر اعلیٰ حلف اٹھا لیا تھا حالانکہ اس وقت تک لیگ اسمبلی پارٹی نے اسے اپنا قائد منتخب نہیں کیا تھا۔ 17 ستمبر کو اس نے اپنی نو رکنی کابینہ کی تشکیل کی جس کے ارکان یہ تھے:

1۔	وزیر اعلیٰ نورالامین	=	داخلہ، قانون سازی، تعلقات عامہ، عدلیہ اور منصوبہ بندی
2۔	حمیدالحق چودھری	=	مال، خزانہ، تجارت، محنت اور صنعت
3۔	عبدالحمید	=	تعلیم
4۔	حسن علی	=	مواصلات، تعمیرات اور آبپاشی
5۔	سید محمد افضل	=	سول سپلائیز
6۔	حبیب اللہ چودھری	=	صحت اور لوکل سیلف گورنمنٹ
7۔	ڈاکٹر اے۔ ایم۔ مالک	=	امداد باہمی اور زراعت، جنگلات، حیوانات، ماہی پروری
8۔	مفیض الدین احمد	=	بحالیات اور جیل خانہ جات
9۔	تفضّل علی	=	محکمہ خزانہ کی ریونیو برانچ

جب 17 ستمبر 1948ء کو نورالامین کی اس کابینہ کی تشکیل کا سرکاری اعلان ہوا اس وقت مشرقی بنگال میں کمیونسٹوں کی زیر قیادت کسانوں کی تحریک بے حد زور پکڑ چکی تھی۔ ہندوستان میں تو غریب کسانوں کی اس تحریک نے خاصے وسیع پیمانے پر مسلح جدوجہد کی صورت

اختیار کر لی تھی حالانکہ وہاں کی مرکزی حکومت نے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی فروری 1948ء کی کانگرس کے تقریباً تین ہفتے بعد 26/مارچ کو مغربی بنگال کی کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عائد کر دی تھی۔ اس پابندی کے بعد آسام اور مغربی بنگال کے بہت سے ہندوستانی کمیونسٹ لیڈر روپوش ہو گئے تھے اور انہوں نے برما کے کمیونسٹوں کے علاوہ مشرقی بنگال کے کمیونسٹوں سے بھی اشتراک عمل شروع کر دیا تھا۔ کلکتہ کے اخبار امرت بازار پتریکا کی 30/ستمبر کی اطلاع یہ تھی کہ "کچھ عرصہ سے ہندوستان اور برما کے سرحدی علاقوں میں کمیونسٹوں کی سرگرمیوں میں اضافہ ہو گیا ہے اور شمالی برما کے کچھ باغی منی پور اور آسام کے علاوہ مشرقی بنگال میں داخل ہو گئے ہیں۔ چند ہفتے ہوئے ہندوستان کے روپوش کمیونسٹوں نے پاکستانی کمیونسٹوں کے تعاون سے کاچھار، پاکستان کے سرحدی علاقے میں گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن آسام کے ڈی۔ آئی۔ جی پولیس نے فی الفور سخت اقدام کر کے ان تخریب پسند عناصر کی سرکوبی کر دی تھی"[2] اور یکم اکتوبر کو ڈھاکہ سے یہ اطلاع آئی کہ "چٹاگانگ کے نزدیک دیہاتیوں اور پولیس کے درمیان تصادم ہوا جس میں 9 افراد ہلاک اور 11 زخمی ہوئے۔ سرکاری طور پر اس جھگڑے کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ متعلقہ علاقے کے کسان بعض زمینداروں کی زمینوں میں ایک نہر کھود کر اپنی زمینوں کو سیراب کرنا چاہتے تھے۔ جب پولیس نے انہیں اس غیر قانونی کارروائی سے روکا تو وہ باز نہ آئے اور انہوں نے جمع ہو کر پولیس پر حملہ کر دیا۔ اس پر ایک مجسٹریٹ کے حکم کے مطابق گولی چلائی گئی اور مشتعل ہجوم کو منتشر کیا گیا۔"[3]

مشرقی بنگال میں نورالامین کی حکومت اور مغربی بنگال میں ڈاکٹر بی۔ سی۔ رائے کی حکومت نے کمیونسٹوں کے اس روز افزوں خطرے کے سدباب کے لئے پولیس کی گولیوں کے علاوہ بعض دوسرے اقدامات بھی کئے۔ ان میں سے ایک اقدام یہ تھا کہ اس خطرے کو فرقہ وارانہ تضاد کے بوجھ تلے دبا دیا جائے۔ اس تضاد کی چنگاریاں تو ہمہ وقت موجود تھیں انہیں صرف ذرا سی ہوا دینے کی ضرورت تھی۔ بظاہر 15/اگست 1948ء کو ہندوستان کے پہلے یوم آزادی کے موقع پر مغربی بنگال کے قصبہ باٹا نگر میں اسی پالیسی کے تحت مسلم اقلیت کا قتل عام جائز قرار دیا گیا تھا اور اس واقعہ کے بعد مشرقی بنگال میں غالباً "جوابی" کارروائی کے طور پر نارائن گنج اور متعدد دوسرے شہروں میں ممتاز ہندوؤں کے گھروں کی تلاشی لے کر ان میں سے کئی ایک کو گرفتار کیا گیا تھا۔ گرفتار شدگان میں ہفت روزہ "ایسٹ بنگال ٹائمز" کا ایڈیٹر رل چندرا گوھا، پرنٹر پبلشر اسیم رتن گوھا،

نارائن گنج کا میونسپل کمشنر بی۔ پی۔ داس، ضلع ڈھاکہ کا ایک زمیندار ترنی کانت چودھری، مالک گنج کانگرس کمیٹی کا سیکرٹری آر وبرائے اور وہیں کا ایک اخبار نویس سائیکوسین بھی شامل تھے۔

کمیونسٹوں کے خطرے کے خلاف مشرقی بنگال کی حکومت کا دوسرا اقدام یہ تھا کہ 28 ستمبر کو وزیر اعلیٰ نور الامین نے ڈھاکہ میں اچھوتوں کی ایک کانفرنس کا افتتاح کیا۔ اس کانفرنس کی صدارت مرکزی وزیر قانون جوگندر ناتھ منڈل نے کی اور اس میں دس قراردادیں منظور کر کے فوج، نیشنل گارڈز، بلدیات اور سول انتظامیہ میں اچھوتوں کی نمائندگی کے مطالبات کئے گئے اور یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ ''پاکستان کے مستقبل کے آئین میں اچھوتوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے انہیں ویٹیج دیا جائے۔''[4] اس کانفرنس کے پس پردہ یہ پالیسی کارفرما تھی کہ اچھوتوں کا فرقہ ہندوؤں کے فرقے کا جزو نہیں ہے اور وہ اپنے لئے الگ حقوق و مراعات کے مستحق ہیں اور اس کا فوری مقصد یہ تھا کہ اچھوتوں کو ہندوؤں کی کمیونسٹ تحریک سے علیحدہ رکھا جائے۔

صوبائی حکومت کا تیسرا اقدام یہ تھا کہ اس نے 4 اکتوبر کو چٹاگانگ میں متحدہ بنگال کے ایک سابق وزیر مولوی جلال الدین احمد کی زیر صدارت اس ضلع کے ممتاز علما کی ایک کانفرنس کا انتظام کیا جس میں مطالبہ کیا گیا کہ ''پاکستان میں اسلامی آئین نافذ کیا جائے۔ کیونکہ صرف اسی نظریے سے مسلمان متحد ہو سکتے ہیں اور اقلیتوں کو تحفظات مل سکتے ہیں۔''[5] اس کانفرنس کے پس پردہ پالیسی یہ تھی کہ حکومت کے خلاف ہر قسم کی سیاسی، معاشی اور ثقافتی تحریک کو مذہبی نعرے کے ہتھیار سے ختم کیا جائے اور اس کا فوری مقصد یہ تھا کہ غریب مسلمان کسانوں کو ''اسلام دشمن'' ہندو کمیونسٹوں کی تحریک میں شامل ہونے سے باز رکھا جائے۔

کراچی کا روزنامہ ڈان بھی اس سلسلے میں نور الامین کی حکومت کی مؤثر امداد کر رہا تھا۔ اس اخبار نے 17 اکتوبر 1948ء کو ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کے صدر کے نام پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے بعض ہندو ارکان کے ایک مبینہ خط کا عکس چھاپا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ ''وہ پاکستان کی شہریت کو ذہنی طور پر قبول نہیں کر سکتے اور اگر پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کوئی تصادم ہوا تو ان کی ہمدردیاں ہندوستان کے ساتھ ہوں گی'' اور پھر اسی دن اس نے مبینہ خط پر ادارتی تبصرہ کیا کہ ''مشرقی بنگال کے ہندوؤں نے ابھی تک نفسیاتی طور پر پاکستان کے تصور کو قبول نہیں کیا اور نہ ہی وہ ایسا کرنے کی کوئی دیانتدارانہ کوشش کر رہے ہیں لہٰذا ان سے یہ توقع نہیں کی

جاسکتی کہ وہ پاکستان کی شہریت قبول کر کے اس ملک کے وفادار رہیں گے۔ یہاں ان کی زندگیاں اور جائیدادیں خواہ کتنی ہی محفوظ کیوں نہ ہوں وہ ہندوستان کے لئے تڑپتے ہی رہیں گے اور اگر وہ محض اپنی اس ''روحانی'' بدفطرتی کی وجہ سے ازخود اپنے آپ کو خانماں برباد کرنا چاہتے ہیں تو انہیں ایسا کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔''

دوسری طرف کلکتہ کے ہندو اخبارات اور کانگرسی لیڈر بھی بظاہر مغربی بنگال میں ڈاکٹر بی۔سی۔رائے کی حکومت کی امداد کے لئے نہایت خطرناک فرقہ وارانہ اشتعال انگیزی کر رہے تھے۔ مثلاً 20ر اکتوبر کو انند بازار پتریکا میں مغربی بنگال کانگرس کمیٹی کے صدر ڈاکٹر سریش چندرا بنیر جی کا یہ بیان چھپا تھا کہ ''مشرقی بنگال میں نوجوان ہندو عورتوں کو اغوا کر کے ان کی مسلمان لڑکوں سے زبردستی شادیاں کروائی جارہی ہیں اور ہندو طلبا کو مسلمانوں کا کھانا کھانے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔''[6] 27ر اکتوبر کو مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر بی۔سی۔رائے نے کلکتہ میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے یہ الزام عائد کیا کہ مشرقی بنگال سے ہندوؤں کا انخلا جاری ہے کیونکہ وہاں ہندو اقلیت کو اذیت پہنچائی جارہی ہے۔ اس نے اس کانفرنس میں مشرقی بنگال کے بہت سے ممتاز ہندوؤں کے ناموں کی فہرست پیش کی جن کے گھروں کی گزشتہ چند ہفتوں میں مبینہ طور پر تلاشی لی گئی تھی یا دوسرے طریقوں سے ہراساں کیا گیا تھا۔

سردار پٹیل کی طرف سے مشرقی بنگال کو دھمکی اور پاک و ہند قومی تضاد کی شدت میں اضافہ

4ر نومبر 1948ء کو ہندوستان کے وزیر داخلہ سردار پٹیل نے ناگپور کے ایک جلسہ عام میں مشرقی بنگال کی حکومت کے خلاف اسی قسم کا الزام لگایا اور دھمکی دی کہ اگر پاکستان ہندوؤں کو مشرقی بنگال سے نکالنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے تو اسے ان کی آبادکاری کے لئے ہندوستان کو مزید علاقے دینے پر آمادہ ہونا پڑے گا۔[7]

فریقین کی جانب سے اس قسم کے اشتعال انگیز ادارتی تبصروں، خبروں، بیانات اور تقریروں کا مطلب یہ تھا کہ برصغیر کے مشرقی علاقے میں کمیونزم کا جو خطرہ درپیش تھا، دونوں ملکوں کی حکومتیں اس کے سدباب کے لئے دیرینہ فرقہ وارانہ تضاد، جس نے اب ہندوستان اور پاکستان

کے درمیان قومی تضاد کی صورت اختیار کر لی تھی، سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ حکومت ہندوستان نے ستمبر 1948ء میں حیدر آباد (دکن) پر فوجی چڑھائی کر کے تلنگانہ کے علاقے میں تو کسانوں کی بغاوت پر قابو پانے کا بندوبست کر لیا تھا لیکن اس کے لئے آسام، مغربی بنگال اور منی پور میں ایسا کرنا آسان نہیں تھا کیونکہ یہ علاقے برما سے ملحق تھے جہاں کمیونسٹوں کی بغاوت روز بروز شدید ہو رہی تھی۔ پاکستان میں مشرقی بنگال کی حکومت کو برما کے کمیونسٹوں سے زیادہ مغربی بنگال کے کمیونسٹوں سے خطرہ تھا۔ اس لئے وہ نہ صرف صوبہ میں کسان تحریک کو مغربی بنگال کے ہندو ایجنٹوں کی سازش کا نتیجہ قرار دیتی تھی بلکہ اس نے بمبئی کے کمیونسٹ جریدے پیپلز ایج (Peoples Age) کا اور کلکتہ کے ان تمام اخبارات اور جریدوں کا مشرقی بنگال میں داخلہ بند کر دیا تھا جن سے صوبہ میں کسان تحریک کی حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔

سردار پٹیل کی 4رنومبر کی تقریر سے بین المملکتی قومی تضاد کی شدت میں اضافہ ہوا تو مشرقی بنگال میں خاصی سراسیمگی پھیل گئی کیونکہ اس سے یہ تاثر پیدا ہو گیا تھا کہ حکومت ہندوستان ریاست حیدر آباد (دکن) کو بزور قوت ملحق کرنے کے بعد اب مشرقی بنگال کی طرف رخ کرے گی جبکہ کشمیر میں پہلے ہی جنگ جاری تھی۔ چنانچہ اس صورت حال کے پیش نظر 6رنومبر کو کراچی سے یہ اعلان ہوا کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان 18رنومبر کو مشرقی بنگال جائے گا اور وہاں وہ تقریباً ایک ہفتہ تک صوبہ کے مختلف علاقوں کا دورہ کرے گا۔ پاکستان کے اخبارات میں یہ خبر 7رنومبر کو چھپی تو اسی دن روزنامہ ڈان کا اداریہ یہ تھا کہ ''جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ پاکستان ایک تھیوکریسی ہے وہ دراصل ہم پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں، وہ ہم سے نفرت کرتے ہیں کیونکہ وہ اسلام سے نفرت کرتے ہیں...... ہندو لیڈروں کے نقطۂ نگاہ سے جس چیز نے ہمیں ایک قوم بنایا اور جس چیز نے ہماری انفرادیت کو تشدد پسند اور احیائی ہندو ازم کے سمندر میں غرق ہونے سے بچایا ہے وہ اسلام ہے۔ لہٰذا اسلام کو تباہ کرنا ضروری ہے۔ اسلام کو گالی دینا ضروری ہے اور اسلام کو دقیانوسی اور رجعت پسند قرار دینا ضروری ہے۔ پاکستان کو تھیوکریٹک کہنا تو محض ایک بہانہ ہے۔ اصلی دشمن اسلام ہے۔ ہندوستان کے پٹیلوں اور نہروؤں کے عزائم ہٹلر اور مسولینی کے عزائم سے زیادہ سنگین ہیں، وہ انسان کے ناقابل تسخیر جذبہ کو مسخر کرنا چاہتے ہیں جو کہ حق وصداقت کا جذبہ ہے۔ وہ اپنا ترنگا جھنڈا، اللہ تعالیٰ کے عرش بریں پر نصب کرنے کے متمنی ہیں۔'' ڈان کا یہ اداریہ بین المملکتی

کشیدگی میں اضافہ کرنے کے لئے کافی سے زیادہ تھا لیکن اس کے اگلے دن مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر بی۔سی۔رائے نے اس کشیدگی میں یہ کہہ کر اور بھی اضافہ کر دیا کہ ''اب تک 15 لاکھ ہندو مشرقی بنگال سے نقل مکانی کر کے مغربی بنگال پہنچ چکے ہیں۔ان میں سے دو لاکھ کو تو مفت اناج مہیا کیا جا رہا ہے جس پر ماہانہ 25 لاکھ روپے خرچ ہو رہے ہیں۔ یہ خرچہ اب مزید برداشت نہیں کیا جا سکتا۔''[8]

11 رنومبر کو ڈان نے غالباً جواب آں غزل کے طور پر اس آگ کو اس خبر سے مزید ہوا دی کہ ''مشرقی بنگال کی حکومت نے 10 راکتوبر کو ڈھاکہ میں تین ہندوؤں کو اس الزام میں گرفتار کیا تھا کہ وہ حکومت ہندوستان کی امداد کے لئے چندہ جمع کر رہے تھے تاکہ وہ مشرقی پاکستان پر حملہ کر دے۔ان کے خلاف بنگال سپیشل پاورز آرڈی نینس کے تحت مقدمہ چلایا جا رہا ہے۔'' اس خبر کے ساتھ مشرقی بنگال کے وزیر مال حمید الحق چودھری کا یہ بیان بھی تھا کہ ''پاکستان سردار پٹیل کے رحم وکرم کے سہارے قائم نہیں ہے۔ پاکستان کسی کے خلاف جارحانہ عزائم نہیں رکھتا لیکن اس میں جارحیت کا مقابلہ کرنے کی مطلوبہ طاقت ہے۔پاکستان حیدر آباد نہیں ہے۔''

تاہم 15 رنومبر 1948ء کو ہندوستان کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے کراچی میں ہندوستانی ہائی کمشنر سری پرکاش کے نام ایک تار کے ذریعے اس خطرناک حد تک بڑھتی ہوئی بین المملکتی کشیدگی کو قدرے کم کرنے کی کوشش کی۔اس کا تار یہ تھا کہ ''سردار پٹیل کی تقریر کی غلط تعبیر کی گئی ہے۔ پاکستان کو فوجی کاروائی کی دھمکی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔سردار پٹیل نے تو صرف مشرقی بنگال سے ہندوؤں کی وسیع پیمانے پر نقل مکانی کی وجہ سے پیدا شدہ مسئلہ پر زور دیا تھا۔ اس نقل مکانی کی ہم اور مشرقی بنگال کی حکومت دونوں ہی مخالفت کرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ نقل مکانی مشرقی بنگال میں ہندوؤں کے ساتھ جابرانہ سلوک اور وہاں کے بگڑتے ہوئے معاشی حالات کی وجہ سے ہوئی ہے۔''[9] نہرو کے اس مصالحانہ تار کی بظاہر ایک وجہ تو یہ تھی کہ ان دنوں اقوام متحدہ کا ایک مشن کشمیر میں جنگ بندی کروانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ مغربی دنیا میں حیدر آباد (دکن) کے خلاف ہندوستان کی جارحیت کی مذمت کی گئی تھی اور وہ اس عالمی تاثر کو زائل کرنا چاہتا تھا کہ ہندوستان اپنے گردونواح کے چھوٹے ممالک کے خلاف جارحانہ عزائم رکھتا ہے اور تیسری وجہ یہ تھی کہ 13 رنومبر کو کلکتہ میں محرم کے موقع پر مسلم اقلیت کا قتل عام اور ڈھاکہ میں اس

کاردعمل یہ ہوا تھا کہ 15 رنومبر کو وہاں پر ایک جلوس نکلا تھا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ کلکتہ میں جن مسلمانوں کو قتل کیا گیا ہے ان کا انتقام لیا جائے۔ پھر اسی دن ڈھاکہ میں ریفیوجی لیگ ورکرز یونین کی جانب سے ڈاکٹر نعمان اور وحیدالدین نور (ایڈیٹر الہلال) کا ڈان کے ایڈیٹر کو ایک تار موصول ہوا تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ "کلکتہ کے مسلمانوں کے قتل عام سے مشرقی پاکستان کی صورت حال بڑی کشیدہ ہو رہی ہے۔ ہزاروں مسلمان قتل کر دیئے گئے ہیں۔ مقتولین میں بچے اور عورتیں بھی شامل ہیں۔ مختلف محلوں میں مسلمانوں پر حملے ابھی تک جاری ہیں اور مسلمان عورتوں کی بے آبروئی ہو رہی ہے۔ ہم کلکتہ کے مسلمانوں کے مصائب کے بارے میں پاکستان کی غفلت کے خلاف احتجاج کرتے ہیں اور استدعا کرتے ہیں کہ وہاں فوراً امدادی مشن بھیجے جائیں اور بین الاقوامی سطح پر انکوائری کرائی جائے۔"[10] اس تار میں مبالغہ آمیزی تھی۔ کلکتہ کے اس فساد میں بہت سے مسلمان جاں بحق ہوئے تھے لیکن ان کی تعداد ہزاروں تک نہیں تھی۔ حکومت مغربی بنگال کے 15 رنومبر 1948ء کے سرکاری اعلان کے مطابق اس فساد کے ذمہ دار 24 افراد کو گرفتار کیا گیا تھا اور چونکہ پولیس کی بروقت کاروائی کے باعث حالات معمول پر آ گئے تھے اس لئے کرفیو اٹھا دیا گیا تھا۔ تاہم ڈان نے کلکتہ میں مسلمانوں کے قتل عام اور ہندوستانی ہندوؤں کے عزائم کے بارے میں طویل اداریوں کا ایک سلسلہ شروع کیا جو چار دن تک جاری رہا۔ ان اداریوں کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستانی لیڈروں نے اب اپنی لالچی نظریں مشرقی بنگال پر جما لی ہیں اور وہ پاکستان کے خلاف ایک اور محاذ کھولنے پر غور کر رہے ہیں۔ مشرقی بنگال کی موجودہ صورتحال خود ہندوؤں کے اپنے اقدامات کی پیدا کردہ ہے۔ یہ حقیقت سارے ذمہ دار ہندو لیڈر تسلیم کر چکے ہیں۔

وزیراعظم لیاقت علی خان نے دورۂ بنگال کے دوران وہاں کے عوام کے معاشی ولسانی مطالبات کو رد کر دیا

17 رنومبر کو ڈان کے مذکورہ اداراتی تبصرے ختم ہوئے تو پروگرام کے مطابق 18 رنومبر کو وزیراعظم لیاقت علی خان ڈھاکہ پہنچا۔ 19 رنومبر کو لیاقت علی خان نے ڈھاکہ میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے افسروں کے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے انہیں ہدایت کی کہ وہ اقلیتوں سے نہ صرف منصفانہ بلکہ فیاضانہ سلوک کریں۔ اس نے کہا "مجھے معلوم ہے بہت سے لوگوں کو شکایت

ہے کہ ہمارے ہاں معاشی ترقی کی رفتار سست ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ معاشی ترقی میں وقت لگتا ہے۔ میں اس مقصد کی تکمیل کا انتظار کرسکتا ہوں لیکن دفاعی اقدامات کو پوری رفتار سے آگے بڑھنا ضروری ہے۔ ہم ایک دن کے لئے بھوکا رہ سکتے ہیں لیکن ایک منٹ کے لئے بھی غلام نہیں رہ سکتے۔'' 20 رنومبر کو اس نے ڈھاکہ کے ایک جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے دفاعی امور کی اہمیت کا پھر ذکر کیا اور کہا کہ ''پاکستان کی سلامتی کا مطلب ساری مسلم دنیا کی سلامتی ہے۔ اگر ہمارے ملک پر کوئی ضرب لگی تو اس سے سارے مسلم ممالک میں امن و آزادی کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ لہٰذا تم میں سے ہر شخص کو آزادی کے تحفظ کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہانے کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ یہ آزادی ہم نے بڑی قربانیوں کے بعد حاصل کی ہے۔ میں تمہیں متنبہ کرتا ہوں کہ بنگالی، سندھی اور پنجابی وغیرہ کے طور پر نہ سوچیں۔ اسلام میں ایسے امتیازات کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہم ایک قوم ہیں اور ہمارا ایک ملک ہے۔ اپنے آپ کو ہمہ وقت صرف پاکستانی تصور کریں۔'' اس نے کہا کہ ''ہم پاکستان کے دفاعی تقاضوں سے غافل نہیں ہیں اس لئے ہم نے بجٹ میں اس مقصد کے لئے بھی زیادہ رقم مختص کی ہے۔ ہمیں ان سات لاکھ مسلمانوں کو نہیں بھولنا چاہیے جنہوں نے ہماری آزادی کے لئے اپنی جانیں قربان کی ہیں اور ان 70 لاکھ مسلمانوں کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے جو حصول پاکستان کی خاطر خانماں برباد ہوئے ہیں۔'' 22 رنومبر کو اس نے بسنت کمار کی سربراہی میں کانگرسی ارکان اسمبلی کے ایک وفد سے ملاقات کی۔ اس وفد نے اسے ایک یادداشت پیش کی جس پر اس نے اپنی خصوصی توجہ دینے کا وعدہ کیا۔ 24 رنومبر کو لیاقت علی خان نے کھلنا میں طلبا کے ایک جلسہ میں تقریر کی اور انہیں ہدایت کی کہ وہ سیاسیات میں حصہ نہ لیں اور اپنی پوری توجہ اپنی تعلیم کی طرف مبذول رکھیں۔ 25 رنومبر کو اس نے چٹاگانگ کے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے حاضرین کو متنبہ کیا کہ ہمارا دشمن ہمارے درمیان صوبائی عصبیت و نفرت کے جذبات کے ذریعے ہمارے ملک کو کمزور کرنے کے درپے ہے۔ اس نے کہا کہ ''صوبہ پرستی ملک کی سالمیت کے لئے خطرہ ہے تاہم مشرقی بنگال اور مغربی پاکستان کے درمیان جو جغرافیائی بُعد اور فاصلہ ہے وہ ہمارے لئے بے معنی ہے۔''

27 رنومبر کو لیاقت علی خان صوبہ کے مختلف علاقوں کا سات روزہ دورہ ختم کر کے واپس ڈھاکہ آیا تو اس نے طلبا کے ایک بڑے اجتماع میں شرکت کی۔ اس موقع پر طلبا نے جو سپاسنامہ

پیش کیا اس میں پہلا مطالبہ یہ تھا کہ اردو زبان کی طرح بنگالی کو بھی قومی زبان بنایا جائے اور دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ مرکزی حکومت کی سرکاری ملازمتوں میں آبادی کی بنیاد پر صوبہ وار تخصیص کا سسٹم جاری کیا جائے۔ تیسرا مطالبہ یہ تھا کہ کالجوں میں لازمی فوجی تربیت کا انتظام کیا جائے اور چوتھا مطالبہ یہ تھا کہ صوبہ میں زمینداری نظام کا بلا معاوضہ خاتمہ کیا جائے۔ لیاقت علی خان طلبا کے ان مطالبات پر برہم ہوا اور اس نے ان کو سرزنش کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کی سرکاری زبان کے بارے میں فیصلہ ہو چکا ہے اور وہ فیصلہ یہ ہے کہ اردو ہی اس مملکت کی سرکاری زبان ہوگی۔ اس نے مرکزی ملازمتوں میں آبادی کی بنیاد پر نمائندگی کا اصول رائج کرنے کے مطالبہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ مطالبہ صوبہ پرستی کا مظہر نہیں ہے تو کیا ہے؟ یہ مطالبہ صوبائی عصبیت پر مبنی ہے اور اس لئے قابل مذمت ہے کہ جب تک پاکستان وجود میں نہیں آیا تھا، ہم ملازمتوں کی آبادی کی بنیاد پر تخصیص کی مخالفت کرتے رہے تھے۔ یہ کیا بات ہے کہ اب تم خود ہی یہ مطالبہ کر رہے ہو۔ اگر تم صوبائی عصبیت کے زیر اثر رہے تو پاکستان تباہ و برباد ہو جائے گا۔'' اس نے کہا کہ ''کالجوں میں لازمی فوجی تربیت کی تجویز حکومت کے زیر غور ہے لیکن مشرقی بنگال میں فوری طور پر ملٹری اکیڈمی قائم نہیں کی جا سکتی۔ جہاں تک زمینداری نظام کے بلا معاوضہ خاتمہ کے مطالبہ کا تعلق ہے، یہ دانشمندی پر مبنی نہیں ہے کیونکہ ہم نے ایسا کیا تو پاکستان کے عوام پر سے دنیا کا اعتماد متزلزل ہو جائے گا۔''[11] 29 رنومبر کو لیاقت علی خان نے ڈھاکہ میں ایک پریس کانفرنس میں وعدہ کیا کہ وہ بہار کے مہاجرین کو مرکزی حکومت کی زیر نگرانی مشرقی پاکستان کے کئی اضلاع میں آباد کرنے کی تجویز اور پاکستان کی سرکاری زبان اردو کو صوبہ میں مقبول بنانے کے لئے ضروری اقدامات کی تجویز پر غور کرے گا اور پھر 30 رنومبر کو وہ ڈھاکہ ریڈیو سے الوداعی تقریر نشر کرنے کے بعد واپس کراچی پہنچ گیا۔

لیاقت علی خان نے مشرقی بنگال کا یہ دورہ لندن میں دولت مشترکہ کانفرنس میں شرکت کرنے کے فوراً بعد کیا تھا۔ اخباری اطلاعات کے مطابق اس کانفرنس میں مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید کے دفاعی مسائل زیر بحث آئے تھے اور وہ وہاں سے یہ تاثر لے کر واپس آیا تھا کہ برطانوی سامراج کو مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید میں اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے پاکستان کی اہمیت کا احساس ہے۔ لندن میں 20 راکتوبر کو خود اس کا اپنا ایک اخباری انٹرویو یہ تھا کہ پاکستان مسلم دنیا

کے دفاع میں نہایت اہم کردار ادا کرے گا۔ مطلب یہ تھا کہ برطانیہ نے مشرق وسطیٰ میں اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے پاکستان کی افرادی قوت کے استعمال کے منصوبے کے تحت لیاقت علی خان کو تھپکی دے دی تھی۔ وہ اس بنا پر بڑے اعتماد کے ساتھ مشرقی بنگال کے دورے پر گیا تھا اور وہاں اس کی پہلی تقریر یہ تھی کہ ''پاکستان کی سلامتی عالم اسلام کی سلامتی ہے اگر پاکستان کو کوئی ضرب لگی تو سارے مسلم ممالک کے امن اور آزادی کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔'' اس لئے اس اعتماد ہی کا نتیجہ تھا کہ اس نے اپنے اس دورے کے دوران مشرقی بنگال کے طلبا اور دوسرے عوام کا کوئی ایک مطالبہ بھی تسلیم کرنے پر آمادگی ظاہر نہ کی۔ اس کے اعلانات یہ تھے کہ قومی زبان کا مسئلہ پہلے طے ہو چکا ہے اس لئے اردو زبان کی طرح بنگالی زبان کو قومی زبان بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مرکزی ملازمتوں کے لئے آبادی کی بنیاد پر صوبہ وار تخصیص نہیں کی جاسکتی۔ مشرقی بنگال میں ملٹری اکیڈمی قائم نہیں کی جائے گی اور زمینداری نظام کا بلا معاوضہ خاتمہ نہیں ہوگا۔ اگرچہ لیاقت علی خان کے یہ اعلانات مشرقی بنگال کے تعلیم یافتہ عناصر کے لئے خاصے اشتعال انگیز تھے لیکن وقتی طور پر ان کے خلاف کوئی صدائے احتجاج بلند نہ ہوئی۔ اگرچہ ڈان کے 14 دسمبر کے نیوز لیٹر کے مطابق لیاقت علی خان کی 27 نومبر کی تقریر کے بعد ''بعض بنگالی طلبا نے ہڑتال کروانے کی کوشش کی تھی۔'' ان کی اس کوشش کی ناکامی کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان دنوں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بہت کشیدگی تھی اور سردار پٹیل کی 4 نومبر کی تقریر کے بعد مشرقی بنگال کے بیشتر لوگوں کو واقعی یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ ہندوستان حیدرآباد (دکن) کی طرح مشرقی بنگال کو بھی ہڑپ کر لے گا اور کلکتہ میں 14 نومبر کو مسلمانوں کے قتل عام نے اس خطرہ کو اور بھی زیادہ سنگین اور حقیقی بنا دیا تھا۔ لیاقت علی خان جب یہ کہتا تھا کہ میں قوم کو بھوکا رکھوں گا لیکن اس کی دفاعی حیثیت کو کمزور نہیں ہونے دوں گا تو اس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ پاکستان کے قومی وجود کے لئے ہندوستانی خطرے کا الارم بجا کر ملک کے غریب عوام الناس کی توجہ ان کے ناقابل برداشت معاشی مسائل سے ہٹائی جائے اور جب وہ صوبہ پرستی کی مذمت کرتا تھا تو اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ مشرقی بنگال، سرحد، سندھ اور بلوچستان میں کوئی شخص اپنے علاقے کے لئے سیاسی، معاشی اور ثقافتی حقوق کا مطالبہ نہ کرے۔ سندھ کے جی، ایم سید کے بقول وہ ان دنوں اسلام اور قومی اتحاد اور اردو زبان کے نعروں کے زور پر طلیئروں کی ایک مہاجر سلطنت قائم کرنے کا سہانا خواب دیکھ رہا تھا لیکن

اسے معلوم تھا کہ پنجابی شاونزم کا اژدھا اس کے اس خواب کی تعبیر نہیں ہونے دے گا۔

مرکزی حکومت کی طرف سے پروڈا کا قانون اور صوبائی خودمختاری کے خلاف دلیلیں،...... بنگالیوں کی جانب سے فوجی بھرتی کا مطالبہ

مشرقی بنگال سے لیاقت علی خان کی واپسی کے تقریباً دو ہفتے کے بعد 14 ر دسمبر 1948ء کو پاکستان دستور ساز اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا تو معلوم ہوا کہ اسمبلی کے اس سیشن میں ایک قانون منظور کیا جائے گا جس کے تحت کسی بھی عوامی نمائندے کو ایک مقررہ مدت کے لئے سرکاری عہدے کا نااہل قرار دیا جاسکے گا۔ اگرچہ اس مجوزہ قانون (پروڈا) کا فوری مقصد تو یہ تھا کہ سندھ کے برطرف شدہ وزیراعلیٰ ایوب کھوڑو کو بدعنوانیوں کا مرتکب قرار دے کر اسے صوبہ سندھ کی سیاست میں حصہ لینے کے حق سے محروم کیا جائے لیکن مشرقی بنگال اور پاکستان کے دوسرے صوبوں میں اس کا مطلب یہ سمجھا گیا کہ اس قانون کے زور سے مرکزی حکومت صوبائی حکومتوں کو اپنی فرمانبرداری میں رکھنے کی خواہاں ہے۔ گویا مرکزی حکومت نے اس قانون کے ذریعے وفاقی نظام حکومت کے دستور پر ایک اور کاری ضرب لگائی تھی اور وحدانی طرز حکومت کی طرف ایک اور قدم بڑھایا تھا۔ کراچی اور پنجاب کے بعض سیاسی اور صحافتی حلقوں کی طرف سے پہلے ہی کئی مرتبہ یہ تجویز پیش کی جا چکی تھی کہ ملک میں صوبائی عصبیت کے زہر کو ختم کرنے کے لئے وحدانی طرز حکومت رائج کیا جائے اور وزیراعظم لیاقت علی خان نے نومبر میں اپنے مشرقی بنگال کے دورے کے دوران جس قسم کی تقریریں کی تھیں ان سے بھی یہی تاثر ملتا تھا کہ وہ صوبائی حقوق کے تصور کو پاکستان کے وجود کے لئے نہایت سنگین خطرہ سمجھتا تھا۔ اس نے نہ صرف اردو کی طرح بنگالی زبان کو پاکستان کی سرکاری زبان قرار دینے سے صاف انکار کر دیا تھا بلکہ اس نے مرکزی ملازمتوں میں آبادی کی بنیاد پر صوبہ وار تخصیص کے مطالبہ کو صوبہ پرستی قرار دے کر اس کی سخت مذمت کی تھی۔

بظاہر روزنامہ ڈان نے اسی پس منظر میں 16 ر دسمبر کو ایک اداریہ لکھا جس میں یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ ''مغرب کا جمہوری نظام حکومت، پاکستان کے لئے موزوں نہیں ہے۔ کوئی شخص دیانتداری سے یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ ہندو پاک برصغیر میں یہ نظام حکومت کامیاب رہا ہے۔ یہ نظام حکومت جماعتی سیاسیات پر مبنی ہوتا ہے اور جماعتی سیاسیات، دھڑے بندی سیاسیات سے مل

کر انفرادی سیاسیات کی شکل اختیار کر لیتی ہے...... ہمیں صوبائی خودمختاری کے نہایت اہم مسئلے کی طرف بھی توجہ مبذول کرنی چاہیے۔ صوبے اور صوبائی حکومتیں سامراج کے آخری دور کی پیداوار ہیں جو عوام کے جذبہ آزادی کی اس قسم کے نام نہاد عوامی راج سے تسکین کرنا چاہتا تھا۔ اب جبکہ جذبہ آزادی کی پوری طرح تسکین ہوگئی ہے اور سامراج کی علامتیں پوری طرح مٹادی گئی ہیں تو کیا یہ ضروری ہے کہ ہم ایسا نظام حکومت قائم رکھیں جس کے نقائص اس کی خوبیوں سے بہت زیادہ نمایاں ہیں۔ علاوہ بریں الگ الگ صوبائی یونٹوں کو ان کی موجودہ خودمختار شکل میں برقرار رکھنے پر جو خرچ ہوتا ہے وہ اس نظام کے خاتمہ کے حق میں بڑی وزنی دلیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ پانچ چھ مہینوں میں بہت سے عوامل نے، جن میں وزارتوں اور ان کے مخالفین کے درمیان جھگڑے بھی شامل ہیں، رائے عامہ کو ہمارے اس نظریے کا پرزور طرفدار بنا دیا ہے کہ الگ صوبوں کو واحد یونٹوں...... مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان میں مدغم کر دیا جائے تو اس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا بلکہ بڑا فائدہ ہوگا۔ اس تجویز کی مخالفت چند مفاد پرستوں کے سوا کوئی اور نہیں کرے گا۔ لیکن درحقیقت ان مفاد پرستوں کو اس سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ صوبائی وزارتوں کے خاتمہ سے جو افراد فارغ ہوں گے انہیں بآسانی مرکزی کابینہ یا سفارتی ملازمتوں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔''[12]

اگرچہ اس اداریے کی لاٹھی کا زیادہ تر رخ مغربی پاکستان کے صوبوں کی طرف تھا لیکن اس میں مغرب کے جمہوری نظام حکومت اور صوبائی خودمختاری کے تصور کی جو مخالفت کی گئی تھی اس کی ضرب مشرقی بنگال پر بھی پڑتی تھی لہٰذا وہاں کے تعلیم یافتہ عناصر میں یہ تاثر پختہ تر ہونا ناگزیر تھا کہ کراچی اور پنجاب کے حکمران طبقے سندھ، سرحد اور بلوچستان کو اپنے زیر نگیں کرنے کے ساتھ ساتھ مشرقی بنگال کو اپنی نوآبادی بنانے کا عزم رکھتے ہیں۔ اسی تاثر کی بنا پر وہاں کے باشعور حلقے مسلسل یہ مطالبہ کرتے تھے کہ بنگالیوں کو پاکستان کی بری، بحری اور ہوائی افواج میں بھرتی کے مواقع مہیا کئے جائیں۔ ان حلقوں کی صحیح طور پر یہ رائے تھی کہ اگر پاکستان کی مسلح افواج میں آبادی کی بنیاد پر بھرتی ہوگئی تو پھر کراچی اور پنجاب کے استحصالیوں کے لئے بنگالیوں کے سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی حقوق کو غصب کرنا آسان نہیں ہوگا۔ دوسری طرف کراچی اور پنجاب کے استحصالی عناصر اسلامی اخوت اور مساوات کے دل پذیر نعروں کے باوجود ملک کی آبادی کو مارشل اور نان مارشل نسلوں میں تقسیم کر کے یہ کہتے تھے کہ بنگالی عوام کو ان کی جسمانی توانائی، تعلیمی

قابلیت اور تربیتی صلاحیت کی کمی کی وجہ سے مسلح افواج میں بھرتی نہیں کیا جا سکتا۔ پنجابی شاونسٹوں کا ایک ترجمان تو بنگالیوں کو پولیس میں بھرتی کے قابل بھی نہیں سمجھتا تھا۔ ان کے اس فسطائی موقف کی بنیاد ان کے اس خطرے پر تھی کہ اگر آبادی کی بنیاد پر بنگالیوں کو مسلح افواج میں بھرتی کیا گیا تو قومی زندگی کے ہر شعبہ میں ان کی بالادستی قائم ہو جائے گی۔

مشرقی بنگال کے وزیر اعلیٰ نورالامین کو اچھی طرح معلوم تھا کہ پاکستان کی مسلح افواج میں بنگالیوں کی بھرتی کا مطالبہ کس قدر زوردار تھا۔ چنانچہ 21/دسمبر 1948ء کو کراچی ریڈیو سے اس کی جو تقریر نشر کی گئی اس کے خاصے حصے میں اس مطالبہ کا ذکر تھا۔ اس کی اس تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ مشرقی بنگال کے عوام پاکستان کی بحری فوج میں بھرتی کے لئے بہت ہی موزوں ہیں۔ مارشل اور نان مارشل نسلوں کا تصور سامراجی ہے، بنگالی عوام اپنی شجاعت اور مردانگی کے لحاظ سے کسی سے کم نہیں۔ انگریز وہابی تحریک کے بعد جن سیاسی وجوہ کی بنا پر بنگالیوں کو فوج میں بھرتی نہیں کرتے تھے اب پاکستان میں اس قسم کے امتیازات کو روا نہیں رکھنا چاہیے اور بنگالیوں کو تینوں مسلح افواج میں بھرتی کے پورے مواقع دینے چاہئیں۔"[13]

تاہم 2/جنوری 1949ء کو ڈھاکہ یونیورسٹی کورٹ نے ایک مرتبہ پھر اس مطالبہ کو دہرایا۔ اس سلسلے میں جو قرارداد منظور کی گئی اس میں کہا گیا تھا کہ یونیورسٹی اور اس سے ملحقہ کالجوں میں لازمی فوجی بھرتی کا بندوبست کیا جائے۔ تاہم 3/جنوری کو وزیر اعظم لیاقت علی خان نے صوبائی حقوق کے اس قسم کے مطالبات کو نظر انداز کر کے دستور ساز اسمبلی میں متذکرہ مسودۂ قانون (پروڈا) پیش کیا جو دو دن کی بحث کے بعد 6/جنوری کو منظور کر لیا گیا۔

انجمن ترقی اردو اور کراچی کی تعمیرات کے لئے رقم کی منظوری مگر ڈھاکہ یونیورسٹی کے ترقیاتی منصوبوں کے لئے نامنظوری...... بنگلہ ادبی کانفرنس میں بنگالی قوم پرستی کا مظاہرہ

متذکرہ سیشن کے دوران ایوان کی فنانس سٹیئرنگ کمیٹی نے 22 مدات پر ڈیڑھ کروڑ روپے کے اخراجات کی منظوری دی۔ اس رقم میں سے ساٹھ ستر فیصد رقم کراچی کی دس بارہ تعمیری مدات کے لئے مختص تھی اور اس میں انجمن ترقی اردو کے لئے بھی 20 ہزار روپے کی گرانٹ موجود

تھی۔[14] لیکن ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبا کے لئے نئے ہوسٹلوں اور دوسری عمارتوں کی تعمیر کے لئے جو 20 لاکھ روپے کا مطالبہ کر رکھا تھا فنانس کمیٹی نے اسے درخور اعتنا نہ سمجھا۔ اگرچہ انجمن ترقی اردو کے لئے 20 ہزار روپے کی گرانٹ کی رقم کوئی زیادہ نہیں تھی لیکن ڈھاکہ یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبا میں اس سے جو برہمی پیدا ہوئی وہ خاصی زیادہ تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اردو زبان کو پاکستان کی واحد قومی زبان قرار دینے کے بارے میں قائداعظم جناح اور وزیراعظم لیاقت علی خان کے غیر مبہم اعلانات کے باوجود بنگالیوں کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ نے اس فیصلے کو منظور نہیں کیا تھا اور بنگالی اساتذہ اور طلبا کی طرف سے مسلسل یہ کوشش جاری تھی کہ اردو کی طرح بنگالی زبان کو بھی قومی زبان قرار دیا جائے چنانچہ اس مقصد کے لئے 31 دسمبر 1948ء اور یکم جنوری 1949ء کو ڈھاکہ میں ایسٹ پاکستان ادبی کانفرنس ہوئی تھی جس میں بنگالی ادب کے پروفیسر ڈاکٹر محمد شہید اللہ نے صوبائی وزیر حبیب اللہ بہار کو جو سپاسنامہ پیش کیا تھا اس میں اس نے کہا تھا کہ یہ سچ ہے کہ ہم ہندو اور مسلمان ہیں لیکن اس سے بھی زیادہ سچ یہ ہے کہ ہم بنگالی ہیں۔ یہ کوئی فضول بات نہیں ہے۔ یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔'' ڈاکٹر شہید اللہ نے رابندرا ناتھ ٹیگور کی ایک مشہور نظم کا حوالہ دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ بنگالی ایک قوم ہیں اور پھر کہا کہ ''جیسے بدھ، عیسائی، ہندو اور مسلمان ایک مخلوط قوم ہیں اسی طرح ہماری بنگالی زبان بھی ایک مخلوط زبان ہے...... لہٰذا اس امر کا امکان ہے کہ بنگالی زبان پاکستان اور ہندوستان دونوں ہی ملکوں کی سرکاری زبانوں کی فہرست میں شامل کر لی جائے۔'' اور صوبائی وزیر حبیب اللہ بہار نے اپنی جوابی تقریر میں کہا تھا کہ ''میں اپنے آپ کو بنگالی کہنے پر فخر محسوس کرتا ہوں۔ پرانے زمانے میں بنگالی ادب دیوتاؤں اور دیویوں کی کہانیوں تک محدود تھا لیکن بعد میں مسلمانوں کی تحریروں نے اس موضوع میں وسعت پیدا کر دی۔ اب قیام پاکستان کے بعد ہم بڑے شہر سے چھوٹے شہر میں آ گئے ہیں اور اب ہم توقع کرتے ہیں کہ اس ایک آزاد اور محنتی قوم کا حقیقی ادب مہیا ہوگا۔ میری رائے میں انسان سب سے عظیم ہے اور انسان سے عظیم تر کوئی ہستی نہیں۔''[15]

روزنامہ ڈان نے اپنی 9 جنوری کی اشاعت میں بنگالی ادبی کانفرنس کی اس کاروائی پر سخت نکتہ چینی کی۔ اخبار نے یہ رائے ظاہر کی کہ صوبائی وزیر حبیب اللہ بہار کو مسلمانوں کے بنیادی عقائد کے منافی کوئی بات نہیں کہنی چاہیے تھی اور ڈاکٹر شہید اللہ نے بنگالی قوم کے بارے

میں جو کچھ کہا ہے وہ بیہودگی بلکہ غدارانہ بیہودگی ہے۔ ڈان کی یہ سرزنش بالکل بے سود تھی۔ سرزنش کا کوئی اثر نہ ہونا تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مشرقی بنگال میں بنگالی زبان کا ثقافتی مسئلہ صوبہ کی معاشی زبوں حالی سے منسلک تھا۔

اناج کی مہنگائی کے خلاف عوامی ردعمل کو حب الوطنی اور اسلام کے نعروں سے روکنے کی کوشش

ان دنوں پاکستان دستور ساز اسمبلی کے ایک بنگالی رکن غیاث الدین پٹھان کے بیان کے مطابق صوبہ بھر میں چاول کا بھاؤ اتنا زیادہ بڑھ گیا تھا کہ یہ درمیانہ طبقہ کی دسترس سے بھی باہر ہو گیا تھا اور مشرقی پاکستان مسلم لیگ کے جوائنٹ سیکرٹری اسد علی کا بیان یہ تھا کہ ''صوبہ کی غذائی صورت حال بہت سنگین ہو گئی ہے۔ بعض علاقوں میں بھاؤ چالیس روپے فی من تک پہنچ گیا ہے۔'' ڈھاکہ کے طلبا نے اس ناقابل برداشت معاشی بدحالی کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا کہ صوبائی حکومت کے جبر و تشدد کے خلاف یوم احتجاج منایا جائے گا۔ اگر چہ اس مجوزہ یوم احتجاج کا بظاہر مقصد یہ تھا کہ راجشاہی کالج کے پرنسپل نے جن چار طلبا کو نظم و ضبط کی مسلسل خلاف ورزی کرنے کے الزام میں خارج کیا تھا انہیں دوبارہ کالج میں داخل کروایا جائے۔ لیکن اس سلسلے میں ایسٹ پاکستان مسلم سٹوڈنٹس لیگ نے جو اشتہار چھاپا تھا اس میں یہ مطالبات لکھے تھے کہ ''چاول کی سمگلنگ بند کی جائے، راشن کی دوکانوں پر بہتر معیار کا اناج مہیا کیا جائے، ڈھاکہ کی سڑکوں کی مرمت کی جائے اور رکشا اور گاڑی ڈرائیوروں کے مفادات کا تحفظ کیا جائے۔'' وزیر اعلیٰ نور الامین نے 7 / جنوری کو طلبا کے اس فیصلے کا سخت نوٹس لیا۔ اس کا الزام یہ تھا کہ ''کمیونسٹ اور ملک کے دوسرے دشمن عناصر تعلیمی اداروں میں داخل ہو کر اسلام دشمن اور پاکستان دشمن خیالات پھیلا رہے ہیں۔''[16]

لیکن جب اناج کے نرخوں میں کوئی کمی نہ ہوئی تو طلبا کی ایجی ٹیشن کسی نہ کسی صورت میں جاری رہی۔ نارائن گنج میں پٹ سن کی گانٹھیں باندھنے والے کارخانوں کے مزدوروں نے اپنی تنخواہوں میں اضافہ کے لئے ہڑتال کر دی اور کھلنا، رنگ پور، باریسال، فرید پور اور راجشاہی میں بٹائی کے خلاف کسانوں کی تحریک زور پکڑتی چلی گئی تو کراچی میں یہ فیصلہ ہوا کہ گورنر خواجہ ناظم الدین، مولانا شبیر احمد عثمانی حب الوطنی اور مذہبی نعروں کے ذریعے غریب عوام الناس کی بے چینی

کا علاج کرنے اور صوبائی اسمبلی کے متوقع بجٹ سیشن میں وزیر اعلیٰ نور الامین کے حالات سازگار کرنے کی غرض سے مشرقی بنگال کا دورہ کریں گے۔ قبل ازیں 10 رجنوری 1949ء کو نور الامین مؤخر الذکر مقصد کے لئے بارہ پارلیمنٹری سیکرٹریوں کا تقرر کر چکا تھا۔ یہ دونوں زعما 29 رجنوری کو ایک ساتھ پہنچے اور انہوں نے فوراً ہی مطلوبہ کارروائی شروع کر دی۔ خواجہ ناظم الدین نے ڈھاکہ، باریسال اور بعض دوسری جگہوں پر پبلک جلسوں میں تقریریں کر کے حاضرین کو تسلی دلانے کی کوشش کی کہ صوبہ کے حالات اتنے برے نہیں جتنے کہ بعض عناصر ظاہر کرتے ہیں۔ ان عناصر کا خیال ہے کہ یہ ہماری مشکلات اور کوتاہیوں کے ذکر میں مبالغہ آمیزی کر کے اپنا کام کرا سکتے ہیں۔ ان افراد میں ایسے بھی ہیں جو اپنے آپ کو محب الوطن کہتے ہیں لیکن عملاً وہ ہمہ وقت حکومت کو برا بھلا کہتے رہتے ہیں۔ ان کا مقصد دراصل یہ ہے کہ ملک میں بدامنی پیدا کر کے انقلابی تبدیلی لائی جائے۔'' خواجہ ناظم الدین نے 8 رفروری کو نارائن گنج چیمبر آف کامرس کے ارکان سے ملاقات کی اور انہیں یقین دلایا کہ اگر کمیونسٹ پارٹی جیسی سماج دشمن پارٹیوں نے ملک میں ترقیاتی سرگرمیوں کو سبوتاژ کرنے اور صنعت کو مفلوج کرنے کے لئے مزدوروں میں ایجی ٹیشن کو ہوا دی تو حکومت ان کے خلاف یقیناً مناسب اقدامات کرے گی۔[17] 10 رفروری کو مولانا شبیر احمد عثمانی نے ڈھاکہ میں جمعیت العلمائے اسلام کی دو روزہ کانفرنس کی صدارت کی۔ اس کانفرنس میں تقریباً دس ہزار لوگوں نے شرکت کی اور اس کے آخری سیشن میں ایک قرارداد کے ذریعے مطالبہ کیا گیا کہ ''پاکستان میں انتظامی مقاصد کے قرآنی اصولوں کو رائج کیا جائے اور ایک ایسا آئین مرتب کیا جائے جس کی بنیاد شریعت پر ہو۔''

12 رفروری 1949ء کو ان دونوں کا کام ختم ہوا تو یہ اس سے اگلے دن واپس کراچی پہنچ گئے۔ گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نے ہوائی اڈے پر اخبار نویسوں کو بتایا کہ ''کمیونزم صوبہ میں سرگرم عمل ہے۔ کمیونسٹ عناصر چاول کی مہنگائی کے مسئلہ کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے رہے ہیں کیونکہ کسی وجہ سے دسمبر کے مہینے میں وہاں چاول کی ترسیل بند کر دی گئی تھی لیکن اب جبکہ صوبہ میں چاول کی باقاعدگی کے ساتھ سپلائی شروع ہو گئی ہے تو میرا خیال ہے کہ آئندہ ان کے پروپیگنڈے کا اثر نہیں ہوگا۔''

گورنر جنرل کے اس انٹرویو کا پس منظر یہ تھا کہ اس کے مشرقی بنگال میں دس بارہ دن

قیام کے دوران ضلع میمن سنگھ کے بعض علاقوں میں کسانوں اور پولیس کے درمیان کئی جھڑپیں ہوئی تھیں کیونکہ ان کسانوں نے کمیونسٹ پارٹی کی زیر قیادت زمینداروں کو لگان دینے سے انکار کر دیا تھا۔ کلکتہ کے بعض اخبارات کی اطلاعات کے مطابق ان جھڑپوں میں 100 کسان ہلاک ہوئے تھے لیکن صوبائی حکومت کے ایک سرکاری اعلان کے مطابق ہلاک ہونے والے کسانوں کی تعداد 13 سے زیادہ نہیں تھی۔ 16 رفروری کو لاہور کے اخبار پاکستان ٹائمز نے ایک ادارتی نوٹ میں افسوس کا اظہار کیا کہ مشرقی بنگال میں کسانوں اور پولیس کے درمیان تصادموں میں بہت سے کسان ہلاک اور زخمی ہوئے ہیں اور اسی دن ڈان نے سرخ خطرے کے زیر عنوان میمن سنگھ اور مشرقی بنگال کے بعض دوسرے علاقوں میں کمیونسٹوں کی سرگرمیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے رائے ظاہر کی کہ ''کمیونزم کا مقابلہ محض تشدد کے ذریعے نہیں ہو سکتا بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ غریب عوام کو بھوک، افلاس اور معاشی بے انصافیوں سے نجات دلائی جائے...... اگر عوام الناس کی بے اطمینانی کے اسباب کے انسداد کے لئے مصمم اقدام کئے بغیر محض اپیل سے اس سلسلے میں کوئی کامیابی نہیں ہوگی۔ کیا پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک مرتبہ نہیں فرمایا تھا کہ غریبی بعض اوقات انسان کو الحاد کی جانب دھکیل سکتی ہے۔''[18]

میمن سنگھ کے غریب کسانوں کا یہ خون فروری کے تیسرے ہفتے میں پاکستان مسلم لیگ کونسل کے سہ روزہ اجلاس میں قدرے رنگ لایا جبکہ کونسل میں ایک قرارداد پیش کی گئی جس کے ذریعے بڑے پیمانے پر زرعی اصلاحات کا مطالبہ کیا گیا اور پاکستان مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کو ہدایت کی گئی کہ وہ کسانوں کے حقوق کا چارٹر مرتب کرے۔ اس قرارداد پر 80 منٹ تک بارہ کونسلروں نے تقریریں کیں اور ان سب کی رائے یہ تھی کہ زمینداری نظام کی موجودہ شکل بہت بری ہے۔ بعض کونسلروں کا مطالبہ یہ تھا کہ اس نظام کو بلا تاخیر اور بلا معاوضہ ختم کر دیا جائے بلکہ دوسرے کونسلروں کا خیال تھا کہ اس مسئلہ کا فیصلہ دستور ساز اسمبلی کو کرنا چاہیے۔ کونسل کے اس اجلاس میں ایسٹ بنگال ریلوے کی زبوں حالی، مشرقی بنگال کی غذائی قلت اور وہاں کے عوام کے متعدد دوسرے مسائل کا بھی ذکر ہوا لیکن ان مسائل کا سنجیدگی سے کوئی نوٹس نہ لیا گیا۔ صرف دو ایک بے ضرر سی قراردادیں منظور کی گئیں جن کا مطلب یہ تھا کہ مرکزی ارباب اقتدار بنگالی عوام کے ان مسائل کو حل کرنے کے لئے کوئی مؤثر اقدامات کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔

بنگالیوں کے سول سروسز اور فوج میں بھرتی کے مطالبات نامنظور، پنجابی جوانوں کی ایسٹ پاکستان رائفلز میں بھرتی

22رفروری کو جب مقامی ایسٹ پاکستان کلب نے مشرقی پاکستان سے دستور ساز اسمبلی اور مسلم لیگ کونسل کے ارکان کے اعزاز میں ایک دعوت دی تو اس موقع پر بہت سے مقررین نے اپنے دلوں کی بھڑاس نکالی۔ ان مقررین کی ایک بڑی شکایت یہ تھی کہ بنگالیوں کو مرکزی ملازمتوں میں ان کا جائز حصہ نہیں دیا جاتا۔ روزنامہ ڈان کو بنگالیوں کی اس دریدہ دہنی اور گستاخی پر بہت غصہ آیا چنانچہ اس نے اگلے ہی دن ایک اداریے میں ان کو بہت سرزنش کی۔ اگرچہ ان میں سے بعض کونسلروں کی تقریریں بالکل بے وزن نہیں تھیں۔ اس اداریے کے آخر میں کہا گیا تھا کہ ''جو لوگ مرکزی ملازمتوں میں بنگالیوں کی عدم نمائندگی کی شکایت کرتے ہیں انہیں معلوم نہیں کہ مرکزی ارباب اختیار زیادہ سے زیادہ مشرقی پاکستانیوں کو سول اور فوجی ملازمتوں میں بھرتی کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ لیکن سول سروسز کے لئے بالعموم اور ڈیفنس سروسز کے لئے بالخصوص مطلوبہ جسمانی اور ذہنی صلاحیت کے مشرقی پاکستانی امیدواروں کی تعداد بہت ہی کم رہی ہے۔ سول ملازمتوں میں مشرقی پاکستان کے امیدواروں کے لئے ایک تناسب مقرر کر دیا گیا ہے اور اگر اس پالیسی پر مناسب طریقے سے عمل ہوا تو آئندہ اس سلسلے میں کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان ایڈمنسٹریٹو سروسز (جن میں موزوں امیدواروں کی عدم موجودگی کے باعث مشرقی پاکستان کا مقررہ کوٹا پورا نہیں ہوا) کے سوا مختلف محکموں میں دوسری اسامیاں پر کرتے وقت تناسب قائم نہیں رکھا گیا ہے۔''[19] ڈان کے اس اداریے کا صاف مطلب یہ تھا کہ مرکزی حکومت کی سول سروسز میں تو بنگالیوں کو کچھ حصہ مل سکتا ہے لیکن ڈیفنس سروسز میں ان کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ وہ مطلوبہ جسمانی اور ذہنی صلاحیت کے حامل نہیں ہیں۔

ڈان کے فسطائی موقف کی تائید اسی دن یعنی 23رفروری کو ہی لاہور سے جاری شدہ ایک سرکاری پریس نوٹ سے ہوئی جس کا مضمون یہ تھا کہ ''وہ سابقہ فوجی جو ایسٹ پاکستان رائفلز اور بری فوج میں بھرتی ہونے کے خواہشمند ہیں وہ 26رفروری 1949ء کو مینیجر ریجنل ایمپلائمنٹ

آفس فرید کوٹ ہاؤس مزنگ لاہور کے روبرو پیش ہوں۔ اس سلسلے میں سیالکوٹ کے دفتر روزگار میں 3 /مارچ کو اور جہلم کے دفتر روزگار میں 9 /مارچ کو بھرتی ہوگی۔"[20] اس پریس نوٹ میں کوئی ابہام نہیں تھا۔ یہ مرکزی محکمہ دفاع کے دو نظریوں کا مظہر تھا۔ اول یہ کہ بنگالی نوجوان جسمانی اور ذہنی لحاظ سے اتنی صلاحیت بھی نہیں رکھتے تھے کہ وہ ایسٹ پاکستان رائفلز جیسی نیم فوجی تنظیم میں بھرتی کئے جائیں۔ دوئم یہ کہ پنجابی جوان اس میں بھرتی ہو کر مشرقی بنگال میں غریب کسانوں کی بڑھتی ہوئی تحریک کو بزور قوت کچل سکیں گے۔ پاکستان مسلم لیگ کے جائنٹ سیکرٹری اور دستور ساز اسمبلی کے رکن غیاث الدین پٹھان کا یکم مارچ کو بیان یہ تھا کہ مشرقی بنگال میں کمیونسٹوں کی سرگرمیاں خطرناک حد تک بڑھ گئی ہیں کیونکہ اب پروپیگنڈا نے ملک کے خلاف بغاوت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ان کے خلاف صوبائی حکومت کی بے بسی کا یہ عالم ہے کہ جن کمیونسٹوں کے خلاف مدت ہوئی تخریبی سرگرمیوں کے الزام میں وارنٹ گرفتاری جاری کئے گئے تھے وہ کھلے بندوں پھر رہے ہیں اور اناج اور دوسری ضروریات زندگی کی کمیابی اور مہنگائی سے سیاسی فائدہ اٹھا رہے ہیں۔"[21]

مشرقی و مغربی بنگال اور آسام میں کمیونسٹوں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے خلاف یہاں کی حکومتوں کے مابین اشتراک عمل

کمیونسٹوں کی یہ پرتشدد تحریک صرف مشرقی پاکستان تک ہی محدود نہیں تھی، ہندوستان کے صوبہ جات آسام اور مغربی بنگال میں اس کی شدت بہت زیادہ تھی چنانچہ فروری 1949ء کے تیسرے ہفتے میں کلکتہ میں ڈم ڈم کے ہوائی اڈے، ڈم ڈم کی بارود ساز فیکٹری، انگریزوں کی ایک انجینئرنگ ورکشاپ اور دو پولیس اسٹیشنوں پر حملے ہوئے تھے جن کا مقصد اسلحہ و بارود جمع کرنا تھا۔ چونکہ مغربی بنگال کے ان کمیونسٹوں کا مشرقی بنگال کے کمیونسٹوں سے رابطہ تھا اس لئے ان کے خلاف مشرقی اور مغربی بنگال کی حکومتوں کے درمیان اشتراک عمل شروع ہو گیا۔ ڈان کی اطلاع کے مطابق حکومت مشرقی پاکستان نے اس مقصد کے لئے مغربی بنگال کی سرحد پر سخت پہرا لگا دیا تھا اور گشتی دستوں کی سرگرمیاں تیز کر دی گئی تھیں تاکہ ہندوستان سے کوئی تخریب کار مشرقی پاکستان میں داخل نہ ہو سکے۔ سرحد کے نزدیک ضلعی اور سب ڈویژنل حکام کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ مغربی بنگال کے جو کمیونسٹ عناصر پناہ لینے کی غرض سے مشرقی پاکستان میں داخل ہوتے ہیں

ان کی گرفتاری کے لئے مغربی بنگال کے متعلقہ حکام کی امداد کی جائے۔ [22] ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کے درمیان اس قسم کے تعاون واشتراک عمل کی تجویز یکم جنوری 1949ء کو کشمیر میں جنگ بندی کے فوراً بعد مغربی بنگال کے ایک ممتاز لیڈر سرت چندر بوس نے پیش کی تھی۔ اس نے 3؍جنوری کو لندن میں برطانوی خبر رساں ایجنسی سٹار سے ایک انٹرویو میں یونائیٹڈ نیشنز آف ساؤتھ ایشیا کی تشکیل کی وکالت کی تھی۔ اس کی رائے یہ تھی کہ پاکستان، ہندوستان، نیپال اور سیلون کو بلا تاخیر اس قسم کی تنظیم قائم کرنی چاہیے جو بالآخر یونائیٹڈ نیشنز آف ایشیا کی صورت اختیار کرلے گی۔“[23]

20؍جنوری 1949ء کو ہندوستان کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے بظاہر انڈونیشیا کے حریت پسندوں کی امداد کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ایک ایشیائی کانفرنس بلائی تھی لیکن سوویت اور چینی کمیونسٹوں کی رائے میں اس کانفرنس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ کمیونزم کے سدباب کے لئے ہندوستان کی زیر سرکردگی ایک ایشیائی بلاک کی تشکیل کی جائے۔ 28؍فروری کو جواہر لال نہرو نے برما میں کمیونسٹوں کی بغاوت کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے برطانوی ڈومینیوں کی ایک کانفرنس طلب کی تھی۔ اس کانفرنس میں پاکستان نے بھی شرکت کی تھی اور اس میں فیصلہ ہوا تھا کہ کمیونسٹوں کے خلاف برما کی حکومت کو 6 ملین پونڈ کی امداد دی جائے گی۔ مارچ 1949ء میں برطانیہ کا کنزرویٹو لیڈر انتھونی ایڈن (Anthony Eden) نئی دہلی آیا تھا اور اس نے کمیونزم کے خلاف اینگلو۔ امریکی بلاک کی پروپیگنڈا مہم کے بارے میں جواہر لال نہرو سے خفیہ بات چیت کی تھی اور پھر اپریل 1949ء میں لندن دولت مشترکہ کانفرنس کے دوران نہ صرف مشرق وسطیٰ سے لے کر جنوب مشرقی ایشیا تک کے دفاع کے مسائل زیر بحث آئے تھے بلکہ یہ بھی طے ہوا تھا کہ کس طرح ان علاقوں کو کمیونزم سے بچایا جاسکتا ہے۔

پاکستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے اس کانفرنس کے بعد 29؍اپریل کو لندن میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ”پاکستان میں کمیونزم کا کوئی وجود نہیں ہے لیکن پاکستان کی جغرافیائی پوزیشن ایسی ہے کہ جب کبھی ہمسایہ ممالک میں کمیونسٹوں کے خلاف کوئی اقدام کیا جاتا ہے تو وہ چپکے سے مشرقی پاکستان میں آجاتے ہیں۔“[24]

طلبا کی ہڑتالیں اور گرفتاریاں، مولوی عبدالحق کا اردو زبان کے فروغ کے لئے مشرقی بنگال کا دورہ اور بنگالیوں کا شدید ردعمل

جس دن لیاقت علی خان نے لندن میں مذکورہ باتیں کہی تھیں اسی دن ڈھاکہ میں طلبا کے ایک جلوس پر پولیس نے لاٹھی چارج کیا تھا جس سے پانچ طلبا زخمی ہوئے تھے۔ طلبا کا یہ جلوس گزشتہ پانچ ہفتے سے ڈھاکہ یونیورسٹی میں لوئر گریڈ ملازمین کی ہڑتال کا نتیجہ تھا اور متعلقہ حکام کا الزام یہ تھا کہ یہ ہڑتال اروبندوبوس اور عبدالمنان اور دوسرے کمیونسٹ طلبا کی انگیخت کی وجہ سے ہوئی تھی۔ چونکہ بہت سے طلبا ہڑتالیوں سے اظہار ہمدردی کے لئے آئے دن مظاہرے کرتے تھے اس لئے 28/مارچ کو یونیورسٹی غیر معین عرصہ کے لئے بند کردی گئی تھی۔

طلبا کے ان مظاہروں کی ایک وجہ یہ تھی کہ مارچ کے مہینے میں صوبائی اسمبلی کے بجٹ سیشن کے دوران متعدد ارکان اسمبلی کی جانب سے صوبائی خودمختاری کے جو مطالبات کئے گئے تھے وہ ان کی حمایت کرنا چاہتے تھے۔ لاہور کے اخبار نوائے وقت کی رپورٹ کے مطابق اس سیشن میں سرکاری پارٹی کے اکثر ممبروں نے بھی بجٹ پر تقریریں کرتے ہوئے اس پر سخت تنقید کی۔ عام طور پر ان کی تقریروں میں ان دو باتوں پر زور دیا گیا۔ اولاً تو یہ کہ انکم ٹیکس، سیلز ٹیکس اور جیوٹ ٹیکس کے ذریعے جو روپیہ مرکزی حکومت مشرقی بنگال سے حاصل کرتی ہے اس میں سے صوبہ کو کافی حصہ ملنا چاہیے اور دوسرے یہ کہ صنعت وحرفت کے میدان میں صوبہ کی ترقی کی رفتار بہت سست ہے۔ وزیر اعلیٰ نورالامین نے بھی مشرقی بنگال کی حکومت سے مرکزی حکومت کے سلوک کا سخت گلہ کیا اور کہا کہ ''جب تک مرکزی حکومت ہمارے مطالبات تسلیم نہیں کر لیتی ہماری جدوجہد جاری رہے گی۔''[25]

طلبا کے ان مظاہروں کی ایک وجہ یہ تھی کہ اسی مہینے میں انجمن ترقی اردو کے صدر مولوی عبدالحق نے مشرقی پاکستان کے مختلف علاقوں کا دورہ کر کے یہ پرچار کیا کہ بنگالی زبان کو عربی رسم الخط میں لکھا جائے۔ مشرقی بنگال میں اردو زبان مقبول عام بنانے کے لئے یہ تجویز دراصل 7/فروری 1949ء کو پشاور میں ایجوکیشن ایڈوائزری بورڈ کے اجلاس میں زیر بحث آئی تھی۔ اس موقع پر مرکزی وزیر تعلیم فضل الرحمان نے اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ بنگالی زبان کا موجودہ رسم

الخط بہت مشکل ہے اور اس میں شارٹ ہینڈ اور ٹائپ رائیٹنگ ممکن نہیں ہے۔ انجمن ترقی اردو کا صدر مولوی عبدالحق یہ تجویز لے کر مارچ کے اواخر میں ڈھاکہ پہنچا اور اس نے ہفتہ عشرہ تک کومیلا، چٹاگانگ، سلہٹ اور بعض دوسرے علاقوں کا دورہ کر کے وہاں اردو کا پرچار کیا۔ ساتھ ہی اس کی حمایت کی کہ بنگالی زبان کو عربی رسم الخط میں لکھا جائے۔ کومیلا میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ آئی۔ اے۔ خان کی زیر صدارت ایک پبلک جلسہ ہوا جس میں مولوی عبدالحق نے حاضرین کو تلقین کی کہ وہ اردو زبان کے خلاف مفاد پرستوں کے پروپیگنڈے سے متاثر نہ ہوں۔ اس نے کہا کہ ''قوم کی یک جہتی اور افکار کے اتحاد کے لئے زبان کا اتحاد ضروری ہے اور یہ مقصد صرف اردو زبان سے پورا ہوسکتا ہے لیکن یہاں بنگالی کی جگہ اردو کو رائج کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ بنگالی مشرقی بنگال کی علاقائی زبان ہے لیکن اردو قومی زبان ہے۔''[26]

تاہم ڈھاکہ میں صوبائی وزیر خزانہ حمید الحق چودھری کے اخبار پاکستان آبزور میں ایک مضمون نگار نے نہ صرف اس رائے سے شدید اختلاف کیا کہ قومی اتحاد و یکجہتی کے لئے لسانی اتحاد ضروری ہے بلکہ اس نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی کہ بنگالی زبان کو عربی رسم الخط میں لکھا جائے۔ مضمون نگار کی رائے یہ تھی کہ ''اگر اردو اور بنگالی زبان کا رسم الخط ایک ہی ہو تو اس سے دونوں زبانوں کے درمیان قربت پیدا نہیں ہوگی اور نہ ہی ان میں افکار کی یکسانیت ہوگی۔ بنگالی زبان کو عربی رسم الخط میں لکھنے کی تجویز نے بڑے شبہات کو جنم دیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اس سلسلے میں ''عربی'' کا لفظ محض اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ عوام الناس کے دلوں میں عربی زبان کے لئے جو عزت واحترام ہے اس سے فائدہ اٹھا کر اردو رسم الخط کو رائج کیا جائے۔ کراچی کے جن ارباب اقتدار نے یہ تجویز سوچی ان کی چالاکی کی داد دینی پڑتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ عربی رسم الخط کی مخالفت اردو رسم الخط کے مقابلے میں بہت کم ہوگی۔ جب یہاں عربی رسم الخط رائج ہو جائے گا تو پھر بنگالی زبان میں بتدریج اردو الفاظ واصطلاحات کو شامل کیا جائے گا۔ بہت جلد اردو اور بنگالی کا فرق مٹ جائے گا اور بالآخر رسم الخط کی بظاہر بے ضرر سی تبدیلی سے بنگالی زبان کی موت واقع ہو جائے گی...... لیکن یہ لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کرتے ہیں کہ ایک زبان یا ایک رسم الخط کا لازمی طور پر یہ مطلب نہیں ہے کہ اس طرح ثقافت میں یکسانیت اور قوم میں یک جہتی پیدا ہوگی اور نہ ہی ایک سے زیادہ زبانوں یا رسوم الخط کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ یہ ایک ثقافت اور ایک

قوم کے تصور کے منافی ہوتی ہے۔ بنگال میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبان ایک ہی ہے لیکن ان کی ثقافتیں مختلف ہیں۔ سوئٹزرلینڈ میں چار زبانیں ہیں لیکن اس کے باوجود یہ زبانیں بولنے والے سب لوگ ایک ہی قوم ہیں۔ سوویت یونین میں بھی ایسی ہی صورت حال ہے۔ اگر ہم مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان دوستانہ اور پائیدار روابط کے متمنی ہیں تو ہمیں زبان سے آگے بڑھ کر کچھ دوسرے عوامل پر بھی نظر ڈالنا ہوگی کیونکہ آج کل اس قسم کے روابط کا زیادہ تر انحصار معاشی اور معاشرتی مراعات کے مادی تصورات پر ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض لوگوں کا یہ خیال صحیح ہوگا کہ مادی حالات سے زندگی میں روحانی دولت پیدا نہیں ہوتی لیکن اس حقیقت سے ہر کوئی آگاہ ہے کہ روحانی سکون کے لئے ضروری ہے کہ جسم توانا اور آسودہ ہو۔ مرکزی حکومت نے اس سال جو بجٹ منظور کیا ہے اگر آئندہ چند سالوں میں ایسے بجٹ منظور ہوتے رہے تو لسانی اصلاحات سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا خواہ عربی زبان کو ہی قومی زبان کیوں نہ بنا لیا جائے۔ بنگالی عوام کو اسلامی ثقافت اور اسلامی اتحاد کے کھوکھلے نعروں سے متاثر نہیں ہونا چاہیے''[27] لیکن مولوی عبدالحق پر اس مضمون کا کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے 9راپریل 1949ء کو صوبہ مسلم لیگ کے صدر مولانا اکرم خان کی جانب سے دی گئی ایک دعوت استقبالیہ میں تقریر کرتے ہوئے اس امر پر مسرت کا اظہار کیا کہ مشرقی بنگال میں اردو زبان بہت تیزی سے مقبول ہو رہی ہے۔ اس نے بتایا کہ اس کے اس دورے کے دوران قومی زبان کی ترویج و تبلیغ کے لئے انجمن ترقی اردو کی ایک صوبائی شاخ قائم کر دی گئی ہے جس کے عہدیدار یہ ہیں:

صدر	=	مولانا اکرم خان
نائب صدر	=	خان عبدالرحمان پرنسپل جگن ناتھ کالج ڈھاکہ اور مولانا امین عرفان
جنرل سیکرٹری	=	خواجہ نورالدین
سیکرٹریز	=	ڈاکٹر عندلیب شادانی اور مولانا رکن الدین
جائنٹ سیکرٹریز	=	حکیم ارتضا الرحمان اور سراج الرحمان جعفری
خزانچی	=	عبدالمتین (الٰہی بخش اینڈ کمپنی)

مولوی عبدالحق کے اس پر مسرت اعلان سے دو دن قبل چار طلبا کو ڈھاکہ یونیورسٹی سے

خارج کر دیا گیا تھا اور 17 طلبا سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ تحریری طور پر یقین دہانی کرائیں کہ آئندہ ان کا رویہ اچھا ہوگا اور طلبا کی کونسل آف ایکشن نے اعلان کیا تھا کہ اگر یونیورسٹی کے کارپردازوں نے اپنا یہ حکم واپس نہ لیا تو طلبا کی عام ہڑتال ہوگی اور پھر 13/اپریل کو ڈھاکہ یونیورسٹی کے بنگالی ڈیپارٹمنٹ کے طلبا نے کراچی میں ایجوکیشن ایڈوائزری بورڈ کو ایک میمورنڈم پیش کیا جس میں بنگالی زبان کے لئے عربی رسم الخط رائج کرنے کی تجویز پر برہمی کا اظہار کیا گیا تھا اور یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ ''یہ تجویز غیر آئینی ہے اور اس پر عمل کرنے سے بنگالی زبان کی ثقافتی اور ادبی ترقی کے سارے راستے بند ہو جائیں گے۔ عربی رسم الخط کی تجویز عوام الناس کو فریب دینے کی ایک کوشش کی حیثیت رکھتی ہے اس طرح ثقافتی اتحاد پیدا نہیں ہوگا۔ ثقافتی اتحاد کا واحد راستہ یہ ہے کہ ملک کے مختلف ثقافتی یونٹوں کے درمیان مفاہمت پیدا کی جائے۔''[28]

بنگالی طلبا کی اس برہمی کا اظہار 16/اپریل 1949ء کو ڈھاکہ میں بھی ہوا جبکہ یونیورسٹی کے سینکڑوں طلبا نے کونسل آف ایکشن کے متذکرہ فیصلے کے مطابق ہڑتال کر کے زبردست مظاہرہ کیا۔ تقریباً دو سو طلبا نے وائس چانسلر کے گھر پر دھاوا بول دیا۔ انہوں نے گھر کے فرنیچر اور دوسرے سامان کو توڑ پھوڑ دیا اور پھر ڈرائنگ روم میں ایک جلسہ کر کے زبردست نعرے لگائے۔ طلبا کے اس قسم کے جلوس آٹھ دن تک جاری رہے جس کے دوران پولیس نے کئی مرتبہ آنسو گیس استعمال کی اور لاٹھی چارج کیا جس سے متعدد مظاہرین زخمی ہوئے اور بہت سے گرفتار ہوئے۔ یہ مظاہرے ابھی جاری ہی تھے کہ صوبائی گورنر نے 22/اپریل کو امتناعی نظر بندی کا ایک آرڈیننس جاری کر دیا اور اسی دن کلکتہ کے اخبارات کا مشرقی بنگال میں داخلہ بند کر دیا گیا۔ صوبائی حکومت کی اس کاروائی سے اور بھی اشتعال پھیلا اور طلبا نے 25/اپریل کو دفعہ 144 کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بڑا زوردار مظاہرہ کیا۔ اس دن طلبا سے اظہار ہمدردی کے لئے شہر کی عدالتیں بھی بند رہیں۔

جنوبی تانگیل کے ضمنی انتخاب میں مسلم لیگ کی شکست اور اس کے معاشی وسیاسی اسباب

یہ صورت حال صوبائی حکومت کے لئے بڑی پریشان کن تھی کیونکہ اپریل کے اواخر

میں جنوبی تانگیل میں ضمنی انتخاب ہونے والا تھا جس میں مسلم لیگ کے ایک جغادری امیدوار خرم خان پنی کا ایک نوجوان سیاسی کارکن شمس الحق سے مقابلہ تھا۔ چنانچہ یونیورسٹی کے ارباب اختیار نے طلبا کے مطالبات تسلیم کر کے ان سے مفاہمت کر لی مگر اس وقت نورالامین کی حکومت صوبہ بھر میں اتنی غیر مقبول ہو چکی تھی کہ اس کا امیدوار اس ضمنی انتخاب میں کامیاب نہ ہو سکا۔ شمس الحق 260 ووٹوں کی اکثریت سے جیت گیا۔

یکم مئی 1949ء کو اس نتیجے کا اعلان ہوا تو حمید الحق چودھری کے اخبار پاکستان آبزرور نے 3 رمئی کو اپنے ادارتی تبصرے میں یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ''جنوبی تانگیل میں خرم خان پنی کی انتخابی شکست برسر اقتدار پارٹی مسلم لیگ کے لئے بدشگونی کی علامت ہے۔ اس سے پورے صوبہ میں مایوسی پیدا ہوگی...... مسلم لیگ اور صوبائی وزارت کو اس سے سبق سیکھنا چاہیے اور اپنی سیاسی بقا کے لئے محض ماضی کے کارناموں پر انحصار کرنا نہیں کرنا چاہیے بلکہ اسے نئے تصورات اور نئے جوش وجذبہ کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے۔'' لیکن جو بات پاکستان آبزرور نے اپنے تبصرے میں نہیں لکھی تھی وہ یہ تھی کہ مشرقی بنگال کا یہ ضمنی انتخاب نورالامین کی صوبائی حکومت کے مقابلے میں نہ صرف لیاقت علی خان کی مرکزی حکومت کے لئے بلکہ پاکستان کے وجود کے لئے زیادہ بدشگونی کی علامت تھا۔ اس زمانے میں لیاقت علی خان اور مس فاطمہ جناح کے درمیان تضاد کھل کر سامنے آ چکا تھا۔ پنجاب میں ممدوٹ وزارت کی برطرفی کے بعد پنجابی عصبیت کا بھوت برسر عام ناچنے لگا تھا اور سندھ میں ایوب کھوڑو کی زیر قیادت مقامی شاونزم پورے عروج پر تھا۔ ایسے حالات میں تانگیل کے ضمنی انتخاب میں مسلم لیگ کی شکست کا مطلب یہ تھا کہ مشرقی بنگال میں احساس محرومیت ایک خطرناک راستے پر چل پڑا تھا۔ متحدہ بنگال کے سابق وزیر اعلیٰ حسین شہید سہروردی نے پاکستان دستور ساز اسمبلی کی رکنیت سے الگ کئے جانے کے باوجود پاکستان کی مستقل شہریت اختیار کر لی تھی اور وہ لیاقت علی خان کے اقتدار کو چیلنج کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ آل پاکستان سٹیٹس مسلم لیگ کے صدر منظر عالم کا تانگیل کے اس انتخابی نتیجے پر تبصرہ یہ تھا کہ ''یہ ضمنی انتخاب قیام پاکستان کے بعد نہایت اہم سیاسی واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس سے مسلم لیگ کی عوامی نمائندگی کے ڈھول کا پول کھل گیا ہے۔ خرم خان پنی مشرقی بنگال میں ایک بڑے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک عدالتی ٹربیونل نے 15 رمارچ 1949ء کو اسے انتخابات میں حصہ لینے کے

لئے نااہل قرار دیا تھا لیکن صوبائی حکومت نے اس عدالتی فیصلے کے صرف 15 دن بعد یعنی 30 مارچ کو اس کی نااہلیت کو کالعدم قرار دے دیا اور پاکستان مسلم لیگ نے فوراً ہی اسے اپنا امیدوار بنالیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلم لیگ اور صوبائی حکومت عدالتوں کا کتنا احترام کرتی ہیں۔ خرم خان کے مقابلے میں ایک نہایت غریب نوجوان امیدوار تھا جس کے پاس کوئی مالی ذرائع نہیں تھے لیکن اس نے یہ ضمنی انتخاب جیت کر یہ ثابت کردیا ہے کہ مسلم لیگ ملک کی مختلف وزارتوں کے لئے قوت کا سرچشمہ ہونے کی بجائے ان کی کمزوری کا باعث ہے۔"[29]

مشرقی بنگال کی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے 16 مئی کو تانگیل کے ضمنی انتخاب میں مسلم لیگی امیدوار کی شکست کی وجوہ اور اس کے سیاسی نتائج کا جائزہ لیا۔ اس وقت صوبہ میں شمالی اضلاع میں غیر معمولی بارش کے باعث اوس اور بورو کی فصلیں بالکل تباہ ہوچکی تھیں اور یہ خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اگر ابھی سے آئندہ آٹھ ماہ کے لئے اناج کی بہم رسانی کا معقول انتظام نہ کیا گیا تو اس کے نتائج نہایت سنگین ہوں گے۔ مرکزی وزیر خوراک پیرزادہ عبدالستار ایسی ہی تشویشناک اطلاعات کے پیش نظر اسی دن ڈھاکہ پہنچا تھا۔ مجلس عاملہ نے اپنے اس اجلاس میں جو سب سے پہلی قرارداد منظور کی وہ صوبہ کے غیر بنگالی افسروں کی رعونت اور عوام الناس سے ان کے توہین آمیز سلوک کے بارے میں تھی۔ قرارداد میں کہا گیا تھا کہ "اب جبکہ آزادی کے بعد اقتدار اعلیٰ عوام کو منتقل ہوگیا ہے اور ہر شہری کو عزت ووقار کا ایک نیا مقام مل گیا ہے تو سارے حلقوں کو بالعموم اور مستقل سرکاری ملازمین کو بالخصوص عوام کے اس وقار کو تسلیم کرنا چاہیے۔ مجلس عاملہ کو کچھ عرصہ سے یہ شکایات موصول ہوتی رہی ہیں کہ بعض حکام عوام الناس سے اچھا سلوک نہیں کرتے۔ ان کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور وہ شہریوں سے پرانے افسر شاہی طریقے سے پیش آتے ہیں۔ مجلس عاملہ ایسے سرکاری افسروں کو تلقین کرتی ہے کہ وہ خوش اخلاقی کو اپنائیں اور شہریوں سے ہمدردانہ سلوک کریں۔ صوبائی حکومت کو ایسے افسروں کو اپنے رویے میں اصلاح کرنے پر مجبور کرنا چاہیے اور ان کی کارگزاری پر نظر رکھنی چاہیے۔" صوبائی مسلم لیگ کی اس قرارداد کا مطلب یہ تھا کہ اس وقت تک صوبہ میں غیر بنگالی افسروں کی رعونت اور بدسلوکی کے خلاف عوام الناس کی شکایات اتنی زیادہ ہوگئی تھیں کہ مسلم لیگ جیسی پٹھو جماعت بھی اس کا نوٹس لئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ کراچی کے روزنامہ ڈان اور ڈھاکہ کے پاکستان آبزرور میں اس سلسلے

میں کئی شکایتی خطوط شائع ہو چکے تھے اور بعض سیاسی حلقوں کا خیال یہ تھا کہ تانگیل کے ضمنی انتخاب میں مسلم لیگی امیدوار کی شکست کی ایک بڑی وجہ غیر بنگالی بیوروکریسی کی فرعونیت میں مضمر تھی۔

مجلس عاملہ کی دوسری قرارداد یہ تھی کہ ''پاکستان کی خود مختار ریاستوں کے قیام سے اس تاریخی بے انصافی کا ازالہ کرنا ممکن ہو گیا ہے جو مسلم اکثریتی علاقوں کو معاشی طور پر پسماندہ رکھنے کے لئے منظم طریقے سے کی گئی تھی۔ مجلس عاملہ کو اس حقیقت کا احساس ہے کہ تحریک آزادی کے پس پردہ سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ عوام الناس اپنا معیار زندگی بلند کرنے کے موقع کے متلاشی تھے۔ مسلمانوں کا بحیثیت مجموعی بہت استحصال ہوا ہے۔ وہ انفرادی طور پر اپنی معیشت کو بعجلت ترقی دینے کے ذرائع نہیں رکھتے اور اگر ایسا نہ ہوا تو ملک کا وجود سخت خطرے میں پڑ جائے گا۔ معاشی سرگرمی کی بنیاد اجتماعی معیشت کے اصول اور نجی منافع کی بجائے خدمت کے جذبہ پر ہونی چاہیے۔ یہ نہ صرف اسلام کے جمہوری جذبے کے عین مطابق ہے بلکہ یہ معاشی نظام کی بہتر شکل ہے۔ اس طرح پیداواری قوتوں کی جلدی سے ترقی ہو گی اور افرادی محنت کی پیداوار کی منصفانہ تقسیم ہو گی۔ عوام الناس کے حالات کو بلا تاخیر بہتر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سرمایہ دارانہ رجحانات کو فروغ دینے کی بجائے اجتماعی معیشت کے اصول کو اپنایا جائے اور اس مقصد کے لئے ایک پلاننگ کمیٹی کی تشکیل کی جائے جو معاشی ترقی کا پروگرام تیار کرے۔''[30] صوبائی مسلم لیگ کی اس دوسری قرارداد کا پس منظر یہ تھا کہ مشرقی بنگال میں چند افراد کا سرمایہ دارانہ معیشت کی ترقی کے لئے نجی سطح پر سرمایہ کا ارتکاز ممکن نہیں تھا کیونکہ غیر بنگالی سرمایہ دار پٹ سن اور چائے وغیرہ کے کاروبار سے جو دولت کماتے تھے وہ اس سے مقامی طور پر سرمایہ کاری نہیں کرتے تھے بلکہ وہ اپنا فالتو سرمایہ کراچی اور پنجاب میں منتقل کر دیتے تھے۔ مشرقی بنگال کے درمیانہ طبقہ کو اپنے غریب عوام کے اس استحصال کا اگست 1947ء کے چند ماہ بعد ہی احساس ہو گیا تھا۔ چنانچہ حمید الحق چودھری اور بعض دوسرے عناصر نے ایک منصوبہ کے تحت صوبائی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کی تجاویز پیش کی تھیں مگر کراچی میں وزیر خزانہ غلام محمد اور ڈھاکہ میں چیف سیکرٹری عزیز احمد وغیرہ نے ان کی اس قسم کی کسی تجویز کو زیر عمل نہیں آنے دیا تھا اور جب وہ اس سلسلے میں واویلا کرتے تھے تو ان پر صوبہ پرستی کا الزام عائد کیا جاتا تھا۔

غذائی قلت اور مہنگائی کا شدید دباؤ اور مسلم لیگ کی کوکھ سے عوامی مسلم لیگ کا جنم

مجلس عاملہ کے 17/مئی 1949ء کے اجلاس میں مرکزی وزیر خوراک پیرزادہ عبدالستار نے بھی شرکت کی اور اس نے یقین دلایا کہ شمالی اضلاع میں غیر معمولی بارش کے باعث فصلوں کو جو نقصان پہنچا ہے اس کے ازالہ کے لئے مرکزی حکومت صوبائی حکومت کی ہر ممکن امداد کرے گی لہٰذا ہمیں کسی قحط کا خطرہ لاحق نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن یہ یقین دہانی کھوکھلی ثابت ہوئی اور صوبہ کی غذائی صورت حال زور بروز خراب ہوتی چلی گئی۔ جون 1949ء کے اوائل میں ڈان کی اطلاع یہ تھی کہ مشرقی بنگال میں غذائی اشیا کی مہنگائی کے باعث چھوٹے اور متوسط درجہ کے تنخواہ دار لوگوں کی روزمرہ کی خوراک بری طرح متاثر ہو رہی ہے۔ سرسوں کا تیل اڑھائی تین روپے سیر بک رہا ہے حالانکہ اس میں بہت ملاوٹ ہوتی ہے۔ گوشت کا نرخ بہت چڑھ گیا ہے اور مچھلی و انڈوں کی سپلائی میں بہت کمی ہوگئی ہے کیونکہ یہ دونوں چیزیں ہندوستان اور برما کو برآمد کی جا رہی ہیں۔ پاکستان آبزرور کی سریش باڑی سے خبر یہ تھی کہ مقامی منڈی میں چاول کا بھاؤ 45 روپے من ہے۔ اگر حکومت نے اس مہنگائی میں کمی کرنے کے لئے فوری طور پر کوئی مؤثر اقدام نہ کیا تو خطرناک صورت حال پیدا ہو جائے گی۔

12/جون کو لاہور کے اخبار پاکستان ٹائمز نے مشرقی بنگال میں غذائی قلت کا جو نقشہ کھینچا وہ بہت ہی تشویشناک تھا۔ اخبار کا تخمینہ یہ تھا کہ سال رواں میں وہاں چار لاکھ 18 ہزار ٹن اناج کی کمی ہوگی جبکہ گزشتہ سال ایک لاکھ بیس ہزار ٹن کی قلت تھی۔ اور 15/جون کو پاکستان آبزرور کی سراج گنج سے اطلاع یہ تھی کہ ''وہاں چاول کی اس قدر قلت اور مہنگائی ہے کہ بعض لوگ بھوک سے سسک سسک کر مرنے کی بجائے خودکشی کر رہے ہیں۔ چاول کا بھاؤ 45 روپے من اور دھان کا بھاؤ 28 روپے من ہے چونکہ عام لوگوں میں اس بھاؤ پر اناج خریدنے کی مالی سکت نہیں ہے اس لئے وہ اپنی جھونپڑیاں اور اپنے مویشی بیچ رہے ہیں۔ نتیجتاً مویشیوں کی قیمت 50 فیصد سے کم ہوگئی ہے۔''

مشرقی بنگال کی اس غذائی زبوں حالی میں 18/جون کو صوبائی مسلم لیگ کونسل کا دو روزہ اجلاس شروع ہوا تو پہلے ہی دن بہت ہنگامہ ہوا اور کونسلروں کی باہمی مکا بازی اور ہاتھا پائی اور

گالی گلوچ کے باعث لیگ کے سیکرٹری یوسف علی چودھری کی رپورٹ کے سوا کوئی خاص کاروائی نہ ہو سکی۔ پاکستان مسلم لیگ کا صدر چودھری خلیق الزماں صوبائی کونسل کے اس اجلاس میں شرکت کے لئے اسی دن ڈھاکہ پہنچا تھا کیونکہ اسے اور کراچی کے دوسرے متعلقہ لیڈروں کو یہ خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ مشرقی بنگال کی مسلم لیگ کا تنظیمی ڈھانچہ سیاسی اور معاشی دباؤ کے باعث پارہ پارہ ہو جائے گا۔صوبائی لیگ کا صدر مولانا اکرم خان پہلے ہی اندرونی اختلافات کے باعث استعفیٰ پیش کر چکا تھا اور بھاشانی گروپ اپنی ایک علیحدہ تنظیم بنانے کی تجویز پر غور کر رہا تھا۔ جبکہ حسین شہید سہروردی کا 17 رجون کو نارائن گنج میں اعلان یہ تھا کہ ''میں نے پاکستان میں رہ کر یہاں کے عوام کی فلاح و بہبود کے لئے اپنی زندگی وقف کرنے کا قطعی فیصلہ کر لیا ہے۔'' اگرچہ کونسل کے اس اجلاس کے ایجنڈے میں غذائی قلت کا مسئلہ سرفہرست تھا۔ تاہم دہلی کے اخبار سٹیٹسمین (Statesman) کی اطلاع کے مطابق صوبائی لیگ کے جنرل سیکرٹری یوسف علی چودھری نے پہلے دن جو رپورٹ پیش کی اس میں چین اور برما میں کمیونزم کے روبہ اضافہ خطرے کا ذکر کیا اور مطالبہ کیا کہ مشرقی بنگال میں اس خطرے کے سدباب کے لئے ہر بالغ کو فوجی تربیت دی جائے اور یہ بھی مطالبہ کیا کہ کمیونزم کے خطرے سے پیدا شدہ صورت حال سے نمٹنے کے لئے مشرقی پاکستان کی خودمختاری میں اتنی توسیع کی جائے کہ مرکزی امور کے بارے میں بھی علاقائی سطح پر فیصلے ہو سکیں۔ اس نے صوبہ میں غذائی قلت کے اسباب پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی کہ لازمی لیوی سکیم کا نتیجہ اس لئے غیر تسلی بخش رہا ہے کہ اس سلسلے میں حکومت اور مسلم لیگ کے درمیان اشتراک عمل نہیں تھا۔ اگلے دن 19 رجون کو کونسل کا دوسرا اجلاس ہوا تو غذائی مسئلہ پر بڑی گرما گرم بحث ہوئی۔ تاہم متحدہ بنگال کے ایک سابق وزیر شمن الدین احمد نے محکمہ سول سپلائیز کے خلاف جو قرارداد پیش کی وہ منظور نہ ہو سکی۔ البتہ اس مضمون کی قرارداد منظور ہو گئی کہ ''سرکاری حکام کو عوام الناس سے حقارت آمیز سلوک نہیں کرنا چاہیے۔'' اس اجلاس کی کچھ کاروائی بند کمرے میں ہوئی جس کے دوران چودھری خلیق الزماں نے قومی اور بین الاقوامی صورتحال پر روشنی ڈالی اور یہ بھی بتایا کہ مولانا اکرم خان نے اپنا استعفیٰ واپس لے لیا ہے۔

لیکن صوبائی مسلم لیگ کے اتحاد کو پھر بھی قائم نہ رکھا جا سکا اور 25 رجون 1949ء کو ڈھاکہ میں مسلم لیگی کارکنوں کے ایک اجلاس میں سرکاری مسلم لیگ کے مقابلے میں مشرقی

پاکستان عوامی مسلم لیگ کی بنیاد ڈال دی گئی۔ عطا الرحمان خان ایڈووکیٹ کی زیر صدارت اس اجلاس میں ایک تنظیمی کمیٹی منتخب کی گئی جس کا صدر آسام مسلم لیگ کا سابق صدر مولانا عبدالحمید بھاشانی تھا۔ سیکرٹری کے عہدے کے لئے صوبائی اسمبلی کے ایک نوجوان رکن شمس الحق کا انتخاب ہوا اور جائنٹ سیکرٹری کا عہدہ ایک اور نوجوان شیخ مجیب الرحمان کو دیا گیا جوان دنوں جیل میں نظر بند تھا۔ کمیٹی کے 31 ارکان میں متحدہ بنگال کے سابق وزیر اعلیٰ مولوی فضل الحق کے علاوہ ایک سابق وزیر شمس الدین احمد بھی شامل تھا۔ اس گروپ نے 1948ء میں بھی مسلم لیگ کی رکنیت سازی کے موقع پر لیگ کی صوبائی قیادت اور صوبائی حکومت کے خلاف منظم طریقے سے مہم چلا کر صوبائی مسلم لیگ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر ان کی یہ کوشش اس لئے کامیاب نہیں ہوئی تھی کہ چودھری خلیق الزماں نے رکنیت سازی کی معیاد میں توسیع کرنے سے انکار کر کے انہیں مطلوبہ فارم مہیا کرنے سے انکار دیا تھا اور الزام عائد کیا تھا کہ بعض وطن دشمن عناصر مسلم لیگ پر قبضہ کر کے دونوں بنگالوں کے اتحاد کے لئے راستہ ہموار کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم اب مولانا بھاشانی کی زیر صدارت عوامی مسلم لیگ کی تشکیل اس لحاظ سے بہت تاریخی اہمیت کی حامل تھی کہ اس سے مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کے ایک حلقے کی جانب سے اس مسلم لیگ کی منظم طریقے سے مخالفت کی ابتدا ہوئی تھی جس کی زیر قیادت اگست 1947ء میں برصغیر کے مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل پاکستان کی مملکت وجود میں آئی تھی۔ گویا صرف دو سال کے عرصے میں مسلم لیگ مشرقی پاکستان میں اپنی مقبولیت اسی قدر کھو چکی تھی کہ بعض ممتاز مسلم لیگیوں کے لئے سیاسی لحاظ سے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ اس روبہ زوال جماعت سے الگ ہو کر اپنی نئی جماعت قائم کریں۔ لیکن اس دو سال کے دوران مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کے عوامی جماعت کی حیثیت سے محروم ہو جانے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ کراچی کے مسلم لیگی ارباب اقتدار نے 1940ء کی قرارداد پاکستان کے برعکس وحدانی نظام مسلط کرنے کی کوشش کی تھی۔ حالانکہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان جغرافیائی، تاریخی، سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی لحاظ سے زمین و آسمان کا فرق تھا۔ چونکہ ان کی مرکزیت پسندی نے ہر طبقہ کے بنگالی عوام کو ہر قسم کے حقوق سے محروم کر رکھا تھا اس لئے ان کے خلاف منظم طریقے سے بیزاری کا اظہار ہونا ناگزیر تھا۔ 25/جون 1949ء سے قبل ایسا محض اس لئے نہیں ہوا تھا کہ وہاں کے مسلم عوام کے دلوں میں کلکتہ کے ہندو مارواڑی سرمایہ داروں اور

ہندو بنگالی زمینداروں کے دوسوسالہ استحصال کے زخم ابھی تازہ تھے اور وہ ان تاریخی استحصالیوں کے چنگل میں دوبارہ کسی قیمت پر نہیں پھنسنا چاہتے تھے۔

جون 1949ء میں نئی جماعت کی تشکیل کے لئے حالات بہت سازگار تھے۔ تانگیل کے ضمنی انتخاب میں شکست کے بعد مسلم لیگ کا سیاسی بھرم ٹوٹ چکا تھا۔ چاول کی قلت اور مہنگائی کے باعث عوام الناس بلبلا رہے تھے۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے کوئی ذریعہ روزگار نہیں تھا۔ صوبہ میں صنعت وحرفت کی ترقی کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا اور مرکزی ملازمتوں کے دروازے ان پر عملاً بند تھے۔ حمید الحق چودھری کے 3/جولائی کے بیان کے مطابق سٹہ بازی کے باعث پٹ سن کا کاروبار بہت مندا تھا اور غریب کسانوں کو اپنی اس نقد آور فصل کی بہت کم قیمت مل رہی تھی۔ اردو زبان کے شیدائیوں کی یلغار کے باعث بنگال کی ثقافت خطرے میں تھی اور غیر بنگالی افسروں کی فرعونیت کے خلاف عوامی شکایتوں کا انبار بلند سے بلند ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود پاکستان مسلم لیگ کا صدر چودھری خلیق الزماں اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا تھا کہ اس کی مسلم لیگ، مشرقی بنگال میں عوامی سطح پر زوال پذیر ہوگئی ہے۔ اس کی رائے یہ تھی کہ ''مولوی فضل الحق اور شمس الدین احمد جیسے افراد نے متوازی مسلم لیگ شروع کی ہے۔ شاید ان کا مقصد یہ ہے کہ لیگ کے نظریے کو تباہ کیا جائے جس کی وجہ سے بعض اعلیٰ پایہ کے مسلم لیگیوں کو عظیم تر بنگال قائم کرنے میں ناکامی ہوئی تھی۔ عظیم تر بنگال کی تجویز کا مقصد یہ تھا کہ نظریہ پاکستان کو خوش اسلوبی سے دفن کر دیا جائے۔ مجھے امید ہے کہ مشرقی بنگال کے مسلمان اس قسم کی انتشار پسند سرگرمیوں کو برداشت نہیں کریں گے اور لیگ کے مخالفین کو اپنے کھیل کے بے سود ہونے کا احساس ہو جائے گا۔''[31]

بظاہر صوبائی مسلم لیگ کے صدر مولانا اکرم خان کو چودھری خلیق الزمان کی اس رائے سے سو فیصد اتفاق نہیں تھا اسی لئے اس نے 7/جولائی کو ایک پریس کانفرنس میں اپنا وہ خط برائے اشاعت جاری کر دیا جو اس نے صوبہ میں مسلم لیگ کی حیثیت کے بارے میں چودھری خلیق الزماں کو لکھا تھا۔ اس نے اس خط میں لکھا تھا کہ مشرقی بنگال میں مسلم لیگ کی مقبولیت میں کمی ہوئی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ سرکاری حکام مسلم لیگ کی کوئی پرواہ نہیں کرتے اور وہ کسی معاملے میں بھی مسلم لیگی لیڈروں سے مشورہ نہیں کرتے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مسلم لیگ کے پاس عوام کی فلاح وبہبود کا کوئی واضح پروگرام نہیں ہے اور تیسری وجہ یہ ہے کہ مسلم ارکان اسمبلی میں بعض ایسے

مفاد پرست اور موقع پرست ارکان بھی ہیں جو انتہائی نازک موقع پر مسلم لیگ کی کمر میں چھرا گھونپنے سے دریغ نہیں کرتے۔ [32] مولانا اکرم خان کا یہ خط 8 رجولائی کو اخبارات میں شائع ہوا تو اسی دن صوبائی اسمبلی کے تین مسلم لیگی ارکان انورا خاتون، خیرات حسین اور چودھری شمس الدین احمد کو مسلم لیگ سے خارج کر دیا گیا۔ ان کے خلاف الزام یہ تھا کہ انہوں نے پاکستان دستور ساز اسمبلی کے ایک ضمنی انتخاب کے موقع پر حسین شہید سہروردی کے حق میں کھلم کھلا کنویسنگ کی تھی۔ مولانا اکرم کی اس کاروائی سے صوبائی مسلم لیگ میں پھوٹ کی کاروائی قطعی طور پر مکمل ہو گئی حالانکہ ان دنوں صوبہ میں غذائی مسئلہ پر قابو پانے کے لئے مسلم لیگ میں اتحاد و یک جہتی کی ضرورت تھی۔ اناج کی قلت اتنی شدید تھی کہ صوبہ لیگ کے جنرل سیکرٹری یوسف علی چودھری کا 7 رجولائی کو بیان یہ تھا کہ ”اگر اس قلت پر قابو پانے کے لئے فوری اقدامات نہ کئے گئے تو اس امر کا خدشہ ہے کہ 1943ء کی ہولناک تاریخ کا اعادہ ہوگا۔“ 10 رجولائی کو کراچی کے اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ کا تبصرہ یہ تھا کہ مشرقی بنگال کے غذائی مسئلہ کو بلا تاخیر حل نہ کیا گیا تو اس کے مہلک نتائج برآمد ہونگے اور 14 رجولائی کو مشرقی بنگال سے دستور ساز اسمبلی کے رکن نور احمد کی وزیر اعظم لیاقت علی خان اور گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین سے استدعا یہ تھی کہ ”مشرقی بنگال میں غریب عوام اناج مہیا نہ ہونے کی وجہ سے بڑی مصیبت میں مبتلا ہیں۔ انہیں راشن کی دوکانوں پر سستا اناج دینے کے لئے ایک کروڑ روپے کی امداد دی جائے۔ 44-1943ء کے قحط کے زمانے میں ایسا ہی کیا گیا تھا۔“

غالباً نور احمد کی اس دردمندانہ استدعا کی بڑی وجہ یہ تھی کہ چاول اور دوسری ضروریات زندگی کی مسلسل کمیابی اور مہنگائی کی وجہ سے پاکستان سے بیزاری اور بنگالی قوم پرستی میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ ڈان کی ایک رپورٹ کے مطابق جولائی میں پورے صوبہ میں ثقافتی میٹنگوں میں یکا یک اضافہ ہو گیا تھا اور صوبائی وزیر صحت حبیب اللہ بہار نے بھی اس قسم کی کئی ایک میٹنگوں میں شرکت کی تھی اور پاکستان آبزرور میں رابندر ناتھ ٹیگور کے بارے میں ایک مضمون چھپا تھا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ ”ثقافت کی تقسیم نہیں ہوئی۔ بنگال ایک شخص تھا اور شخص کا نام ٹیگور تھا۔“

باب:6

صوبائی مسلم لیگ کی جانب سے معاشی، سیاسی، انتظامی وثقافتی خودمختاری کے مطالبات اور کراچی و پنجاب کا فسطائی رویہ

صوبائی وزیر خزانہ وتجارت حمید الحق چودھری کا اخبار پاکستان آبزرور ......بورژواپواقوم پرستی کا ترجمان

پاکستان آبزرور نے 12راگست 1949ءکوایک اداریے میں یہ شکایت کی کہ اگرچہ مشرقی پاکستان سے برآمدی تجارت کی آمدنی مغربی پاکستان کی برآمدی تجارت سے بہت زیادہ ہے لیکن مشرقی پاکستان میں جو مال درآمد کیا جاتا ہے اس کی مالیت مغربی پاکستان میں درآمد شدہ مال کی قیمت سے بہت کم ہوتی ہے۔ اداریے میں اس شکایت کی تائید میں حکومت ہندوستان کی طرف سے شائع کردہ اعدادوشمار کا حوالہ دے کر اس حقیقت کی نشاندہی کی گئی کہ ''پاکستان سے ہندوستان کو 107 کروڑ روپے کا مال برآمد کیا گیا ہے جس میں سے 72 فیصد مال مشرقی پاکستان سے گیا ہے۔ ہندوستان سے پاکستان میں 73 کروڑ روپے کے مال کی درآمد ہوئی ہے جس میں سے صرف 35 فیصد حصہ مشرقی پاکستان میں درآمد ہوا ہے...... مشرقی پاکستان کی برآمدی تجارت سے جو زیادہ آمدنی ہوئی ہے وہ مرکزی ٹیکسوں، بینکوں انشورنس کمپنیوں اور دوسرے مالی اداروں کی فالتو دلالیوں کی صورت میں کراچی چلی جاتی ہے۔ یہ مالی ادارے اپنی آمدنی میں سے مشرقی پاکستان میں بہت ہی تھوڑی سرمایہ کاری کرتے ہیں...... ہماری اس شکایت کا مطلب یہ نہیں ہے

کہ مرکزی حکومت دانستہ طور پر اس صوبہ کے حقوق کو نظر انداز کر رہی ہے لیکن اگر انتظامی اور پالیسی ساز کارروائیوں کا مرکز دو ہزار میل کے فاصلے پر ہو اور مالی اور تجارتی مسائل سے بروقت اور موقع پر آگاہی ممکن نہ ہو تو متذکرہ نتائج کے بارے میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے۔''[1]

پاکستان آبزرور کے اس اداریے کی اہمیت اس لئے بہت زیادہ تھی کہ یہ اخبار صوبائی وزیر خزانہ و تجارت حمید الحق چودھری کی ملکیت تھا اور اس بنا پر یہ نتیجہ اخذ کرنا بے جا نہیں تھا کہ اس اداریے میں حمید الحق چودھری کے خیالات کی ترجمانی کی گئی تھی۔ حمید الحق چودھری کی یہ شکایت کوئی نئی نہیں تھی۔ وہ صوبائی وزیر خزانہ کی حیثیت سے مرکزی حکومت کے مالی امور سے اچھی طرح واقف تھا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ کس کس طرح کراچی اور پنجاب کے ارباب اقتدار اور سرمایہ دار سرکاری اور نجی طور پر مشرقی پاکستان کا استحصال کرتے ہیں لیکن وہ سیاسی مفاد پرست اور موقع شناس ہونے کی وجہ سے مرکز سے کھلم کھلا محاذ آرائی کی پالیسی پر عمل نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے جب 11 رمارچ 1949ء کو اپنا یہ اخبار جاری کیا تھا تو باشعور سیاسی حلقوں کو معلوم تھا کہ اس اخبار کی پالیسی کیا ہو گی۔ اول یہ کہ حمید الحق چودھری بالواسطہ طور پر مشرقی بنگال کے عوام کے اس احساس محرومیت کی ترجمانی کرے گا جو روز بروز شدید ہو رہا تھا۔ دوئم یہ کہ وہ بنگالی ثقافت اور تحفظ کے لئے صوبائی وزیر صحت حبیب اللہ بہار کی کسی نہ کسی طرح ہمنوائی کرے گا۔ اور سوئم یہ کہ وہ پنجابی بیوروکریسی کی فرعونیت کے خلاف بنگالی عوام کے غم و غصہ کی آئینہ داری کرے گا۔ پنجاب کی سول و فوجی بیوروکریسی اور حمید الحق چودھری کے درمیان تضاد خاصا شدید تھا اور اس امر کی علامتیں نظر آنے لگی تھیں کہ زود یا بدیر حمید الحق چودھری کو سندھ کے ایوب کھوڑو اور پنجاب کے نواب ممدوٹ کی طرح ''پروڈا'' کے تحت کسی نہ کسی مقدمے میں ملوث کیا جائے گا۔ تاہم حمید الحق چودھری مرکزی حکومت اور پنجابی بیوروکریسی کی مخالفت میں احتیاط اور اعتدال کا دامن بھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا اور نہ ہی وہ ان انتہا پسند عناصر سے گٹھ جوڑ کرنا چاہتا تھا جو مشرقی بنگال کی سیاسی اور معاشی ابتری سے فائدہ اٹھا کر اور بنگالی ثقافت کی آڑ لے کر مشرقی اور مغربی بنگال کو متحد کرنے کی متمنی تھے۔ اس کی خواہش تھی کہ مشرقی بنگال میں خود مختار بورژوا سیاست اور معیشت فروغ پائے اور بنگالی عوام کے احساس محرومیت سے کمیونزم کے لئے راستہ ہموار نہ ہو۔

مہنگائی، قحط سالی اور قومیتی حقوق سے محرومی کے نتیجے میں طلبا میں کمیونزم کی مقبولیت اور حکومت کے سخت گیر رویہ میں اضافہ

حمید الحق چودھری کی مذکورہ خواہش پاکستان آبزرور کے 13 راگست کے شمارے میں ایک خط کی اشاعت کا باعث بنی جو سید پور کی ینگ مسلم ایسوسی ایشن سے تعلق رکھنے والے ایک گمنام شخص نے لکھا تھا۔ اس خط میں بتایا گیا تھا کہ ''جب میں 30 رجولائی 1949ء کو بذریعہ ٹرین سیالدہ (کلکتہ) سے رنگھاٹ کی طرف سفر کر رہا تھا تو رنگھاٹ سٹیشن پر دو دھوتی پوش ہندو نوجوان اس کے کمپارٹمنٹ میں گھس آئے اور انہوں نے وہاں پوسٹر چسپاں کر دیئے۔ ان پوسٹروں پر جو تصویریں چھپی ہوئی تھیں ان میں سے ایک تصویر یہ تھی کہ پاکستان کا وزیر اعظم لیاقت علی خان کراچی میں جموں وکشمیر کے غریب لوگوں کو چاول کی بوری دے رہا ہے۔ دوسری تصویر میں مشرقی بنگال کی ایک راشن شاپ کا نوٹس بورڈ تھا جس میں لکھا تھا کہ چاول کا بھاؤ 40 سے 50 روپے تک ہے اور تیسری تصویر مشرقی بنگال کے ایک مفلوک الحال اور فاقہ زدہ مسلم خاندان کے چند افراد پر مشتمل تھی۔ اس میں شوہر نہایت مایوسی سے یہ کہہ رہا تھا کہ ''اے اللہ! چاول چالیس پچاس روپے من تک بک رہا ہے۔'' اور بیوی کہہ رہی تھی ''پھر کیسے زندہ رہیں گے؟'' اور اس کے اس سوال کے جواب میں یہ لکھا تھا کہ ''مشرقی پاکستان میں غریبی کی حالت میں پیٹ میں روٹی نہیں، تن پر کوئی کپڑا نہیں صرف پاکستان، پاکستان کے نعرے ہیں۔'' پاکستان آبزرور نے اسی دن اس خط پر یہ ادارتی تبصرہ کیا کہ ''جو لوگ اس قسم کے پوسٹر لگا رہے ہیں وہ اس صوبہ کے عوام میں انتشار پھیلانے کے لئے دانستہ طور پر جھوٹ بول رہے ہیں کیونکہ راشن کی دکانوں پر چاول کا بھاؤ چالیس پچاس روپے من نہیں ہے...... اس قسم کے لوگ صرف باہر سے نہیں آتے بلکہ ہمارے اندر بھی موجود ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ آج جب بعض مایوس سیاسی لیڈروں نے جلسہ کیا تو اس میں بعض نامعلوم افراد نے اشتہار تقسیم کئے تھے جن میں مشرقی پاکستان کے لوگوں سے کہا گیا تھا کہ وہ پاکستان کے یوم آزادی کے موقع پر سیاہ جھنڈے لہرائیں اور احتجاجی مظاہرے کریں۔''
لیکن ستم ظریفی یہ تھی کہ اسی اخبار میں صرف ایک دن پہلے یعنی 12 راگست کو منشی گنج سے یہ خبر چھپی تھی کہ وہاں کی مقامی منڈی میں چاول کا بھاؤ 39 سے 49 روپے من تک پہنچ گیا ہے اور پھر 3 دن

بعد 16/اگست کو برہمن باڑیا سے خبر تھی کہ ''یہاں چاول کا بھاؤ 34 روپے سے لے کر 42 روپے فی من ہے اور بہت سی عورتیں اپنے بچوں کو اٹھائے گھر گھر بھیک مانگ رہی ہیں۔گائی بندھا میں غذائی قلت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ لوگوں کو 42 روپے سے لے کر 45 روپے من تک چاول بڑی مشکل سے دستیاب ہوتا ہے۔20/اگست کی اطلاع یہ تھی کہ گائی بندھا کے شہر میں چاول کا بھاؤ 52 روپے من تک پہنچ گیا ہے اور پھر 21/اگست کو صوبائی حکومت کا ایک پریس نوٹ جاری ہوا جس کے مطابق ڈھاکہ کی کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے جاری کردہ ایک اشتہار ضبط کرلیا گیا تھا۔اس اشتہار کا عنوان یہ تھا کہ ''لیگ کی حکومت سے اناج چھین لو......لیگ کی حکومت کو ختم کرو'' اور غالباً یہ وہی اشتہار تھا جو عوامی مسلم لیگ کے متذکرہ جلسہ میں تقسیم کیا گیا تھا۔نوائے وقت کی اطلاع کے مطابق اس جلسہ میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ ''مشرقی بنگال کی موجودہ وزارت عوام کے اعتماد کی حامل نہیں رہی۔لہٰذا اسے برخاست کر دیا جائے اور صوبہ میں نئے انتخابات کرائے جائیں۔''

صوبائی حکومت کی طرف سے اس مطالبہ کا جواب 25/اگست کو اس خبر کی صورت میں دیا گیا کہ ایسے تخریب کاروں اور دوسرے حکومت دشمن عناصر کے خلاف اقدامات کئے جارہے ہیں جو صوبہ میں کمیونزم کا اسلام دشمن نظریہ پھیلا رہے ہیں اور دوسری تخریبی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔چونکہ ان تخریب پسند عناصر کو کسانوں کی جانب سے کوئی خاص حمایت حاصل نہیں ہوئی اس لئے اب وہ تعلیم یافتہ طبقہ کے بعض حلقوں میں بالعموم اور کالجوں،سکولوں اور ثقافتی اداروں میں بالخصوص اپنا حلقۂ اثر بڑھا رہے ہیں تاکہ نوجوانوں کے ذہنوں کو زہر آلود کر کے قوم کی جڑوں پر ضرب لگائی جائے اور نوجوانوں کے اخلاق کو برباد کیا جائے جن پر قوم کی ترقی کا دارومدار ہے۔ لہٰذا حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ تعلیمی اداروں پر نگاہ رکھے گی تاکہ جو اساتذہ اور طلبا پاکستان کے خلاف پراپیگنڈے یا تخریب کاری میں مصروف ہیں ان کا سد باب کیا جائے۔جن اداروں کے اساتذہ اور طلبا تخریب کاری کے مجرم پائے گئے یا تخریب کاروں کے لئے کوئی کام کرتے ہوئے پائے گئے تو ان کی مالی امداد بند کر دی جائے گی اور ان کے الحاق نامے منسوخ کر دیئے جائیں گے۔حکومت کے تعلیمی اداروں میں جو اساتذہ اور طلبا تخریبی کاروائی کریں گے انہیں وہاں سے خارج کر دیا جائے گا اور تخریب کار طلبا کے لئے سرکاری ملازمتوں کے دروازے بھی بند کر دیئے جائیں گے۔آئندہ جو نوجوان سرکاری ملازمتوں کے لئے درخواستیں دیں گے انہیں اپنی تعلیمی اسناد

کے علاوہ اپنے تعلیمی ادارے کے سربراہ کا اس مضمون کا سرٹیفکیٹ بھی پیش کرنا ہوگا کہ درخواست دہندہ نے اپنی تعلیمی مدت کے دوران تخریبی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیا تھا۔[2] باخبر ذرائع کے حوالے سے ایسوسی ایٹڈ پریس کی اس خبر کا مطلب یہ تھا کہ بنگالی طلبا کا احساس محرومیت واقعی انہیں کمیونزم کی طرف دھکیل رہا تھا اور صوبائی حکومت نے جبر وتشدد کے ذریعہ انہیں اس راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے لئے یہ رائے قابل قبول نہیں تھی کہ کمیونزم کا مقابلہ محض جبر وتشدد کے ذریعہ نہیں کیا جا سکتا تھا بلکہ اس مقصد کے لئے ضروری تھا کہ معاشرے میں ہر سطح پر سیاسی، معاشی اور ثقافتی انصاف کیا جائے۔

طلبا کی کمیونزم میں دلچسپی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ برما، آسام اور مغربی بنگال میں کمیونسٹ تحریک زوروں پر تھی اور اس کی کامیابیوں سے ان کا متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ مزید برآں دوسری جنگ عظیم کے بعد سارے ایشیا میں جوزف سٹالن کی زیر قیادت سوویت یونین کا سیاسی وقار اپنے عروج پر تھا اور ماؤزے تنگ کی زیر قیادت چین کا انقلاب پایۂ تکمیل کو پہنچنے والا تھا۔ ہندوستان کے صوبہ آسام میں کمیونسٹ تحریک کی کامیابی اتنی نمایاں تھی کہ اس سے ضلع سلہٹ کے بعض علاقے بھی متاثر ہوئے۔ چنانچہ 27/اگست کو ضلع سلہٹ کے ایک سرحدی تھانے کے نزدیک تقریباً دو ہزار کسانوں اور پولیس میں زبردست تصادم ہوا جس میں چار افرار ہلاک اور متعدد زخمی ہوئے۔ سرکاری اعلان کے مطابق ہندوستانی کمیونسٹوں کی زیر قیادت اس ہجوم نے پولیس کے ساتھ تصادم میں بندوقیں استعمال کی تھیں اور کمیونسٹوں کا سرخ جھنڈا لہرا کر پاکستان کے خلاف نعرے لگائے تھے۔ چونکہ سلہٹ میں کمیونسٹوں کی یہ کاروائی ایسے زمانے میں ہوئی تھی جبکہ پورا صوبہ نہایت تشویشناک غذائی قلت کی لپیٹ میں تھا اس لئے صوبائی حکومت نے یکم ستمبر کو بنگال فوڈ گرین کنٹرول آرڈر فوری طور پر منسوخ کر کے صوبے کے بیشتر علاقوں میں غلہ کی نقل وحمل کی اجازت دے دی۔ حکومت کا خیال یہ تھا کہ اس طرح چاول کے نرخوں میں استحکام پیدا ہوگا۔ اگرچہ غذائی قلت والے علاقوں اور فالتو اناج والے علاقوں کے درمیان اناج کی نقل وحمل پر بدستور پابندی عائد رہی تھی لیکن 5/ستمبر کو ڈان کے نیوز لیٹر میں بتایا گیا تھا کہ ''صوبائی حکومت کی اس کاروائی سے فوری طور پر خوشگوار اثر نہیں ہوا۔ ضلع راجشاہی کی نیا گاؤں سب ڈویژن میں چاول کی بہت قلت ہے۔ کئی علاقوں سے فاقہ کشی کی اطلاعات آ رہی ہیں اور بہت سے لوگ بھیک

مانگنے کے لئے شہر کا رخ کر رہے ہیں۔ سب سے گھٹیا درجہ کے چاول کا نرخ 34 روپے سے 36 روپے من ہے۔ کلکتہ کے لئے انڈوں اور مچھلی کی برآمد پر سے پابندی اٹھائے جانے کے باعث ان دونوں اشیائے خوردنی کی قیمتیں بھی بڑھ گئی ہیں۔ گزشتہ ہفتے ڈھاکہ میں ہلسا اور راہو مچھلی کا بھاؤ 120 روپے اور 125 روپے من تھا جبکہ مچھلی کی برآمد سے پابندی اٹھنے سے پہلے ان دونوں قسم کی مچھلی کا بھاؤ 70 سے لے کر 80 روپے فی من تھا۔ سرسوں کے تیل کی قیمت میں بھی یکا یک تقریباً 15 فیصد اضافہ ہو گیا ہے۔''

بڑی صنعتوں کی ترقی کو صوبائی دائرہ اختیار سے خارج کرنے کا مرکزی حکومت کا فیصلہ اور بنگال کے لیگی و غیر لیگی حلقوں کا شدید رد عمل

ضروریات زندگی کی کمیابی اور مہنگائی کی خبروں کے اس ہجوم میں جب کراچی سے مرکزی وزیر تجارت و صنعت فضل الرحمان کا یہ اعلان موصول ہوا کہ آئندہ بڑے صنعتی ذرائع کی ترقی کا کام صوبائی حکومتوں کے دائرہ اختیار سے باہر ہوگا تو ڈھاکہ اور چٹا گانگ کے ان حلقوں میں غم و غصہ کی زبردست لہر دوڑ گئی جو اپنے صوبہ میں ایک خود مختار سرمایہ دارانہ معیشت کو ترقی دینے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ مرکزی وزیر تجارت، صنعت نے یہ اعلان 8 ستمبر کو پاکستان کونسل آف انڈسٹریز کے افتتاحی اجلاس میں کیا تھا جبکہ وزیر اعظم لیاقت علی خان بھی وہاں موجود تھا۔ وزیر اعظم لیاقت علی خان کی افتتاحی تقریر کا پہلا پیرا گراف یہ تھا کہ مرکزی حکومت نے ڈویلپمنٹ آف انڈسٹریز (فیڈرل کنٹرول) ایکٹ 1949ء کے تحت 27 مختلف صنعتوں کی ترقی کی ذمہ داری خود سنبھال لی ہے اور وزیر تجارت و صنعت کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ریگولیشن آف مائینز اینڈ آئل فیلڈز اینڈ منرل ڈویلپمنٹ (فیڈرل کنٹرول) ایکٹ 1948ء کے تحت مرکزی حکومت ہی معدنی ذرائع کی ترقی کی ذمہ دار ہوگی۔

اس تقریب کی خبر ڈھاکہ پہنچی تو اس کی کاروائی پر پاکستان آبزرور نے ایک ایسا تنقیدی اداریہ لکھا جو مشرقی بنگال کے ان تعلیم یافتہ عناصر کے جذبات کی ترجمانی کرتا تھا جو گزشتہ دو سال سے مسلسل یہ محسوس کر رہے تھے کہ کراچی اور پنجاب کے حکمران طبقے مشرقی بنگال کو اپنی نو آبادی تصور کرتے ہیں۔ ان عناصر کا بالاصرار مطالبہ یہ تھا کہ مشرقی بنگال کی صنعت و حرفت کی ترقی کے

لئے الگ خودمختار ادارے قائم کئے جائیں کیونکہ دو ہزار میل کے فاصلے پر کراچی میں قائم شدہ کوئی ادارہ مشرقی بنگال کی صنعتی ترقی کے مسائل کو نہیں نمٹا سکے گا۔ حمید الحق چودھری قبل ازیں کئی مرتبہ یہ کوشش کر چکا تھا کہ مشرقی بنگال کی صنعتکاری کے لئے علاقائی سطح پر منصوبہ بندی کی جائے اور اس منصوبہ کو صوبائی انتظامی مشینری اور مقامی تعلیم یافتہ درمیانہ طبقے کی امداد سے پایۂ تکمیل کو پہنچایا جائے لیکن مرکزی ارباب اقتدار اسے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے اور اس کے برعکس وہ صنعت وحرفت کے شعبہ میں ہر کام کچھ اس طرح کرتے تھے کہ اس میں سے انتہا درجہ کی مرکزیت، آمریت اور سامراجیت کی بو آتی تھی۔ چنانچہ اس مسئلہ پر پاکستان آبزرور کے اداریے کی ابتدا اس طرح کی گئی تھی کہ ''یہ اخبار گالیوں کی زبان استعمال کرنے کا ماہر نہیں ہے اور نہ ہی یہ مغربی پاکستان کے معاصرین کے نقش قدم پر چل کر یہ کہتا ہے کہ جو لوگ ہم سے اتفاق نہیں کرتے وہ یا تو ہندوستان کے ایجنٹ ہیں یا عقل و دانش سے عاری ہیں...... مغربی پاکستان کے مقابلے میں مشرقی پاکستان میں اخراجات زندگی کی اونچائی اس حیرت انگیز و غیر حقیقت پسندانہ نظریے کی تردید کرتی ہے کہ پاکستان کے دونوں حصوں کو ایک واحد معاشی یونٹ تصور کیا جا سکتا ہے یا یہ کہ مشرقی پاکستان کو محض کراچی سے ایک الگ پلاننگ ریجن قرار دے کر ایک اچھی تنظیم کا قیام ممکن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علاقائیت کے تصور کو اس کے عملی تقاضوں کو۔۔ مثلاً مطلوبہ کام کے لئے صوبائی حکومت کی مشینری کے استعمال کے تقاضے کو۔۔ قبول کئے بغیر محض کاغذ پر قبول کرنے سے صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان میں مروجہ مرکزیت کی بلا سوچے سمجھے غلامانہ تقلید کی جا رہی ہے اور مشرقی بنگال کے ذہنی قوت اور تنظیمی اہلیت کے ذرائع کے بارے میں غیر معقول اور توہین آمیز شبہ کیا جا رہا ہے...... مرکزی حکومت مشرقی پاکستان میں قرضہ کے سرمایہ یا بینکوں کی فالتو آمدنی سے فیکٹریاں قائم کر سکتی ہے لیکن اس سے صوبہ کی آج کل کی بنیادی معاشی زبوں حالی کا انسداد کیسے ہو گا؟ چھوٹے کسان کو کیسے ان قومی صنعتوں سے قریبی اور براہ راست وابستہ کیا جائے گا۔ فضل الرحمان کے محکمہ کے افسران مشرقی بنگال کے کاشتکاروں کے نظریے میں انقلابی تبدیلی کیسے لائیں گے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ بچتوں کو ایک سلیقے سے استعمال کیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ تعلیم یافتہ بنگالیوں کو صنعتی شعبہ کے مینیجریل، ٹیکنیکل اور سپر وائزری عملہ میں شامل کیا جائے اور زرعی معیشت اور صنعتی منصوبہ بندی کے درمیان قریبی اشتراک عمل پیدا کیا جائے۔ یہ کام صوبہ کی اپنی

تنظیم کو پس پشت ڈال کر مرکزی بیورو کریسی مختلف سطح کے درمیانی عناصر کے ذریعے یہ کام سرانجام نہیں دے سکتی۔ پاکستان کے سارے دماغ کراچی کے محکمہ تجارت میں مرتکز نہیں ہیں۔ ہم صوبہ پرستی کو برا سمجھتے ہیں لیکن ہمارے لئے رعونت اس سے بھی زیادہ بیزاری کا باعث ہوتی ہے۔''[3]

پاکستان آبزرور کے اس تلخ اداریے کی تائید 17 ستمبر کو ہوئی جبکہ ایک مراسلہ نگار نے اس اخبار کے قارئین کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرائی کہ بورڈ آف انڈسٹریل فنانس کارپوریشن کے جن نو ڈائریکٹروں کا تقرر ہوا ہے ان میں سے صرف ایک ڈائریکٹر مشرقی پاکستان سے لیا گیا ہے اور چھ ڈائریکٹروں کا تعلق کراچی سے ہے۔ مراسلہ نگار نے ان تقرریوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اگرچہ غیر ملکی کرنسی کی زیادہ تر کمائی مشرقی پاکستان کرے گا لیکن اس کرنسی کا زیادہ تر استعمال مغربی پاکستان میں ہوگا۔ اس نے آخر میں لکھا تھا کہ مشرقی پاکستانیوں کو صبح و شام یہ تلقین کی جاتی ہے کہ وہ صوبہ پرستی کو ترک کر دیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ ہراکری (خود کشی) کر لیں۔ پاکستان آبزرور نے اس دن تو اس مراسلے کا کوئی ادارتی نوٹس نہ لیا البتہ اس نے اپنے اداریے میں یہ شکایت کی کہ مرکزی حکومت نے اعلیٰ ملازمتوں میں مشرقی بنگال کے لئے 42 فیصد کوٹا مقرر کرنے کے بارے میں 6 اگست کو جس فیصلے کا اعلان کیا تھا اس پر صحیح طریقے سے عملدرآمد نہیں ہو رہا ہے۔ یہ اداریہ بظاہر اسی اخبار میں 19 اگست کو شائع شدہ ایک خط کی بنیاد پر لکھا گیا تھا جس میں یہ الزام عائد کیا گیا تھا کہ ''جہاں تک مشرقی بنگال کا تعلق ہے اعلیٰ ملازمتوں میں صوبوں کے لئے کوٹا مقرر کرنے کی پالیسی جنم لینے سے پہلے ہی مر چکی ہے۔ اس قسم کی پالیسی کا اعلان 20 اگست 1948ء کو بھی ہوا تھا لیکن اس پر کبھی عمل نہیں ہوا۔ اب تک بہت ہی کم بنگالیوں کو مرکزی ملازمتوں میں بھرتی نصیب ہوئی ہے۔ مرکزی محکموں کے بہت سے سربراہوں نے اپنے ماتحتوں کو بے شمار ترقیاں دے کر مشرقی بنگال کے عوام کو بے پناہ نقصان پہنچایا ہے کیونکہ بنگالیوں کی ان محکموں میں کوئی نمائندگی نہیں ہے اور آئندہ ان میں ان کی بھرتی کا کوئی امکان نہیں ہے اس طرح مرکزی محکموں کے بنگالی ملازمین میں صرف بے اطمینانی ہی پیدا نہیں ہوئی بلکہ وہ بہت برہم ہیں...... برصغیر کی تقسیم سے قبل مرکزی حکومت کے بعض ملازمین اپنی دھڑے بازی اور اقربا نوازی کے باعث بہت بدنام ہوئے تھے ہم مخلصانہ طور پر امید کرتے ہیں کہ وہی کہانی نہیں دہرائی جائے گی کیونکہ اس طرح پاکستان کے مفادات کو سخت نقصان پہنچے گا۔'' 17 ستمبر کو ایک

شخص عطاالحق کا بھی اس مسئلہ پر ایک خط چھپا تھا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ "پاکستان ایڈمنسٹریٹو سروسز میں مشرقی بنگال کو کم از کم 60 فیصد حصہ دیا جائے کیونکہ مرکزی اور صوبائی دفاتر میں بنگالیوں کی کوئی نمائندگی نہیں ہے" اور 22 ستمبر کو ایسٹ پاکستان مسلم سٹوڈنٹس لیگ کی صوبائی کانفرنس ہوئی تو اس میں بنگالیوں کے لئے اعلیٰ سول ملازمتوں کے علاوہ چھوٹی بڑی فوجی ملازمتوں کا بھی اس دیرینہ مطالبہ کی صورت میں ذکر ہوا کہ مشرقی بنگال میں ایک ملٹری اکیڈمی اور ایک نیول ٹریننگ سکول کھولا جائے۔ طلبا کی یہ کانفرنس دراصل صوبائی حکومت کی تحریک پر ہوئی تھی اور اس کے افتتاح کے لئے صوبہ سرحد کے وزیر اعلیٰ عبدالقیوم خان کو بلایا گیا تھا۔ اس کانفرنس کے پس پردہ ایک مقصد یہ تھا کہ مسلم طلبا کو کمیونسٹوں کے اثر و رسوخ سے محفوظ رکھا جائے اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ پنجابی شاونزم کے خلاف لیاقت، قیوم اور نورالامین کے گٹھ جوڑ کو مستحکم کیا جائے۔ اس کانفرنس سے تین چار دن پہلے کراچی سے یہ اعلان ہو چکا تھا کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان اکتوبر میں مشرقی بنگال کا دورہ کرے گا۔

ہندوستان کے ساتھ "تجارتی جنگ" میں بنگالیوں کی ثابت قدمی اور حب الوطنی کا مظاہرہ

طلبا کی کانفرنس کے مذکورہ دونوں مقاصد وقتی طور پر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان قومی تضاد کے بوجھ تلے دب گئے کیونکہ عوام الناس کی توجہ ان بے پناہ معاشی مسائل کی طرف مبذول ہو گئی جو ہندوستان کی جانب سے پاکستان کے ساتھ یکا یک تجارت بند کر دینے کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے۔ ہندوستان نے پاکستان سے اس "تجارتی جنگ" کا آغاز ستمبر کے آخری ہفتے میں کیا تھا جبکہ برطانوی پونڈ کی شرح مبادلہ میں تقریباً 30 فیصد کمی کی وجہ سے ہندوستان نے فوراً ہی اسی تناسب سے اپنی کرنسی کی مالیت میں کمی کر دی تھی لیکن پاکستان نے 22 ستمبر کو وزیر تجارت فضل الرحمان کے اصرار پر اپنی کرنسی کی شرح مبادلہ میں کوئی کمی نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پاکستان کے اس فیصلے کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان کے ایک سو روپے کی مالیت ہندوستان کے 145 روپے کے برابر ہو گئی تھی چونکہ 49-1948ء میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تجارتی توازن 35 کروڑ روپے کی حد تک پاکستان کے حق میں تھا اس لئے اگر دونوں

ملکوں کے درمیان نئی شرح مبادلہ پر تجارت جاری رہتی تو بین المملکی تجارتی توازن بہت زیادہ پاکستان کے حق میں ہو جاتا۔ ہندوستان مشرقی بنگال سے پٹ سن اور مچھلی وغیرہ خریدتا تھا جبکہ مشرقی پاکستان میں ہندوستان سے لوہا، کوئلہ اور کپڑا وغیرہ درآمد کیا جاتا تھا۔ اگرچہ کلکتہ میں پٹ سن کے بیشتر کارخانے مشرقی بنگال سے خام پٹ سن کی سپلائی پر چلتے تھے تاہم ہندوستانی ارباب اقتدار نے پاکستان کی کرنسی کی نئی شرح کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور اس طرح دونوں ملکوں کے درمیان تجارت بالکل بند ہو گئی اور 30 رجون 1949ء کو بین المملکتی تجارتی معاہدہ ختم ہو گیا۔

ہندوستان کا خیال تھا کہ مشرقی بنگال کے عوام جو پہلے ہی چاول کی مسلسل مہنگائی اور پٹ سن کی ارزانی کی وجہ سے تنگ آ چکے تھے اس بین المملکتی ''تجارتی جنگ'' سے بلبلا اٹھیں گے اور پاکستان جلد ہی ہندوستانی شرائط کے تحت تجارت کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ مگر ایسا نہ ہوا حالانکہ پٹ سن کا بھاؤ پچیس تیس روپے فی من سے گر کر پندرہ سولہ روپے فی من ہو گیا تھا اور کوئلہ کی نایابی کے باعث ڈھاکہ اور صوبہ کے دوسرے شہروں میں بجلی کی سپلائی بہت ہی کم ہو گئی تھی۔ چونکہ ہندوستان نے 30 رجون کے تجارتی معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کوئلہ کی سپلائی یکایک بند کر دی تھی۔ اس لئے پاکستان نے جوابی کاروائی کے طور پر پٹ سن کی تین لاکھ گانٹھوں کی سپلائی روک دی جن کے پرائیویٹ طور پر سودے ستمبر 1949ء سے پہلے ہو چکے تھے۔ اس پر ہندوستان نے مغربی پنجاب کی فیروز پور لین میں پانی کی سپلائی بند کر دی اور مشرقی بنگال کو براستہ کلکتہ جو پٹرول، ڈیزل آئل اور مٹی کا تیل آتا تھا اس کے لئے راہداری کی مزید سہولت دینے سے انکار کر دیا اور ہندو مہا سبھا نے اعلانیہ طور پر یہ مطالبہ کیا کہ ''جو علاقے الگ کئے گئے ہیں (یعنی پاکستان) انہیں دوبارہ ہندوستان میں شامل کرنے کے لئے اقدامات کئے جائیں۔'' ہندو مہا سبھا کے اس مطالبے کی بنیاد یہ تھی کہ مشرقی بنگال سے خام پٹ سن کی سپلائی بند ہونے کی وجہ سے کلکتہ کے تقریباً ایک سو کارخانے بند ہو گئے تھے۔ بمبئی اور احمد آباد میں بہت سی کاٹن ملیں بھی بند ہو گئی تھیں کیونکہ ان کے لئے مغربی پاکستان سے کپاس مہیا نہیں ہو رہی تھی۔

چونکہ مشرقی پاکستان کے عوام کی ہندوستان کے حکمران طبقوں کے ساتھ قومی تضاد کی بنیاد دو سو سالہ معاشی استحصال پر تھی اس لئے انہوں نے اپنی بے پناہ معاشی مشکلات کے باوجود ہندوستان کی اس معاندانہ کاروائی کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ 28 ستمبر کو ڈھاکہ مسلم ایوان تجارت نے

ایک بیان میں ہندوستان کے ساتھ ہر قسم کی تجارت کی مخالفت کی اور حکومت کو ہندوستانی اشیا کے جوابی بائیکاٹ کے اقدام کی تائید کا پوری طرح یقین دلایا۔ ایون تجارت کی رائے تھی کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو پاکستانی صنعتوں کی نشوونما پر اس کے مضر اثرات پڑیں گے۔ ہمیں دوسرے ممالک کے ساتھ تجارتی تعلقات بڑھانے چاہئیں اور چٹاگانگ کی بندرگاہ کی جلد از جلد تعمیر وترقی کا بندوبست کرنا چاہیے کیونکہ اس بندرگاہ کے استحکام کا اثر براہ راست مشرقی پاکستان کے تحفظ پر پڑے گا۔ ہندوستان سے تجارت پر اپنے تاثرات کی وضاحت کرتے ہوئے ایوان نے کہا کہ وہ ہندوستان کی درآمد پر ٹیکس کی تخفیف کی ہر تجویز کے خلاف سخت احتجاج کرتا ہے خواہ ایسا نہ کرنے سے اشیا کی قیمتوں میں کتنا ہی اضافہ کیوں نہ ہو جائے۔[4]

متذکرہ ساز گار صورتحال میں وزیر اعظم لیاقت علی خان 11 ر اکتوبر کو ڈھاکہ پہنچا۔ اسی دن عوامی مسلم لیگ نے چند دن قبل نافذ شدہ مرکزی پبلک سیفٹی آرڈیننس کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے ایک جلسہ کیا اور پھر جلوس نکالا مگر پولیس نے اشک آور گیس اور لاٹھی چارج کے ذریعے اسے منتشر کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد 19 افراد کو پبلک سیفٹی آرڈیننس کے تحت گرفتار کیا گیا جن میں عوامی مسلم لیگ کا صدر مولانا عبدالحمید بھاشانی بھی شامل تھا۔ ان کی گرفتاریوں کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے 12 ر اکتوبر کو ڈھاکہ میں مکمل ہڑتال ہوئی۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبا کی جانب سے اس احتجاجی ہڑتال میں حصہ لینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ لیاقت علی خان نے 19 ر ستمبر کو کراچی انجمن ترقی اردو کی قائم کردہ پبلک لائبریری کی افتتاحی تقریب میں اشتعال انگیز تقریر کی تھی۔ اس تقریر میں لیاقت علی خان نے اپنے اس موقف کا اعادہ کیا تھا کہ ''اردو اور صرف اردو ہی ہماری قومی زبان ہے اور موجودہ حالات میں یہی زبان ہماری قومی زبان بننے کی مستحق ہے۔'' اس نے پس منظر بیان کرتے ہوئے مزید کہا کہ ''حکومت پاکستان نے نومبر 1947ء میں جو تعلیمی کانفرنس منعقد کی تھی اس نے دو قراردادیں منظور کی تھیں۔ پہلی قرارداد میں دستور ساز اسمبلی سے سفارش کی گئی تھی کہ اردو کو پاکستان کی قومی زبان بنایا جائے اور دوسری قرارداد یہ تھی کہ اردو کو پاکستان کے سارے اسکولوں میں لازمی مضمون قرار دیا جائے۔ مرکزی حکومت نے ان دونوں قراردادوں کو منظور کر کے ساری صوبائی حکومتوں کو اس فیصلے سے مطلع کر دیا تھا۔ پھر ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن نے فروری 1949ء میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ اردو کو آئندہ چار پانچ سال میں اعلیٰ

تعلیمی اداروں میں ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ اس سلسلے میں مرکزی وزارت تعلیم نے دو کمیٹیاں مقرر کی تھیں۔ پہلی کمیٹی رسم الخط کے مسئلہ پر غور کر رہی ہے اور دوسری کمیٹی کے زیر غور سائینٹیفک اور ٹیکنیکل اصطلاحات کا مسئلہ ہے۔ ان اقدامات سے بالکل واضح ہے کہ حکومت کو اردو کی اہمیت کا پورا احساس ہے۔"[5] عام حالات میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبا کو لیاقت علی خان کی اس تقریر کے خلاف زبردست ایجی ٹیشن شروع کرنا چاہیے تھی۔ لیکن ایسا نہ ہوا کیونکہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ایک قومی تضاد، مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان کئی سیاسی، معاشی اور ثقافتی تضادات سے بھاری تھا۔

لیاقت علی خان کا دورۂ مشرقی بنگال اور یہ فسطائی نظریہ کہ بنگالی سول وفوجی ملازمتوں کے تعلیمی اور جسمانی معیار پر پورے نہیں اترتے

لیاقت علی خان نے تقریباً دو ہفتے تک مشرقی پاکستان کے مختلف علاقوں کا دورہ کر کے ہندوستان کے تجارتی بائیکاٹ کی وجہ سے پیدا شدہ صورتحال کے بارے میں صوبائی وزراء اور سرکاری حکام کے علاوہ ڈھاکہ اور چٹاگانگ کے کاروباری حلقوں سے تبادلہ خیالات کیا اور تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی مسائل کے بارے میں شکایات سنیں۔ پاکستان آبزرور اور دوسرے مقامی اخبارات کی اطلاعات کے مطابق تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کی سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ بنگالی نوجوانوں کو نہ صرف مرکزی حکومت کے سول اور فوجی شعبوں میں ملازمتیں نہیں ملتیں بلکہ صوبائی حکومت میں بھی ان کے لئے اچھی ملازمتوں کے دروازے بند ہیں۔ مرکزی حکومت کی اعلیٰ سول ملازمتوں کا مشرقی بنگال کے لئے جو کوٹا مقرر کیا گیا ہے وہ محض ایک کاغذی کاروائی ہے۔ عملاً بنگالی نوجوانوں کو اس سے بہت ہی کم فائدہ پہنچا ہے۔ اس کوٹا میں زیادہ تر حصہ یا تو غیر بنگالی مہاجرین کو مل جاتا ہے یا ان غیر بنگالی امیدواروں کو دے دیا جاتا ہے جو محض اس مقصد کے لئے صوبائی حکومت کی غیر بنگالی بیوروکریسی سے ڈومی سائل سرٹیفکیٹ حاصل کر لیتے ہیں۔ مسلح افواج میں بھرتی کے لئے مشرقی بنگال کے اخبارات میں اشتہارات نہیں دیئے جاتے اور اگر کبھی اس صوبہ میں فوجی بھرتی کی کوئی کاروائی کی جاتی ہے تو وہ محض ایک ڈھونگ ہوتا ہے۔ بیشتر بنگالی نوجوانوں کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا جاتا ہے کہ ان میں فوجی ملازمت کے لئے مطلوبہ

جسمانی اور ذہنی صلاحیت نہیں ہے۔

لیاقت علی خان نے 12 را کتوبر کو ڈھاکہ میں ایک جلسہ عام میں اس شکایت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''جہاں تک ملازمتوں میں تناسب کا تعلق ہے مشرقی بنگال کے لئے پہلے ہی پچاس فیصد ملازمتیں مخصوص کر دی گئی ہیں لیکن مقابلہ کے امتحان میں مشرقی بنگال کے لئے معیار نیچا کرنا پڑا ہے تاکہ یہاں کا کوٹا پورا ہو جائے۔ ایسا غالباً اس لئے کرنا پڑا ہے کہ یہاں کے طلبا یا ان میں سے بیشتر طلبا اپنی توانائیاں غیر تعلیمی سرگرمیوں میں ضائع کر دیتے ہیں۔'' اس نے افسوس کا اظہار کیا کہ ''ڈیفنس سروسز میں بھرتی کے لئے مشرقی پاکستان سے مطلوبہ تعداد میں اور صحیح قسم کے نوجوان آگے نہیں آتے، تاہم مشرقی بنگال کے لوگوں کو یقین رکھنا چاہیے کہ مرکز ان کے دفاع سے غافل نہیں۔''[6] لیاقت علی خان کو پبلک جلسہ میں اس شکایت کا ذکر اس لئے کرنا پڑا تھا کہ 22 رستمبر کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشیدگی پیدا ہونے کے باعث ہر طرف سے یہ آواز اٹھ رہی تھی کہ یہاں کی سول انتظامیہ مقامی لوگوں کے ہاتھ میں ہونی چاہیے اور یہاں کے دفاع کا کام بھی مقامی لوگوں کو سر انجام دینا چاہیے کیونکہ ڈیڑھ دو ہزار میل کے فاصلے پر رہنے والے پنجابیوں کو یہاں کے سول اور فوجی مسائل سے اچھی طرح واقفیت نہیں ہو سکتی۔ 22 رستمبر کو ایسٹ پاکستان مسلم سٹوڈنٹس لیگ کی کانفرنس میں بھی یہی مطالبہ کیا گیا تھا۔ لیکن لیاقت علی خان نے اپنی تقریر میں اس عوامی مطالبہ کا جو جواب دیا وہ وہی تھا جو گزشتہ دو سال سے پنجابی سول اور فوجی حکام دیتے رہے تھے، یعنی یہ کہ بنگالی نوجوانوں کا جسمانی توانائی اور تعلیمی اہلیت کا معیار پست ہے۔ برصغیر کی تقسیم سے قبل چھوٹی بڑی سول ملازمتوں میں بھرتی کے موقع پر یہاں تک کہ تعلیمی اداروں میں داخلہ کے موقع پر بھی ہندو حکام، مسلمان امیدواروں کے بارے میں بالعموم اسی رائے کا اظہار کیا کرتے تھے۔

پاکستان آبزرور اور بنگالی تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کی طرف سے لیاقت علی کے فسطائی نظریہ کا مدلل جواب

پاکستان آبزرور نے 16 را کتوبر کو اس مسئلہ پر ایک اداریہ لکھا جس میں اس نے براہ راست لیاقت علی خان کی تقریر کا حوالہ تو نہ دیا البتہ اس نے اپنے 12 را کتوبر کے شمارہ میں شائع

شدہ اسی مضمون کے ایک خط پر تبصرہ کرتے ہوئے اس فسطائی نظریے کی دھجیاں اڑا دیں کہ بنگالی نوجوان جسمانی اور ذہنی لحاظ سے مسلح افواج میں بھرتی ہونے کی صلاحیت واہلیت نہیں رکھتے۔ اخبار نے اس تاریخی حقیقت کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا کہ ''انگریزوں نے مارشل اور نان مارشل نسلوں کے نظریے کی تخلیق محض اس لئے کی تھی کہ وہ بنگالیوں کو اپنی افواج میں بھرتی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہیں بنگالیوں کی وفاداری پر اعتماد نہیں تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ فطرتاً باغی ہیں۔'' اخبار نے رائے ظاہر کی کہ ''اگر صرف جسمانی حجم اور تناسب اعضا کو ہی فوجی صلاحیت کا معیار تصور کیا جائے تو پھر جاپانی جنوب مشرقی ایشیا میں اینگلو امریکی فوجوں کو شکست فاش نہ دے سکتے۔ آج کل کے ایٹمی دور میں جنگ جسمانی توانائی کی بجائے دماغی اہلیت سے لڑی جاتی ہے۔ مشرقی بنگال میں فن حرب سے واقفیت اور شجاعت کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اگر کوئی کمی ہے بھی تو وہ یہاں اس قسم کے فوجی کالجوں اور تربیتی مراکز کے قیام سے دور ہو سکتی ہے جیسے کہ جہلم (مغربی پاکستان) میں پرنس آف ویلز ملٹری کالج ہے۔ بنگالی نوجوانوں کو کمتر اور حقیر سمجھنے کی نفسیات کا فوراً انسداد ہونا چاہیے کیونکہ اس کے مضمرات بہت شر انگیز ہیں۔''

اس اخبار کے اسی دن کے شمارے میں 62۔ سوبھاش ایونیو ڈھاکہ کے ایک شخص خوندکر عبدالرشید کا ایک خط بھی شائع ہوا۔ اس خط میں لیاقت علی خان کی متذکرہ تقریر کا حوالہ دے کر اس کے نوٹس میں یہ حقیقت لائی گئی کہ اگست 1949ء میں ایک اشتہار کے ذریعے کشمیر رفیوجی ٹیکنیکل ٹریننگ سکیم کے تحت کئی سو ٹیکنیشینوں کی ضرورت کا اعلان کیا گیا تھا اور یہ ضرورت پوری کرنے کے لئے مشرقی بنگال کے امیدواروں سے بھی درخواستیں طلب کی گئی تھیں۔ لیکن بدقسمتی سے مشرقی بنگال سے جتنے امیدواروں نے درخواستیں دی تھیں ان میں سے کسی ایک کو بھی انٹرویو کے لئے نہیں بلایا گیا حالانکہ مغربی پاکستان میں بھرتی شروع ہو چکی ہے اور پھر تین چار دن بعد ڈھاکہ کے ایک اور شخص محمد مفضل حسین کا یہ خط چھپا کہ حکومت پاکستان نے غیر ممالک میں اعلیٰ تعلیم کے لئے 26 میڈیکل افراد کو منتخب کیا ہے لیکن بدقسمتی سے ان میں سے صرف تین کا تعلق مشرقی بنگال سے ہے۔ ہم مرکزی حکومت میں بنگالی افراد سے پوچھتے ہیں کہ وہ اس قسم کی سلیکشن کمیٹی کے ہاتھوں اپنے ہی مفادات کو نقصان پہنچنے کی اجازت کیوں دیتے ہیں۔ یقیناً ہمارے صوبہ میں مطلوبہ اہلیت کے حامل امیدواروں کی کمی نہیں ہے۔

بھارتی بائیکاٹ کے بعد پٹ سن کی فروخت کا بحران، مرکزی کنٹرول میں جیوٹ بورڈ کی تشکیل پر صوبائی مسلم لیگ اور چیمبر آف کامرس کا مطالبہ کہ اسے صوبائی کنٹرول میں دیا جائے

13ر اکتوبر کو لیاقت علی خان چٹا گانگ گیا تو وہاں بھی اس کے سامنے عوامی شکایتوں کا انبار لگ گیا۔ مقامی مسلم چیمبر آف کامرس نے اس کو جو میمورنڈم پیش کیا اگر چہ اس میں اسے یقین دلایا گیا تھا کہ ہندوستان نے پاکستان کے خلاف جو ''تجارتی جنگ'' شروع کر دی ہے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ شکایت بھی کی گئی کہ مغربی پاکستان کے مقابلے میں مشرقی پاکستان میں چاول اور گندم کا بھاؤ بہت زیادہ ہے۔ یہاں تک کہ مشرقی بنگال میں چاول اور گندم کی کنٹرول قیمت بھی مغربی پاکستان کے مقابلے میں دوگنا ہے۔ اس لئے غریب کسانوں کو بڑی مشکلات درپیش ہیں۔ جنگ سے پہلے وہ ایک من پٹ سن بیچ کر دو من چاول خریدا کرتے تھے لیکن اب وہ دو من پٹ سن بیچ کر ایک من چاول خریدتے ہیں۔ اسی دن ڈھاکہ مسلم چیمبر آف کامرس کے صدر سخاوت حسین نے ایک بیان میں مطالبہ کیا کہ حکومت کو خود پٹ سن کی فوراً خریداری شروع کر دینی چاہیے ورنہ کسان بالکل تباہ ہو جائیں گے اور پھر 17ر اکتوبر کو ڈھاکہ مسلم چیمبر آف کامرس کی مجلس عاملہ نے ایک طویل قرارداد میں پاکستانی کرنسی کی مالیت کم نہ کرنے کے فیصلے کی تائید کی لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بتایا کہ ہندوستان کے تجارتی بائیکاٹ کے باعث غریب کسان بڑی مصیبت میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ پٹ سن دس روپے من فروخت ہو رہی ہے اور چھالیہ کا بھاؤ پانچ چھ روپے من تک گر گیا ہے۔

تاہم لیاقت علی خان نے میمن سنگھ، دیناج پور، فینی، باریسال اور دوسرے علاقوں کا دورہ جاری رکھا۔ اس نے اس دوران کئی پبلک جلسوں سے خطاب کیا۔ بہت سے وفود سے ملاقاتیں کیں اور اس طرح ہندوستان کے تجارتی بائیکاٹ کے اثرات سے آگاہی حاصل کی۔ پھر اس نے 22ر اکتوبر کو واپس ڈھاکہ پہنچ کر ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ حکومت پاکستان نے ایک جیوٹ بورڈ قائم کیا ہے جو مرکزی وزارت صنعت کے سیکرٹری جی۔ فاروق (صدر)، مرکزی وزارت خزانہ کے ڈپٹی سیکرٹری حفیظ احمد اور ایک سوداگر مرزا احمد اصفہانی پر مشتمل ہوگا۔

اس بورڈ کی حیثیت حکومت کی ایک ایگزیکٹو کمیٹی کی ہوگی، اسے وسیع اختیارات حاصل ہوں گے تاکہ کاشتکاروں سے منصفانہ سلوک ہو اور یہ پٹ سن کی قیمت اور کوالٹی کا اس طرح تعین کرے گا کہ یہ جنس غیر ملکی خریداروں کے لئے دلکش ہو۔ اس نے بتایا کہ آئندہ پٹ سن کی کم از کم قیمت خرید 23 روپے فی من ہوگی۔

صوبائی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے اس جیوٹ بورڈ کی تشکیل کے سلسلے میں مرکزی حکومت کی جانب سے جاری کردہ آرڈیننس پر تین دن تک مرکزی وزیر تجارت فضل الرحمان کی موجودگی میں غور کیا۔ بالآخر 25/ اکتوبر کو جب عاملہ کا اجلاس ختم ہوا تو یہ بتایا گیا کہ اگرچہ صوبائی مسلم لیگ کو مرکزی حکومت کے اس آرڈیننس پر بہت غصہ آیا ہے تاہم اس کا مطالبہ یہ ہے کہ اس آرڈیننس پر عملدرآمد کا کام صوبائی حکومت کے سپرد کیا جائے۔ جیوٹ بورڈ میں کاشتکاروں اور صوبائی حکومت کے نمائندوں کو شامل کیا جائے کیونکہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو پاکستان کے اس بازو کے عوام میں بجا طور پر شکوک پیدا ہوں گے۔ مجلس عاملہ کا مزید مطالبہ یہ ہے کہ جیوٹ سمگلنگ کے امکانات کے سدباب کے لئے اس کی سرکاری قیمت میں اضافہ کیا جائے اور جیوٹ کی خریداری کا کام بڑی بڑی فرموں کی بجائے چھوٹے تاجروں کے سپرد کیا جائے۔[7]

صوبائی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کی یہ قرارداد جیوٹ بورڈ کی تشکیل پر مشرقی بنگال کے تعلیم یافتہ اور درمیانہ درجہ کے کاروباری حلقوں کے اس ردعمل کی مظہر تھی کہ (1) مرکزی حکومت جیوٹ بورڈ کی وساطت سے پٹ سن کے کاروبار پر اپنی اجارہ داری قائم کر لے گی اور اس سرکاری کاروبار میں جو منافع ہوگا وہ کراچی منتقل کر دیا جائے گا جہاں مشرقی بنگال کے غریب عوام کی خون پسینے کی کمائی سے صنعتکاری کی رفتار تیز ہو جائے گی یعنی جس طرح برصغیر کی تقسیم سے پہلے کلکتہ کے گردونواح میں صنعتکاری کے لئے مشرقی بنگال کے عوام کا استحصال کیا جاتا تھا اسی طرح اب کراچی میں صنعتکاری کے لئے یہاں کے عوام کا خون چوسا جائے گا۔ (2) جیوٹ بورڈ کی وجہ سے مشرقی بنگال پر غیر بنگالی بیوروکریسی کا غلبہ اور بھی مستحکم ہو جائے گا۔ (3) جیوٹ بورڈ میں صوبائی حکومت اور کاشتکاروں کی نمائندگی نہ ہونے کی وجہ سے صوبہ اور کاشتکاروں کے مفادات کو نقصان پہنچے گا۔ اس بورڈ کی تشکیل سے پہلے صوبائی حکومت سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا تھا۔ (4) جیوٹ بورڈ کی امداد سے کراچی کی بڑی بڑی فرمیں پٹ سن کی برآمدی تجارت میں بالکل اسی طرح

بے پناہ منافع کمائیں گی جس طرح کہ قبل ازیں کلکتہ کی مارواڑی فرمیں کمایا کرتی تھیں۔ باالفاظ دیگر آئندہ کلکتہ کے مارواڑیوں کی بجائے کراچی کے خوجے، میمن، بوہرے اور پنجاب کے شیخ اور سید وغیرہ غریب کاشتکاروں کا استحصال کریں گے۔ 44-1943ء میں ہولناک قحط ایسے ہی سرکاری آڑھتیوں کی ناجائز منافع خوری اور ذخیرہ اندوزی کی وجہ سے پڑا تھا۔ (5) ڈھاکہ، چٹاگانگ اور دوسرے شہروں میں درمیانہ طبقہ کے بنگالی کاروباری عناصر کی تجارت میں ترقی کے امکانات ختم ہو جائیں گے۔ (6) چونکہ مرکزی حکومت نے مشرقی بنگال میں جیوٹ ملیں لگانے کے لئے ایک طویل المیعاد منصوبہ بنایا ہوا تھا اس لئے اب اس امر کا کوئی امکان نہیں رہا تھا کہ یہ جیوٹ ملیں صوبائی حکومت یا مقامی کاروباری عناصر کے زیر انتظام چلائی جائیں گی بلکہ زیادہ امکان یہ تھا کہ یہ صنعتی شعبہ کراچی اور پنجاب کے سرمایہ داروں کی اجارہ داری میں چلایا جائے گا۔ (7) مرکزی حکومت نے پٹ سن کی سرکاری خریداری کے لئے 23 روپے من کی جو قیمت مقرر کی ہے وہ بہت ہی کم ہے، اگر یہ قیمت بڑھا کر 30 روپے تک نہ کی گئی تو آئندہ جیوٹ کی پیداوار میں بہت کمی آجائے گی۔ 23 روپے من کی مقررہ قیمت سے پٹ سن کی پیداوار کے اخراجات پورے نہیں ہوتے۔ مختصر یہ کہ ہندوستان کے تجارتی بائیکاٹ سے مشرقی بنگال کے غریب کاشتکاروں پر جو مصیبت نازل ہوئی ہے اس سے بھی مرکزی حکومت، غیر بنگالی اعلیٰ حکام اور کراچی و پنجاب کے سرمایہ داروں کو فائدہ پہنچے گا۔ تاہم وزیر اعظم لیاقت علی خان اس ردعمل کو نظرانداز کر کے 26 راکتوبر کو واپس کراچی پہنچ گیا اور جیوٹ بورڈ نے اپنا کام شروع کر دیا۔

وزیر اعظم لیاقت علی خان کی واپسی کے ہفتہ عشرہ بعد ڈھاکہ مسلم چیمبر آف کامرس کے صدر سخاوت حسین نے ایک طویل بیان میں بتایا کہ جیوٹ بورڈ کے قیام کے موقع پر مشرقی بنگال کے غریب کاشتکاروں کو نقصان پہنچنے کے بارے میں جن خدشات کا اظہار کیا گیا تھا وہ چند ہی دنوں میں صحیح ثابت ہوں گے۔ سخاوت حسین نے کہا کہ "آج کل پٹ سن کا بھاؤ 18 روپے سے لے کر 28 روپے من تک ہے۔ بظاہر یہ بھاؤ کوئی زیادہ نامناسب معلوم نہیں ہوتا لیکن اگر اس کا ذرا بغور تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ کاشتکار کو ایک من پٹ سن کی قیمت دس روپے سے بھی کم مل رہی ہے۔ 18 سے 28 روپے من تک کی قیمت گانٹھیں باندھنے والے مراکز کو دی جاتی ہے لیکن پٹ سن ان مراکز تک پہنچانے کے لئے کم از کم تین ہاتھوں سے گزرتی اور تینوں درمیانی اشخاص

میں سے ہر شخص روپیہ ڈیڑھ روپیہ فی من کے حساب سے کماتا ہے اور پھر اس پٹ سن کو گانٹھیں باندھنے والے مراکز تک پہنچانے کے لئے 3 روپے من کے حساب سے کرایہ دینا پڑتا ہے اس طرح کاشتکار کے ہاتھ سے جب یہ پٹ سن ان مراکز میں پہنچتی ہے تو اس پر تقریباً 6 روپے من کا خرچہ ہو چکا ہوتا ہے۔ اور پھر ان مراکز میں جو آڑھتی مقرر کئے گئے ہیں وہ اپنا حصہ لیتے ہیں اور بالآخر اس سارے عمل کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کاشتکار کو ایک من پٹ سن کی دس روپے سے بھی کم قیمت ملتی ہے جبکہ اس کا پیداواری خرچ تقریباً 20 روپے من کے حساب سے ہوتا ہے۔''[8] 21 نومبر کو مسلم لیگ اسمبلی پارٹی نے ایک قرارداد منظور کی جس سے سخاوت حسین کے اس بیان کی تائید ہوئی کہ جیوٹ بورڈ کے قیام کے بعد غریب کاشتکاروں کو ان کی پیداوار کی بہت ہی کم قیمت مل رہی ہے پارٹی نے اس قرارداد میں مطالبہ کیا کہ جیوٹ بورڈ میں توسیع کر کے اس میں صوبائی حکومت کے نمائندے شامل کئے جائیں۔ اس دن صوبائی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا جس میں لیگ اسمبلی پارٹی کو متذکرہ قرارداد منظور کرنے پر مبارکباد دی گئی اور حکومت کی توجہ کاشتکاروں کے ان الزامات کی طرف مبذول کرائی گئی کہ وہ نہ صرف پٹ سن تولنے میں ڈنڈی مارتے ہیں بلکہ کاشتکاروں کو کم قیمت دے کر زیادہ قیمت کی جعلی رسیدیں دیتے ہیں۔ یہ ایجنٹ کاشتکاروں کو منڈی سے دور رکھتے ہیں اور انہیں حکومت کی مقررہ قیمت سے تقریباً نصف قیمت ادا کرتے ہیں۔ مجلس عاملہ نے تجویز پیش کی کہ ''پٹ سن کی کم از کم قیمت بیلنگ سنٹروں میں مقرر کرنے کی بجائے دیہی منڈیوں میں مقرر کی جائے اور ایک مناسب انتظامی مشینری کے ذریعہ اس امر کو یقینی بنایا جائے کہ کاشتکاروں کو ان کے گھروں کے پاس ہی ان کی پیداوار کی مقررہ قیمت مل جائے۔''[9]

صوبائی حقوق کی آواز اٹھانے پر حمید الحق چودھری کے خلاف ''پروڈا'' کے تحت کارروائی......اس کا وزارت سے استعفیٰ

چونکہ حکومت پاکستان اور جیوٹ بورڈ کے خلاف زیادہ تر پروپیگنڈا پاکستان آبزرور میں ہو رہا تھا اور اسی اخبار میں مشرقی بنگال کے حقوق و مفادات کا پرچار ہوتا تھا اس لئے دسمبر کے اوائل میں وہ کچھ ہو گیا جس کے بارے میں گزشتہ دو تین ماہ سے اخباری قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ 5 دسمبر 1949ء کو مشرقی بنگال کے وزیر تجارت حمید الحق چودھری نے صوبائی اسمبلی میں

اپنے استعفیٰ کا اعلان کرتے ہوئے بتایا کہ اس کے خلاف ''پروڈا'' کے تحت انکوائری شروع کر دی گئی ہے۔ اس نے کہا کہ ''میں دو سال سے زائد عرصہ تک ملک کی خدمت کرنے کے بعد بڑی مایوسی کی حالت میں حکومت سے الگ ہو رہا ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ اس عرصہ میں قوم کی معاشی فلاح و بہبود کے لئے میری ساری سکیمیں یکے بعد دیگرے مسترد کر دی گئی ہیں۔ میں افسوس سے مغلوب ہوں کیونکہ میں نے جو کام کرنے کی کوشش کی اور نہیں کر سکا ان کی یاد بہت ہی افسوسناک ہے...... سب کو معلوم ہے کہ میں نے اپنے مختصر عہد وزارت میں بعض بڑے طاقتور لوگوں کو اپنا دشمن بنا لیا ہے۔ یہ میری بدقسمتی رہی ہے کہ میں نے جب کبھی اپنے عوام کے مفاد کی وکالت کی تو میرے دشمنوں نے میرے اس نقطۂ نگاہ کو اس طرح پیش کیا کہ اس سے صوبہ پرستی کے ابلیسی جذبہ کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اب انہوں نے مرکزی حکومت کو آمادہ کر لیا ہے کہ میرے خلاف انکوائری کرائی جائے۔ میں اس انکوائری کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ مجھے بھروسہ ہے کہ ایک غیر جانبدار ٹربیونل کے روبرو پبلک انکوائری سے میرے ہم وطنوں کی نظروں میں نہ صرف یہ ثابت ہو جائے گا کہ میری عزت کا دامن بے داغ ہے بلکہ عوام نے میری ذات پر جو اعتماد کیا تھا وہ بھی بحال ہو جائے گا۔''[10] حمید الحق چودھری نے اپنے اس بیان میں طاقتور دشمنوں کا جو ذکر کیا تھا ان سے اس کی مراد پنجابی بیوروکریسی تھی۔

حمید الحق چودھری مشرقی بنگال کے خوشحال درمیانہ طبقہ کے ان عناصر سے تعلق رکھتا تھا جو قیام پاکستان کے بعد سرکاری انتظامیہ کی امداد سے راتوں رات بڑے سرمایہ دار بننے کے متمنی تھے۔ بورژوا سیاست میں ان کی یہ تمنا بالکل صحیح و جائز تھی کہ بے قید سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں کسی فرد یا افراد کے پاس دولت کا ارتکاز سرکاری انتظامیہ کی ناجائز امداد کے بغیر اور دوسرے ناجائز ذرائع اختیار کئے بغیر نہیں ہو سکتا۔ یہ سرمایہ دارانہ معیشت کا بنیادی قانون ہے اور گزشتہ تین چار سو سال سے ساری سرمایہ دار دنیا میں اس قانون کی فرمانروائی ہے لیکن اس بے قید سرمایہ دارانہ نظام معیشت کا ایک یہ بھی بنیادی قانون ہے کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد مشرقی بنگال میں جن غیر بنگالی حکام نے صوبہ کی انتظامیہ کی باگ ڈور سنبھالی تھی وہ کراچی اور پنجاب کے حکمران طبقوں کی نمائندگی کرتے تھے اور ان کے اپنے ذاتی مفادات بھی مغربی پاکستان کی سرزمین سے منسلک تھے لہٰذا قدرتی طور پر ان کی ہمہ وقت کوشش یہ تھی کہ صرف کراچی

اور پنجاب کے سرمایہ دار ہی ان کی سرکاری انتظامیہ کی مدد سے مشرقی بنگال کے ذرائع کا استحصال کریں۔ وہ حمید الحق چودھری جیسے مقامی عناصر کو اس استحصال میں حصہ دار بننے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ چنانچہ جب حمید الحق چودھری نے اپنے لئے اور اپنے جیسے دوسرے مقامی عناصر کے لئے مملکت خداداد پاکستان کی نعمتوں میں سے اپنا حصہ لینے پر اصرار کیا تو وہ سب کے سب صوبہ پرست، وطن دشمن، ففتھ کالمنسٹ، انڈین ایجنٹس اور اسلام دشمن کہلوائے۔ مرکزی حکومت میں وزیر اعظم لیاقت علی خان کے علاوہ وزیر خزانہ غلام محمد اور سیکرٹری جنرل چودھری محمد علی وغیرہ اس قسم کے تنگ نظر اور صوبہ پرست بنگالیوں کو برداشت نہیں کرتے تھے اور وہ ہر معاملہ میں صوبائی وزراء کے خلاف چیف سیکرٹری عزیز احمد، ڈائریکٹر سول سپلائیز این۔ ایم۔ خان اور دوسرے غیر بنگالی اعلیٰ حکام کی بھرپور حمایت کرتے تھے۔

حمید الحق چودھری 14 راگست 1947ء کو خواجہ ناظم الدین کی کابینہ میں وزارت خزانہ کے عہدے پر فائز ہوا تھا۔ غالباً اس کا خیال یہ تھا کہ چونکہ پاکستان کا مرکزی دارالحکومت ڈھاکہ سے ڈیڑھ دو ہزار میل کے فاصلے پر واقع ہے اس لئے مشرقی بنگال کو خاصی سیاسی اور مالی خود مختاری حاصل ہوگی اور وہ اس خود مختاری سے فائدہ اٹھا کر مقامی سطح پر بورژوا طبقہ کی نشوونما کا بندوبست کر سکے گا۔ چنانچہ اس نے ابتدا ہی سے صوبائی صنعت وحرفت اور تجارت کی ترقی کے لئے اپنی سکیمیں تیار کرنا شروع کر دی تھیں اور پھر اس نے یہ کوشش بھی کی کہ اس کی کچھ سکیموں پر عملدرآمد ہو جائے۔ مگر اسے اپنی کوشش میں کامیابی نہ ہوئی جس کی وجہ یہ تھی کہ صوبہ کی غیر بنگالی بیوروکریسی اس کی ان سکیموں کے خلاف تھی اور اس بیوروکریسی کی خفیہ رپورٹوں کی بنا پر مرکزی وزارت خزانہ نے یکے بعد دیگرے ان سکیموں کی منظوری دینے سے انکار کر دیا تھا۔ یوں بھی مرکزی حکومت ابتدا ہی سے صوبائی خود مختاری کے وفاقی تصور کے خلاف تھی اور اس نے عملاً وحدانی نظام حکومت قائم کر رکھا تھا۔ جب ستمبر 1948ء میں بابائے قوم قائد اعظم محمد علی جناح کا انتقال ہوا تو اس وقت تک مشرقی بنگال میں مرکزی حکومت اور مسلم لیگ کی ساکھ کو خاصا نقصان پہنچ چکا تھا اور پھر جب چند ماہ کے بعد پنجابی شاونزم نے وزیر اعظم لیاقت علی خان کے اقتدار کو چیلنج کرنا شروع کیا اور مشرقی بنگال میں حسین شہید سہروردی، مولوی فضل الحق اور عبدالحمید بھاشانی مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے مقابلے کے لئے خم ٹھونک کر میدان میں نکل آئے تو حمید الحق چودھری نے بھی سرکاری سطح پر

اپنے صوبہ کے درمیانہ طبقہ کے عزائم کی نمایاں طور پر علمبرداری شروع کر دی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ستمبر 1948ء میں جب خواجہ ناظم الدین پاکستان کا گورنر جنرل بنا تھا تو صوبائی وزارت اعلیٰ کی گدی نورالامین کے سپرد کی گئی تھی جبکہ حمیدالحق چودھری خود اپنے آپ کو اس عہدے کا مستحق سمجھتا تھا۔ نورالامین میں خوبی صرف یہ تھی کہ وہ اپنے پیشرو خواجہ ناظم الدین کی طرح مرکزی حکومت کا فرمانبردار تھا اور صوبہ میں غیر بنگالی بیوروکریسی سے محاذ آرائی نہیں کرتا تھا۔ لیکن اس کی یہ خوبی مشرقی بنگال کے عوام الناس کی نظر میں سب سے بڑی برائی تھی کیونکہ اس وجہ سے وہ اپنے صوبہ کے بے شمار سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی مسائل میں سے کوئی ایک مسئلہ بھی حل نہیں کر سکا تھا۔ چنانچہ جب مارچ 1949ء میں صوبائی اسمبلی کا بجٹ سیشن شروع ہوا تو نور الامین کی سیاسی حالت بہت پتلی تھی۔ حمیدالحق چودھری نے اس صورتحال سے فائدہ اٹھانے کے لئے کئی ایک اقدامات کئے جن میں سے ایک قدم یہ تھا کہ اس نے 11 رمارچ کو اپنا ایک انگریزی روزنامہ، پاکستان آبزرور، شائع کرنا شروع کر دیا۔ اس اخبار نے ابتدا میں تو بڑی احتیاط کے ساتھ صوبہ کے درمیانہ طبقہ کی شکایات کی آئینہ داری کی لیکن اپریل 1949ء میں تانگیل کے ضمنی انتخاب میں مسلم لیگ کے امیدوار کو ایک نوجوان سیاسی کارکن کے ہاتھوں شکست ہوگئی تو پاکستان آبزرور نے صوبائی حقوق ومفادات کی ذرا کھل کر ترجمانی شروع کر دی۔ ستمبر 1949ء تک اس اخبار نے اپنے اداریوں، مضامین، خبروں اور خطوط کے ذریعہ صوبہ کی غیر بنگالی بیوروکریسی اور مرکزی حکومت کی آمریت کے خلاف مشرقی بنگال کے عوام کی شکایات اور مطالبات کا ایک پہاڑ کھڑا کر دیا۔ ہر روز مثالیں دے دے کر اس مضمون کا احتجاجی پروپیگنڈا ہوتا تھا کہ صوبائی حکومت کے غیر بنگالی اعلیٰ حکام بنگالی عوام سے حقارت آمیز سلوک کرتے ہیں، صوبہ اور مرکزی سول انتظامیہ میں بنگالیوں کی نمائندگی نہیں ہے، پاکستان کی مسلح افواج میں بنگالیوں کو بھرتی نہیں کیا جاتا، درآمدی و برآمدی تجارت پر غیر بنگالیوں کا غلبہ ہے، صوبہ میں صنعت وحرفت کی ترقی کے لئے کچھ نہیں ہو رہا، اعلیٰ پایہ کی بنگالی ثقافت و بنگالی زبان کو ختم کر کے گھٹیا درجہ کی گنگا جمنی ثقافت اور اردو زبان کو ٹھونسا جا رہا ہے، مشرقی بنگال میں اناج اور دوسری ضروریات زندگی کی قلت اور مہنگائی کا سلسلہ مرکزی حکومت کی مجرمانہ غفلت اور صوبہ کی غیر بنگالی بیوروکریسی کی بدعنوانیوں کی وجہ سے ختم ہونے میں نہیں آتا اور اسی لئے مشرقی بنگال میں اخراجات زندگی مغربی پاکستان کے مقابلے

میں بہت زیادہ ہیں۔

اگرچہ یہ ساری عوامی شکایات بہت حد تک مبنی بر صداقت تھیں تاہم پاکستان آبزرور میں ان کی ہر روز تشہیر، فرعون مزاج چیف سیکرٹری عزیز احمد کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ چنانچہ اس کی خفیہ رپورٹ کی بنیاد پر حمید الحق چودھری کے خلاف ''پروڈا'' کے تحت مقدمہ چلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس فیصلہ کے مطابق ستمبر 1949ء میں ''ملزم'' کو پاکستانی وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لئے نیویارک بھیجا گیا اور اس کی عدم موجودگی میں مرکزی حکومت کی سپیشل پولیس کے انسپکٹر جنرل اعتزاز الدین نے چار مقامی اخبارات کے مشترکہ مطالبہ کے پیش نظر اس کے خلاف تفتیش شروع کر دی۔ اس ابتدائی تفتیش کا نتیجہ 12/اکتوبر کو برآمد ہوا جبکہ ایسوسی ایٹڈ پریس کی وساطت سے یہ خبر شائع ہوئی کہ وزیر اعلیٰ نورالامین نے حمید الحق چودھری سے وزارت خزانہ کا قلمدان لے لیا ہے اور اب وہ محض وزیر تجارت ہوگا۔ پھر 5/نومبر کو کراچی کے روزنامہ ڈان نے یہ خبر چھاپی کہ مقامی پولیس نے حمید الحق چودھری کے خلاف رشوت ستانی اور دوسری بدعنوانیوں کے الزامات کی تفتیش کے سلسلہ میں پاکستان آبزرور ڈھاکہ کے الہلال پریس پر چھاپہ مارا ہے اور حکومت پاکستان کی سپیشل پولیس اسٹیبلشمنٹ نے پہلے ہی اس کے خلاف اہم دستاویزی شہادتیں حاصل کر لی ہیں۔ سپیشل پولیس کا انسپکٹر جنرل اعتزاز الدین ڈھاکہ میں گزشتہ دو ہفتہ سے یہی کام کر رہا ہے۔ اس نے کئی گواہوں سے پوچھ گچھ کی ہے۔ حمید الحق چودھری کو نیویارک میں یہ خبر ملی تو وہ فوراً واپس ڈھاکہ پہنچا لیکن اس وقت تفتیش مکمل ہو چکی تھی۔ ڈان کی نومبر کی اطلاع یہ تھی کہ متعدد تاجروں نے بھی پولیس کے روبرو یہ بیانات دیئے ہیں کہ جب وہ کوئی کاروبار کرنا چاہتے تھے تو حمید الحق چودھری یہ اصرار کیا کرتا تھا کہ اس کے کسی رشتہ دار کو اس کاروبار میں حصہ دار بنایا جائے۔ 8/نومبر کو حمید الحق چودھری کراچی پہنچا اور اس نے وزیر اعظم لیاقت علی خان سے ملاقات کی لیکن 10/نومبر کو ڈھاکہ میں مولانا اکرم خان کے روزنامہ آزاد کی خبر یہ تھی کہ لیاقت علی خان نے حمید الحق چودھری کے حق میں مداخلت کرنے سے انکار کر دیا ہے اور اسے بتایا ہے کہ قانون کے تقاضے پورے ہوں گے اور اس مقصد کے لئے کسی وزیر اور عام شہری کے درمیان کوئی امتیاز نہیں ہوگا۔ چنانچہ اس کے بعد 5/دسمبر کو حمید الحق چودھری نے صوبائی اسمبلی میں اعلان کر دیا کہ اس نے عہدے سے استعفیٰ دے دیا

ہے۔ اس کے اس اعلان کے موقع پر اسمبلی میں زمینداری نظام کی تنسیخ سے متعلقہ مسودۂ قانون زیر بحث تھا۔ یہ بل تقریباً ایک سال قبل اسمبلی میں پیش کیا گیا تھا مگر زمیندار طبقہ کے دباؤ کی وجہ سے اس کی منظوری معرض التوا میں پڑی رہی تھی۔ اب اس کی منظوری اس لئے ضروری ہوگئی تھی کہ ہندوستان کے تجارتی بائیکاٹ کے باعث کاشتکار معاشی طور پر مکمل تباہی کے کنارے پر پہنچ گئے تھے اور انہیں کسی نہ کسی اقدام سے ڈھارس دینا ضروری تھا۔ دسمبر 1949ء میں اس مسودۂ قانون پر بحث کے دوران جس سلسلے پر سب سے زیادہ گرما گرمی ہوئی وہ یہ تھا کہ زمینداروں سے جو زمین سرکاری تحویل میں لی جائے گی انہیں اس کا معاوضہ دینا چاہیے یا نہیں؟ سرکاری پارٹی کے بعض ارکان بلامعاوضہ پالیسی کے حق میں تھے لیکن انہوں نے ایوان میں کھلم کھلا اعتراف کیا کہ وہ اپنی پارٹی کے نظم وضبط سے مجبور ہو کر معاوضہ کی پالیسی کی حمایت کرتے ہیں۔

بنگلہ کو عربی رسم الخط میں رائج کرنے کی سرکاری کوشش کے خلاف بنگالی عوام کا شدید ردعمل، جلسے اور مظاہرے

تاہم صوبائی اسمبلی میں یہ بحث ابھی نامکمل ہی تھی کہ ایوان سے باہر 9/دسمبر 1949ء کو قومی زبان کے پرانے مسئلہ نے پھر شدت اختیار کر لی جبکہ مرکزی وزیر تعلیم و تجارت فضل الرحمان پاکستان ایجوکیشن بورڈ کے اجلاس میں شرکت کے لئے ڈھاکہ پہنچا۔ اس کی آمد سے ایک دن پہلے ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبا نے ایک قرارداد میں مطالبہ کیا تھا کہ بنگالی زبان کے موجودہ رسم الخط کو تبدیل نہ کیا جائے۔ طلبا کے جس جلسہ میں متفقہ طور پر یہ قرارداد منظور کی گئی تھی اس میں بنگالی رسم الخط کے حق میں رائے عامہ کو بیدار کرنے کے لئے ایک مجلس عمل بھی مقرر کی گئی تھی۔ اس مجلس کا مطالبہ یہ تھا کہ عوامی سطح پر قومی زبان کی تحریک پھر شروع کی جائے گی۔ چنانچہ 10/دسمبر کو ڈھاکہ یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کی ایگزیکٹو کمیٹی نے ایک قرارداد کے ذریعہ بنگالی زبان کے لئے عربی رسم الخط رائج کرنے کی تحریک پر نکتہ چینی کی اور یہ رائے ظاہر کی کہ اگر ایسا کیا گیا تو یہ امر مشرقی بنگال کے عوام کے لئے نہایت نقصان دہ ہوگا۔ ایگزیکٹو کمیٹی نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ عربی رسم الخط کی تجویز کی مخالفت کرنے کے لئے طلبا کا جلسہ عام منعقد کیا جائے گا۔ اسی دن افتخار النسا کی زیر صدارت یونیورسٹی کی طالبات کا بھی ایک جلسہ عام ہوا جس میں بنگالی زبان کے لئے عربی رسم الخط رائج

کرنے کی تحریک کی مذمت کی گئی اور مشرقی بنگال کی ساری طالبات سے اپیل کی گئی کہ وہ متحد ہو کر عربی رسم الخط کی تحریک کی عملی طور پر مخالفت کریں۔[11] یونیورسٹی کے طلبا اور طالبات کی جانب سے اس موقع پر بنگالی زبان کا مسئلہ اٹھانے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ مرکزی وزیر تعلیم نے 9ر دسمبر کو ڈھاکہ پہنچ کر بجا طور پر یہ خدشہ پیدا کر دیا تھا کہ 14ر دسمبر کو ڈھاکہ میں پاکستان ایجوکیشن بورڈ کا جو اجلاس ہوگا اس میں بنگالی زبان کے لئے عربی رسم الخط رائج کرنے کا فیصلہ کیا جائے گا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ 22ر اکتوبر کو غیر بنگالی ارکان پر مشتمل جیوٹ بورڈ کی تشکیل کے بعد صوبہ کے سارے حلقوں میں یہ احساس شدت پکڑ گیا تھا کہ کراچی کے ارباب اقتدار مشرقی بنگال کو فی الحقیقت اپنی نوآبادی تصور کرتے ہیں اور وہ اس صوبہ کو اس کے سیاسی، معاشی اور ثقافتی حقوق دینے پر آسانی سے آمادہ نہیں ہوں گے۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کی جانب سے تجارتی بائیکاٹ کے باعث بنگالی کسانوں کی معاشی حالت بے انتہا خراب ہو گئی تھی۔ ان کی پٹ سن تقریباً دس روپے من کے حساب سے بکتی تھی جبکہ چاول کا بھاؤ تیس چالیس روپے من تھا۔ لہٰذا وہ کسی بھی مسئلہ پر ایجی ٹیشن کے لئے تیار تھے۔ چوتھی وجہ یہ تھی کہ حمید الحق چودھری کے استعفیٰ کے باعث اسمبلی میں نور الامین کی وزارت ڈانواں ڈول ہو گئی تھی اور کسی بھی مسئلہ پر عوامی تحریک کا دباؤ اس کا صفایا کر سکتا تھا۔ پانچویں وجہ یہ تھی کہ ان طلبا کو پاکستان آبزرور جیسے بااثر انگریزی اخبار کی تائید و حمایت حاصل تھی اور یہ اخبار ان کی ساری سرگرمیوں کی خبروں کو بڑی نمایاں جگہ دیتا تھا اور چھٹی وجہ یہ تھی کہ صوبہ کے درمیانہ طبقہ کے کاروباری عناصر صوبائی حکومت کے غیر بنگالی اعلیٰ حکام اور مرکزی حکومت کی غیر ہمدردانہ پالیسی کے پیش نظر طلبا کی ہر تحریک کی ہر طرح سے حمایت کرنے پر آمادہ تھے۔

10ر دسمبر کو یونیورسٹی کے علاوہ شہر کے دوسرے تعلیمی اداروں میں بھی طلبا کے جلسے ہوئے جن میں عربی رسم الخط کی تجویز کے خلاف قراردادیں منظور کی گئیں۔ یونیورسٹی کے شعبہ سائنس کے طلبا نے ایک قرارداد میں مشرقی بنگال اسمبلی کے ارکان سے مطالبہ کیا کہ وہ اس مسئلہ پر عوام الناس کا ساتھ دیں بصورت دیگر وہ چار کروڑ بنگالیوں سے غداری کے مرتکب ہوں گے۔ اسی دن طلبا کی مجلس عمل نے اپنے مطالبہ کی تائید کے لئے عوامی دستخطوں کی ایک مہم بھی شروع کی۔ طلبا کے ایک وفد نے ارکان اسمبلی سے ملاقات کی اور ایک میمورنڈم تیار کر کے اس پر ڈھاکہ کے دانشوروں، پروفیسروں، ادیبوں اور اساتذہ کے دستخط کرائے۔ فضل الحق مسلم ہال میں طلبا کی ایک

ادبی مجلس منعقد ہوئی اور بنگالی رسم الخط کے حق میں قرارداد منظور کی گئی۔ پھر شام کو مجلس عمل کے کنوینر عبدالحلیم نے ایک بیان میں طلبا کی اس یک روزہ مہم کے پس منظر پر روشنی ڈالی۔ اس نے کہا کہ ''ہمیں پاکستان ایجوکیشن ایڈوائزری بورڈ کی اس قرارداد سے تشویش لاحق ہوئی ہے کہ پاکستان کی ساری علاقائی زبانوں کے لئے عربی رسم الخط رائج کیا جائے۔ بورڈ نے یہ قرارداد سال رواں کے اوائل میں وزیر تعلیم فضل الرحمان کی زیر صدارت پشاور میں منظور کی تھی۔ اس کے بعد فروری میں مرکزی وزارت تعلیم کے ایک ترجمان نے اس قرارداد کی حمایت کی تھی اور اس امر کا امکان ہے کہ ایجوکیشن ایڈوائزری بورڈ کا 14 دسمبر کو ڈھاکہ میں جو اجلاس ہوگا اس میں رسم الخط کے سوال پر کوئی ٹھوس اقدام کرنے کا فیصلہ ہوگا۔ چونکہ بنگالی عوام کا مستقبل تاریک ہے اس لئے ہم اساتذہ، طلبا اور دوسرے عوام سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ 12 دسمبر کو بنگالی زبان کے لئے عربی رسم الخط کی تحریک کے خلاف غیر مبہم طریقے سے صدائے احتجاج بلند کریں۔''[12]

عبدالحلیم کی اس اپیل کے مطابق 12 دسمبر کو ڈھاکہ کے سارے تعلیمی اداروں میں احتجاجی جلسے ہوئے جن میں اساتذہ، طلبا اور دوسرے ملازمین نے شرکت کی۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں سٹوڈنٹس یونین کے زیر اہتمام ایک جلسے میں ایک قرارداد کے ذریعہ عربی رسم الخط کی پرزور مخالفت کرتے ہوئے وائس چانسلر سے درخواست کی گئی کہ وہ ایجوکیشن ایڈوائزری بورڈ کے اجلاس میں بنگالی اساتذہ اور طلبا کے ان جذبات کی ترجمانی کرے اور صوبائی اسمبلی کے ارکان سے اپیل کی گئی کہ وہ اس تحریک کے خلاف احتجاج کریں۔ جگن ناتھ کالج ڈھاکہ، ایڈن گرلز کالج، ڈھاکہ میڈیکل کالج اور اقبال ہال میں بھی اس قسم کے احتجاجی جلسے ہوئے اور تمدن مجلس نے بھی اپنے ایک خصوصی اجلاس میں عربی رسم الخط کی تجویز پر سخت خفگی کا اظہار کیا اور سنٹرل سٹوڈنٹس سکرپٹ کمیٹی نے اعلان کیا کہ عربی رسم الخط کی تجویز کے خلاف یوم احتجاج منایا جائے گا۔ پاکستان سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن اور ایسٹ پاکستان مسلم سٹوڈنٹس لیگ نے اپنے بیانات میں اس اعلان کی تائید کی اور عربی رسم الخط کی مخالفت کی۔

پاکستان آبزرور نے بھی اسی دن ایک طرف تو صوبائی حکومت کا یہ پریس نوٹ شائع کیا کہ حمید الحق چودھری کا استعفیٰ منظور کر لیا گیا ہے اور دوسری طرف ایک طویل مضمون کی صورت میں عربی رسم الخط کی تجویز کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ ڈاکٹر محمد احسان الحق ایم۔ اے،

پی۔ایچ۔ڈی۔ کے تحریر کردہ اس مضمون میں یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ بنگالی زبان کا موجودہ رسم الخط برقرار رہنا چاہیے اور اس کی جگہ رومن یا عربی رسم الخط رائج کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ اگر ایسا کیا گیا تو یہ ایک غیر سائنسی اور ناقابل عمل اقدام ہوگا۔ اس طرح بنگالیوں کی تعلیمی ترقی یکا یک رک جائے گی۔ کیونکہ نئے رسم الخط کو مقبول عام کرنے میں کم از کم پچاس سال کا عرصہ لگے گا۔ بنگالی عوام اپنے ثقافتی ورثہ سے محروم ہو جائیں گے اور ہمارا وہ سارا ادبی ذخیرہ ضائع ہو جائے گا۔ جو بہت سے بنگالی مصنّفین کی ذہنی کاوشوں کے نتیجہ میں جمع ہوا ہے۔ ہم اس سارے ادب کا عربی رسم الخط میں ترجمہ نہیں کر پائیں گے۔ ہم کم از کم دو نسلوں تک احمقوں کی قوم بن جائیں گے اور حکومت کو بے روزگاری کا ایک مسئلہ درپیش ہو جائے گا جس سے ہماری نوزائیدہ ریاست کی بنیادیں ہل جائیں گی۔ مضمون میں مزید رائے ظاہر کی گئی تھی کہ محض رسم الخط کے یکساں ہونے سے اسلامی ممالک میں اتحاد و یگانگت کی فضا پیدا نہیں ہو سکتی۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو ایران، عراق، شام، فلسطین، یمن، اردن، مصر اور افغانستان بہت دیر پہلے ایک ریاست کی صورت اختیار کر چکے ہوتے۔ عرب ممالک کی تو زبان بھی مشترک ہے لیکن اس کے باوجود ان میں اتحاد پیدا نہیں ہوا۔ امریکہ اور برطانیہ کی زبان ایک ہی ہے لیکن یہ مشترک زبان ان دونوں ممالک کو متحد نہیں رکھ سکی۔

چونکہ اساتذہ اور طلبا کے ان جلسوں میں بڑی پر جوش تقریریں کی گئی تھیں اور یہ اعلان کیا گیا تھا کہ 14 دسمبر کو یوم احتجاج منایا جائے گا اس لئے نورالامین کی صوبائی حکومت بہت پریشان ہوئی۔ اس کی تشویش یہ تھی کہ طلبا کی یہ تحریک کہیں ایسی شدت نہ اختیار کر لے جیسی کہ مارچ 1948ء میں ہوئی تھی اور جس کے پیش نظر، وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین ایک ایسے معاہدے پر دستخط کرنے پر مجبور ہو گیا تھا جس پر بعد میں عملدر آمد نہیں کیا گیا تھا۔ چنانچہ صوبائی حکومت نے ایک پریس نوٹ میں یقین دلایا کہ صوبہ کے عوام کی مرضی کے خلاف ان کی زبان کے رسم الخط میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ پریس نوٹ میں کہا گیا تھا کہ ''بعض حلقے طلبا کو اس قسم کی جھوٹی افواہوں کے ذریعہ اشتعال دلا رہے ہیں کہ بنگالی زبان پر عربی رسم الخط ٹھونسنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور ڈھاکہ میں پاکستان ایجوکیشن ایڈوائزری بورڈ کا اجلاس اسی مقصد کے لئے ہو رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بورڈ کے اجلاس میں اس موضوع پر کوئی بحث نہیں ہوگی لہٰذا بنگالی زبان پر کسی رسم الخط کے

ٹھونسنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بنگالی زبان کا موجودہ رسم الخط برقرار رہنا چاہیے یا اس کے لئے عربی رسم الخط اختیار کرنا چاہیے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا فیصلہ صوبہ کے عوام ہی کر سکتے ہیں۔ حکومت طلبا کو مطلع کرتی ہے کہ وہ ایسی افواہوں سے گمراہ نہ ہوں۔ یہ افواہیں ایسے لوگوں نے پھیلائی ہیں جو اپنے مخصوص مقاصد کے لئے طلبا کا استحصال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''[13]

تاہم جب 14 ردسمبر کو ڈھاکہ یونیورسٹی میں ایجوکیشن ایڈوائزری بورڈ کا اجلاس ہوا تو مسلح پولیس کے نہایت غیر معمولی پہرے کے باوجود اساتذہ اور طلبا نے پرجوش طریقے سے یوم احتجاج منایا۔ ڈھاکہ کالج میں ایک احتجاجی جلسہ ہوا جس میں شہر کے سارے تعلیمی اداروں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ معززین نے صوبائی حکومت کے 13 ردسمبر کے متذکرہ سرکاری اعلان کو اس بنا پر نا قابل اعتبار قرار دیا کہ حکومت نے پہلے بھی ایسے مواقع پر کئی وعدے کئے تھے لیکن بعد میں جب حالات معمول پر آ گئے تھے تو وہ ان وعدوں پر قائم نہیں رہی تھی۔ چنانچہ اس جلسہ میں متفقہ طور پر ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں طلبا کو مشورہ دیا گیا کہ ''وہ اس قسم کے دلکش وعدوں سے گمراہ نہ ہوں اور اس وقت تک اتحاد و یگانگت کے ساتھ اپنی جدوجہد جاری رکھیں جب تک کہ بنگالی زبان کو پاکستان کی قومی زبان قرار نہیں دے دیا جاتا۔''[14] اس جلسے کی جوشیلی تقریروں میں پاکستان آبزرور کے اس دن کے اداریے کا کچھ نہ کچھ عنصر بھی شامل تھا۔ اس اداریے میں لکھا تھا کہ ''بعض حلقوں کے خیال میں بنگالی زبان اور بنگالی رسم الخط غیر اسلامی ہے اور بعض لوگ تو مشرقی بنگال کے مسلمانوں کی اسلامی نیت کے بارے میں بھی شک وشبہ کا اظہار کرتے ہیں۔ دوسری طرف ایسے لوگ بھی ہیں جو ہر اس چیز کو اجنبی تصور کرتے ہیں جس کا مشرقی بنگال سے تعلق نہیں ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ دونوں انتہا پسند حلقے شعوری یا غیر شعوری طور پر پاکستان کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اگرچہ ہماری رائے میں اس قسم کے مسئلے کا فیصلہ جذباتی یا نیم مذہبی نقطۂ نگاہ سے نہیں ہونا چاہیے۔ تاہم اس موقف کو بلا تامل غلط قرار دیا جا سکتا ہے کہ عربی رسم الخط اسلامی ہے اور بنگالی رسم الخط بت پرستانہ ہے۔'' تاہم اسی دن حکومت کے ایک پریس نوٹ کے مطابق وزیر تعلیم فضل الرحمان نے ایجوکیشن بورڈ کے افتتاحی اجلاس میں جو تقریر کی اس میں بتایا کہ ''بنگالی زبان کے موجودہ رسم الخط کی جگہ عربی رسم الخط رائج کرنے کے لئے 20 رمراکز کھولے گئے ہیں۔ ان مراکز کے تجربہ کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا جائے گا کہ اس طرح تعلیم بالغاں کے عمل کو تیز کیا جا سکتا ہے

یا نہیں۔؟[15] بورڈ کا یہ اجلاس تین دن جاری رہا اور 16 ردسمبر کو آخری اجلاس کے بعد یہ اعلان کیا گیا کہ اردو زبان پانچویں جماعت سے لازمی مضمون ہوگی اور بورڈ کے فیصلہ کے مطابق ایک اعلیٰ اختیاراتی کمیٹی مقرر کی جائے گی جو مشرقی بنگال میں اردو زبان اور ادب کی ترقی کے لئے تجویز پیش کرے گی۔

ایجوکیشن ایڈوائزری بورڈ کے اس سہ روزہ اجلاس کے دو تین دن بعد ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبا کا ایک بہت بڑا جلسہ ہوا جس میں بہت سے معززین نے بورڈ کے اس فیصلہ کی، کہ عربی رسم الخط میں بنگالی زبان کی تعلیم دینے کے لئے 20 تجرباتی مراکز کھولے جائیں گے، مذمت کی اور اسے بنگالی زبان کو کچلنے کی ایک سازش قرار دیا۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ ان مراکز میں بنگالی زبان بنگالی رسم الخط میں سکھائی جائے اور طلبا سے اپیل کی کہ حکومت نے رسم الخط کی تحریک کو سبوتاژ کرنے کے لئے جو پریس نوٹ جاری کیا ہے اس سے گمراہ نہ ہوں۔ بہت سی جذباتی تقریروں کے بعد اس جلسہ میں متفقہ طور پر چار قراردادیں منظور کی گئیں۔ ''(1) حکومت مشرقی بنگال کو بلا تاخیر واضح الفاظ میں یہ اعلان کرنا چاہیے کہ بنگالی رسم الخط کی جگہ عربی رسم الخط رائج نہیں کیا جائے گا۔ (2) مذکورہ 20 مراکز میں فوری طور پر بنگالی رسم الخط رائج کیا جائے۔ (3) مرکزی وزیر تعلیم نے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں ذریعہ تعلیم کے بارے میں جو مبہم سا بیان دیا ہے اس کی وضاحت کی جائے۔ (4) مغربی پاکستان کے اسکولوں میں بنگالی زبان کو لازمی مضمون قرار دیا جائے تاکہ وہاں کے لوگ پاکستان کے اس حصے کے لوگوں سے واقف ہوسکیں۔''[16] پھر یونیورسٹی کے بنگالی ڈیپارٹمنٹ کے پروفیسر ڈاکٹر محمد شہید اللہ نے ایک مضمون میں مرکزی وزیر تعلیم فضل الرحمان کی اس خاموشی کی مذمت کی جو اس نے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں بنگالی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے بارے میں اختیار کی تھی اور گورنر سر فریڈرک بورن (Fredrick Bourne) کی اس رائے کا شکریہ ادا کیا کہ صوبہ کے چھوٹے سے چھوٹے تعلیمی ادارے سے لے کر بڑے سے بڑے تعلیمی ادارے میں بنگالی زبان کو ہی ذریعہ تعلیم ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر شہید اللہ نے کہا کہ ''ہم کسی بھی غیر ملکی زبان کو خواہ وہ زبان انگریزی ہو یا اردو ہو اسکول، کالج، یونیورسٹی، مکتب یا مدرسے میں ذریعہ تعلیم بنانے کی مخالفت کریں گے کیونکہ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ اگر غیر ملکی زبان میں تعلیم دی جائے تو وہ بار آور نہیں ہوتی...... ایجوکیشن بورڈ نے اردو بولنے والے طلبا کے لئے بنگالی زبان کو لازمی

قرار نہیں دیا۔ یہ امر بنگالی بولنے والے طلبا سے سخت بے انصافی ہے بلکہ ظلم ہے۔ بورڈ کی قراردادوں میں عربی زبان اور بنگالی زبان کے بارے میں مکمل خاموشی اختیار کی گئی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ بنگالی زبان اور ادب کو اسلام اور اسلامی ثقافت سے مالا مال کرنے کے لئے ترجمہ کا ایک شعبہ قائم کیا جائے۔ اس سے بنگالی عوام کو بہت فائدہ ہوگا جو پاکستان کی آبادی کا 60 فیصد ہیں لیکن اس قسم کا شعبہ قائم کرنے کی بجائے عربی رسم الخط میں بنگالی زبان سکھانے کے لئے 20 مراکز کھولے جارہے ہیں جیسے کہ ہم وسطی افریقہ کے غیر مہذب لوگ ہیں جس کی زبان کا کوئی رسم الخط نہیں ہے۔ ہم روٹی چاہتے ہیں لیکن ہمیں پتھر دیئے جارہے ہیں۔"[17] اس مضمون کی اشاعت کے ایک دن بعد ڈھاکہ میں ایسٹ بنگال ٹیچرز کانفرنس کے پہلے اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے مطالبہ کیا گیا کہ بنگالی زبان کو مشرقی پاکستان کی سرکاری زبان قرار دیا جائے اور اسکولوں و کالجوں میں بھی اسی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔

رسم الخط کے مسئلہ پر پاکستان ایجوکیشن ایڈوائزری بورڈ کا یہ فیصلہ واقعی بہت اشتعال انگیز تھا کیونکہ اس کی بنیاد سراسر فریب اور دھوکہ بازی پر تھی اور اس سے مشرقی بنگال کے عوام الناس میں حروف القرآن کے لئے احترام کے جو جذبات پائے جاتے تھے ان کی آڑ لے کر دیو ناگری رسم الخط کی بنگالی زبان کو ختم کر کے وہاں اردو زبان رائج کی جارہی تھی۔ یہ رویہ بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ وسطی ایشیا کے مسلمان حکمرانوں نے برصغیر پر اپنی تقریباً ایک ہزار سالہ حکمرانی کے دوران فارسی زبان کو سرکاری زبان بنائے رکھنے کے لئے اختیار کیا تھا اور پھر برطانوی سامراجیوں نے اپنے دوسو سالہ عہد اقتدار میں انگریزی زبان کو سرکاری زبان بنانے کے سلسلے میں اختیار کیا تھا۔ لہٰذا عربی رسم الخط کی مرکزی تحریک پر صوبہ کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ میں اس قدر ہیجان پیدا ہوا کہ بہت سے ارکان اسمبلی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور اس بنا پر نورالامین کی حکومت کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔

مسلم لیگ کے ارکان صوبائی اسمبلی کے اجلاس کی قرارداد کہ دفاع اور امور خارجہ کے علاوہ تمام شعبوں میں مشرقی بنگال کو مکمل خودمختاری دی جائے

اس صورت حال میں 19 ردسمبر کو وزیر اعلیٰ نورالامین کی زیر صدارت صوبائی لیگ

اسمبلی پارٹی کا اجلاس ہوا تو اس میں ایک قرارداد منظور کر کے یہ مطالبہ کیا گیا کہ دفاع اور امور خارجہ کے علاوہ تمام شعبوں میں مشرقی پاکستان کو خودمختاری ملنی چاہیے۔ یہ قرارداد بہت تاریخی اہمیت کی حامل تھی اس لئے کہ اس میں صوبائی اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی نے پہلی مرتبہ کھل کر اور رسمی طور پر یہ مطالبہ کیا تھا کہ مشرقی بنگال کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری ملنی چاہیے۔ بلاشبہ وزیراعلیٰ نورالامین کراچی کے ارباب اقتدار کا فرمانبردار تھا لیکن صوبہ میں چاول اور دوسری ضروریات زندگی کی مہنگائی، پٹ سن کی فقید المثال کساد بازاری، مرکز کی جانب سے مقرر کردہ جیوٹ بورڈ میں صوبائی مفادات کی عدم نمائندگی اور عربی رسم الخط کی تحریک کی وجہ سے ایک زبردست سیاسی طوفان کی جو علامتیں نظر آنے لگیں تھیں ان کے دباؤ کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ حمید الحق چودھری کے استعفیٰ کے باعث اسمبلی میں اس کی حالت پہلے ہی ناگفتہ بہ ہوگئی تھی اور اسمبلی کے باہر مولانا بھاشانی کی عوامی مسلم لیگ نے اس کی حکومت کا ناطقہ بند کر دیا تھا۔ اسمبلی پارٹی کی اس قرارداد میں پاکستان دستور ساز اسمبلی میں بنگالی نمائندوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ اس امر کا خیال رکھیں کہ پاکستان کے آئندہ کے آئین میں صوبہ کے مفادات کا مناسب طریقے سے تحفظ ہو اور مرکزی اسمبلی میں مشرقی بنگال کی نمائندگی جمہوری اصولوں کے مطابق آبادی کی بنیاد پر ہو۔ اسمبلی پارٹی نے مرکز میں مشرقی پاکستان کی پوزیشن کا جائزہ لیا اور اس کے اوپر تشویش کا اظہار کیا کہ پاکستان دستور ساز اسمبلی کی آئین ساز کمیٹی میں مشرقی بنگال کو پوری نمائندگی حاصل نہیں ہے اور اس بنا پر اس کمیٹی کو مشرقی بنگال کے موقف کو سمجھنے میں بڑی مشکل پیش آرہی ہے۔ اجلاس میں مرکزی حکومت کے ان متعدد آرڈیننسوں پر بحث کی گئی جن سے صوبہ کی خودمختاری پر برا اثر پڑا ہے اور دستور ساز اسمبلی کے ارکان سے درخواست کی گئی کہ وہ ان آرڈیننسوں کو منسوخ کر دیں۔ ''پروڈا'' پر بالخصوص سخت نکتہ چینی کر کے اس کی تنسیخ کا مطالبہ کیا گیا اور یہ بھی سفارش کی گئی کہ مرکز سے مشرقی پاکستان کی بہت دوری سے پیدا شدہ مشکلات کے پیش نظر دفاع اور امور خارجہ کے سوا باقی سارے شعبوں میں مشرقی پاکستان کو مکمل خودمختاری دی جائے۔ اجلاس نے مزید سفارش کی کہ دستور ساز اسمبلی میں مشرقی بنگال کی جو نشستیں خالی ہیں انہیں پر کیا جائے اور ان ارکان کی جگہ نئے ارکان کا انتخاب کیا جائے جو اپنی سرکاری مصروفیات یا دوسری وجوہ کی بنا پر ایوان سے مسلسل غیر حاضر رہتے ہیں اور یہ بھی مطالبہ کیا کہ جیوٹ بورڈ میں مشرقی بنگال کے تین نمائندے شامل کئے جائیں۔[18]

لیگ اسمبلی پارٹی کی اس قرارداد کا ایک پس منظر یہ بھی تھا کہ ستمبر 1949ء سے اخبارات میں مسلسل اس مضمون کی خبریں شائع ہو رہی تھیں کہ پاکستان دستور ساز اسمبلی نے آئینی تجاویز مرتب کرنے کے لئے جو کمیٹی مقرر کی تھی اس نے اپنا کام تقریباً مکمل کر لیا ہے۔ اگر اس کمیٹی کی مرتب کردہ رپورٹ پر عمل کیا گیا تو ''مرکزی حکومت کو پہلے سے بھی زیادہ اختیارات حاصل ہو جائیں گے۔ مرکز میں دو ایوانی مقنّنہ ہوگی اور ایوان بالا میں ہر صوبے کو مساوی نمائندگی حاصل ہو گی۔'' مشرقی بنگال کے باشعور سیاسی حلقوں میں ان رپورٹوں سے سخت بے چینی پیدا ہو گئی تھی کیونکہ عام تاثر یہ تھا کہ ''اس طرح مغربی پاکستان کو مرکز کی مؤثر مقنّنہ میں 75 فیصد نمائندگی مل جائے گی حالانکہ اس کی آبادی پچاس فیصد سے کم ہے۔ بالفاظ دیگر آج کل مغربی پاکستان کو مشرقی بنگال پر جو غلبہ حاصل ہے اسے آئینی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔''

اس قسم کی رپورٹوں کے پیش نظر ڈھاکہ مسلم چیمبر آف کامرس کے صدر سخاوت حسین نے 11ر دسمبر کو سراج گنج (پبنہ) میں ایسٹ بنگال مرچنٹس کانفرنس کے دو روزہ سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے پہلی مرتبہ ایک مؤثر صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے کراچی کے ارباب اقتدار کی روز افزوں مرکزیت پسندی کو مشرقی بنگال کے لئے انتہائی نقصان دہ قرار دیا اور پھر مطالبہ کیا کہ ''مشرقی پاکستان کو دفاع، امور خارجہ اور کرنسی کے سوا سارے شعبوں میں خود مختاری ملنی چاہیے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ محصولات کے سارے محکمے، چٹاگانگ کی بندرگاہ، ایسٹ بنگال ریلوے اور محکمہ ڈاک و تار وغیرہ بلا تاخیر صوبائی حکومت کی تحویل میں دے دیئے جائیں۔''[19]
سخاوت حسین نے قبل ازیں ایک اور تقریر میں مرکزی جیوٹ بورڈ میں صوبائی حکومت اور کاشتکاروں کی عدم نمائندگی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے بتایا تھا کہ ''اس بورڈ نے پٹ سن کی خریداری کے لئے جو طریقہ کار وضع کیا ہے اور جو انتظامی مشینری قائم کی ہے اس کی وجہ سے غریب کاشتکار بالکل تباہ ہو رہے ہیں۔'' پاکستان آبزرور نے لیگ اسمبلی پارٹی کی اس قرارداد پر فوری طور پر کوئی براہ راست تبصرہ نہ کیا البتہ 25ر دسمبر کے شمارے میں صوبہ پرستی کے زیر عنوان ایک اداریے میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ ''مرکزی ارباب اقتدار میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ جب کبھی کوئی شخص مقامی یا صوبائی مفادات کا ذکر کرتا ہے تو اس پر فوراً صوبہ پرستی کا الزام عائد کر دیا جاتا ہے حالانکہ سیاسی تدبر کا تقاضا یہ ہے کہ مقامی مفادات کو حقیر سمجھ کر نظر انداز نہ کیا جائے بلکہ انہیں قومی

زندگی میں مربوط کیا جائے۔ صوبائی زندگی کے بہت سے پہلو ایسے ہیں کہ اگر انہیں قومی زندگی کے بڑے دھارے کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے تو اس طرح قومی زندگی کی توانائی میں اضافہ ہوگا۔ اگر ہمارے قومی زعمانے اس مسئلہ پر سنجیدگی سے توجہ نہ کی تو یہ ہماری مملکت کے لئے لاعلاج پھوڑا بن سکتا ہے۔ ضرورت حقیقت پسندی کی ہے نہ کہ وعظ کی۔''

پھر تین چار دن کے بعد پاکستان آبزرور نے اسمبلی پارٹی کی قرارداد پر ایک طویل اداریے میں براہ راست تبصرہ کیا۔ اس اداریہ کا خلاصہ یہ تھا کہ لیگ اسمبلی پارٹی نے 19 دسمبر کو جو قرارداد منظور کی تھی اسے مشرقی پاکستان کے سارے عوام کی بھرپور تائید وحمایت حاصل ہے۔ عوام الناس حقیقی، مکمل اور خالص صوبائی خودمختاری کے خواہاں ہیں۔ خودمختاری کا مطلب یہ ہے کہ دفاع اور امور خارجہ کے سوا سارے شعبوں میں صوبائی حکومت کو مکمل اختیارات حاصل ہوں۔ ہمارے پاس آئے دن اس مضمون کی شکایتیں موصول ہوتی رہتی ہیں کہ مشرقی بنگال کے تاجروں کو درآمدی و برآمدی پرمٹ ملنے میں بڑی دیر ہوتی ہے کیونکہ ان کی درخواستیں برائے فیصلہ کراچی بھیجی جاتی ہیں۔ ہم میں سے بعض عناصر نے دو سال قبل یہ کہا تھا کہ مشرقی بنگال کے معاملات کا فیصلہ بلا تاخیر موقع پر ہی ہونا چاہیے۔ مگر ہماری اس رائے کو قابل توجہ نہ سمجھا گیا اور صوبائی اختیارات کو بتدریج مرکزی تحویل میں لینے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ حتیٰ کہ سیلز ٹیکس کو بھی مرکزی ٹیکس بنالیا گیا اور اعلیٰ ملازمتوں میں بھرتی کے سارے اختیارات بھی مرکزی حکومت نے حاصل کر لئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب مشرقی پاکستان میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو صوبائی خودمختاری کے مسئلہ کے بارے میں پختہ نظریے کا حامل نہ ہو۔ صوبائی خودمختاری اور یونٹوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم کے اصولوں پر جغرافیائی اور تاریخی حقائق کو پیش نظر رکھ کر غور کرنا چاہیے۔[20]

اس اداریے کے ساتھ ایک شخص شاہد پرویز کا ایک خط چھپا تھا جس میں شکایت کی گئی تھی کہ پاکستان کی مسلح افواج میں بھرتی کے موقع پر مشرقی بنگال کے امیدواروں سے بے انصافی کی جاتی ہے۔ مراسلہ نگار نے اس مبینہ بے انصافی کی ایک مثال دیتے ہوئے بتایا تھا کہ ''حال ہی میں ہوائی فوج میں کمیشن کے لئے 100 امیدواروں میں سے 22 کا انتخاب کیا گیا تھا لیکن انٹر سروسز بورڈ نے ان 22 میں سے ایک کے سوا سب کو مسترد کر دیا ہے اور اس قتل عام سے یہاں کے نوجوانوں میں بڑی مایوسی پھیل گئی ہے'' اور اسی دن اسی اخبار میں دو خبریں بھی چھپی تھیں جن میں

سے پہلی خبر یہ تھی کہ یکم اپریل 1948ء کی بات ہے مرکزی حکومت نے سیلز ٹیکس کو دو سال کے لئے مرکزی ٹیکس بنالیا تھا لہٰذا خیال تھا کہ 31/مارچ 1950ء کے بعد صوبائی حکومت کو یہ ٹیکس وصول کرنے کا پھر اختیار مل جائے گا۔ مگر اب ایسا نہیں ہوگا کیونکہ فیصلہ یہ ہوا کہ 31/مارچ 1950ء کے بعد بھی سیلز ٹیکس مرکزی ٹیکس ہی رہے گا۔ 11/جنوری 1950ء کو جی۔ الانہ کی زیر صدارت کراچی کے ایوان تجارت کا ایک اجلاس ہوگا جس میں حکومت پاکستان کے اس فیصلہ کی حمایت کی جائے گی اور دوسری خبر یہ تھی کہ مشرقی بنگال کے وزیر اعلیٰ نے اس تجویز سے اتفاق کرلیا ہے کہ مرکزی حکومت ایک سنٹرل پولیس سروس قائم کرے گی جس کے ارکان کی صوبوں کی پولیس کے اعلیٰ عہدوں پر تقرری ہوگی۔ یہ تجویز مروجہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے منافی ہے کیونکہ اس ایکٹ کے تحت صوبائی حکومتوں کو صوبائی انتظامیہ کے سارے افسروں کی بھرتی اور تقرری کا اختیار حاصل ہے۔ خیال ہے کہ دستور ساز اسمبلی کے بنگالی ارکان اس فیصلے کی سخت مخالفت کریں گے کیونکہ لیگ اسمبلی پارٹی کے 19/دسمبر کے اجلاس میں اس تجویز کی سخت مخالفت کی گئی تھی۔"

پنجابی شاونزم کے ترجمان اخبار نوائے وقت کی مشرقی بنگال مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کی قرارداد کے خلاف زہرافشانی

کراچی اور پنجاب کے سیاسی حلقوں کے لئے مشرقی بنگال اسمبلی پارٹی کی یہ قرارداد غیر متوقع تھی اگرچہ گزشتہ دو سال میں مشرقی بنگال کے تعلیم یافتہ اور کاروباری عناصر 1940ء کی قرارداد پاکستان کے مطابق مسلسل صوبائی خودمختاری کا مطالبہ کرتے رہے تھے۔ صوبائی اسمبلی میں بھی خواجہ ناظم الدین اور نورالامین سمیت متعدد ارکان صوبائی حقوق ومفادات کا ذکر کرتے رہے تھے اور کراچی کے ارباب اقتدار کے خلاف مشرقی بنگال کے سیاسی اور مالی حقوق غصب کرنے کے الزامات عائد کرتے رہے تھے۔ تاہم کراچی اور پنجاب کے حکمران طبقوں میں سے کسی کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ مشرقی بنگال کی لیگ اسمبلی پارٹی پٹھو وزیر اعلیٰ نورالامین کی زیر صدارت اس قسم کی باغیانہ قرارداد منظور کرسکتی ہے۔ لاہور کا روزنامہ نوائے وقت، پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے شاونسٹوں کے عزائم کی ترجمانی کرتے ہوئے ہر روز وزیر اعظم لیاقت علی خان کے خلاف زہرافشانی کرتا تھا اور اسے پنجاب کے حقوق ومفادات کا بدترین دشمن

قرار دے کر اس پر آمریت اور مطلق العنانیت کے الزامات عائد کرتا تھا لیکن اس اخبار نے کبھی بھی لیاقت علی خان کی حکومت کے ایسے اقدام کی مذمت نہیں کی تھی جو وہ پے در پے مشرقی بنگال کے حقوق و مفادات کو غصب کرنے کے لئے کرتی رہتی تھی۔ اس معاملے میں نوائے وقت اور لیاقت علی خان کے درمیان پورا اتحاد و اتفاق تھا۔ چنانچہ اس اخبار نے اس بنا پر مشرقی بنگال کی لیگ اسمبلی پارٹی کی متذکرہ قرارداد کو ایک خطرناک مطالبہ قرار دیا۔ اس کا ادارتی تبصرہ یہ تھا کہ ''جہاں تک صوبائی خودمختاری کا تعلق ہے مشرقی پاکستان اس وقت بھی خودمختار ہے اور مرکز اس کے معاملات میں کم سے کم دخل دے رہا ہے لیکن اگر اس قسم کے مطالبات شروع ہو گئے تو اس سے پاکستان کی وحدت خطرے میں پڑ جائے گی۔ مشرقی بنگال کی پارلیمنٹری پارٹی کے فرزانوں کو یہ صورت حال کیوں پسند نہیں کہ مرکز میں گورنر جنرل، صدر دستور ساز اسمبلی، وزیر داخلہ، وزیر تعلیم وتجارت، وزیر قانون اور وزیر صحت بنگالی ہیں۔ مشرقی بنگال کی پارلیمنٹری پارٹی اور خان غفار خان کے مطالبہ پٹھانستان کی اساس بالکل ایک ہے...... پھر مغربی پاکستان میں بھی ان خطوط پر سوچنے والے لوگ نہ نکل آئیں گے کہ ہم مشرقی بنگال کے دفاع کی ذمہ داری کیوں قبول کریں۔ آخر ہمیں اس تعلق سے کیا فائدہ پہنچے گا جو یک طرفہ ہے؟...... مشرقی بنگال کی وزارت مشکلات میں پھنسی ہوئی ہے۔ مسٹر حمید الحق چودھری کی علیحدگی نے اس کے لئے نئی الجھنیں پیدا کر دی ہیں۔ ہمیں شبہ ہے کہ وہاں کے برسر اقتدار طبقہ نے عوام کی توجہ دوسری طرف کرنے کے لئے یہ سٹنٹ کھڑا کر دیا ہے۔''[21]

برخودغلط پنجابی شاونسٹوں کے ترجمان اخبار نوائے وقت کا یہ اداریہ ''دروغ گوئم برروئے تو'' کی بدترین مثال تھا۔ دنیا کا کوئی اور اخبار اس قسم کا سفید جھوٹ نہیں لکھ سکتا تھا کہ ''جہاں تک صوبائی خودمختاری کا تعلق ہے مشرقی پاکستان اس وقت بھی خودمختار ہے اور مرکز اس کے معاملات میں کم سے کم دخل دے رہا ہے۔'' گزشتہ دو اڑھائی سال میں مرکزی ارباب اقتدار نے جس طریقے سے سیلز ٹیکس اور جیوٹ ٹیکس کی وصولی اور انکم ٹیکس میں سے صوبائی حصہ کو غصب کر کے مشرقی بنگال اور دوسرے صوبوں سے بدسلوکی کی تھی، مرکزی سپیشل پولیس، پروڈا، پبلک سیفٹی آرڈیننس اور جیوٹ بورڈ کی صوبائی حکومت کے مشورہ کے بغیر تشکیل کے سلسلے میں آرڈیننسوں کے ذریعہ جو مجرمانہ کاروائی کی تھی، مرکز کے سول اور فوجی شعبوں میں بنگالیوں کو بھرتی نہ کرنے کے

سلسلے میں جوعذرداریاں کی تھیں، مرکزی اعلیٰ سروسز کے قیام کے لئے جو یکطرفہ اقدام کیا تھا، صوبہ کی انتظامیہ پر جس طرح غیر بنگالی بیوروکریسی کا قبضہ قائم کیا تھا، بنگالی زبان اور ثقافت کو تباہ کرنے کے لئے جو سامراجی کوششیں کی تھیں، درآمدی و برآمدی تجارت میں بنگالیوں سے جو کھلی بے انصافی کی تھی، صنعت وحرفت کی ترقی کے معاملے میں جس طریقے سے مشرقی بنگال کو نظرانداز کیا تھا، ان سارے حقائق کے پیش نظر اس قسم کا جھوٹ لکھنے کے لئے کہ ''مشرقی بنگال اس وقت بھی خودمختار ہے اور مرکز اس کے معاملات میں کم سے کم دخل دے رہا ہے۔'' بڑی سنگدلانہ جرأت یا بے ضمیری کی ضرورت تھی۔ پنجابی شاؤنسٹوں اوران کے نوائے وقت کے پاس ان دونوں چیزوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اس قسم کی دلیل بھی صرف نوائے وقت ہی دے سکتا تھا کہ چونکہ مرکز میں گورنر جنرل، صدر دستورساز اسمبلی، وزیرداخلہ، وزیرتعلیم وتجارت، وزیرقانون اور وزیرصحت بنگال سے ہیں اس لئے مشرقی بنگال کے فرزانوں کو خودمختاری کا مطالبہ نہیں کرنا چاہیے۔

پہلی بات تو یہ تھی کہ قائداعظم کے انتقال کے بعد گورنرجنرل اور صدر دستورساز اسمبلی کے عہدوں کی حیثیت محض نمائشی تھی۔ وزارت داخلہ کا عہدہ بھی اس لئے نمائشی تھا کہ اس وزارت کے سیکرٹری سے لے کر ایک معمولی سپاہی تک کے عملہ کی بھاری اکثریت پنجابیوں پر مشتمل تھی۔ تعلیم، تجارت، قانون اور صحت کی غیراہم وزارتوں میں بھی شاید ہی کوئی بنگالی اہلکار موجود تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ مرکزی حکومت میں ان بنگالی نمائندوں کی موجودگی کا صوبائی خودمختاری کے مطالبہ سے کیا تعلق تھا۔ یہ مطالبہ صوبائی لیگ اسمبلی پارٹی نے کیا تھا اور پاکستان آبزرور کے بقول مشرقی بنگال میں شاید ہی کوئی ایسا شخص تھا جو اس مطالبہ کی پرزور تائید نہیں کرتا تھا۔ تیسری بات یہ تھی کہ مرکزی حکومت میں اہم ترین وزارتیں یعنی دفاع، امورخارجہ، خزانہ اور صنعت کی وزارتیں غیر بنگالیوں کے پاس تھیں اور مرکزی حکومت کا سیکرٹری جنرل جس کے ہاتھ میں ملک کی پوری انتظامیہ کی باگ ڈور تھی وہ بھی غیر بنگالی تھا۔ چوتھی بات یہ تھی کہ مشرقی بنگال کا گورنر انگریز تھا اور چیف سیکرٹری پنجابی تھا اور یہ دونوں صوبائی وزارت کی کارکردگی کے بارے میں مرکزی حکومت کو خفیہ رپورٹیں بھیجتے تھے۔ پانچویں بات یہ تھی کہ مرکزی حکومت میں چند بنگالی پٹھوؤں کی شمولیت کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ملک کی عنان اقتدار بنگالیوں کے ہاتھ میں تھی۔ برصغیر کی تقسیم سے پہلے 46-1945ء میں انڈین نیشنل کانگرس کا صدر ایک مسلمان

ابوالکلام آزاد تھا اور کانگرس کی مجلس عاملہ میں رفیع احمد قدوائی، ڈاکٹر سید محمود اور خان عبدالغفار خان جیسے جغادری مسلمان شامل تھے لیکن اس کے باوجود آل انڈیا مسلم لیگ کا بجا طور پر موقف یہ تھا کہ کانگرس مسلمانان ہند کی نمائندگی نہیں کرتی اور قائداعظم جناح کے بقول ابوالکلام آزاد محض ایک شو بوائے تھا۔ 1937ء میں ہندو اکثریتی صوبوں میں کانگرس نے حافظ محمد ابراہیم جیسے مسلمانوں کو صوبائی وزارتوں میں شامل کیا تھا لیکن آل انڈیا مسلم لیگ نے ان پٹھوؤں کو مسلمانوں کا نمائندہ تسلیم نہیں کیا تھا۔ 1946ء میں پنجاب میں کانگرس نے یونینسٹ پارٹی کے آٹھ دس مسلمانوں کو ساتھ ملا کر خضر حیات خان کی سربراہی میں ایک مخلوط وزارت بنائی تھی، اس وزارت کو اسمبلی میں اکثریت کی حمایت بھی حاصل تھی لیکن پنجاب مسلم لیگ نے بجا طور پر یہ موقف اختیار کیا تھا کہ خضر وزارت مسلمانان پنجاب کی نمائندگی نہیں کرتی۔ اگر ماضی کے یہ سارے تاریخی واقعات مبنی برصداقت تھے تو پھر 1949ء میں یہ موقف کیسے اختیار کیا جا سکتا تھا کہ چونکہ پاکستان کی مرکزی وزارت میں بنگالی بھی شامل ہیں اس لئے صوبائی لیگ اسمبلی پارٹی کو صوبائی خودمختاری کا مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ چھٹی بات یہ تھی کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں کم از کم چھ غیر بنگالی ارکان بشمول وزیر خزانہ غلام محمد ایسے تھے جن کا انتخاب مشرقی بنگال اسمبلی نے کیا ہوا تھا۔ ان غیر بنگالی ارکان کو مشرقی بنگال کے حالات سے نہ تو کوئی واقفیت تھی اور نہ ہی کوئی دلچسپی تھی۔ اس دستور ساز اسمبلی نے آئینی تجاویز مرتب کرنے کے لئے جو دو تین کمیٹیاں مقرر کی تھیں وہ زیادہ تر غیر بنگالی ارکان پر مشتمل تھیں حالانکہ ملک میں آبادی کی اکثریت بنگالیوں پر مشتمل تھی اور ساتویں اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ملک کی سول اور فوجی بیوروکریسی پر تلیئروں اور پنجابیوں کی اجارہ داری تھی۔ چونکہ مملکت کے دو اہم ترین ستون بنگالیوں کی دسترس سے باہر تھے اس لئے صوبہ اور مرکز کی سطح پر بنگالی وزیروں اور ارکان اسمبلی کی حیثیت محض نمائشی پٹھوؤں کی تھی۔ خواجہ ناظم الدین، خواجہ شہاب الدین، فضل الرحمان اور نورالامین بنگالی "محب الوطن" تھے کیونکہ وہ کراچی اور پنجاب کے حکمران طبقوں کی فرمانبرداری میں تامل نہیں کرتے تھے لیکن حسین شہید سہروردی، مولوی فضل الحق اور مولانا عبدالحمید بھاشانی جیسے لوگ "غداران وطن، تنخواہ دار انڈین ایجنٹس اور اسلام دشمن" تھے کیونکہ وہ صوبہ اور مرکز میں مسلم لیگ کے اقتدار کو چیلنج کرتے تھے۔

بنگالی اپنے دفاع کے لئے پنجابیوں کے محتاج نہ تھے انہیں معیار پر پورا نہ اترنے کے فسطائی بہانے کے تحت بھرتی نہ کیا جاتا تھا

جہاں تک پنجابی شاونزم کی اس دھمکی کا تعلق تھا کہ ''مغربی پاکستان میں ان خطوط پر سوچنے والے لوگ بھی نکل آئیں گے کہ ہم مشرقی بنگال کے دفاع کی ذمہ داری کیوں قبول کریں۔ آخر ہمیں اس تعلق سے کیا فائدہ پہنچے گا جو یک طرفہ ہے۔'' اس کا جواب گزشتہ دو اڑھائی سال میں مشرقی بنگال کے اہل الرائے اصحاب بارہا اس مطالبہ کی صورت میں دے چکے تھے کہ مشرقی بنگال کی مخصوص جغرافیائی پوزشن کے پیش نظر اسے دفاعی امور میں خود کفیل بنانے کے لئے موثر اقدامات کئے جائیں مثلاً ملٹری اکیڈمی قائم کی جائے۔ آرڈیننس فیکٹری قائم کی جائے، چٹاگانگ میں نیول ہیڈکوارٹرز قائم کیا جائے اور ہوائی فوج کے تربیتی مراکز کھولے جائیں مگر اس مطالبہ کا جواب ہمیشہ ٹال مٹول سے دیا گیا۔ لیگ اسمبلی پارٹی کی متذکرہ قرارداد کی منظوری کے بعد 3رجنوری 1950ء کو گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین مشرقی بنگال کے بارہ روز کے دورے پر ڈھاکہ پہنچا تو جگہ جگہ پھر یہی مطالبہ کیا گیا کیونکہ ستمبر 1949ء کے بعد ہندوستان کے ساتھ ''تجارتی جنگ'' شروع ہونے کے بعد مشرقی بنگال کے عوام میں عدم تحفظ کا شدید احساس پیدا ہو گیا تھا جبکہ کلکتہ کے مہاسبھائی عناصر مشرقی بنگال کو بزور قوت مغربی بنگال میں شامل کرنے کی باتیں کرتے تھے۔ 8رجنوری کو خواجہ ناظم الدین نے پاکستان نیشنل گارڈز اور پاکستان ویمنز (Women's) نیشنل گارڈز کی مشترکہ ریلی سے خطاب کرتے ہوئے اس مطالبہ کا ذکر کیا اور امید ظاہر کی کہ ''مشرقی بنگال کے دفاع کے معاملے میں جو خلا پایا جاتا ہے اسے بعجلت پر کیا جا رہا ہے اور وہ دن دور نہیں جب مشرقی بنگال، مغربی پاکستان سے بے نیاز ہو کر خود اپنا دفاع کرنے کے قابل ہو جائے گا۔''

پاکستان آبزرور نے اگلے دن اپنے اداریے میں خواجہ ناظم الدین کے اس دل خوش کن اعلان سے اختلاف کیا اور بتایا کہ ''ابھی تک مشرقی بنگال کو دفاعی معاملات میں خود کفیل بنانے کے لئے ٹھوس قدم نہیں اٹھایا گیا ہے۔ اس مقصد کے لئے آرڈیننس فیکٹری کے علاوہ بری فوج، ہوائی فوج اور بحری فوج کی اکیڈمیوں کے قیام کی ضرورت ہے۔ صوبہ کے عوام ایک عرصے سے ان اداروں کے قیام کا مطالبہ کر رہے ہیں لیکن ابھی تک ان کی شنوائی نہیں ہوئی...... بدقسمتی

سے ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ جب کبھی پاکستان کے اس اہم حصے کی ترقی کے لئے تجاویز پیش کی جاتی ہیں تو انہیں صوبہ پرستی کی علامتیں قرار دے دیا جاتا ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کسی فوجی مہارت کی ضرورت نہیں کہ مشرقی بنگال کی مخصوص جغرافیائی پوزیشن کے پیش نظر اس کے دفاعی نظام کا خود کفیل ہونا ضروری ہے۔''[22]

خواجہ ناظم الدین تقریباً دو ہفتے تک مشرقی بنگال میں رہا اور اس عرصے میں اس سے ہر جگہ جو مطالبات کے گئے ان میں یہ مطالبہ ضرور شامل تھا کہ مشرقی بنگال کے دفاعی نظام کو خود کفیل بنایا جائے۔ چنانچہ 17 رجنوری کو جب وہ کراچی واپس روانہ ہوا تو اس نے ڈھاکہ سے اپنی نشری تقریر میں پھر یہ یقین دلایا کہ ''پاکستان کے مشرقی حصے کو نا قابل تسخیر بنانے کے لئے بڑی تیزی سے اقدامات کئے گئے ہیں۔ فوجی ہیڈ کوارٹرز کی از سر نو تنظیم اور توسیع کی گئی ہے اور مزید بنگالی یونٹ قائم کر کے انہیں تربیت دی گئی ہے۔ یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ مشرقی بنگال کے یونٹوں میں بھرتی کے لئے جن بنگالیوں کو بھرتی کیا گیا ہے وہ اچھے اور ہنر مند ہیں۔ لیکن افسروں کی سطح پر باصلاحیت بنگالی امیدواروں کی تعداد بہت ہی کم ہے اور یہ شکایت غلط ہے کہ بنگالی افسروں کی بھرتی میں تعصب کی کارفرمائی ہوتی ہے...... صوبہ پرستی کے جال سے خبردار رہنا چاہیے کیونکہ پاکستان کی خوشحالی کا انحصار ملک کے دونوں حصوں کے درمیان مکمل ہم آہنگی پر ہے۔''[23] گویا خواجہ ناظم الدین کو میجر جنرل ایوب خان کی اس رائے سے اتفاق تھا کہ مشرقی بنگال میں رہبری اور رہنمائی کی صفات رکھنے والے نوجوان نہیں ملتے تھے۔ یہ ایک سامراجی اور فسطائی تصور تھا جو ایوب خان وغیرہ کو اپنے برطانوی آقاؤں سے ورثہ میں ملا تھا۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے انگریزوں کو پورے برصغیر میں فوجی افسروں کی سطح پر بھرتی کے لئے رہبری اور رہنمائی کی صفات رکھنے والے ہندوستانی نوجوان نہیں ملتے تھے لیکن جب دوسری جنگ عظیم شروع ہونے کے بعد مسلح افواج میں ہندوستانی افسروں کی بھرتی ناگزیر ہو گئی تو پھر ان میں رہبری و رہنمائی کی صفات دکھائی دینے لگی تھیں۔

1949ء میں مشرقی بنگال کے جنرل آفیسر کمانڈنگ ایوب خان کا رویہ بھی بنگالی نوجوانوں کے بارے میں بالکل ایسا ہی تھا جیسا کہ دوسری جنگ عظیم سے قبل انگریزوں کا ہندوستانی نوجوانوں کے بارے میں ہوا کرتا تھا۔ ایوب خان لکھتا ہے کہ ''آرمی سلیکشن بورڈ ہر

چھٹے مہینے مشرقی پاکستان جایا کرتا۔شروع شروع میں اس بورڈ کو پہلی یا دوسری ٹرم کے لئے چار یا پانچ لڑکے ایسے مل جاتے جنہیں آرمی ملٹری کالج میں داخلہ مل سکتا تھا لیکن یہ لڑکے زیادتر مہاجر خاندانوں کے ہوتے تھے۔ جب یہ ذریعہ ختم ہو گیا تو مقامی لڑکوں کو چنا جانے لگا۔ اگر سیلیکشن بورڈ کو ایک یا دو ایسے لڑکے مل جاتے جنہیں گوارہ کیا جا سکتا تھا تو یہ اس کی بڑی خوش قسمتی سمجھی جاتی تھی۔ میں بورڈ کو مشورہ دیا کرتا تھا کہ ان کو بہر صورت چن لو کیونکہ کوئی شخص نہیں مانے گا کہ بورڈ نے یہ انتخاب انصاف کے ساتھ اور رورعایت کے بغیر کیا ہے یا یہ کہ قواعد وضوابط کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔"[24] ایوب خان کا یہ بیان اس کے انگریز آقاؤں کی طرح سراسر جھوٹ اور بددیانتی پر مبنی تھا۔ 1949ء میں پاکستان کی مسلح افواج میں افسروں کی سطح پر بنگالی نوجوانوں کے بھرتی نہ کئے جانے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان میں رہبری ورہنمائی کی صفات نہیں تھیں بلکہ اصلی وجہ یہ تھی کہ کراچی اور پنجاب کے حکمران طبقوں کو انگریزوں کی طرح بنگالی نوجوانوں کی وفاداری پر شبہ تھا۔ انہیں خطرہ تھا کہ اگر بنگالیوں کو پاکستان کی مسلح افواج میں ان کا جائز حصہ دیا گیا تو پھر ان کے سیاسی، معاشی اور ثقافتی حقوق و مفادات کو غصب کرنا آسان نہیں ہو گا لیکن چند سال بعد جب مشرقی بنگال کے عوام کی سیاسی بیداری، تنظیم اور قوت میں اضافہ ہوا تو پھر مسلح افواج کے لئے رہبری اور رہنمائی کی صلاحیت رکھنے والے بنگالی نوجوان خود بخود دکھائی دینے لگے تھے۔

باب: 7

مشرقی و مغربی بنگال، آسام اور تری پورہ میں ہولناک ہندو مسلم فسادات اور اقلیتوں کے تحفظ کے لئے

لیاقت۔نہرو معاہدہ

ہندوستان کے تجارتی بائیکاٹ کی وجہ سے مارواڑیوں کی ڈھاکہ اور چٹا گانگ سے کلکتہ نقل مکانی پر ہندو مہا سبھا مشتعل ہوئی

خواجہ ناظم الدین نے مشرقی بنگال کا یہ دورہ ایسے موقع پر کیا تھا جبکہ ہندوستان کے صوبہ جات آسام اور مغربی بنگال اور پاکستان کے صوبہ مشرقی بنگال میں سخت فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہو چکی تھی اور ان تینوں صوبوں کے بہت سے مظلوم اقلیتی لوگوں نے اپنے آبائی گھروں کو چھوڑ کر محفوظ مقامات پر پناہ لینا شروع کر دی تھی جبکہ کلکتہ اور ڈھاکہ کے اخبارات بے انتہا اشتعال انگیزی کر رہے تھے۔ اس کشیدگی کی ابتدا در اصل ستمبر 1949ء کے تیسرے ہفتے میں شروع ہو گئی تھی جب حکومت ہندوستان نے پاکستان کی جانب سے اپنی کرنسی کی شرح مبادلہ میں کمی نہ کرنے کے فیصلے کو نامنظور کر کے بین المملکتی تجارت بند کر دی تھی۔ اس وقت پٹ سن کی فصل کا موسم تھا۔ ہندوستان میں دنیا کی 60 فی صد پٹ سن کی کھڈیاں نصب تھیں اور وہی پٹ سن کا سب سے بڑا خریدار تھا۔ کلکتہ، جہاں کثیر تعداد میں گانٹھیں باندھنے والے کارخانے تھے، مشرقی پاکستان سے بیرونی منڈیوں کے لئے خام پٹ سن کے نکاس کا بڑا دروازہ تھا۔ مارواڑی، جن کے ہاتھ میں پٹ سن کی بیشتر تجارت تھی ہندوستانی شہری تھے اور ان کے صدر دفاتر بھی کلکتہ میں تھے۔ تجارت کے

لئے جو بینک قرضے کی سہولتیں بہم پہنچاتے تھے وہ بھی کلکتہ میں ہی تھے۔ لہٰذا ہندوستان کو یقین تھا کہ مشرقی پاکستان اس کے تجارتی بائیکاٹ کا متحمل نہیں ہو سکے گا۔ لیکن جب حکومت پاکستان نے گھٹنے ٹیکنے سے انکار کر دیا، مشرقی بنگال کے مفلوک الحال عوام نے پٹ سن کا کاروبار بے انتہا مندا ہو جانے کے باوجود ہندوستان کے ساتھ بہر قیمت تجارت بحال کرنے کا کوئی پرزور مطالبہ نہ کیا، کلکتہ میں جیوٹ ملیں بند ہو جانے کے باعث لاکھوں مزدور بیکار ہو گئے اور ڈھاکہ و چٹاگانگ وغیرہ میں مارواڑیوں کے دفاتر بند ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تو ناگزیر طور پر مغربی اور مشرقی بنگال کے حکمران طبقوں نے اس معاشی مسئلہ کو ہندو۔ مسلم تنازعہ کا رنگ دے دیا۔ اکتوبر 1949ء میں جب حکومت پاکستان نے پٹ سن کی خریداری کے لئے ایک جیوٹ بورڈ قائم کر دیا اور اس کے ساتھ ہی مشرقی پاکستان میں نیشنل بینک آف پاکستان کی شاخیں کھل گئیں تو پٹ سن کا کاروبار کرنے والے مارواڑی مشرقی بنگال میں اپنے ضلعی دفاتر بظاہر عارضی طور پر بند کر کے کلکتہ پہنچ گئے اور ان کے ساتھ بہت سے دوسرے ہندو کاروباری عناصر بھی نقل مکانی کر گئے تو کلکتہ کے اخبارات اور ہندو مہاسبھا کے لیڈروں نے ہندو۔ مسلم تضاد کی آگ کو اور بھی ہوا دینا شروع کر دی۔ نومبر 1949ء میں جب نور الامین کی حکومت نے مشرقی بنگال کے افلاس زدہ کاشتکاروں کو قدرے تسلی دینے کے لئے صوبائی اسمبلی میں زمینداری نظام کے خاتمہ کا مسودہ قانون پیش کیا تو کلکتہ میں ہندو زمیندار بھی اس آگ کو بھڑکانے کی کوشش میں مصروف ہو گئے جبکہ ان میں سے بیشتر ہندو زمینداروں کے مسلم کسانوں نے پہلے ہی انہیں لگان دینے کا سلسلہ بند کر دیا تھا۔

راجشاہی کے موضع نچول اور کھلنا کے موضع کالیسرا میں ہندو۔ مسلم فساد کیسے شروع ہوا

دسمبر 1949ء میں ضلع راجشاہی کے موضع نچول اور ضلع کھلنا کے موضع کالیسرا میں دو ایسے واقعات ہوئے جو بعد میں مشرقی اور مغربی بنگال میں وسیع پیمانے پر ہندو۔ مسلم فسادات اور اقلیتوں کی نقل مکانی کا باعث بنے۔ موضع نچول کا واقعہ یہ تھا کہ اس علاقے کے غریب سنتھالی کسانوں نے ایک ہندو کمیونسٹ استانی ایلا مترا کی زیر قیادت دفعہ 144 کی خلاف ورزی کرتے

ہوئے ایک جلسہ عام منعقد کیا تھا۔ ابھی اس جلسہ میں ایلامترا نے اپنی تقریر شروع کی ہی تھی کہ پولیس کی ایک جمعیت موقع پر پہنچ گئی۔ متعلقہ پولیس افسر نے پہلے تو جلسہ کو منتشر ہو جانے کا حکم دیا اور جب اس کے حکم کی تعمیل نہ ہوئی تو اس نے اپنے عملہ کو مناسب کاروائی کرنے کی ہدایت کردی۔ اس کاروائی کے دوران ایک سب انسپکٹر ہلاک ہو گیا تو راجشاہی کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے مسلح پولیس کی بہت سی نفری فوراً ہی موقع پر بھیج دی۔ اس پر پولیس اور کسانوں میں شدید تصادم ہوا جس کے دوران پولیس کی گولیوں سے بہت سے سنتھالی کسان ہلاک اور زخمی ہوئے۔ جب پولیس اپنی یہ کاروائی مکمل کر چکی تو 1400 کسانوں کو گرفتار کر لیا گیا اور ہزاروں کسان خوفزدہ ہو کر اپنے آبائی گھروں کو چھوڑ کر مغربی بنگال کے ضلع مرشدآباد چلے گئے۔ ایلامترا روپوش ہو گئی لیکن اسے 7رجنوری 1950ء کو ایک ریل گاڑی میں سے گرفتار کر لیا گیا جبکہ وہ ایک سنتھالی عورت کا لباس پہن کر سفر کر رہی تھی۔

دوسرا واقعہ یہ تھا کہ ضلع کھلنا کی باگرہاٹ سب ڈویژن میں تین چار سپاہیوں کی ایک جمعیت، ایک تھانیدار کی سربراہی میں کالیسرا کے ایک کمیونسٹ کے گھر کی تلاشی لینے کے لئے وہاں پہنچی تو اس پولیس پارٹی اور ہندو کسانوں میں تصادم ہو گیا جس کے دوران ایک سپاہی مارا گیا۔ یہ اطلاع ایک قریبی گاؤں کے انصار اور مسلم کسانوں کو ملی تو غالباً انہوں نے مقامی انتظامیہ کی تحریک پر کالیسرا کے ہندو گھروں پر ہلہ بول دیا۔ ان مسلم حملہ آوروں نے ہندوؤں کو مارا پیٹا۔ ان کے گھروں اور ان کی دکانوں کو لوٹا اور ان کی عورتوں کی آبروریزی کی۔ پھر آئندہ چند دن میں یہ فرقہ وارانہ فساد کھلنا اور باریسال کے کئی اور دیہات میں پھیل گیا جہاں ہندوؤں کا خاصا جانی اور مالی نقصان ہوا۔ بہت سے ہندو ان دیہاتوں سے بھاگ گئے اور انہوں نے کلکتہ پہنچ کر پناہ لی۔

ڈھاکہ کے اخبارات میں ان دونوں واقعات کے بارے میں کوئی خبر شائع نہ ہوئی لیکن کلکتہ کے اخبارات نے ان کے بارے میں بڑی تفصیل سے اشتعال انگیز خبریں شائع کیں۔ ان اخبارات کی اطلاعات یہ تھیں کہ نچول کے واقعہ میں سینکڑوں سنتھالی کسان مارے گئے اور ہزاروں نقل مکانی پر مجبور ہوئے۔ سنتھالی عورتوں کو درختوں سے باندھ کر ان کی آبروریزی کی گئی۔ کالیسرا کے واقعہ کے بارے میں کلکتہ کے اخبارات کی خبریں یہ تھیں کہ 20رد سمبر کو کالیسرا کے نمبرداروں نے درگا دیوی کا ایک جلوس نکالا تھا۔ جب یہ جلوس کالیسرا کے اس محلے میں پہنچا جہاں

مسلمانوں کی اکثریت تھی تو وہاں جلوس کے ہراول دستے اور مسلمانوں کے درمیان کچھ جھگڑا ہو گیا جس کے دوران یہ افواہ پھیلا دی گئی کہ اس جھگڑے میں ایک مسلمان مار دیا گیا ہے۔ یہ افواہ نہ صرف کالیسرا کے سارے مسلمانوں میں بلکہ گردونواح کے مسلم دیہات میں بھی جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ چنانچہ بندوقوں، کلہاڑیوں، لاٹھیوں اور دوسرے ہتھیاروں سے مسلح مسلمانوں نے مقامی پولیس کی موجودگی میں ہندوؤں پر حملہ کر کے انہیں سینکڑوں کی تعداد میں قتل کیا۔ ان کے گھروں اور ان کی دکانوں کو لوٹا اور ان کی بہت سی عورتوں کی آبروریزی کی۔ ہزاروں ہندو اپنی جان بچانے کے لئے کھلنا اور باریسال کے اضلاع سے فرار ہو کر کلکتہ پہنچ گئے اور اس طرح اس شہر میں مسلم اقلیت کے قتل عام کے لئے میدان تیار ہو گیا۔

کلکتہ میں پٹیل کی اشتعال انگیز تقریر اور مغربی بنگال میں مسلم اقلیت کے قتل عام کا آغاز

مسلمانوں کے قتل عام سے پہلے جنوری 1950ء کے پہلے ہفتے میں ہندوستان کے وزیراعظم جواہر لال نہرو اور دوسرے ہفتے میں نائب وزیراعظم سردار پٹیل کلکتہ پہنچے تھے۔ ان کے ان دوروں کا بظاہر مقصد یہ تھا کہ کمیونسٹوں کی پر تشدد کارروائیوں کی وجہ سے مغربی بنگال میں جو لاقانونیت پھیل گئی تھی اس کا انسداد کرنے کے لئے مؤثر انتظامات کئے جائیں۔ چنانچہ نہرو نے اپنی 8 رجنوری کی تقریر میں اور پٹیل نے اپنی 15 رجنوری کی تقریر میں صوبائی کانگرس اور صوبائی حکومت کو اس سلسلے میں مناسب مشورے دیئے تھے۔ کلکتہ کے اخبار امرت بازار پتریکا کی رپورٹ کے مطابق 15 رجنوری کو سردار پٹیل کی تقریر یہ تھی کہ "بنگال کے دکھوں کو کون نہیں جانتا۔ وہ احباب جو کل تک ہمارے ساتھ تھے آج غیر ملکی بن گئے ہیں۔ لیکن یہ عملی طور پر کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ ہمارے نزدیک ابھی تک وہی ہیں جو پہلے تھے اور ہمیں یہ مسئلہ درپیش ہے کہ ہم ان کی کیسے امداد کر سکتے ہیں۔ لیکن اس میں مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ اگر ہم جنوبی افریقہ کے لوگوں سے ہمدردی کر سکتے ہیں اور ان کی مدد کے لئے دوڑ سکتے ہیں تو ہمارے لئے ان لوگوں کے واسطے ایسا کرنا بہت آسان ہے جو پاکستان میں ہیں۔ مصنوعی سرحدیں ہمیں ان سے الگ نہیں کر سکتیں۔ ہمارے تعلقات اور ہمارے معاشی وسیاسی روابط کو توڑا نہیں جا سکتا۔ بلاشبہ مشکلات اور رکاوٹیں

ہیں جن کو ہمیں دور کرنا ہوگا لیکن اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ ہم پہلے اپنے گھر کو ٹھیک ٹھاک کریں۔"[1] غالباً پٹیل کی اس تقریر کے آخری جملے کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان میں ہندوؤں کی امداد کے لئے کوئی کاروائی کرنے سے پہلے مغربی بنگال، آسام اور ہندوستان کے بعض دوسرے علاقوں میں کمیونسٹوں کی سرکوبی کر کے نظم و نسق بحال کرنا ضروری ہے کیونکہ اس امر کی واضح علامتیں موجود تھیں کہ حیدرآباد (دکن) کے تلنگانہ کے علاقے میں ہزیمت اٹھانے کے بعد تشدد پسند کیونسٹ عناصر برصغیر کے مشرقی علاقے کو اپنی باغیانہ سرگرمیوں کا مرکز بنانے کی کوشش کر رہے تھے اور اس مقصد کے لئے برما، آسام، مغربی بنگال اور مشرقی بنگال کے کمیونسٹوں میں اشتراک عمل ہو رہا تھا لیکن مغربی بنگال کے انتہا پسند ہندوؤں اور مارواڑی سرمایہ داروں نے پٹیل کی پاکستان کے خلاف اس اشتعال انگیز تقریر کا مطلب یہی سمجھا کہ پہلے مغربی بنگال اور آسام میں مسلم اقلیت کا قتل عام کیا جائے اور پھر مشرقی بنگال کو مغربی بنگال میں شامل کرنے کے لئے ویسی ہی فوجی کاروائی کی جائے جیسی کہ ستمبر 1948ء میں حیدرآباد (دکن) کے خلاف کی گئی تھی۔ چنانچہ پہلے تو انہوں نے کئی دن تک کلکتہ میں اپنی تقریروں، بیانات اور قراردادوں کے ذریعے پاکستان کو دوبارہ ہندوستان میں شامل کرنے کے مطالبات کئے اور پھر شہر کے سارے علاقوں میں ایسے اشتہار لگائے جن پر بہت اشتعال انگیز نعرے لکھے ہوئے تھے۔ آل انڈیا ہندو مہا سبھا کا بیان یہ تھا کہ ضلع کھلنا کے مواضعات کالیسرا، جھالڑ ونگا اور پانچ چھ دوسرے دیہات میں امن پسند ہندوؤں کے ساتھ نہایت انسانیت سوز ظلم کیا گیا ہے جبکہ ایک بنگالی روزنامہ "ستیہ جگ" نے کلکتہ کی مسلم اقلیت کی خوفزدگی اور سراسیمگی کی اس طرح ترجمانی کی کہ ضلع کھلنا میں جو کچھ ہوا وہ کمیونسٹوں کے خلاف پولیس کی کاروائی کا نتیجہ تھا۔

تاہم انتہا پسند ہندوؤں کی یہ اشتعال انگیزی 24 رجنوری کو رنگ لائی۔ جبکہ پہلے ہوڑہ میں اور پھر مرشد آباد میں اور کریم گنج (آسام) میں مسلم اقلیت کی خونریزی شروع ہوئی جو 5 رفروری تک جاری رہی۔ اس قتل عام میں کل کتنے لوگ مارے گئے؟ کتنے گھر برباد ہوئے؟ کتنی دکانیں لوٹی گئیں اور کتنی عورتوں کی آبروریزی ہوئی؟ اس کے بارے میں کوئی مصدقہ اطلاع نہ مل سکتی تھی اور نہ ہی ملی۔ البتہ ڈھاکہ کے اخبارات میں ہلاک شدگان کی تعداد ہزاروں میں بتائی گئی تھی۔ لیکن ان اخبارات نے یہ نہیں بتایا تھا کہ مغربی بنگال اور آسام کی مسلم اقلیت

کے اس خون میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کا وہ پروگرام بھی بہہ گیا تھا جو اس نے 26 / جنوری کو ری پبلک ڈے منانے کے لئے بنایا ہوا تھا۔ اس پروگرام کے مطابق بمبئی، دہلی، مدراس، کلکتہ اور بعض ہندوستانی شہروں میں مظاہرے ہوئے لیکن ان کی شدت اتنی نہیں تھی جتنی کہ کمیونسٹ پارٹی کو توقع تھی۔ وجہ صاف ظاہر تھی اور وہ یہ تھی کہ جس طرح پاکستان کی حکومت نے کمیونسٹ لیڈر راج کمار مونی سنگھ کی زیر قیادت میمن سنگھ، راجشاہی، کھلنا، باریسال اور بعض دوسرے اضلاع میں کسانوں کی پرتشدد جدوجہد کو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان قومی تضاد اور فرقہ وارانہ تضاد کا رنگ دے کر کچل دیا تھا، اسی طرح حکومت ہندوستان نے بھی کمیونسٹوں کی مسلح تحریک کو پاکستان کے خلاف جنگی نعروں اور مسلم اقلیت کے خون میں بہا دیا تھا۔ حالانکہ پورے ہندوستان کے معاشی حالات کمیونسٹوں کی کامیابی کے لئے بڑے سازگار تھے۔ سڈنی کے اخبار مارننگ ہیرلڈ کی اطلاع کے مطابق ہندوستان میں 1948ء کے بعد بیروزگاری میں 40 فیصد اضافہ ہوا تھا اور غیر ملکی تجارت میں اسے 17 کروڑ پونڈ کا خسارہ ہوا تھا۔ اناج کی سخت قلت تھی اور افراط زر میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔

مسلم اقلیت کے قتل عام پر ڈھاکہ سے حکومتی و غیر حکومتی رد عمل

آسام اور مغربی بنگال میں ان فسادات کے دوران ہندوستان کی پارلیمنٹ اور اخبارات میں یہ پروپیگنڈا ابھی جاری رہا کہ مشرقی بنگال سے بہت سے ہندو ترک وطن کر کے مغربی بنگال میں پناہ لے رہے ہیں اور ان شرنارتھیوں کی وجہ سے پورے مغربی بنگال کا امن خطرے میں پڑ گیا ہے۔ چنانچہ 4 / فروری کو مشرقی بنگال کی حکومت نے ایک پریس نوٹ میں الزام عائد کیا کہ ”گزشتہ تین مہینے سے کلکتہ کے اخبارات میں پاکستان کے خلاف مسلسل پروپیگنڈا ہو رہا ہے۔ مشرقی بنگال کی حکومت اس سلسلے میں مغربی بنگال کی حکومت سے بارہا احتجاج کر چکی ہے۔ اس معاندانہ پروپیگنڈے کو کلکتہ میں ہندو مہاسبھا کی حالیہ کانفرنس کی اشتعال انگیز تقریروں سے بہت ہوا ملی ہے۔ اس کانفرنس میں پاکستان کے وجود کو ہی ناجائز قرار دیا گیا ہے اور ہندوستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر (متعینہ ڈھاکہ) نے کلکتہ میں اپنی حالیہ تقریر میں مسلم لیگ کے ڈائریکٹ ایکشن ڈے (1946ء) کے فسادات، نواکھلی کے 1946ء کے فسادات اور بنگال کی

تقسیم کا ذکر کر کے فرقہ وارانہ فضا کو اور بھی زیادہ خراب کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان تقریروں کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کلکتہ کے اخبارات کا رویہ بے انتہا اشتعال انگیز اور دشنام انگیز ہو گیا ہے۔ نہ صرف یہ اخبارات ہر روز ہندوؤں کو اکساتے ہیں کہ وہ مسلمانوں سے انتقام لیں بلکہ اس مقصد کے لئے شہر میں پمفلٹ بھی تقسیم کئے گئے ہیں۔ ہندو مہا سبھا اور دوسری شر پسند جماعتوں کے لیڈروں نے کھلنا کے ایک حالیہ واقعہ کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔ مغربی بنگال کے مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے جذبات کو بھڑکانے کی مزید کوشش کی ہے۔ کھلنا کے واقعہ کی حقیقت یہ ہے کہ ایک تھانیدار اور 3 کانسٹیبلوں پر مشتمل پولیس کی ایک جمعیت، ایک ملزم کے مکان کی تلاشی کے لئے موضع کالیسرا جا رہی تھی کہ راستے میں شودروں کے ایک مسلح گروہ نے اسے گھیر لیا۔ ایک کانسٹیبل موقع پر ہی مر گیا اور جمعیت کے دوسرے ارکان شدید مجروح ہوئے۔ لیکن ایک نزدیکی گاؤں سے انصار اور دیہاتیوں کی بروقت آمد سے ان کی جانیں بچ گئیں۔ بعد ازاں گرفتاری اور لوگوں کی انتقامی کاروائی کے خوف سے کالیسرا اور جھالڑونگا کے باشندے اپنے گھروں کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ گرد ونواح کے غنڈوں اور مفسدوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ان لوگوں کا کچھ مال لوٹ لیا جواب برآمد کر کے اصل مالکان کو واپس کیا جا رہا ہے۔ جبراً مذہب کی تبدیلی اور مورتیوں کی بے حرمتی کے الزامات قطعاً بے بنیاد ثابت ہوئے ہیں۔ عورتوں پر مجرمانہ حملوں کے صرف دو واقعات کی اطلاع ملی ہے۔ تاہم مغربی بنگال میں مسلمانوں کے خلاف جو اشتعال انگیز پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے وہ اپنا رنگ لا رہا ہے۔ چنانچہ مغربی بنگال میں فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ مرشد آباد اور 24 پرگنہ کے اضلاع کے مسلم مہاجرین مشرقی بنگال میں پناہ لے رہے ہیں۔ مسلمان مردوں اور عورتوں پر حملے کئے جا رہے ہیں۔ ان کا مال واسباب لوٹا جا رہا ہے۔ گورا بازار، بیرام پور، فراش نگر، اشاردنگا میں ضلع مرشد آباد کے مختلف مقامات پر اس قسم کے فسادات رونما ہو چکے ہیں۔''[2]

اسی دن ڈھاکہ کی اسلامک کلچرل ایسوسی ایشن کے ایک اجلاس نے مغربی بنگال میں ہندوؤں کے ہاتھوں مسلمانوں پر ظلم وستم کی مذمت کی اور حکومت مغربی بنگال سے مطالبہ کیا کہ مرشد آباد اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں مسلمان مردوں اور عورتوں پر حملوں کے سدباب کے ضروری اقدامات کرے۔ جلسہ میں مقررین نے بتایا کہ ''جو پاکستانی کاروبار یا ذاتی وجوہ کی بنا پر مغربی بنگال جاتے ہیں انہیں بلا جواز اور بلا امتیاز گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ کوچ بہار کی ریاست میں

بھی یہی صورتحال ہے۔ وہاں بھی مسلمانوں کو بلا امتیاز دھمکایا جا رہا ہے، گرفتار کیا جا رہا ہے اور ان پر تشدد کیا جا رہا ہے۔ گرفتار شدگان میں مولانا سراج اور مولانا نوری بھی شامل ہیں۔ مشرقی پاکستان کی حکومت کا فرض ہے کہ وہ ان کی رہائی کا مطالبہ کرے۔"[3] 5 رفروری کو ڈھاکہ میں مغربی بنگال مسلم ایسوسی ایشن کے نائب صدر ایس۔ ایم۔ بذل حق نے امریکہ کے صدر ٹرومین کے نام ایک تار میں بتایا کہ "مغربی بنگال کے متعدد مقامات میں مسلمانوں کا نام ونشان مٹا دیا گیا ہے۔ سینکڑوں عورتوں کی بے آبروئی کی گئی ہے اور بچوں کو چھتوں سے نیچے پھینک کر ہلاک کیا گیا ہے۔"[4] اگرچہ اس قسم کی وحشیانہ وارداتیں کہیں بھی مذہبی جنونیوں سے بعید نہیں ہوتیں۔ تاہم یہ امر بھی بعید از قیاس نہیں تھا کہ فروری کے اوائل میں ڈھاکہ میں یکا یک اس قسم کا اشتعال انگیز پروپیگنڈا اس معاندانہ پروپیگنڈے کے جواب میں تھا جو کہ کلکتہ کے اخبارات میں راجشاہی اور کھلنا کے واقعات کے بعد سے کیا جا رہا تھا۔

پاکستان آبزرور کا اس قسم کی مبینہ وارداتوں کی خبروں اور ان کے بارے میں تقریروں و بیانات پر ادارتی تبصرہ یہ تھا کہ "اگر ہندوستان کے مسلمانوں پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور اگر ان کو ہندوستان سے پریشان و ہراساں کر کے ملک سے بھاگنے پر مجبور کیا جاتا ہے تو پاکستان کو اقوام متحدہ سے اپیل کرنی چاہیے کہ وہ ان خانماں برباد اور مظلوم انسانوں کو آباد کرنے کے لئے پاکستان کو ہندوستان سے مزید علاقہ دلائے۔ پاکستان کو چاہیے کہ مسلم لیگ کی ابتدائی قرارداد کے مطابق غیر منقسم بنگال اور آسام کا علاقہ حاصل کرنے پر زور دے۔ سردار پٹیل اور اس کے ساتھی ہندوستان میں ہندو راج کے قیام کی کوشش میں ہیں اور یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ مغربی بنگال کی حکومت محض سردار پٹیل اور رجعت پسند گروہ کی حمایت کے بل پر قائم ہے۔ مغربی بنگال کے ہندوؤں کو اب پٹیل، ماؤنٹ بیٹن اور مارواڑیوں کے اس پر فریب وعدے کی حقیقت کا علم ہو گیا ہے کہ مشرقی بنگال دوبارہ ہندوستان میں شامل ہو جائے گا۔ دراصل ان لوگوں کی سازش صرف یہ تھی کہ کلکتہ کو پاکستان کی تحویل میں نہ جانے دیا جائے۔ لہٰذا انہوں نے اس جھوٹے وعدے سے عوام الناس کو الو بنایا۔ اسی طرح سکھوں کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے۔ وہ حکومت ہند سے غیر مطمئن اور بیزار ہیں۔ ان کی آنکھوں پر سے پردہ اٹھ چکا ہے۔ انہیں محض زبانی طور پر دلکش وعدے کر کے مسلمانوں سے علیحدہ کیا گیا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن نے اکالی سکھوں اور ہندوستان کے

دوسرے رجعت پسند عناصر سے جو ساز باز کی تھی اسے ہندوستان پر برطانوی اقتدار کی تاریخ کا سیاہ ترین باب تصور کیا جائے گا۔''[5] پاکستان آبزرور کا یہ اداریہ یقیناً ہندو مہاسبھا کی اس قرارداد کے جواب کے طور پر لکھا گیا تھا جس میں نہ صرف پاکستان کے وجود کے جواز کو چیلنج کیا گیا تھا۔ بلکہ۔لندن ٹائمز کی رپورٹ کے مطابق۔ یہ مطالبہ بھی کیا گیا تھا کہ ''جو علاقے (یعنی پاکستان) الگ ہوئے ہیں انہیں ہندوستان کے جزولاینفک کے طور پر بحال کیا جائے۔''[6]

مشرقی بنگال اسمبلی سے کانگرسی ارکان کا واک آؤٹ اور کلکتہ میں مسلمانوں کا قتل عام، لوٹ مار اور آبروریزی

6رفروری کو مشرقی بنگال اسمبلی کا سرمائی اجلاس شروع ہوا۔اس کے ایجنڈے کی پہلی مد یہ تھی کہ زمینداری نظام کے خاتمہ کے بل پر بحث جاری رہے گی۔ اس بل پر صوبائی اسمبلی کے ایک خصوصی اجلاس میں 14رفروری 1949ء کو بحث شروع ہوئی تھی لیکن 19ردسمبر 1949ء کو بحث ملتوی کر دی گئی تھی۔ چونکہ نورالامین کی حکومت کو خدشہ تھا کہ اسمبلی کے ہندو ارکان اس بل کو ایک مرتبہ اور پس پشت ڈالنے کے لئے راجشاہی اور کھلنا کے واقعات کو زیر بحث لائیں گے۔ اس لئے ان کی پیش بندی کے لئے کلکتہ، مرشد آباد اور کریم گنج وغیرہ کے مسلم کش فسادات کی تشہیر بھی خوب کی گئی تھی تاہم سرکاری خدشہ صحیح ثابت ہوا کیونکہ اسمبلی کے پہلے دن کے اجلاس میں یہ بل زیر بحث نہ آسکا اور سارا وقت ان دو تحاریک التوار پر ابتدائی بحث میں گزر گیا جو دو کانگرسی ارکان پی سی لہری اور گوبندلال بینرجی نے پیش کی تھیں۔ان تحاریک کا مقصد ضلع راجشاہی اور ضلع کھلنا کے متذکرہ واقعات کو زیر بحث لانا تھا مگر سپیکر نے ضلع راشاہی کے واقعہ سے متعلقہ تحریک التوا پر اس بنا پر بحث کی اجازت نہ دی کہ یہ معاملہ عدالت میں زیر سماعت تھا اور دوسری تحریک اس وجہ سے مسترد کر دی کہ اس کا تعلق عوامی اہمیت کے ایک خصوصی مسئلے سے تھا۔اس پر حزب اختلاف کے قائد بسنت کمار داس نے ان دونوں اضلاع کے واقعات کے بارے میں اپنی جماعت کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے بین الاقوامی تحقیقات کا مطالبہ کر کے اعلان کیا کہ ''اس کی جماعت ایوان کی آئندہ کی کاروائی میں حصہ نہیں لے گی۔'' وزیراعلیٰ نورالامین نے اپنی جوابی تقریر میں کہا کہ ''اگرچہ دونوں واقعات سے مشرقی بنگال کے لوگوں میں بہت

اشتعال پھیلا ہے لیکن صوبائی حکومت کی عمومی پالیسی یہ ہے کہ صوبہ کا نظم ونسق درہم برہم نہ ہونے پائے۔ کھلنا کے واقعہ کے بارے میں حکومت ایک پریس نوٹ جاری کر چکی ہے جس میں کسی ایک حقیقت کو بھی چھپایا نہیں گیا ہے۔ میں مغربی بنگال کے وزیراعلیٰ کے ساتھ خط وکتابت کرتا رہا ہوں اور اس خط وکتابت کے نتیجے میں عنقریب دونوں صوبوں کے چیف سیکرٹریوں کی ایک کانفرنس ہو گی جس میں ایک مشترکہ پالیسی وضع کی جائے گی تاکہ آئندہ اشتعال انگیز اور بے بنیاد پروپیگنڈے کا سدباب ہو سکے۔ اگر اس وقت حزب اختلاف کی تحاریک التوا کو زیر بحث لایا گیا تو چیف سیکرٹریوں کی مجوزہ کانفرنس کے لئے سازگار فضا پیدا نہیں ہو گی کیونکہ کانگرسی ارکان اسمبلی کی بے بنیاد اور مبالغہ آمیز تقریروں سے بدامنی اور لاقانونیت پیدا ہو گی۔''[7] تاہم کلکتہ، مرشد آباد اور کریم گنج میں فرقہ وارانہ فسادات کی وہ آگ جو 5 رفروری کو بجھتی نظر آنے لگی تھی 6 رفروری کو مشرقی بنگال اسمبلی سے کانگرسی لیڈروں کے واک آؤٹ کی وجہ سے پھر بھڑک اٹھی اور ڈھاکہ میں بھی فرقہ وارانہ کشیدگی نے خطرناک صورت اختیار کر لی۔ ڈھاکہ کے اخبار مارننگ نیوز کا اس واقعہ پر تبصرہ یہ تھا کہ ''کانگرسی لیڈروں نے یہ واک آؤٹ سوچ سمجھ کر ایسے وقت میں کیا ہے جبکہ مغربی بنگال کی اقلیت سے مبینہ بدسلوکی کے خلاف ایک ہیجان پیدا کر دیا گیا ہے۔ یہ حقیقت کسی سے خفیہ نہیں کہ پاکستان کی اقلیتوں کے یہ لیڈر کلکتہ کے کانگرسی اور مہا سبھائی لیڈروں سے اشتراک عمل کر رہے ہیں۔ بعض کانگرسی ارکان اسمبلی کی رہائش کلکتہ میں ہے۔ وہ محض اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لئے ڈھاکہ آتے ہیں اور ان کی حکمت عملی کا تعین کلکتہ میں ہوتا ہے۔''[8] مارننگ نیوز کا یہ تبصرہ 9 رفروری کو شائع ہوا تھا جبکہ کلکتہ کے مانک تولہ علاقہ میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے گھروں کو اس طرح تہس نہس کیا تھا کہ پولیس کو امن بحال کرنے کے لئے گولی چلانا پڑی تو پھر وہاں پوری رات کا کرفیو لگا دیا گیا۔ لیکن فساد ختم نہ ہوا اور اگلے دن یعنی 10 رفروری کو لوٹ مار، قتل وغارت اور آتش زنی کے اتنے واقعات ہوئے کہ پولیس کو پانچ مرتبہ گولی چلانا پڑی۔ ہلاک شدگان اور مجروحین کی تعداد کا کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا اور نہ ہی کسی کو یہ معلوم تھا کہ کتنے گھر برباد ہوئے اور کتنی عورتوں کی آبروریزی ہوئی۔

ڈھاکہ میں ہندوؤں پر حملے، لوٹ مار اور قتل کی وارداتیں اور لیاقت علی کا بیان صفائی

اسی دن یعنی 10 رفروری 1950ء کو ہی ڈھاکہ میں اسی قسم کی وحشت و بربریت کا مظاہرہ کیا گیا۔ شہر کے بے گناہ ہندوؤں کے گھروں اور ان کی دکانوں پر منظم طریقے سے حملے کئے گئے جن کے دوران متعدد ہندو مارے گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ اس فساد کی ابتدا صوبائی سیکرٹریٹ کے سامنے ایک احتجاجی مظاہرے کے بعد ہوئی تھی جبکہ مغربی بنگال کا چیف سیکرٹری ہندوستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر کے ہمراہ دونوں صوبوں کے چیف سیکرٹریوں کی کانفرنس کے لئے وہاں پہنچا تھا۔ شہر میں لوٹ مار اور قتل و غارت اتنے وسیع پیانے پر ہوئی کہ مقامی انتظامیہ کو شام سے لے کر صبح تک کا کرفیو نافذ کرنا پڑا۔ لیکن یہ فساد ختم نہ ہوا بلکہ دو تین دن تک نہ صرف ڈھاکہ شہر میں بلکہ مشرقی بنگال کے بعض دوسرے علاقوں میں بھی اقلیت کا قتل عام جاری رہا حالانکہ چیف سیکرٹریوں کی کانفرنس میں فرقہ وارانہ فسادات کے سدباب کے لئے متعدد فیصلے کئے گئے تھے۔ جن میں سے ایک فیصلہ یہ تھا کہ آئندہ دونوں صوبوں میں فرقہ وارانہ جلسوں اور جلوسوں پر پابندی ہوگی اور جو لوگ اشتعال انگیز اشتہارات اور پمفلٹ وغیرہ چھاپیں گے ان کے خلاف بلا تاخیر تعزیری اقدامات کئے جائیں گے۔

13 رفرروی کو وزیر اعظم لیاقت علی خان نے ایک بیان میں کلکتہ اور مغربی بنگال کے دوسرے علاقوں میں فرقہ وارانہ فسادات پر بڑے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی کہ ''ڈھاکہ میں 10 رفروری سے لے کر 13 رفروری تک جو کچھ ہوا وہ مغربی بنگال کے فسادات کا ناگزیر ردعمل تھا۔ جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل کا یہ بیان غلط ہے کہ کلکتہ کا فساد مشرقی بنگال کے بعض واقعات کے نتیجہ کے طور پر برپا ہوا تھا۔ کھلنا کا واقعہ جس کی ہندوستانی اخبارات میں اتنی تشہیر ہوئی ہے بالکل غیر فرقہ وارانہ نوعیت کا تھا اور یہ بنیادی طور پر کمیونسٹوں کی جانب سے شرانگیزی کی ایک کوشش تھی جیسا کہ مشرقی بنگال کی حکومت کے 5 رفروری کے ایک پریس نوٹ میں بتایا گیا تھا۔ 20 ردسمبر 1949ء کو پولیس کی ایک جمعیت ایک ملزم کی گرفتاری کے لئے کالیسرا گئی تھی مگر کمیونسٹوں کی تحریک پر ایک ہجوم نے اس جمعیت پر حملہ کر دیا جس کے نتیجے میں ایک

کانسٹیبل موقع پر ہی ہلاک ہو گیا اور دوسرے سپاہی شدید زخمی ہو گئے۔ بعد ازاں جب اس گاؤں کے فسادیوں کو پولیس کے اقدام کا خطرہ لاحق ہوا تو وہ اپنے گھر چھوڑ کر بھاگ گئے اور پھر اس گاؤں کے قرب وجوار کے غنڈے اور شر پسند عناصر بھی اس خطرے کے تحت کلکتہ چلے گئے۔ انہوں نے وہاں جو افسانے بیان کئے کلکتہ کے اخبارات نے ان پر فرقہ وارانہ رنگ چڑھا کر ان کی خوب تشہیر کی۔ ان اخبارات نے نہ صرف مشرقی بنگال کی حکومت کے پریس نوٹ کو مکمل طور پر نظر انداز کیا بلکہ بعض ہندو لیڈروں کے ان بیانات کو بھی نظر انداز کیا جو جھوٹی افواہوں کی تردید میں جاری کئے گئے تھے۔ ہندو اخبارات اس طرح ہندوؤں کے فرقہ وارانہ جذبات کو ہوا دیتے رہے اور اس پروپیگنڈے کے پس پردہ مہاسبھائی وراشٹریہ سیوک سنگھ اور کونسل فار دی پروٹیکشن آف مینارٹیز کی جانب سے مسلم کشی کے منصوبے بنتے رہے۔ مؤخر الذکر تنظیم نے تو اپنی پرائیویٹ فوج تیار کر کے اور اسلحہ جمع کر کے کلکتہ میں ایک عارضی حکومت بھی قائم کر لی تھی۔"[9]

ہندوستانی پارلیمنٹ میں آسام سے بنگالیوں کے اخراج کے قانون کی منظوری اور مشرقی بنگال اسمبلی میں زمینداری نظام کے خاتمہ کے قانون کی منظوری......دونوں طرف فرقہ وارانہ کشیدگی میں شدت

لیاقت علی خان نے اپنے اس بیان میں حکومت ہندوستان کے تارکین وطن کے قانون (آسام سے اخراج) کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ غالباً اسے اس وقت تک معلوم نہیں تھا کہ یہ قانون اسی روز ہندوستان کی پارلیمنٹ میں منظور کیا گیا تھا اور اس کا مقصد ان 5 لاکھ بنگالیوں کو صوبہ آسام سے نکالنا تھا جو مبینہ طور پر مشرقی بنگال سے نقل مکانی کر کے وہاں چلے گئے تھے۔ یہ قانون دسمبر 1949ء میں بطور آرڈیننس نافذ کیا گیا تھا اور پارلیمنٹ نے اس کی باقاعدہ منظوری دے دی تھی۔ پارلیمنٹ میں صوبہ بہار کے ایک رکن رام نارائن سنگھ کو اعتراض تھا کہ "اس قانون میں تارکین وطن کو چھ ماہ کی مہلت کیوں دی گئی تھی۔" اس کا بیان یہ تھا کہ "اگر ہندوستان کی بزدل حکومت اس مسئلہ کو حل نہیں کر سکتی تو پھر یہ کام کسی اور ہی کو کرنا پڑے گا۔"[10]

ہندوستانی پارلیمنٹ میں اس قانون کی منظوری کے تین دن بعد 16 رفروری کو مشرقی بنگال اسمبلی نے 157 سال پرانے زمینداری نظام کے خاتمے کا قانون منظور کر دیا اور اس طرح

مشرقی بنگال کے ہندو زمینداران استحصالی مفادات سے محروم ہو گئے جو انہیں لارڈ کارنیوالس نے 1793ء میں عطا کئے تھے۔ اکتوبر 1949ء میں جیوٹ بورڈ کے قیام کی وجہ سے کلکتہ کے مارواڑیوں کا مشرقی پاکستان سے کاروباری رابطہ ختم ہو گیا تھا۔ اب اس قانون کی منظوری کے بعد کلکتہ میں مقیم ہندو زمینداروں کا بھی مشرقی پاکستان سے مفاداتی رشتہ ٹوٹ گیا اور اس طرح دونوں بنگالوں میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ کے شعلے اور بھی بلند ہو گئے۔

23رفروری کو روزنامہ ڈان نے اپنے ڈھاکہ نیوز لیٹر میں کلکتہ کے مسلم مہاجرین کے حوالے سے ہندوستان کے نائب وزیراعظم سردار پٹیل کی اس تقریر کے بعض اور حصے بھی شائع کئے جو اس نے کلکتہ میں 15رفروری 1950ء کو کی تھی۔ اس نے اپنی اس تقریر میں حاضرین کو تلقین کی تھی کہ ''پولیس والوں پر بم مت پھینکو کیونکہ پولیس والے اس آزادی کے محافظ ہیں جو تم نے 1946ء میں نواکھلی میں مردوں، عورتوں اور بچوں کا خون دے کر حاصل کی تھی۔'' اس نے مزید کہا تھا کہ ''نواکھلی کو مت بھولو۔ بھارت ماتا کے اس حصے کو مت بھولو جو کاٹ دیا گیا ہے اور یہ نہ بھولو کہ تم نے ابھی اپنا نصب العین حاصل نہیں کیا اور آخر میں یہ بھی نہ بھولو کہ تمہیں اور تمہاری پولیس کو کسی اور سے لڑنا ہے۔''

24رفروری کو ڈان نے ڈھاکہ کے معتبر ذرائع کے حوالے سے یہ خبر شائع کی تھی کہ کلکتہ اور اس کے نواحی علاقوں میں دس ہزار مسلمان ہلاک ہو چکے ہیں اور 5رفروری سے لے کر 11رفروری تک صرف پانچ دن میں مسلمانوں کی 50 کروڑ روپے سے زیادہ مالیت کی جائیدادیں تباہ و برباد کر دی گئی ہیں۔ 25رفروری کو پاکستان کے اخبارات میں اکھیل بھارتیہ ہندو مہا سبھا کے آرگنائزنگ سیکرٹری وی۔ جی۔ دیش پانڈے کی اس پریس کانفرنس کی روداد شائع ہوئی جو اس نے 23رفروری کو پٹنہ میں کی تھی۔ پٹنہ کے اخبار نیشنل سٹینڈرڈ کی رپورٹ کے مطابق دیش پانڈے نے اس پریس کانفرنس میں کہا تھا کہ ''پاکستان کے ہندوؤں کا مسئلہ پرامن طریقہ سے صرف اسی صورت میں حل ہو سکتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان پھر ایک ہو جائیں یا کم از کم مشرقی پاکستان انڈین یونین میں شامل ہو جائے۔ اگر حکومت میں یہ جرأت یا دور اندیشی نہیں کہ وہ ہندوستان اور پاکستان کو پھر متحد کرے یا کم از کم مشرقی پاکستان کو انڈین یونین میں شامل کرے تو مشرقی پاکستان کے سارے ہندوؤں کو ہندوستان میں لے آنا چاہیے اور یہاں سے اتنی ہی تعداد

میں مسلمانوں کو پاکستان بھیج دینا چاہیے اور اگر یہ بھی نہیں ہوسکتا تو پاکستان کو مجبور کرنا چاہیے کہ وہ حکومت ہندوستان کو اس تناسب کے مطابق علاقہ دے جس تناسب سے مشرقی پاکستان میں ہندوؤں کی آبادی ہے۔"[11]

نہرو کا اشتعال انگیز اور دھمکی آمیز بیان اور لیاقت علی کا جوابی بیان

دیش پانڈے کی پریس کانفرنس کی متذکرہ رپورٹ خاصی اشتعال انگیز تھی لیکن اسی دن ہندوستان کے وزیراعظم جواہر لال نہرو کی تقریر کی جو رپورٹ شائع ہوئی وہ بہت تشویشناک تھی کیونکہ اس میں پاکستان کے خلاف فوجی کاروائی کرنے کی دھمکی دی گئی تھی۔ دہلی کے اخبار ٹائمز آف انڈیا کی رپورٹ کے مطابق نہرو نے ہندوستانی پارلیمنٹ میں مشرقی پاکستان میں فرقہ وارانہ فسادات کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں نے کچھ عرصہ قبل حکومت پاکستان کو یہ تجویز پیش کی تھی کہ مشرقی و مغربی بنگال میں فسادات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے تحقیقاتی کمیشن مقرر کرنے چاہئیں اور دونوں ممالک کے وزرائے اعظم کو متاثرہ صوبوں کا اکٹھے دورہ کرنا چاہیے۔ اب میں نے ایک اور تجویز پیش کی ہے کہ انٹرنیشنل ریڈ کراس کے نمائندوں کو دونوں ممالک کے وزراء یا حکام کے ہمراہ مشرقی اور مغربی بنگال کے متاثرہ علاقوں کا دورہ کرنا چاہیے۔ اگر پاکستان نے حکومت ہندوستان کے تجویز کردہ ان طریقوں سے اتفاق نہ کیا تو ممکن ہے کہ ہمیں دوسرے ذرائع استعمال کرنے پڑیں...... جو کچھ کشمیر میں ہوا ہے اور جو کچھ مشرقی پاکستان میں ہو رہا ہے ان کا آپس میں تعلق ہے۔ انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا...... کئی مہینے سے مشرقی پاکستان کے پریس، پلیٹ فارم اور ریڈیو سے ہندوستان اور ہندوؤں کے خلاف پروپیگنڈا ہوتا رہا ہے اور مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کو کافر، ففتھ کالمنسٹ اور ملک کے لئے خطرناک قرار دے کر عوام الناس کو ان کے خلاف مشتعل کیا جاتا رہا ہے۔ اس قسم کی پروپیگنڈا مہم مغربی پاکستان میں کشمیر کے حوالے سے چلائی گئی تھی اور مذہب کے نام پر تشدد اور جنگ کا جذبہ پیدا کیا گیا تھا۔ مشرقی پاکستان میں فسادات 20 دسمبر 1949ء کو شروع ہوئے جبکہ پولیس کی ایک جمعیت ضلع کھلنا کے موضع کالیسرا میں ایک مبینہ کمیونسٹ کو گرفتار کرنے کے لئے گئی تھی۔ چونکہ ملزم گھر میں موجود نہیں تھا اس لئے پولیس نے عورتوں سمیت اس کے اہل خانہ پر دست درازی شروع کر دی۔

اس پر ہمسائے موقع پر پہنچ گئے اور ان کے اور پولیس کے درمیان تصادم ہوا جس کے نتیجہ میں ایک سپاہی موقع پر ہی مارا گیا اور دوسرا بعد میں زخموں کی تاب نہ لا کر جاں بحق ہو گیا تھا۔''[12]

خلاف توقع پاکستان کا وزیر اعظم لیاقت علی خان نہرو کی اس جنگجویانہ تقریر سے مشتعل نہ ہوا اور اس نے 27 ر فروری کو ایک پریس کانفرنس میں نہایت صبر و تحمل سے اس کا جواب دیا۔ اس نے اس الزام کی تردید کی کہ فرقہ وارانہ فسادات کی ابتدا مشرقی بنگال میں ہوئی تھی اور اپنے موقف کی تائید میں یہ حقائق بیان کئے۔ (1) 20 ر دسمبر 1949ء کو کھلنا کے واقعہ کی نوعیت بالکل غیر فرقہ وارانہ تھی۔ اس واقعہ کے بعد کمیونسٹ عناصر نے یہ افواہ پھیلا دی کہ پولیس انتقامی کارروائی کرے گی۔ چنانچہ بہت سے لوگ اس علاقے سے فرار ہو گئے۔ گرد و نواح کے بعض غنڈوں نے اس صورتحال سے فائدہ اٹھایا اور مفرور ہندوؤں کا مال و اسباب لوٹ لیا۔ (2) 24 ر دسمبر کو آل انڈیا ہندو مہا سبھا کے صدر ڈاکٹر کھارے نے کھلم کھلا پاکستان کے خلاف نفرت کا پرچار کیا۔ اس نے کہا کہ ہم ملک کی تقسیم کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہمارا متحد ہونا ضروری ہے۔ (3) 15 ر جنوری 1950ء کو ہندوستان کے نائب وزیر اعظم نے ایک پبلک جلسہ میں بنگالی ہندوؤں کو تشدد پر اکسایا۔ اس نے ڈائریکٹ ایکشن ڈے اور اس کے بعد کلکتہ میں پیدا شدہ حالات کا ذکر کیا اور کہا کہ اس کے بعد نواکھلی کا المیہ ہوا۔ ہندوستان یا تم ان تاریک ایام کو کیسے بھول سکتے ہو۔ (4) نائب وزیر اعظم کی اس تقریر کے فوراً بعد کلکتہ میں ہزاروں اشتہارات تقسیم ہوئے جن میں مشرقی بنگال کے ہندوؤں پر کئے گئے فرضی مظالم کے خلاف اقدام کا مطالبہ کیا گیا۔ (5) 19 ر جنوری کو سپتگاؤں میں مسلمانوں پر حملے ہوئے اور ان کی مسجدوں کی بے حرمتی کی گئی۔ (6) 24 ر جنوری کو بہرام پور میں ہندو مہا سبھا کا جلسہ ہوا جس کے فوراً بعد مرشد آباد کے گورا بازار میں اور دوسرے علاقوں میں مسلمانوں پر حملے کئے گئے۔ (7) اس دن یعنی 24 ر جنوری کو ہی ڈم ڈم چھاؤنی میں مسلمانوں پر حملے کئے گئے اور ان کی ایک مسجد کی بے حرمتی کی گئی۔ اس قسم کے واقعات الٹا ڈنگا، مانک تولہ اور بالیا گھاٹ میں ہوئے۔ (8) 3 ر فروری کو باٹا نگر میں کونسل فار دی رائٹس آف منیارٹیز کے زیر اہتمام ایک پبلک جلسہ ہوا اور اس کے دو دن بعد 5 ر فروری کو باٹا نگر میں فساد ہو گیا۔ (9) 8 ر فروری کو سارے کلکتہ میں فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ (10) اب تک 15 ہزار مسلم مہاجرین، مشرقی بنگال پہنچ چکے ہیں اور تقریباً 20 ہزار مسلمان کلکتہ کے مختلف علاقوں کے کھلے

میدانوں میں پڑے ہوئے ہیں۔(11) مغربی بنگال میں وسیع پیمانے کے ان واقعات کے بعد 10رفروری کو مشرقی بنگال میں پہلی مرتبہ فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوئے۔20ردسمبر 1949ء کا کھلنا کا واقعہ سراسر غیر فرقہ وارانہ نوعیت کا تھا۔(12) 13رفروری سے ڈھاکہ میں بالکل امن وامان ہے۔ ڈھاکہ اور نارائن گنج کے ان چار روزہ فسادات میں 198 افراد ہلاک 223 زخمی ہوئے۔ مشرقی بنگال کی پولیس نے ان فسادات کو کچلنے کے لئے 22 مرتبہ گولی چلائی۔ 121 افراد کو گرفتار کیا اور تلاشیاں لے کر بہت سا مسروقہ سامان برآمد کیا۔(13) ان دنوں ڈھاکہ کے علاوہ چٹاگانگ، فینی، باریسال اور سلہٹ کے اضلاع میں بھی معمولی فسادات ہوئے لیکن ان پر 24 گھنٹے کے اندر قابو پا لیا گیا۔ (14) سلہٹ میں 16رفروری کو فساد کی وجہ یہ تھی کہ کریم گنج (آسام) سے تقریباً20 ہزار مسلم مہاجرین اس ضلع میں آ گئے تھے۔'' لیاقت علی خان نے ان حقائق کو گنوانے کے بعد کہا کہ ''گزشتہ دواڑھائی سال کا تجربہ شاہد ہے کہ بین المملکتی مسائل کو حل کرنے کے لئے تحقیقاتی کمیشنوں یا مشترکہ اداروں کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ میری رائے میں دونوں ملکوں میں فرقہ وارانہ فسادات کا واحد حل یہ ہے کہ دونوں حکومتیں اقلیتوں کا اعتماد حاصل کریں اور انہیں قائل کریں کہ انہیں اپنی شکایات کا ازالہ کرنے کے لئے صرف اپنی حکومتوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ انٹرنیشنل ریڈ کراس کے ذریعہ بھی کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ ضرورت تبدیلی قلب، ذہنی تحفظات کو دور کرنے اور ہندوستان کی تقسیم کو دیانتداری سے تسلیم کرنے کی ہے۔ سچی بات ہے کہ ہندوازم کے لیڈروں نے پاکستان کے وجود کو تسلیم نہیں کیا اور وہ اسے ختم کرنے کے لئے مختلف طریقے اختیار کرتے رہتے ہیں لیکن پاکستان ایک ایسی حقیقت ہے جسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ہندوازم کے لیڈر جتنی جلدی اس حقیقت کا احساس کر لیں برصغیر کے استحکام وترقی کے لئے اتنا ہی بہتر ہوگا۔ چند ہفتے ہوئے جواہر لال نہرو نے اعلانیہ طور پر یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ نہ کرنے کا اعلان کیا جائے۔ میں نے نہرو کے اس بیان کے جواب میں کہا تھا کہ اس قسم کے اعلان سے پہلے یہ ضروری ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان تنازعات کے اسباب کو دور کیا جائے۔ میرا یہ جوابی بیان کس قدر صحیح تھا اس سوال کا جواب ہندوستان کے وزیراعظم کے حالیہ بیان سے مل گیا ہے۔ اب اس نے غلط بیانیوں سے بھرپور اپنی طویل تقریر کے آخر میں دھمکی دی ہے کہ ہندوستان نے ہمیں جو تجاویز پیش کی ہیں اگر ہم نے اس

سے اتفاق نہ کیا تو ہندوستان کو دوسرے ذرائع اختیار کرنے پڑیں گے۔ میں دنیا کے امن پسند لوگوں سے کہتا ہوں کہ وہ اس دھمکی کی طرف دھیان دیں۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے میں پھر کہتا ہوں کہ ہم صرف امن کے خواہاں ہیں۔ میں نے پہلے بھی کہا ہے اور اب پھر کہتا ہوں کہ ہم صرف امن کے خواہاں ہیں۔ میں نے پہلے بھی کہا ہے اور اب پھر کہتا ہوں کہ ہم ہندوؤں کے خلاف کوئی جارحانہ عزائم نہیں رکھتے۔ ہماری پالیسی یہ ہے کہ جیو اور جینے دو۔ لیکن اگر ہندوستان جنگ چاہتا ہے تو وہ ہمیں اس کے لئے پوری طرح تیار پائے گا۔ ہم اپنی آزادی کو دنیا کی ہر چیز سے زیادہ قیمتی سمجھتے ہیں۔"[13]

دونوں طرف وسیع پیمانہ پر فسادات، جنگجویانہ بیانات، جبری تبادلہ آبادی اور مہاجرین کا مسئلہ

بدقسمتی سے لیاقت علی خان کی یہ پریس کانفرنس دونوں بنگالوں میں فرقہ وارانہ فسادات اور جبری تبادلۂ آبادی کے خاتمہ کا سبب نہ بنی۔ دونوں بنگالوں کی اقلیتوں کے بے گناہ عوام آئے دن مذہبی جنونیوں کی وحشت و بربریت کا شکار ہوتے رہے۔ ان فسادات اور خانہ بربادیوں کا ایک افسوسناک پہلو یہ تھا کہ ہندوستان کے اخبارات میں مشرقی بنگال کے وحشیانہ واقعات کی تشہیر ہوتی تھی جبکہ پاکستان کے اخبارات میں مغربی بنگال کی مسلم اقلیت پر ہندوؤں کے مظالم کی ہولناک رپورٹیں چھپتی تھیں اور ان کا دوسرا تشویشناک پہلو یہ تھا کہ ہندوستان میں پاکستان کے خلاف کھلم کھلا جنگی پروپیگنڈا شروع ہو گیا تھا۔ دہلی کا اخبار سٹیٹسمین اس وقت تک انگریزوں کے زیر اہتمام ہی چل رہا تھا، اس لئے اس کی پالیسی یہ تھی کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشیدگی ختم ہو اور یہ دونوں ممالک باہمی تعاون اور اشتراک عمل سے نہ صرف برصغیر میں بلکہ مصر سے لے کر ہند چینی تک اشتراکیت کے سدباب کے لئے برطانوی سامراج کی امداد کریں۔ چنانچہ اس اخبار نے اپنے 6 رفروری کے اداریے میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا تھا کہ ہندوستان میں کھلنا کے واقعہ کے بارے میں جو افواہیں پھیلائی گئی ہیں ان میں مبالغہ کا خاصا عنصر موجود ہے پھر اس اخبار نے نہرو کی 23 رفروری کی تقریر کے بعد کئی مرتبہ بین المملکتی جنگ کی باتوں پر تشویش کا اظہار کیا اور دونوں ممالک کے رہنماؤں سے اپیل کی کہ وہ صلح جوئی کے جذبہ کے تحت دونوں

بنگالوں میں فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ بند کرائیں اور جنگ بازوں کو کھیل کھیلنے کا موقع نہ دیں۔
چنانچہ اس اخبار نے اپنی اس پالیسی کے تحت 8/مارچ کے شمارے میں جواہر لال نہرو کے 6/مارچ کے دورۂ کلکتہ کی جو رپورٹ شائع کی اس میں بتایا کہ جب نہرو وہاں پہنچا تو شہر کی سڑکوں میں بڑے بڑے بینروں پر اس قسم کے نعرے لکھے ہوئے تھے کہ ''فرزندان بنگال مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کو بچانے کی خاطر مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔'' ''مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کو ظلم سے بچاؤ۔'' ''بنگال کا مطالبہ یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کو بچانے کے لئے فوراً مسلح مداخلت کی جائے۔'' ''سچائی کے لئے جنگ سچائی ہے۔'' ''بے عملی محمد علی جناح کی تھیوری صحیح ثابت کر دے گی۔'' ''عوام لیڈروں کا اس وقت حکم مانتے ہیں جب لیڈر عوام کا حکم مانتے ہیں۔'' سٹیٹسمین کی اس رپورٹ میں مزید بتایا گیا تھا کہ نہرو کے گورنمنٹ ہاؤس پہنچنے کے فوراً ہی بعد تقریباً دو سو مظاہرین شمالی دروازے کے باہر جمع ہو گئے اور انہوں نے اس قسم کے نعرے لگائے کہ ہم ہتھیار چاہتے ہیں۔ مشرقی پاکستان کو آزاد کراؤ۔ بنگال کا متحد ہونا ضروری ہے۔ یہ مظاہرہ ایسٹ پاکستان لبریشن موومنٹ نے کرایا تھا اور نہرو نے ان مظاہرین کے چار نمائندوں سے چند منٹ کے لئے ملاقات کی تھی۔

7/مارچ کو ہندوستان کی پارلیمنٹ میں ڈاکٹر آر۔ کے چودھری نے رائے ظاہر کی کہ مشرقی پاکستان کے مسئلہ کا جنگ کے سوا کوئی اور حل نہیں ہے۔ اس دن سوشلسٹ لیڈر جے۔ پرکاش نارائن نے ناگپور میں کہا کہ ''مشرقی پاکستان میں اقلیتوں کے تحفظ کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ہم وہاں اپنی فوج کو بھیجیں۔ ممکن ہے کہ یہ کاروائی بین الاقوامی رویے کے منافی معلوم ہو لیکن موجودہ حالات میں اس مسئلہ کا معقول حل صرف اس طریقہ سے ہو سکتا ہے۔ اگر پاکستان اسے اعلان جنگ تصور کرے تو ہم مجبور ہیں، ہم اسے ایسا کرنے سے نہیں روک سکتے۔ اس نے مزید کہا کہ میں نے 2/مارچ کو نہرو سے ملاقات کے دوران یہ تجویز پیش کی تھی۔''[14] جب جے۔ پرکاش نارائن نے ناگپور میں اپنا ''اعلان جنگ'' کیا تھا اس وقت مسلم کش فسادات آسام کے وسیع علاقوں کے علاوہ بہار اور یو۔ پی کے بعض علاقوں میں بھی پھیل چکے تھے۔ 7 اور 8 مارچ کو آسام کے بہت سے علاقوں میں قتل و غارت، لوٹ مار اور آتش زنی کی اتنی وارداتیں ہوئیں کہ تقریباً 60 ہزار مسلمانوں کو اپنے آبائی گھروں کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہنا پڑا۔ 9/مارچ کو مولوی فضل

الحق، خواجہ نورالدین اور ڈھاکہ کے تین اخباروں کے ایڈیٹروں نے وزیراعظم لیاقت علی خان کے نام ایک تار میں لکھا کہ ''کلکتہ، ہوڑہ، ہگلی، کریم گنج، جل پائی گوڑی اور دوسرے مقامات پر جمع شدہ مسلم پناہ گزینوں کی امداد کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ مشرقی پاکستان کے عوام میں بہت اشتعال پھیلا ہوا ہے لہٰذا بلا تاخیر ڈھاکہ پہنچو''[15] اور 10 / مارچ کو وزیراعلیٰ نورالامین نے صوبائی اسمبلی میں بتایا کہ اب تک مغربی بنگال سے تقریباً ڈیڑھ لاکھ مسلم مہاجرین مشرقی بنگال میں پناہ لے چکے ہیں لیکن اس نے یہ نہ بتایا کہ اس وقت تک تقریباً اتنے ہی ہندو شرنارتھی مغربی بنگال جا چکے تھے۔

18 / مارچ 1950ء کو ہندوستان کے وزیراعظم جواہر لال نہرو نے پارلیمنٹ میں تسلیم کیا کہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ بمبئی اور یوپی کے بعض شہروں تک پہنچ چکا ہے۔ لیکن یہ سلسلہ وہیں ختم نہ ہوا اور 19 / مارچ کو دہلی میں ہندو مہاسبھا کے ایک جلسہ کے بعد دو مسلمان ہلاک اور 19 زخمی ہوئے۔ یہ جلسہ ہندوستانی اخبارات میں شائع شدہ اس قسم کی مبالغہ آمیز خبروں کے پیش نظر منعقد کیا گیا تھا کہ (1) مشرقی پاکستان کے فسادات میں 3500 ہندو ہلاک ہو چکے ہیں۔ 28 / فروری کو سنتھسار کے مقام پر ایک ریل گاڑی میں 200 ہندوؤں کو ہلاک کر دیا گیا تھا۔ (2) مشرقی پاکستان کے مسلح انصار ریل گاڑیوں کو روک کر ہندو مسافروں کو قتل کر رہے ہیں۔ (3) جیسور اور کھلنا کے اضلاع کی ناکہ بندی کر کے ہندو شرنارتھیوں کی نقل وحرکت کو روک دیا گیا ہے اور ضلع کھلنا کے اندرونی علاقوں میں ہندوؤں کا قتل عام جاری ہے اور آتشزنی کی وارداتیں بھی ہو رہی ہیں۔ (4) بہت سے ہندو شرنارتھیوں کو مشرقی بنگال کے دوسرے علاقوں میں جانے کی اس لئے اجازت نہیں دی جاتی کہ ان کے پاس انکم ٹیکس کی ادائیگی اور ڈومی سائل کے سرٹیفکیٹس نہیں ہوتے اور جب انہیں مطلوبہ اجازت دی جاتی ہے تو انہیں پانچ روپے سے زیادہ رقم رکھنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ (5) حکومت مشرقی بنگال فسادات سے متاثرہ ہندوؤں کی بحالی کے لئے کوئی مؤثر اقدام نہیں کرتی۔

وزیراعظم لیاقت علی خان ہندوستانی اخبارات کے اس قسم کے نہایت اشتعال انگیز پروپیگنڈے سے خاصا پریشان ہوا کیونکہ اس میں سے بعض انتہا پسند عناصر کے اس منصوبے کی علامت ملتی تھی کہ پورے ہندوستان کی مسلم اقلیت کو دھکیل کر پاکستان میں بھیج دیا جائے تاکہ یہ مملکت مسلم مہاجرین کے بوجھ تلے دب کر ملیامیٹ ہو جائے۔ مزید برآں پورے ہندوستان میں

جنگ کے نعرے لگ رہے تھے اور بعض خبروں کے مطابق نہرو کے مارچ کے اوائل میں دورۂ کلکتہ کے بعد حکومت ہندوستان نے مشرقی بنگال کی سرحد پر اپنی فوجوں کا اجتماع شروع کر دیا تھا اور یوں لگتا تھا کہ وزیر اعظم نہرو نے جے پرکاش نارائن کے 2/مارچ کے مشورے کے مطابق مشرقی بنگال کے خلاف پولیس ایکشن کا پروگرام بنالیا ہے۔ چنانچہ لیاقت علی خان اس پریشانی کی بنا پر اور مولوی فضل الحق وغیرہ کے 9/مارچ کے تار کے پیش نظر 18/مارچ کو ڈھاکہ پہنچا۔ اس نے 19/مارچ کو باریسال میں اور 23/مارچ کو جیسور میں پبلک جلسوں سے خطاب کرتے ہوئے اقلیتوں کو سلامتی و تحفظ کا یقین دلایا اور مشرقی بنگال کے عوام کو ہندوستان کے توسیع پسندانہ عزائم سے خبردار کیا اور پھر اس نے 22/مارچ کو ڈھاکہ ریڈیو سے اپنی الوداعی نشری تقریر میں اقلیتوں سے اپیل کی کہ وہ بے بنیاد افواہوں پر کان نہ دھریں۔ حکومت پاکستان ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرے گی اور قانون شکنی کرنے والوں کے خلاف سخت اقدام کیا جائے گا۔ قائداعظم کے وعدے کے مطابق اقلیتوں کو پاکستان میں مساوی حقوق حاصل ہیں۔ لیاقت علی خان نے مشرقی پاکستان کی اقلیتوں کو یہ یقین دہانی اس حقیقت کے باوجود کرائی کہ 20/مارچ کو جب آل انڈیا ہندو مہاسبھا کا صدر ڈاکٹر این۔ بی۔ کھارے ہوڑہ اسٹیشن پہنچا تھا تو سٹیشن پر اس کا خیر مقدم کرنے والے لوگوں نے مطالبہ کیا تھا کہ پاکستان پر حملہ کر کے اسے ختم کیا جائے اور پورے برصغیر میں ایک ہندو مملکت قائم کی جائے۔ ڈاکٹر دھریندر ناتھ مکرجی کا اعلان یہ تھا کہ بھارت ایک ہندو ریاست ہے اس میں مسلمانوں، عیسائیوں اور پارسیوں وغیرہ کے لئے کوئی گنجائش نہیں اور کونسل فار دی پروٹیکشن آف رائٹس آف منیارٹیز کے صدر ڈاکٹر جے۔ پی متر کا انکشاف یہ تھا کہ اس کی زیر کمان تین لاکھ ہندو نوجوان ہیں جو سکھوں اور گورکھوں کی رجمنٹوں کے ساتھ مل کر سٹیم رولر کی طرح مشرقی بنگال کی ہر چیز کو کچل دیں گے۔ ان نوجوانوں کو آئی۔ این۔ اے کے افسروں نے فوجی تربیت دی ہے اور یہ جدید اسلحہ استعمال کرنے کی مہارت رکھتے ہیں۔"[16] لیاقت علی خان مشرقی بنگال کے مختلف علاقوں کا دورہ کرنے کے بعد 22/مارچ کو واپس کراچی پہنچا تو اس نے ہوائی اڈے پر بتایا کہ اس وقت تک تقریباً ساڑھے تین لاکھ مسلم مہاجرین مشرقی پاکستان میں پناہ لے چکے ہیں اور 25/مارچ کو اس نے پارلیمنٹ میں مغربی بنگال میں جنگی جنون کا ذکر کرتے ہوئے یقین دلایا کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے ایک ایک انچ

کا دفاع کیا جائے گا۔

تاہم اس نے یہ وعدہ کرنے سے معذوری ظاہر کی کہ مستقبل میں مشرقی بنگال میں ایک نیول اسٹیبلشمنٹ ٹریننگ سکول اور ملٹری اکیڈمی اور ایک آرڈیننس فیکٹری قائم کی جائے گی اور اس نے اس تجویز سے بھی اختلاف کیا کہ مشرقی پاکستان کے دفاع کا کام صرف مشرقی پاکستانیوں کے ہی سپرد ہونا چاہیے۔ اس نے مشرقی پاکستان میں ملٹری اکیڈمی کے قیام کے مطالبہ کی اس بنا پر مخالفت کی کہ جن افراد کو ہماری مسلح افواج میں افسروں کے فرائض سرانجام دینے ہیں ان کی تربیت ایک ہی جگہ ہونی چاہیے۔

اقلیتوں کے تحفظ کے لئے لیاقت۔ نہرو معاہدہ

لیاقت علی خان کے دورہ مشرقی پاکستان اور پارلیمنٹ میں اس کی تقریر کا کوئی نتیجہ نہ نکلا اور مغربی بنگال میں حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے تا آنکہ ہوڑہ میں صورتحال اس قدر خطرناک ہوگئی کہ صوبائی حکومت کو 8 مربع میل میں تقریباً پانچ لاکھ کی آبادی کے علاقے میں مارشل لا نافذ کرنا پڑا۔ یہ کاروائی آل انڈیا ہندو مہا سبھا کے صدر ڈاکٹر این۔ بی۔ کھارے کے دورے کے سات دن بعد 27/مارچ کو کی گئی۔ اس سلسلے میں صوبائی حکومت کے پریس نوٹ میں کہا گیا تھا کہ بعض علاقوں میں قتل کی وحشیانہ وارداتیں ہوئی ہیں اور بعض دوسرے علاقوں کے ہجوم نے بے گناہ لوگوں پر حملے کئے ہیں۔ ریلوے اسٹیشن پر بھی حملے ہوئے ہیں اور دو دن سے خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے لہٰذا امن و امان قائم کرنے کے لئے فوج کی امداد طلب کی گئی ہے۔''[17]
مغربی بنگال کی صوبائی حکومت کی جانب سے پہلی مرتبہ اس قسم کی مؤثر کاروائی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ گزشتہ دس دن سے پاکستان اور ہندوستان کے وزرائے اعظم فرقہ وارانہ فسادات کے سد باب کے مسئلہ پر خط و کتابت کر رہے تھے اور 27/مارچ تک ان دونوں کے درمیان اس تجویز پر اتفاق ہو چکا تھا کہ دونوں کو ملاقات کر کے اس مسئلہ کا کوئی پائیدار حل تلاش کرنا چاہیے۔

وزیر اعظم لیاقت علی خان نے 28/مارچ کو اس سلسلے میں پارلیمنٹ میں ایک طویل بیان دیا۔ جس میں اس نے پہلے تو یہ الزام عائد کیا کہ دونوں بنگالوں میں فرقہ وارانہ فسادات کا بیج آل انڈیا ہندو مہا سبھا کی کلکتہ میں 24/دسمبر سے لے کر 26/دسمبر 1949ء تک کی سہ روزہ

کانفرنس میں اس جماعت کے صدر ڈاکٹر کھارے کے اس اعلان نے بویا تھا کہ ہندوستان برصغیر کی تقسیم کو کبھی تسلیم نہیں کرے گا اور پھر یہ بتایا کہ وہ اس مسئلہ کے حل کے لئے دہلی جا کر وزیراعظم نہرو سے ملاقات کرے گا۔

لیاقت علی خان اپنے اس بیان کے مطابق 2/اپریل کو دہلی پہنچا اور سات دن کی بات چیت کے بعد 8/اپریل 1950ء کو اس کے اور وزیراعظم نہرو کے درمیان معاہدہ ہوا۔ جس میں ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں نے اس ذمہ داری کو باضابطہ طور پر قبول کیا کہ ان میں سے ہر ایک اپنے ملک کے ہر حصے میں اقلیتوں کے لئے مکمل طور پر مساوی شہریت اور بلا امتیاز مذہب، ان کی جان، ثقافت، مال و عزت کی حفاظت کی ضمانت دے گا۔ ہر ملک کے اندر نقل وحرکت کی آزادی کے علاوہ قانون اور اخلاق کے تحت پیشہ، تقریر اور عبادت کی آزادی کی بھی ضمانت دے گا۔ اس معاہدہ میں مشرقی بنگال، مغربی بنگال، آسام اور تری پورہ سے نقل مکانی کرنے والوں کی حفاظت اور ان علاقوں میں حسب معمول حالات کی بحالی اور معاہدہ پر عمل درآمد کرنے کے لئے مشینری کا بھی اہتمام کیا گیا۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ جو عناصر جبر وتشدد کریں گے ان کے خلاف سخت اقدامات کئے جائیں گے اور دونوں بنگالوں میں ایک مینارٹی کمیشن مقرر کیا جائے گا جو اس معاہدہ پر عملدرآمد کی نگرانی کرے گا۔ مشرقی بنگال میں آنے والے مسلم مہاجرین کی تعداد تقریباً چار لاکھ تھی اور تقریباً اتنے ہی ہندو شرنارتھیوں نے مغربی بنگال میں پناہ لی تھی۔ ان شرنارتھیوں کی واپسی اور بحالی کے کام کی نگرانی کی ذمہ داری بھی مینارٹی کمیشنوں کے سپرد کی گئی تھی۔

اس معاہدے کا دونوں ملکوں میں بالعموم خیر مقدم کیا گیا اور نہرو کا پارلیمنٹ میں بیان یہ تھا کہ ہم تباہی کے کنارے سے واپس ہوئے ہیں لیکن کلکتہ کے بعض اخبارات، ہندوستان سٹینڈرڈ، امرت بازار پتریکا اور نیشن وغیرہ نے اس پر نکتہ چینی کرتے ہوئے اسے محض ایک فریب قرار دیا۔ ہندوستان سٹینڈرڈ کی رائے یہ تھی کہ اس معاہدے سے تاریخ کو دھوکہ دینے کی لمبی چوڑی کوشش کی گئی ہے۔ مغربی بنگال کے ہندو سیاسی حلقوں میں بھی اس معاہدے پر برہمی کا اظہار کیا گیا اور نہرو کی کابینہ کے دو بنگالی ارکان ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی اور کے۔ سی۔ نیوگی بطور احتجاج مستعفی ہو گئے۔ ڈاکٹر مکرجی کی رائے یہ تھی کہ اس معاہدے کی بجائے مشرقی پاکستان کے خلاف پولیس ایکشن کا جواز موجود تھا۔ پاکستان میں مشرقی بنگال کے انگریز گورنر سر فریڈرک بورن

کو اس معاہدے پر دستخط ہونے سے پہلے ہی سبکدوش کر دیا گیا تھا اور اس کی جگہ ملک فیروز خان نون نے 6/اپریل کو ڈھاکہ میں گورنری کے عہدے کا چارج سنبھال لیا تھا۔

ہولناک فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ اس پورے خطہ میں کمیونسٹوں کی بڑھتی ہوئی مسلح جدوجہد میں پنہاں تھی

لیاقت علی خان اور جواہر لال نہرو کے درمیان اس معاہدے کے پس منظر پر ایک نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ دونوں بنگالوں میں گزشتہ چار ماہ کے فرقہ وارانہ فسادات اور ان فسادات کے خاتمہ کے لئے اس معاہدے کی تکمیل کی بنیادی وجہ برما، آسام، مغربی بنگال اور مشرقی بنگال میں کمیونسٹوں کی بڑھتی ہوئی مسلح جدوجہد میں پنہاں تھی۔ کمیونسٹوں کی جانب سے مسلح انقلاب برپا کرنے کا فیصلہ فروری مارچ 1948ء میں کلکتہ میں ساؤتھ ایسٹ ایشیا یوتھ کانفرنس اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی سالانہ کانگرس کے موقع پر کیا گیا تھا۔ مشرقی بنگال میں اس مجوزہ انقلابی جدوجہد کی ابتدا ضلع میمن سنگھ کے ہاجونگ کے علاقے میں مہاراجکمار مونی سنگھ کی زیر قیادت شروع ہوئی تھی اور پھر یہ جدوجہد راجشاہی، کھلنا، باریسال، جیسور اور بعض دوسرے علاقوں میں پھیل گئی۔ لیکن مشرقی بنگال کی مسلم لیگی حکومت اس جدوجہد پر فرقہ وارانہ رنگ چڑھا کر اسے کچلنے میں محض اس لئے کامیاب ہوگئی کہ مونی سنگھ کی کمیونسٹ پارٹی کے کم از کم 90 فیصد ارکان ہندو تھے اور انہوں نے جن غریب کسانوں کو مسلح جدوجہد کے لئے منظم کیا وہ بھی ہندو تھے۔ مزید برآں مونی سنگھ اور اس کی پارٹی نے کلکتہ کے فیصلے پر بلا سوچے سمجھے عمل کرتے ہوئے جب بنگال کی تقسیم کے خلاف موقف اختیار کیا تھا تو اس نے خود ہی نہ صرف مشرقی بنگال کے مسلم درمیانہ طبقہ کی جانب سے اپنی مخالفت کا سامان مہیا کر دیا تھا بلکہ اس نے مسلم لیگی حکومت کو موقع دیا تھا کہ وہ کمیونسٹوں کو غدار، انڈین ایجنٹس اور ففتھ کالمنسٹ قرار دے کر انہیں بے رحمی کے ساتھ کچل دے۔ اگر وسط دسمبر 1949ء میں راجشاہی اور کھلنا کے اضلاع میں پولیس سے متصادم ہونے والوں میں مسلمان کسان بھی شامل ہوئے ہوتے تو ان واقعات کو فرقہ وارانہ رنگ نہیں دیا جا سکتا تھا۔ چونکہ کمیونسٹ پارٹی اپنی ہیئت کے لحاظ سے ہندو پارٹی تھی اور اس کا مشرقی بنگال کی آزادی کے بارے میں موقف بھی مغربی بنگال کی ہندو مہاسبھا سے ملتا جلتا تھا، اس لئے مقامی مسلم لیگیوں نے بآسانی اس

پر غدار پارٹی کا ٹھپہ لگا دیا اور مسلم عوام کی بہت بھاری اکثریت نے اس ٹھپہ پر بلاتوقف اپنی مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔

دوسری طرف آسام اور مغربی بنگال میں حکومت ہندوستان نے بھی کمیونسٹوں کی انقلابی جدوجہد کو کچلنے کے لئے کچھ اسی طرح کا حربہ استعمال کیا۔ چونکہ مشرقی بنگال کی حکومت نے راجشاہی اور کھلنا میں کمیونسٹ جدوجہد کو ہندوؤں کی بغاوت قرار دے کر اسے مذہبی جنونیوں اور غنڈوں کے تعاون سے کچلا تھا اس لئے پہلے آل انڈیا ہندو مہا سبھا کے صدر ڈاکٹر کھارے اور پھر ہندوستان کے نائب وزیر اعظم سردار پٹیل کو یہ سنہری موقع ملا کہ وہ غریب ہندو عوام کی توجہ اپنی رجعت پسند حکومت اور عوام دشمن سرمایہ داروں کی طرف سے ہٹا کر بے گناہ مسلم اقلیت اور مشرقی بنگال کی طرف مبذول کرا دیں۔ چنانچہ اس طرح دونوں بنگالوں میں تقریباً چار ماہ تک فرقہ وارانہ قتل عام کا سلسلہ جاری رہا جس کے نتیجے میں ہزاروں مرد، عورتیں اور بچے مارے گئے اور لاکھوں لوگ خانماں برباد ہوئے۔ برطانیہ اور امریکہ کے سیاسی اور صحافتی حلقے یکم جنوری 1949ء کو کشمیر میں جنگ بندی کے تقریباً ایک سال بعد ہندوستان اور پاکستان کے درمیان اس نئی کشیدگی سے بہت فکرمند تھے کیونکہ اپریل 1949ء میں کامن ویلتھ کانفرنس کے دوران یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ برصغیر اور جنوب مغربی ایشیا میں اشتراکیت کے سدباب کے لئے دونوں ممالک ایک دوسرے سے تعاون اور اشتراک عمل کریں گے۔ چنانچہ ان حلقوں کی جانب سے صلح و آشتی کی مسلسل تلقین ہوتی رہی اور یہی تلقین بالآخر 8/ اپریل کے معاہدے کا باعث بنی۔ اس معاہدے سے ہفتہ عشرہ قبل ساری دنیا کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہو چکی تھی کہ برما کے کمیونسٹوں نے رنگون سے صرف 160 میل کے فاصلے پر پرونگ کے مقام پر اپنی حکومت قائم کر لی ہے اور برما کی کمیونسٹ پارٹی کا سیکرٹری جنرل تھاکن تھان تن اس اشتراکی حکومت کا وزیر اعظم مقرر ہوا ہے۔''[18]

دونوں طرف فرقہ وارانہ فسادات کی ثانوی وجوہات

بلاشبہ دونوں بنگالوں میں ان فرقہ وارانہ فسادات کی اور بھی کئی ایک ثانوی وجوہ تھیں۔ مثلاً مشرقی بنگال میں ایک وجہ تو یہ تھی کہ ستمبر 1949ء میں ہندوستان کے تجارتی بائیکاٹ سے مقامی عوام کو جو بے پناہ معاشی مشکلات درپیش ہوئی تھیں ان پر قابو پانے کے لئے نورالامین کی

حکومت نے فرقہ واریت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی مگر اس بنا پر جو حالات پیدا ہوئے ان پر کنٹرول کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ تاریخی اسباب کی بنا پر مشرقی بنگال کے ہندو بحیثیت مجموعی مسلمانوں کے مقابلے میں خوشحال تھے۔ تجارت، صنعت وحرفت اور ساہوکارہ پر ان کی اجارہ داری تھی اس لئے جب مفلوک الحال مسلمانوں کو موقع ملا تو وہ محض لوٹ مار کی خاطر ہندوؤں پر ٹوٹ پڑے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ نورالامین کی حکومت اسمبلی کے اندر حمیدالحق چودھری کے راتوں رات مستعفی ہوجانے کے باعث بہت کمزور تھی اور اسمبلی کے باہر مولانا بھاشانی کی عوامی لیگ نے اسے پریشان حال کر رکھا تھا اور صوبائی خودمختاری کی تحریک نے پھر اس قدر زور پکڑ لیا تھا کہ نورالامین کی زیر صدارت لیگ اسمبلی پارٹی کو خودمختاری کے حق میں قرارداد منظور کرنا پڑی تھی۔ ایسی صورتحال میں مسلم عوام کی توجہ ہندوؤں کی جانب مبذول ہوجانے سے اسے سیاسی فائدہ پہنچنے کی امید ہوسکتی تھی بالخصوص ایسے زمانے میں جبکہ اسمبلی میں صوبائی بجٹ منظور کروانا ضروری تھا۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ پنجابی بیوروکریسی اور بہاری مہاجرین نے کافی عرصہ سے فرقہ وارانہ صورتحال کو دھماکہ خیز بنا رکھا تھا۔ پنجابی افسروں کا خیال تھا کہ درمیانہ اور بالائی طبقوں کے ہندوؤں نے ان کے خلاف بنگالی مسلمانوں میں نفرت پھیلا رکھی ہے اور بہاری مہاجرین کا خیال تھا کہ ہندوؤں کی موجودگی میں ان کی مشرقی بنگال میں نوآبادکاری ممکن نہیں ہوگی۔ لندن کے ہفت روزہ اکونومسٹ (Economist) کے 25 ر مارچ 1950ء کے ادارتی تبصرے کے مطابق مشرقی بنگال میں ہندوؤں کے خلاف منظم فساد کی ابتدا بہاریوں نے کی تھی۔ چوتھی وجہ یہ تھی کہ غیر بنگالی بیوروکریسی اور بہاری مہاجرین کا خیال تھا کہ ہندوؤں کے تعلیم یافتہ عناصر مسلمانوں میں بنگالی عصبیت پھیلانے کے ذمہ دار ہیں اور وہی اردو زبان کے مشرقی بنگال میں بطور قومی زبان رائج ہونے کے راستے میں حائل ہیں۔ بنگالی طلبا کی آئے دن کی ایجی ٹیشن میں بھی انہی ہندوؤں کا ہاتھ ہوتا ہے لہٰذا اگر ان کو سبق سکھا دیا جائے تو بہت سی مشکلات حل ہوجائیں گی۔ پانچویں وجہ یہ تھی کہ غیر بنگالی بیوروکریسی کو، مسلم بنگالیوں کے درمیانہ طبقہ کو اور بہاری مہاجرین کو ہندوؤں کے مکانوں اور دکانوں کی ضرورت تھی اور ان کی یہ ضرورت ہندوؤں کو وہاں سے بھگائے بغیر پوری نہیں ہوسکتی تھی۔

اسی طرح مغربی بنگال، تری پورہ اور آسام میں بھی مسلم اقلیت کے قتل عام کی ایسی ہی کئی ثانوی وجوہ تھیں۔ ان میں سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں سردار پٹیل، ڈاکٹر

کھارے، ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی وغیرہ قسم کے بے شمار انتہا پسند ہندو عناصر موجود تھے جنہوں نے واقعی برصغیر کی تقسیم کو تسلیم نہیں کیا تھا اور ان کی ہمہ وقت خواہش اور کوشش یہ تھی کہ پاکستان کے وجود کو جتنی جلدی ممکن ہو سکے ختم کر کے پورے برصغیر میں ہندو راج قائم کیا جائے۔ کشمیر اور حیدر آباد (دکن) میں ہندوستان کی فوجی کامیابیوں نے ان کے حوصلے بہت بڑھا دیئے تھے اور وہ واقعی چاہتے تھے کہ پولیس ایکشن کے ذریعے مشرقی بنگال کو ہندوستان سے ملحق کر لیا جائے۔ جواہر لال نہرو نے انہی عناصر کے دباؤ کے تحت 23 رفروری کو پاکستان کے خلاف ''دوسرے ذرائع'' استعمال کرنے کی دھمکی دی تھی اور پھر 6 رمارچ کو نہرو جب کلکتہ گیا تھا تو انہی عناصر نے پاکستان کے خلاف فوجی کارروائی کا مطالبہ کیا تھا جبکہ جے پرکاش نارائن جیسا نام نہاد سوشلسٹ لیڈر بھی مشرقی پاکستان میں فوجی مداخلت کی وکالت کرتا تھا۔ انہی دنوں کلکتہ کے ایک اخبار نے یہ جائزہ شائع کیا تھا کہ مغربی بنگال کی 82 فیصد رائے عامہ پاکستان کے خلاف جنگ کے حق میں ہے اور ایک اور اخبار نے ایسٹ پاکستان کی آزاد حکومت کے قیام کا مشورہ دیا تھا۔ لندن کے اخبار ڈیلی ٹیلیگراف کی 27 رمارچ کی رپورٹ یہ تھی کہ ہندوستانی فوجوں کی مشرقی اور مغربی پاکستان کی سرحدوں کے نزدیک نقل و حرکت ہوئی ہے اور نیویارک ٹائمز کی 28 رمارچ کی خبر میں بتایا گیا تھا کہ ''ہندو مہا سبھا کا مقصد ایسے حالات پیدا کرنا ہے کہ حکومت ہندوستان کارروائی کرنے پر مجبور ہو جائے'' اور ایسے مطلوبہ حالات مغربی بنگال، تری پورہ اور آسام کی مسلم اقلیت کے قتل عام سے ہی پیدا ہو سکتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ستمبر 1949ء میں مشرقی پاکستان کے ساتھ جیوٹ کی تجارت بند ہو جانے کی وجہ سے تقریباً ایک سو کارخانے بند ہو گئے تھے اور لاکھوں مزدور بیکار ہو گئے تھے۔ یہ بے روزگار مزدور کمیونسٹوں کی مسلح جدوجہد میں ایک اہم عنصر بن سکتے تھے۔ لہٰذا ان کی طبقاتی نفرت کا رخ مسلم اقلیت کی طرف موڑنا ضروری تھا۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ اکتوبر 1949ء میں مشرقی پاکستان میں سرکاری جیوٹ بورڈ کے قیام کے بعد مارواڑیوں کے لئے مشرقی پاکستان کے کسان عوام کے استحصال کے دروازے بند ہو گئے تھے لہٰذا وہ بزور قوت اپنے اس دوسو سالہ استحصال کو جاری رکھنے کے متمنی تھے اور اسی بنا پر وہ مغربی بنگال میں مہا سبھائیوں کے جنگی نعروں کی ہر ممکن طریقے سے تائید و حمایت کرتے تھے۔ کونسل فار دی پروٹیکشن آف دی رائٹس آف مینارٹیز اور ایسٹ پاکستان لبریشن موومنٹ جیسی تنظیمیں انہی مارواڑیوں کی پیدا کردہ تھیں۔ اس

شیطانی کاروائی میں وہ ہندو زمیندار بھی شریک تھے جو مشرقی بنگال میں اپنے دیرینہ زمیندارانہ مفادات سے محروم ہو گئے تھے۔ چوتھی وجہ یہ تھی کہ دسمبر 1949ء میں راجشاہی، کھلنا اور باریسال کے جن پندرہ بیس ہزار ہندو شرنارتھیوں نے مرشد آباد اور کلکتہ میں پناہ لی تھی انہوں نے وہاں بالکل اسی طرح اشتعال انگیزی کی تھی جس طرح کہ بہاری مہاجرین نے ڈھاکہ، سید پور، نارائن گنج اور سلہٹ وغیرہ میں کی تھی۔ یہ ہندو شرنارتھی انتقام کے جذبہ سے مغلوب تھے اور انہوں نے اپنے اس جذبہ کی تسکین کے لئے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ان شرنارتھیوں میں وہ عناصر بھی شامل تھے جو مشرقی بنگال میں تجارت اور ساہوکارہ کے ذریعہ کئی پشتوں سے مزے اڑاتے رہے تھے۔ پانچویں وجہ یہ تھی کہ صوبہ آسام میں مقامی عصبیت زوروں پر تھی اور آسامی کسان بنگالی بولنے والے مسلمانوں کو وہاں سے نکال کر ان کی زمینوں پر قبضہ کرنے کے خواہاں تھے۔ لہٰذا ان کی اس خواہش کی تکمیل کے لئے حکومت ہندوستان کو ایک خصوصی قانون منظور کرنا پڑا لیکن اس قانون پر عمل درآمد سے پہلے ہی بنگالی بولنے والے مسلمان کسانوں کو راشٹریہ سیوک سنگھ نے بزور قوت وہاں سے نکال دیا۔ کریم گنج میں مسلم اقلیت کا قتل عام اسی پالیسی کا نتیجہ تھا۔

باب:8

غیر بنگالیوں کی آمریت اور لیاقت علی کی غیر جمہوری و غیر وفاقی آئین مسلط کرنے کی کوشش، بنگالی عوام سراپا احتجاج بن گئے

فرقہ وارانہ المیے سے جو مسائل عارضی طور پر دب گئے تھے پھر اٹھ گئے......

بنگالیوں کا فوجی بھرتی اور اپنے دفاع کا مطالبہ

مشرقی اور مغربی بنگال میں چار ماہ کے فرقہ وارانہ المیے کا حکومت پاکستان کو یہ سیاسی فائدہ پہنچا کہ اس عرصے میں وہ خطرہ ٹل گیا جو دسمبر 1949ء میں عربی رسم الخط کے خلاف بنگالی طلبا کی ایجی ٹیشن اور صوبائی لیگ اسمبلی پارٹی کی قرارداد برائے صوبائی خودمختاری کی منظوری کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ اگرچہ اس عرصے میں حمید الحق چودھری کے اخبار پاکستان آبزرور میں محکمہ ریلوے اور بعض دوسرے مرکزی محکموں میں پنجابی افسروں کی اقربا نوازی کے خلاف چند شکایتی خطوط اور رپورٹیں شائع ہوئیں اور اس موضوع پر مضامین کا ایک سلسلہ بھی شائع ہوا کہ مرکزی حکومت مشرقی بنگال کے مقابلے میں مغربی پاکستان کے مختلف علاقوں کی ترقی کے لئے زیادہ رقم خرچ کر رہی ہے اور اگرچہ لیاقت علی خان کے سب سے بڑے سیاسی حریف حسین شہید سہروردی نے پنجاب کے نواب ممدوٹ کے ساتھ مل کر 20/مارچ 1950ء کو لاہور میں عوامی مسلم لیگ کے قیام کا اعلان کر دیا تھا اور اس طرح کل پاکستان بنیادوں پر ایک طاقتور حزب اختلاف وجود میں آ گئی تھی۔ تاہم مشرقی بنگال کی حد تک نور الامین کی صوبائی حکومت اور لیاقت علی خان کی مرکزی

حکومت کے خلاف کوئی مؤثر احتجاجی آواز نہیں اٹھی تھی کیونکہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان قومی تضاد کے طوفان نے مشرقی بنگال کے بیشتر مسلم عوام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ یہاں تک کہ پاکستان آبزرور کا 10 رمارچ 1950ء کا اداریہ یہ تھا کہ اگر پاکستانی عوام کو ہندوستان کے اشوک چکر اور اشتراکیت کے ہتھوڑا درانتی میں سے کسی ایک کے انتخاب پر مجبور کیا گیا تو وہ مؤخرالذکر کا ہزار مرتبہ انتخاب کریں گے۔ لیاقت علی خان نے بظاہر اسی بنا پر اپنی 25 رمارچ کی تقریر میں اس امر پر اطمینان کا اظہار کیا کہ ''آج پاکستان ایک متحدہ قوم ہے۔ اگرچہ کہیں کہیں کتے بھونکنے کی آوازیں آتی ہیں۔'' اس کے اس جملے کا مطلب یہ تھا کہ حسین شہید سہروردی وغیرہ کی مخالفت کے باوجود پورے ملک میں اس کا اقتدار مستحکم ہے۔

تاہم 8 راپریل 1950ء کو بین المملکتی معاہدے کے فوراً ہی بعد یہ آوازیں اٹھنے لگیں کہ مشرقی بنگال کو دفاعی امور میں خود کفیل بنایا جائے۔ اس سلسلہ میں پہل 9 راپریل کو ایسٹ پاکستان مسلم سٹوڈنٹس لیگ نے کی۔ اس تنظیم کی مجلس عاملہ نے اپنے سہ روزہ اجلاس کے بعد ایک قرارداد میں مطالبہ کیا کہ مشرقی بنگال میں ایک ملٹری اکیڈمی قائم کرنے کے علاوہ اس خطہ کے لئے ایک الگ ہوائی فوج کا بندوبست کیا جائے۔ مارننگ نیوز نے 13 راپریل کو اس قرارداد پر تبصرہ کرتے ہوئے رائے ظاہر کی کہ ''مشرقی بنگال کے دفاع اور اس کی ترقی کے لئے اس صوبہ کو ایک الگ مکمل اور مربوط یونٹ تصور کیا جائے اور یہاں ایک ہائی کمان اور ایک ریجنل پلاننگ اتھارٹی کا قیام بلاتاخیر عمل میں لایا جائے۔ مشرقی پاکستان کی جغرافیائی پوزیشن حقائق کو نئے رخ سے دیکھنے کا تقاضا کرتی ہے۔ سوویت یونین میں ایک خود کفیل فار ایسٹرن آرمی کی جو تشکیل ہوئی ہے وہ ہمارے پالیسی سازوں کے لئے ایک قابل تقلید مثال کی حیثیت رکھتی ہے۔ سوویت یونین کی یہ فوج ایک الگ یونٹ ہے اور ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ اس کا ماسکو پر انحصار صرف اتنا ہے کہ اسے بڑے پالیسی معاملات میں وہاں سے ہدایات ملتی ہیں۔ ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں جرأت مندانہ اور دانشمندانہ اقدام کیا جائے۔ اگر وطن عزیز کے دفاع کے لئے عوام کی توانائیوں کو استعمال کرنے کی کوئی کوشش نہ کی گئی تو وہ مایوسی اور بددلی کا شکار ہو جائیں گے۔''

پنجابی سول اور فوجی بیوروکریسی کا بنگالیوں سے رعونت آمیز رویہ اختلافات کی خلیج کو مزید گہرا کرنے کا سبب بنا

مارننگ نیوز قبل ازیں غیر بنگالی بیوروکریسی کی رعونت اور احساس برتری کے خلاف بھی ادارتی احتجاج کر چکا تھا۔ 11راپریل کو کومیلا کی ایک بیگم سلطانہ اسلام نے ایک مراسلے میں مارننگ نیوز کے اس اداریے کی پرزور تائید کی۔ اس کی رائے یہ تھی کہ "مشرقی پاکستان میں اسلامی معاشرے کے خواب کی تعبیر صرف اسی صورت ہوسکتی ہے کہ اس صوبہ میں باہر سے جو لوگ آئے ہیں وہ مقامی لوگوں سے معاشرتی ربط وضبط بڑھائیں۔ ان سے مساوی سلوک کریں اور اپنے آپ کو محض بہاری یا پنجابی تصور نہ کریں۔" 17راپریل کو ڈھاکہ کی بیگم عزیزالنساخاتون نے اپنے مراسلے میں اس مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے غیر بنگالیوں کے احساس برتری کی سخت مذمت کی۔ اس نے لکھا کہ "ان لوگوں نے اپنا ایک الگ دھڑا بنا رکھا ہے اور یہ مشرقی پاکستان کے غریب و بے سہارا لوگوں کو دھتکارتے ہیں۔ یہ اپنے آپ کو ہر لحاظ سے اعلیٰ وارفع سمجھتے ہیں اور ان کا یہ رویہ مقامی لوگوں میں عناد اور غصہ کے جذبات پیدا کرتا ہے اور پھر 8رمئی کو کومیلا کے ایک شخص ڈبلیو۔ احمد نے لکھا کہ "آج کل بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کے درمیان ایک نفسیاتی کشمکش جاری ہے۔ یہاں جو نئے لوگ آئے ہیں وہ اپنی برتری اور اعلیٰ حسب نسب کے بارے میں ڈینگیں مارتے ہیں اور ہم غیر آریوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ انہوں نے اپنا ایک الگ طبقہ بنالیا ہے اور یہ اپنے آپ کو بنگالی معاشرے سے الگ تھلگ رکھتے ہیں۔ کراچی میں جو بنگالی رہتے ہیں انہیں غیر ملکی اور معاشرتی طور پر اجنبی تصور کیا جاتا ہے۔ اسلام میں ذات پات کی کوئی تمیز نہیں ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ہم میں ایسا امتیاز برتا جائے گا۔ مشرقی پاکستان کے لوگوں نے کیا جرم کیا ہے کہ ان سے کالی بھیڑوں کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔ کیا مشرقی پاکستان میں نوآمدہ لوگوں کو توہمات، غلط تعلیم یا پاکستان کی علاقائی اہمیت سے بے تعلقی نے اندھا کر رکھا ہے؟ ان لوگوں کو توہمات اور ناواقفیت سے بالاتر ہو کر پاکستان کی سالمیت کا تحفظ کرنا چاہیے۔"

ڈھاکہ کے اخبارات میں آئے دن اس مضمون کے خطوط چھپنے کی وجہ یہ تھی کہ مشرقی پاکستان میں غیر بنگالیوں کا اور بالخصوص پنجابیوں کا رویہ مقامی لوگوں کے بارے میں واقعی بہت

حقارت آمیز تھا۔ ان کا یہ رویہ بالکل انگریز سامراجیوں کی طرح کا تھا۔ یہ اپنی ثقافتی، تہذیبی اور نسلی برتری کے بارے میں ڈینگیں مارتے تھے۔ یہ بنگالیوں سے معاشرتی روابط قائم نہیں کرتے تھے۔ بات بات پر ان کی دل شکنی کرتے تھے اور اپنے مخصوص معاشرتی حلقوں میں کسی بنگالی کو داخل نہیں ہونے دیتے تھے اور دفتر میں بھی ادنیٰ بنگالی ملازمین سے کبھی پیار و محبت سے پیش نہیں آتے تھے۔ یہ تلخ حقیقت اس قدر نمایاں تھی کہ چودھری محمد علی بھی، جو پاکستان کی بیوروکریسی کا والد محترم ہے، یہ تسلیم کرتا ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں کشیدگی کی ایک وجہ مغربی پاکستانی افسروں کا اس قسم کا طرز عمل تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ''ان افسروں میں سے اکثر پہلے کبھی مشرقی پاکستان نہیں گئے تھے اور وہ وہاں کے لوگوں کی زبان، آداب اور احساسات سے ناواقف تھے۔ افسر شاہی طرز عمل کی عام خامیوں پر مستزاد کم از کم بعض افسروں کے رویے میں متکبرانہ احساس برتری کی نمود تھی۔ اگر سلیقہ شعاری اور ہمدردانہ معاملہ فہمی سے کام لیا جاتا تو ایک نئے نظم و نسق کے قیام میں جو کھینچا تانی اور کشاکش ہوتی ہے اس میں کمی ہو سکتی تھی لیکن ہر ایک کو یہ اوصاف ودیعت نہیں ہوتے۔ چنانچہ شکایتیں بڑھتی گئیں اور بعض لوگ یہاں تک بھی کہنے لگے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں کشیدگی کی سب سے بڑی وجہ مغربی پاکستانی افسروں کا طرز عمل تھا۔ اگرچہ یہ خیال مبالغہ آرائی پر مبنی ہے لیکن اس میں کچھ صداقت بھی ہے۔''[1]

میجر جنرل ایوب خان بھی، جو 49-1948ء میں مشرقی بنگال کا جنرل آفیسر کمانڈنگ تھا، ان مغربی پاکستانی افسروں میں شامل تھا جو متکبرانہ احساس برتری میں مبتلا تھے اور جنہیں مشرقی پاکستان کی کوئی چیز اچھی نہیں لگتی تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ ''مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کے جو افسر کام کر رہے تھے میں ان کے برتاؤ کے بارے میں اکثر نکتہ چینی سنا کرتا۔ ان پر الزام لگایا جاتا کہ وہ عوام سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے۔ وہ شدت پسند ہیں اور ان کا انداز مربیانہ ہوتا ہے...... مشرقی اور مغربی پاکستانیوں کے درمیان کچھ زیادہ سماجی میل جول نہیں تھا۔ مغربی پاکستان والا وہاں خود کو اکیلا محسوس کر کے اپنے ہی آدمیوں کا گروہ بنانے پر مجبور ہو جاتا تھا...... مغربی پاکستان والے بھی کچھ فرشتے یا اخلاص مندی کا نمونہ نہ تھے۔ ان میں سے زیادہ تر سرکاری ملازم تھے جنہیں یہ احساس تھا کہ وہ مغربی پاکستان کی نسبتاً زیادہ با آسائش زندگی چھوڑ کر آئے ہیں۔ وہ متوسط طبقے سے تھے اور اہل و عیال رکھتے تھے۔ دونوں صوبوں میں آنا جانا بھی مشکل اور گراں

تھا۔ وہ مشرقی پاکستان والوں کی عام نااہلی پر چڑتے رہتے تھے اور اس بات کو چھپا نہیں سکتے تھے کہ انہیں مشرقی پاکستان میں نوکری کرنا پسند نہیں۔ غرض عجیب صورتحال تھی۔ ایک طرف تو ڈھاکہ کے لوگ عموماً یہ سمجھتے تھے کہ مغربی پاکستان سے آئے ہوئے افسران پر حکومت جمانا چاہتے ہیں اور دوسری طرف مغربی پاکستان والے اس افسری کو اپنے لئے عذاب سمجھتے تھے۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ میں نے کسی سے مذاق سے کہا تھا ''تم میرے خلاف تحریک شروع کر کے مجھے یہاں سے نکلوا کیوں نہیں دیتے۔ یقین جانو میں اپنی حمایت میں ایک لفظ تک نہ کہوں گا۔''[2]

جب مئی 1950ء کے اوائل میں وزیر اعظم لیاقت علی خان امریکہ اور کینیڈا کے دورہ پر گیا تو اسے مشرقی بنگال کے بارے میں کوئی خاص تشویش لاحق نہیں تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ چار ماہ کے ہولناک فرقہ وارانہ فسادات کے بعد وہاں کے عوام فوری طور پر کوئی سیاسی تحریک چلانے کے موڈ میں نہیں تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ 21/اپریل کو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تین ماہ کے لئے ایک عارضی تجارتی معاہدے کے باعث پٹ سن کی قیمتوں میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا اور کسان عوام کی معاشی مشکلات کسی حد تک دور ہو گئی تھیں۔ لیکن لیاقت علی خان کی چند ہی ہفتوں کی عدم موجودگی میں مسلم لیگ اسمبلی پارٹی پھر دھڑے بندی کا شکار ہو گئی اور اس بنا پر نورالامین کی حکومت پھر ڈانواں ڈول نظر آنے لگی۔ پاکستان مسلم لیگ کا صدر چودھری خلیق الزماں وزیر اعلیٰ نورالامین کو اس بھنور سے نکالنے کے لئے مئی کے وسط میں ڈھاکہ گیا مگر وہ اس کا کوئی سیاسی مسئلہ حل نہ کر سکا اور 3/جون کو قطعی طور پر ناکام ہو کر واپس کراچی آ گیا۔ اسمبلی میں نورالامین کی حالت اتنی پتلی تھی کہ جب وہ 26/جون کو یونیسکو کی میٹنگ میں شرکت کے لئے پاکستانی وفد کے رکن کی حیثیت سے جنیوا گیا تو اس نے اپنی جگہ کسی وزیر کو قائم مقام وزیر اعلیٰ نامزد نہ کیا کیونکہ اسے خطرہ یہ تھا کہ اس عارضی نامزدگی سے بھی اسمبلی میں مسلم لیگی ارکان کی دھڑے بندی اس کے قابو سے باہر چلی جائے گی۔ کراچی کے اخبار ڈان نے 6/جولائی 1950ء کو ایک خبر میں مشرقی بنگال کی اس عجیب وغریب صورتحال کی طرف توجہ مبذول کرائی کہ نورالامین کی عدم موجودگی میں وہاں کوئی وزیر اعلیٰ ہی نہیں ہے اور سارے صوبائی وزراء صرف اپنے اپنے محکموں کا انتظام کر رہے ہیں اور صوبائی کابینہ کی حیثیت ایک ایسے گروہ کی سی ہے جس کا کوئی قائد نہیں ہے۔

جنگ کوریا کی وجہ سے پٹ سن کی برآمد میں یکا یک اضافہ اور ایکسپورٹ ڈیوٹی میں سے مشرقی بنگال کو جائز حصہ نہ ملنے پر بنگالیوں کا واویلا

27 رجون 1950ء کو کوریا کی جنگ شروع ہونے کے بعد پٹ سن کے نرخوں میں یکا یک اضافہ ہو گیا تو صوبہ کا یہ سیاسی بحران وقتی طور پر عوام کی معاشی آسودگی میں دب گیا۔ اگرچہ مٹی کے تیل اور نمک کی کمیابی اور مہنگائی کے بارے میں شکایتیں جاری رہیں۔ پٹ سن کی خریداری کے جیوٹ بورڈ کے مقرر کردہ ایجنٹوں کی بدعنوانیوں کے خلاف بھی واویلا ہوتا رہا۔ یہ مطالبہ بھی جاری رہا کہ جیوٹ بورڈ میں کاشتکاروں کو نمائندگی دی جائے اور یہ شکوہ بھی جاری رہا کہ مرکزی حکومت کو جیوٹ پر ایکسپورٹ ڈیوٹی سے جو آمدنی ہوتی ہے اس میں سے مشرقی بنگال کو اس کا جائز حصہ نہیں دیا جاتا۔

حمید الحق چودھری کا اخبار پاکستان آبزرور اس قسم کی شکایتوں کی تشہیر کرنے میں پیش پیش تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ چودھری کے خلاف ''پروڈا'' کے تحت تفتیش جاری تھی اور وہ اس تفتیش کے مکمل ہونے سے پہلے مشرقی بنگال کے عوام کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ اسے بنگالی عوام کے حقوق و مفادات کی علمبرداری کے جرم میں سزا مل رہی ہے۔ پنجاب میں نواب ممدوٹ نے بھی اپنے خلاف پروڈا کے تحت عائد کردہ الزامات کے جواب میں اسی قسم کا موقف اختیار کیا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اگرچہ کراچی کے ارباب اقتدار زبانی طور پر مشرقی بنگال سے بہت پیار محبت کا اظہار کرتے تھے لیکن عملاً وہ اس علاقے سے سوتیلی ماں کا سا سلوک کرتے تھے۔ وہ گزشتہ اڑھائی تین سال میں مشرقی بنگال کی حکومت کی پیش کردہ کئی ترقیاتی سکیمیں مسترد کر چکے تھے اور اگر انہوں نے کوئی ترقیاتی سکیم منظور کی بھی تو وہ اس پر اس قدر سست رفتاری سے عملدرآمد کرتے تھے کہ صوبائی حکومت کے متعلقہ بنگالی اہلکار اور دوسرے باشعور تعلیم یافتہ عناصر اس سازش کا نوٹس لئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ چونکہ کوریا کی جنگ کے بعد پٹ سن کی برآمدی تجارت کی آمدنی میں بہت اضافہ ہو گیا تھا اس لئے مشرقی بنگال کی اقتصادی ترقی کے بارے میں مرکزی حکومت کی غفلت انہیں پہلے سے زیادہ کھٹکنے لگی تھی۔ مقامی کاروباری حلقوں کو اپنی اس شکایت کے ازالہ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی کہ ان کے لئے کراچی سے برآمدی درآمدی لائسنس حاصل کرنا

جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔ انہیں درآمدی لائسنس حاصل کرنے کے لئے کراچی جانا پڑتا تھا اور اگر طویل خجل خواری کے بعد انہیں مطلوبہ لائسنس مل جاتے تھے تو اس کی بنیاد پر وہ جو اشیائے صرف درآمد کرتے تھے اس پر لاگت زیادہ آتی تھی کیونکہ کراچی آنے جانے اور وہاں قیام کے اخراجات بھی قیمت خرید میں شامل کرنے پڑتے تھے۔ مزید برآں مشرقی بنگال میں جو بینک اور دوسرے مالیاتی ادارے قائم تھے وہ اپنا فالتو سرمایہ بالعموم مغربی پاکستان میں لگاتے تھے۔ اس لئے مقامی تاجروں کو درآمدی تجارت کے لئے مطلوبہ سرمایہ حاصل کرنے میں بھی بڑی دقت پیش آتی تھی اور اس بنا پر برآمدی و درآمدی تجارت کے شعبے میں بنگالیوں کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ اس شعبہ پر زیادہ تر غلبہ کراچی کے ان خوجوں، میمنوں بوہروں اور پنجاب کے شیخوں اور سیدوں وغیرہ کا تھا جنہوں نے اکتوبر 1949ء میں جیوٹ بورڈ کے قیام کے بعد ڈھاکہ اور چٹاگانگ وغیرہ میں مارواڑیوں کی جگہ اپنے دفاتر کھول لئے تھے۔ گویا عملی طور پر مشرقی بنگال کلکتہ کے ہندو مارواڑیوں کی بجائے مسلمان مغربی پاکستانیوں کے لئے ایک شکارگاہ بن گیا تھا۔

حکومت پاکستان نے 10رجولائی کو ڈان کی وساطت سے ایک خبر میں اعداد و شمار پیش کر کے اس الزام کی تردید کی کہ مشرقی بنگال کو پٹ سن کی ایکسپورٹ ڈیوٹی میں سے اس کا جائز حصہ نہیں ملتا۔ اس خبر میں بتایا گیا تھا کہ مشرقی بنگال کو ایکسپورٹ ڈیوٹی کا ساڑھے بیاسی فیصد حصہ یا زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین کروڑ روپے کی ادائیگی کی جاتی ہے حالانکہ غیر منقسم بنگال کو اس آمدنی میں سے کبھی بھی دو کروڑ اسی لاکھ روپے سے زیادہ رقم نہیں ملی تھی۔ 48-1947ء میں مشرقی بنگال کو دو کروڑ ایک لاکھ روپے دیئے گئے تھے اور اس طرح اس صوبہ کا خسارہ کا بجٹ منافع کا بجٹ بن گیا تھا۔ پاکستان آبزرور نے ایک طویل اور تلخ اداریے میں اپنے اعداد و شمار پیش کر کے حکومت پاکستان کے اس موقف کی پرزور تردید کی۔ اس نے بتایا کہ ''49-1948ء میں پٹ سن پر ایکسپورٹ ڈیوٹی سے حکومت پاکستان کو 12 کروڑ روپے کی آمدن ہوئی تھی۔ برصغیر کی تقسیم سے پہلے غیر منقسم بنگال کو اس آمدنی میں ساڑھے باسٹھ فیصد حصہ ملتا تھا۔ اگر 49-1948ء میں اس آئینی روایت پر عمل کیا جاتا تو مشرقی بنگال کو 12 کروڑ روپے کی آمدنی میں سے تقریباً 8 کروڑ ملنے چاہئیں تھے لیکن جب مارچ 1949ء میں مرکزی حکومت کو یہ پتہ چلا کہ پٹ سن کی ایکسپورٹ ڈیوٹی کی آمدنی بہت زیادہ ہوگی تو اس نے گورنر جنرل سے ایک مؤثر بہ ماضی آرڈیننس

نافذ کروا کر مشرقی بنگال کا زیادہ سے زیادہ حصہ ساڑھے تین کروڑ روپے مقرر کروا دیا اور اس طرح اس نے غیر آئینی ذرائع اختیار کر کے اور صوبائی حکومت سے مشورہ کئے بغیر اپنی مالیاتی پالیسی کی تکمیل کی۔ اس کا جواز یہ پیش کیا گیا کہ غیر منقسم بنگال کو اتنی رقم کبھی نہیں ملی تھی لیکن یہ جواز پیش کرتے ہوئے بعض اہم حقائق کو دانستہ طور پر نظرانداز کر دیا گیا۔ اول یہ کہ غیر منقسم بنگال کو انکم ٹیکس کی آمدنی سے سے تقریباً 8 کروڑ روپے ملتے تھے جبکہ تقسیم کے بعد مشرقی بنگال کو اس حساب میں سے ایک پائی بھی نہیں ملی۔ دوئم یہ کہ غیر منقسم بنگال میں خام پٹ سن کی زیادہ تر کھپت مقامی جیوٹ ملوں میں ہوتی تھی لیکن اب مشرقی بنگال کی ساری کی ساری پٹ سن برآمد کی جاتی ہے۔ غیر منقسم بنگال میں صوبائی حکومت کو ایکسپورٹ ڈیوٹی میں جو نقصان ہوتا تھا اس کا ازالہ جیوٹ ملوں، مینجنگ ایجنسیوں، بیلرز اور تاجروں سے انکم ٹیکس اور سیلز ٹیکس کی آمدنی میں سے ہو جاتا تھا۔ اس لئے مشرقی بنگال کو جیوٹ ٹیکسوں میں سے ساڑھے باسٹھ فیصد حصہ سے محروم کرنے کا کوئی اخلاقی یا مالیاتی جواز نہیں ہے۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ مرکزی حکومت نے صوبائی حکومت کو آگاہ کئے بغیر اور اس کی رضامندی حاصل کئے بغیر طریقۂ کار میں بھی بعض بنیادی تبدیلیاں کر دی ہیں۔ مثلاً قانونی ضابطہ کے مطابق ان ٹیکسوں کی آمدنی میں سے صوبائی حکومت کو ہر ماہ کے آخر میں اس کے حصہ کی خود بخود ادائیگی ہو جانی چاہیے۔ لیکن آڈیٹر جنرل کو یہ اختیار کس نے دے دیا ہے کہ وہ اس مسلمہ طریقۂ کار میں تبدیلی کر کے یہ نیا طریقہ رائج کرے کہ صوبائی رقم کی منتقلی مرکزی محکمہ خزانہ اور مرکزی اکاؤنٹنٹ جنرل کی مرضی حاصل کرنے کے بعد ہوگی؟ ہمارے نزدیک اس فیصلے کی تعبیر یہی ہو سکتی ہے کہ اس صوبہ کو مالی طور پر کراچی کے بعض افسروں کا دست نگر بنانے کی ناپاک کوشش کی گئی ہے۔'' پاکستان آبزرور نے اپنے اس اداریے کے آخر میں حکومت پاکستان کے اس موقف کی بھی تردید کی کہ مشرقی بنگال میں وسیع پیمانے پر مستقل سرمایہ کاری کی گئی ہے۔ اخبار کے مطابق ''مرکزی حکومت نے اس مقصد کے لئے 100 کروڑ روپے کا قرضہ حاصل کیا تھا چونکہ مشرقی بنگال کے لوگوں کا معیار زندگی نسبتاً پست ہے اس لئے اس رقم کا زیادہ تر حصہ اس صوبہ میں خرچ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن جو کچھ ہوا وہ اس کے بالکل الٹ ہے یعنی اس میں سے زیادہ تر رقم مغربی پاکستان میں خرچ کی گئی ہے مثلاً ڈھاکہ یونیورسٹی کو تو 10 لاکھ روپے دیئے گئے ہیں لیکن پنجاب یونیورسٹی کو 60 لاکھ روپے کی ادائیگی ہوئی ہے۔''[3] عام طور پر اعداد و شمار کی اس قسم کی لڑائی کا کوئی

فیصلہ نہیں ہوا کرتا لیکن جولائی 1950ء میں یہ لڑائی اس بنا پر فیصلہ کن تھی کہ مشرقی بنگال کا تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ اپنے تین سال کے تلخ تجربے کی بنا پر مرکزی حکومت کے خلاف ہر شکایت اور ہر الزام کو مبنی بر صداقت سمجھنے لگا تھا۔

دورۂ امریکہ سے واپس آ کر لیاقت علی نے سہروردی کی نقل و حرکت پر پابندیاں عائد کر دیں اور حمید الحق کے خلاف پروڈا کے تحت کاروائی تیز کر دی

چنانچہ جب وسط جولائی 1950ء میں وزیراعظم لیاقت علی خان امریکہ اور کینیڈا کے دورہ سے واپس آیا تو مشرقی بنگال میں معاشی آسودہ حالی کے باوجود سیاسی صورتحال خاصی کشیدہ تھی۔ ڈھاکہ اور چٹاگانگ میں عام تاثر یہ تھا کہ کراچی اور پنجاب کے لٹیرے بنگالیوں کی خون پسینے کی کمائی کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ وزیراعلیٰ نورالامین جنیوا میں تھا اور ڈھاکہ میں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ صوبائی حکومت کی باگ ڈور کس کے ہاتھ میں ہے۔ حسین شہید سہروردی پنجاب میں اپنے سیاسی قدم جمانے کے بعد ان دنوں ڈھاکہ پہنچا ہوا تھا اور اس کا موقف یہ تھا کہ مشرقی بنگال کی مسلم لیگی حکومت اپنی نمائندہ حیثیت کھو بیٹھی ہے اور اسی لئے اس نے گزشتہ دو برس میں آٹھ نشستوں کا ضمنی انتخاب نہیں کرایا تھا۔ وزیراعظم لیاقت علی خان نے 19 ر جولائی کو کراچی ریڈیو سے اپنی نشری تقریر میں قوم کو اپنے دورۂ امریکہ کے تاثرات سے مطلع کرتے ہوئے بتایا کہ ''جب ہم نے امریکہ کے لوگوں کے روبرو اسلام کے بنیادی اصولوں کی وضاحت کی تو وہ حیرت زدہ ہو گئے۔ ہم نے ان پر واضح کیا کہ اسلام انسانی ارتقا کی اعلیٰ ترین صورت کی نمائندگی کرتا ہے اور صرف ہمارے مذہب کے بنیادی اصول ہی دنیا کو ایک لازوال نظام عطا کر سکتے ہیں۔ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو مساوات، اخوت اور جمہوریت کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور سکھاتا ہے کہ ساری ترقی ایک ایسے ڈھانچے کی طرح ہے جو بظاہر عظیم الشان اور رعب دار ہونے کے باوجود تجرباتی بنیادوں پر قائم ہے اور وہ ذرا سا جھٹکا بھی برداشت نہیں کر سکتا۔'' لیکن اس لچھے دار تقریر کے دو دن بعد 21 ر جولائی کو ڈھاکہ میں عوامی مسلم لیگ کے قائد حسین شہید سہروردی کو یہ حکم دیا گیا کہ ''ڈھاکہ میں تمہاری سرگرمیاں صرف وکیلانہ پیشہ تک محدود رہنی چاہئیں۔ تمہیں ڈھاکہ میں یا ڈھاکہ کے باہر جا کر صوبہ میں کسی بھی جگہ پبلک جلسے کو خطاب کرنے کی اجازت

نہیں۔ جب تمہارے پیشہ وارانہ فرائض انجام پا جائیں تو تم یہاں سے چلے جاؤ۔" 25 رجولائی کو صوبائی اسمبلی کے پانچ ارکان...... خیرات حسین، شمس الدین، شمس الحق، علی احمد خان اور انورا خاتون...... نے ایک مشترکہ بیان میں سہروردی کی نقل وحرکت پر عائد کردہ اس پابندی کی مذمت کی۔ انہوں نے کہا کہ لیاقت علی خان نے امریکہ میں بڑے عاجزانہ طور پر یہ اعلان کیا تھا کہ پاکستان ایشیا میں سب سے زیادہ جمہوری ملک ہے۔ کیا سہروردی کے خلاف اس الزام سے اس کا یہ اعلان جھوٹا ثابت نہیں ہوتا؟ اور 26 رجولائی کو ڈھاکہ ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن نے شہریوں کی انفرادی آزادی میں ناجائز مداخلت اور تقریر و انجمن سازی کی آزادی پر پابندی کے بارے میں حکومت کے حالیہ اقدام کی زوردار الفاظ میں مذمت کی۔ ایسوسی ایشن نے اس سلسلے میں جو قرارداد منظور کی اس میں کہا گیا کہ "اگر عاملہ کی طرف سے افراد کی آزادی میں اس طرح مطلق العنانیت سے مداخلت ہوتی رہی تو کسی جمہوری حکومت کے چلنے کا امکان نہیں ہوگا۔"[4]

پاکستان آبزرور میں اس قرارداد کے ساتھ اس مضمون کی خبریں بھی چھپیں کہ صوبہ کے مختلف علاقوں میں نمک اور مٹی کے تیل کی قیمتوں میں بہت اضافہ ہو گیا ہے۔ ڈھاکہ میں نمک 10 آنے سے لے کر 12 آنے فی سیر کے حساب سے بک رہا ہے جبکہ دو ہفتے قبل اس کا بھاؤ چار آنے فی سیر تھا اور آج کل کلکتہ میں اس کا بھاؤ دو آنے فی سیر ہے۔ ڈھاکہ کے بعض کاروباری ادارے کلکتہ سے نمک درآمد کرنے کے خواہاں ہیں اور حکومت ہندوستان نے انہیں عام اجازت دے دی ہے لیکن کراچی کے بعض محکموں کا حکم یہ ہے کہ ان کے عطا کردہ لائسنس کے بغیر ہندوستان سے نمک درآمد نہیں کیا جا سکتا۔ شہر میں سرسوں کے تیل کی قیمتیں بھی چڑھ رہی ہیں۔ دو ہفتے پہلے یہ تیل 3 روپے سیر ملتا تھا لیکن آج اس کا بھاؤ ساڑھے تین روپے سے لے کر چار روپے فی سیر تک ہے اور ان خبروں کے ساتھ ہی ایک اور خبر چھپی کہ گورنر جنرل نے ڈھاکہ ہائی کورٹ کو حکم دے دیا ہے کہ وہ حمید الحق چودھری کے خلاف پروڈا کے تحت کاروائی کرے۔ چنانچہ پروڈا ٹربیونل نے حمید الحق کو پہلی پیشی کے لئے یکم اگست کو طلب کیا ہے۔ اس کے خلاف 13 الزامات ہیں جن میں سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ جب وہ وزارت کے عہدے پر فائز تھا تو اس نے اپنی ایک پرائیویٹ لمیٹڈ کمپنی قائم کرنے کے لئے اپنی سرکاری حیثیت کا ناجائز استعمال کیا تھا۔ لیکن اس افسانے میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں تھا جو مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو بہت ناگوار گزری

تھی۔ اور وہ بات یہ تھی کہ اس کمپنی کے زیر اہتمام پاکستان آبزرور شائع ہوتا تھا اور اسی پاکستان آبزرور نے صوبائی حکومت کے خلاف ایک زبردست محاذ قائم کر رکھا تھا۔

گورنر مشرقی بنگال فیروز خان نون نے پنجابیوں کو وہاں آ کر سرمایہ کاری کرنے اور مارواڑیوں کا خلا پر کرنے کی دعوت دی

جب 15 راگست کو حمید الحق چودھری کے خلاف پروڈا کے تحت مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی تو اس وقت مشرقی بنگال کا گورنر ملک فیروز خان نون لاہور میں تھا اور اس کا پنجاب کے کاروباری عناصر کو مشورہ یہ تھا کہ وہ مشرقی بنگال میں جا کر خوب منافع کمائیں۔ اس صوبہ میں بہت مواقع ہیں اور وہاں کاروباری لوگوں کا مستقبل بہت روشن ہے۔ غیر مسلموں کے انخلا کی وجہ سے وہاں کے تجارتی شعبے میں بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے جو یہاں کے کاروباری لوگ پر سکتے ہیں۔ میری طرف سے پاکستان کے سارے علاقے کے تاجروں کو دعوت عام ہے۔ ملک فیروز خان نون نے مشرقی اور مغربی پاکستان میں گہرے تجارتی اور ثقافتی روابط قائم کرنے پر بھی زور دیا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ ''مشرقی پاکستان کو نمک، سرسوں کے تیل، گھی اور دوسری ایسی ایشائے خوردنی کی ضرورت ہے جن کی مغربی پاکستان میں فراوانی ہے۔''[5] فیروز خان نون پنجاب کا نہایت دقیانوسی جاگیردار تھا لیکن اس کی اس دقیانوسیت اور رجعت پسندی کے باوجود اس میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے اس بدنما سیاسی چہرے پر وسیع المشربی یا اسلامی مساوات کا خوشنما غازہ نہیں لگاتا تھا وہ اپنے اچھے یا برے خیالات کا برملا اور کسی لگی لپٹی کے بغیر اظہار کر دیتا تھا۔ لاہور میں اس کے اس بیان کا اہم پہلو یہ تھا کہ میجر جنرل ایوب خان کے بقول ''حمید الحق چودھری بطور وزیر خزانہ ایک ایسا ہوشیار آدمی تھا جو نہیں چاہتا تھا کہ باہر کا کوئی مسلمان اس کے صوبے میں آ کر کوئی صنعتی کارخانہ قائم کرے...... میرے کان میں اکثر یہ بات پڑا کرتی تھی کہ حمید الحق ان مسلمانوں کو ہر طرح بددل کرنے کی کوشش کرتا ہے جو باہر سے آ کر اس کے صوبے میں سرمایہ لگانا چاہتے ہوں۔ ان مسلمانوں میں کچھ تو واپس ہندوستان چلے گئے اور کچھ کراچی آ گئے۔ میں نے دیکھا کہ باہر والوں کے خلاف ایک ذہنی دیوار کھڑی کی جا رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرقی پاکستان میں صنعتکاروں اور سرمایہ کا آنا رک گیا۔''[6] غالباً ملک فیروز خان نون نے بھی اپریل

1950ء میں مشرقی بنگال کی گورنری کا عہدہ سنبھالنے کے بعد یہی محسوس کیا ہوگا کہ حمید الحق چودھری اچھا آدمی نہیں ہے کیونکہ اس کا اخبار پاکستان آبزرور بنگالیوں کے حقوق ومفادات کی ترجمانی کرتا ہے اوران مسلمانوں کو ہر طرح بددل کرنے کی کوشش کرتا ہے جو باہر سے آکر اس کے صوبے میں سرمایہ لگانا چاہتے ہیں۔ اوراب اس کا یہ خیال ہوگا کہ حمید الحق کے پروڈا کے مقدمہ میں ملوث ہو جانے کے باعث مشرقی بنگال میں پنجاب کے صنعتی اور تجارتی لٹیروں کے لئے میدان صاف ہوگیا ہے۔ وہ غیر مسلموں کے انخلا کے باعث مشرقی بنگال کے صنعتی وتجارتی حصہ میں پیدا شدہ خلا کو پر کرنے کے لئے مقامی لوگوں کو کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا بلکہ وہ اس مقصد کے لئے پنجابیوں کو دعوت عام دیتا تھا۔

حمید الحق کے خلاف پروڈا کے تحت کاروائی کی تفصیل غیر بنگالیوں، تاجروں اور پنجابی بیوروکریسی کے گھناؤنے کردار کی عکاسی

22/اگست 1950ء کو حمید الحق چودھری کے خلاف مقدمہ کی باقاعدہ سماعت شروع ہوئی تو پہلے ہی دن تجارتی شعبہ میں بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کے درمیان امتیازات کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ اس مسئلہ کا ذکر استغاثہ کے گواہ الٰہی بخش اینڈ کمپنی کے سینئر حصہ دار حاجی رشید احمد کی شہادت کے دوران ہوا۔ یہ شخص دہلی کا رہنے والا تھا اوراس نے قیام پاکستان کے بعد چٹا گانگ میں اپنا کاروبار شروع کیا تھا۔ اس نے اپنی شہادت کے دوران حمید الحق چودھری کی جرح کے جواب میں تسلیم کیا کہ وہ غیر بنگالی تاجروں کی تنظیم کا رکن ہے۔ اس نے پہلے قائداعظم سے امپورٹ لائسنس کے بارے میں شکایت کی تھی اور پھر اس نے لیاقت علی خان سے شکایت کی تھی کہ اسے جگہ کی الاٹمنٹ نہیں ہوئی۔ 4/ستمبر کو چیف سیکرٹری عزیز احمد کی گواہی شروع ہوئی تو استغاثہ کی طرف سے استدعا کی گئی کہ اس گواہ کا بیان بند کمرے میں قلمبند کیا جائے کیونکہ اس کی شہادت کے دوران کئی سرکاری رازوں کا ذکر ہوگا لیکن ٹربیونل نے اس استدعا کو پوری طرح منظور نہ کیا اور یہ حکم دیا کہ یہ گواہ سرکاری فائلوں اور دستاویزات کا حوالہ دے گا تو اس کی شہادت بند کمرے میں قلمبند ہوگی لیکن اس کی زبانی شہادت کھلے عام ہوگی۔ چنانچہ جب 12/ستمبر کو عزیز احمد پر جرح ہوئی تو اس نے انکشاف کیا کہ میں صوبائی وزراء کو بتائے بغیر ہر دو ہفتے کے بعد مرکزی

حکومت کو خفیہ رپورٹ بھیجتا رہا ہوں لیکن میں ان رپورٹوں کے مضمون کے بارے میں کچھ بتانے کو تیار نہیں ہوں۔''

سوال۔ آئین کی کونسی دفعہ کے تحت تم یہ پندرہ روزہ خفیہ رپورٹ بھیجتے رہے ہو۔

جواب۔ یہ برصغیر کی تقسیم سے پہلے کا طریقۂ کار تھا۔ جس پر بعد میں بھی عمل ہوتا رہا۔

اس پر حمید الحق چودھری نے جسٹس کے استفسار پر کہا کہ ''اگرچہ قیام پاکستان کے بعد اس لحاظ سے عظیم تبدیلی آئی تھی کہ اقتدار اعلیٰ عوام کو حاصل ہو گیا تھا لیکن ملک کے انتظامی ڈھانچے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی اور ملک پر برطانوی طریقے سے ہی حکومت ہوتی تھی۔''

عزیز احمد نے حمید الحق چودھری کی مزید جرح پر بتایا کہ میں پندرہ روز خفیہ رپورٹ بھیجنے کے علاوہ بعض اوقات سیکرٹری جنرل کو بھی بعض امور کے بارے میں لکھتا رہا ہوں۔

سوال۔ کیا یہ رپورٹیں متعلقہ وزیر کی رضامندی سے بھیجی جاتی ہیں۔

جواب: اس کا انحصار رپورٹ کے مضمون پر ہوتا ہے

سوال۔ کیا تمہیں یاد ہے کہ خواجہ ناظم الدین کب گورنر جنرل بنا تھا۔

جواب: ہاں

سوال۔ کیا تم اس کے ساتھ کراچی گئے تھے۔

جواب: ہاں

سوال۔ کیا یہ صحیح ہے کہ کراچی میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ لیگ اسمبلی پارٹی مشرقی بنگال کے وزیر اعلیٰ کا انتخاب نہیں کرے گی بلکہ اس کا انتخاب گورنر کرے گا۔

جواب: مجھے معلوم نہیں۔

چیف جسٹس۔ اس مبینہ فیصلے کا اس مقدمے سے کیا تعلق ہے۔

حمید الحق: اس وقت پارٹی مجھے اپنا قائد منتخب کرنے والی تھی لیکن مارچ 1949ء میں میری بجٹ تقریر کے بعد میرے اور مرکز کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا اور اس بنا پر مرکز نے مداخلت کر کے مجھے موقع نہ ملنے دیا۔

سوال: کیا تمہیں معلوم ہے کہ گورنر جنرل نے مشرقی بنگال کے گورنر کو ایک ذاتی خط لکھا تھا

جس میں اسے ہدایت کی تھی کہ نورالامین کو وزیراعلیٰ منتخب کیا جائے؟

جواب : مجھے معلوم نہیں۔"[7]

حمیدالحق چودھری کے خلاف مقدمہ کی یہ کارروائی کسی تعبیر و تشریح کی محتاج نہیں تھی تاہم مشرقی بنگال کے باخبر و باشعور سیاسی حلقوں کو اس پر کوئی حیرت نہ ہوئی کیونکہ انہیں پہلے ہی سے معلوم تھا کہ قیام پاکستان کے بعد پہلے ہی دن سے مشرقی بنگال کی مسلم لیگی کابینہ کی حیثیت محض نمائشی تھی۔ عملاً صوبہ کی عنان اقتدار چیف سیکرٹری عزیز احمد اور دوسرے غیر بنگالی افسروں کے ہاتھ میں تھی۔ چیف سیکرٹری اپنی کسی کارروائی کے لئے کابینہ کے سامنے جوابدہ نہیں تھا۔ وہ نہ صرف براہ راست مرکزی حکومت کو خفیہ رپورٹیں بھیجتا تھا بلکہ حکومت پاکستان کے سیکرٹری جنرل چودھری محمد علی سے بھی خفیہ خط و کتابت کیا کرتا تھا۔ یہ وہی چودھری محمد علی تھا جو پاکستان میں افسر شاہی نظام حکومت قائم کرنے کا ذمہ دار تھا لیکن یہ چند سال بعد جب اقتدار سے محروم ہوا تھا تو جمہوریت کا عظیم علمبردار بن گیا تھا۔

13 ستمبر 1950ء کو چیف سیکرٹری عزیز احمد کی شہادت اڑھائی گھنٹے تک بند کمرے میں قلمبند ہوئی پھر جب کھلی عدالت میں مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی تو حمیدالحق چودھری نے گواہ کو 1949ء کے ہفت روزہ مارننگ نیوز کے ایک مضمون کے چند اقتباسات پڑھنے کو کہا۔ مارننگ نیوز ایم۔ اے۔ ایچ اصفہانی کی ملکیت تھا۔ یہ اخبار 1948ء تک کلکتہ سے روزانہ شائع ہوتا تھا۔ 1948ء کے اواخر میں کلکتہ میں اس کی اشاعت بند کر دی گئی اور پھر یہ ڈھاکہ سے بطور ہفت روزہ شائع ہونے لگا تھا۔ دسمبر 1949ء میں یہ ڈھاکہ میں پھر روزانہ اخبار بن گیا تھا۔ اس اخبار کی پالیسی مرکزی حکومت کے حق میں تھی اور یہ بالعموم مرکز کی ہر کارروائی کو حق بجانب قرار دیتا تھا۔ عزیز احمد نے مدعا علیہ کی خواہش کے مطابق اس نیم سرکاری ہفت روزہ میں سے جو اقتباسات پڑھے ان میں الزام عائد کیا گیا تھا کہ حمیدالحق مرکز کے خلاف ایجی ٹیشن کو ہوا دے رہا ہے اور ٹین کے خالی پیپوں کی برآمد سے اس کا تعلق ہے لہٰذا اس وزارت خزانہ کا قلمدان لے لیا جائے اور اس کے خلاف تفتیش کے لئے ایک اعلیٰ اختیاراتی ٹربیونل مقرر کیا جائے۔ حمیدالحق نے عزیز احمد سے یہ اقتباسات محض یہ ثابت کرنے کے لئے پڑھوائے تھے کہ اس کے خلاف یہ مضمون دراصل عزیز احمد کے کہنے پر لکھا گیا تھا۔ جب عزیز احمد یہ اقتباسات پڑھ چکا تو حمیدالحق چودھری نے ٹربیونل کو

بتایا کہ مرکزی حکومت نے اعلیٰ ملازمتوں میں بھرتی کے بارے میں جو فیصلہ کیا تو وہ اس کے خلاف تھا۔ چنانچہ اس کی اس آئینی مخالفت کے باعث اس کے اور مرکزی حکومت کے درمیان سیاسی اختلافات پیدا ہو گئے۔ بنابریں اس کے خلاف پہلے تو یہ الزام عائد کیا کہ وہ صوبہ پرستی کا پرچار کرتا ہے اور پھر اسے اس مقدمے میں ملوث کر دیا گیا۔ اس موقع پر عزیز احمد نے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ وزیراعظم لیاقت علی خان نے اکتوبر 1949ء میں اپنے دورۂ مشرقی بنگال کے دوران حمیدالحق چودھری کے خلاف تفتیش شروع کرنے کی تجویز کی منظوری دی تھی۔ حمیدالحق ان دنوں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لئے نیویارک گیا ہوا تھا اور وزیراعلیٰ نورالامین نے اس کی عدم موجودگی میں اسے وزارت خزانہ کے قلمدان سے محروم کر دیا تھا۔

مقدمہ کی اس کاروائی میں مرکزی ملازمتوں میں بھرتی کا ذکر سیاسی طور پر اس لئے اہم تھا کہ اس سے ایک دن پہلے کے پاکستان آبزرور میں ایک مضمون میں سنٹرل پبلک سروس کمیشن کے خلاف یہ الزام عائد کیا گیا تھا کہ وہ بنگالی امیدواروں کے خلاف امتیازی سلوک روا رکھتا ہے۔ مضمون میں بتایا گیا تھا کہ ''1950ء کی بھرتی میں 125 امیدوار کامیاب ہوئے ہیں جن میں سے بنگالی بولنے والوں کی تعداد صرف 20 ہے۔ بنگالی امیدواروں کے اس وسیع پیمانے کی ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ ان کے قد چھ فٹ کے نہیں ہیں اور ان کی شخصیتیں رعب دار نہیں ہیں۔ ان میں سے 80 فیصد دیہاتی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ صدیوں سے استحصال کا شکار ہونے کے باعث بہت ہی غریب ہیں۔ ان کی صحت کمزور ہے۔ وہ خوش پوش نہیں ہیں۔ انہیں نکٹائی باندھنے کا طریقہ بھی نہیں آتا۔ مضمون میں مزید کہا گیا تھا کہ جب تک کرزن ہال کا کمپاؤنڈ، لاہور کے گورنمنٹ کالج کے کمپاؤنڈ کی طرح صبح و شام کاروں سے بھرا نہیں ہوگا، اس وقت تک مشرقی بنگال سے دلکش اور رعب دار شخصیت کے حامل بنگالی نوجوان کبھی نہیں مل سکیں گے۔ کمیشن کے فاضل ارکان کا نظریہ وہی پرانا بیوروکریٹک نظریہ ہے۔ یہ سکالرشپ کی مطلوبہ دولت سے محروم ہے۔ اس میں مشرقی بنگال کا کوئی حقیقی نمائندہ نہیں ہے۔ بنگالیوں کے بارے میں کمیشن کے بعض فیصلے تو فی الحقیقت سرسری نوعیت کے ہیں اور بعض دوسرے فیصلے تو انتہا درجہ کے حیران کن ہیں۔ مثلاً پولیس سروس کے لئے کسی ایک بنگالی نوجوان کو بھی موزوں نہیں سمجھا گیا حالانکہ کئی بنگالی امیدواروں کی صحت اچھی تھی اور تعلیمی اداروں میں ان کا یو۔ او۔ ٹی۔ سی کا (U.O.T.C) کا

ریکارڈ بھی اچھا تھا۔''مضمون کے آخر میں یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ'' آئندہ بھی مشرقی بنگال کی اعلیٰ ملازمتوں کے امتحانات میں کارگردگی اتنی ہی بری رہے گی جتنی کہ آج کل ہے اور وہ مرکز کی خیرات پر زندہ رہے گا۔ ایسا اس وقت تک رہے گا جب تک معاشی مساوات اسے مغرب کی سطح پر نہیں لاتی۔ دریں اثنا یہاں کے جولڑکے کوڑا کرکٹ سے ابھرے ہیں انہیں اپنی توانائیاں اور اپنے والدین کی محنت کی کمائی بے سود کام میں ضائع نہیں کرنی چاہیے۔''[8]

مسلم لیگ کی صوبائی کابینہ اور ارکان اسمبلی میں دھڑے بندیاں حکومت مخالف طلبا تنظیموں کا اتحاد اور ان میں کمیونسٹ پارٹی کا اثر

15 ستمبر 1950ء کو نورالامین یورپ اور برطانیہ کے 82 روزہ دورے کے بعد واپس ڈھاکہ پہنچا تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ ان کے صوبہ کا کوئی وزیر اعلیٰ بھی ہے۔ 82 دن تک مشرقی بنگال کی حکومت وزیر اعلیٰ کے بغیر ہی چلتی رہی تھی اور اس دوران صوبائی کابینہ کا کوئی اجلاس نہیں ہوا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ لیگ اسمبلی پارٹی اور صوبائی کابینہ دو تین دھڑوں میں منقسم تھیں اور نورالامین نے اس صورتحال کے پیش نظر جون کے اواخر میں یورپ کے دورے پر روانہ ہونے سے قبل کسی کو اپنی جگہ عارضی وزیر اعلیٰ نامزد نہیں کیا تھا۔ تاہم جب وہ تقریباً تین ماہ کے بعد ڈھاکہ پہنچا تو اس کے لئے صوبہ کی سیاسی حالت اس سے زیادہ ناسازگار تھی جتنی کہ جون میں تھی۔ مولانا بھاشانی جیل سے رہا ہو کر داخلی رجعت پسندی اور بیرونی سامراجیت کے خلاف نعرے لگا رہا تھا اور کوریا کی جنگ کی وجہ سے کمیونسٹ پارٹی کی پالیسی میں یکا یک تبدیلی آنے کی وجہ سے طلبا پہلے سے زیادہ منظم و متحرک تھے۔ اب پارٹی کی پالیسی مسلح جدوجہد کی نہیں تھی بلکہ اینگلو امریکی سامراج کے خلاف وسیع ترین متحدہ محاذ بنانے کی تھی۔ پارٹی کی اس پالیسی کے تحت 15 ستمبر کو ڈھاکہ بار لائبریری ہال میں دو روزہ ایسٹ پاکستان ایجوکیشن کانفرنس ہوئی جس میں ایسٹ پاکستان مسلم سٹوڈنٹس لیگ، ایسٹ پاکستان سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن، اور ایسٹ پاکستان سٹوڈنٹس فیڈریشن کے تقریباً 400 مندوبین نے شرکت کی۔ صدارت کے فرائض صوبائی اسمبلی کے ایک رکن علی احمد نے سرانجام دیئے۔ کانفرنس میں ایک قرارداد کے ذریعے یہ رائے ظاہر کی گئی کہ حکومت بنگالی زبان کے لئے عربی رسم الخط رائج کرنے کی جو کوشش کر رہی ہے وہ چار کروڑ بنگالیوں کی ثقافت پر براہ

راست حملے کی حیثیت رکھتی ہے۔ کانفرنس کی ابتدا میں بعض لوگوں نے اس میں یہ کہہ کر گڑبڑ کرنے کی کوشش کی کہ یہ ڈھونگ کمیونسٹوں کی جانب سے رچایا جارہا ہے۔ تاہم ان کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ کانفرنس کے دوسرے دن ایک صوبائی بورڈ بنام گنا شکشا پریشد کی تشکیل کی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ حکومت کی تعلیم دشمن پالیسی کے خلاف صوبہ بھر کی تحریک میں اشتراک و تعاون پیدا کیا جائے گا۔ کانفرنس میں کئی قراردادیں بھی منظور کی گئیں جن میں ایک قرارداد کے ذریعے کوریا میں امریکہ کی فوجی مداخلت کی مذمت کی گئی اور طلبا و دوسرے شہریوں سے اپیل کی گئی کہ وہ امن کی تحریک کو تقویت پہنچائیں۔ ایک اور قرارداد میں شہری آزادیوں حکومت کے حملوں کے خلاف احتجاج کیا گیا، سیفٹی ایکٹ کی تنسیخ کا مطالبہ کیا گیا اور یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ مشرقی بنگال کا نام صرف بنگال رکھا جائے۔ یہ کانفرنس اس لحاظ سے اہم تھی کہ اس میں کمیونسٹ پارٹی کے مسلمان کارکنوں نے پہلی مرتبہ منظر عام پر آ کر صوبہ کی جمہوری سیاست میں حصہ لینے کی ابتدا کی تھی۔ اس وقت تک ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی نے بھی ماسکو کی نئی لائن کے مطابق جواہر لال نہرو کی حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد کی پالیسی ترک کر کے اپنے مہم جو لیڈر بی۔ ٹی۔ رندیو کو برطرف کر دیا ہوا تھا اور اب اس کی جگہ جمہوریت پسند راجیشور راؤ پارٹی کا لیڈر تھا۔

آئین سازی کے لئے دستور ساز اسمبلی کی بنیادی اصولوں اور بنیادی حقوق کی کمیٹیوں کی رپورٹوں میں مشرقی بنگال کی مخصوص صورتحال کو نظر انداز کر کے مضبوط مرکز کا آئینی ڈھانچہ تجویز کیا گیا

تقریباً دو ہفتے کے بعد 28 ستمبر کو طلبا کی اس کانفرنس کی سیاسی اہمیت اور بھی بڑھ گئی جبکہ وزیر اعظم لیاقت علی خان نے پاکستان دستور ساز اسمبلی میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ پیش کی۔ یہ کمیٹی 12 مارچ 1949ء کو مقرر کی گئی تھی اور اس میں مشرقی بنگال کی نمائندگی بہت کم تھی۔ اس کے زیادہ تر ارکان وفاقی یونٹوں کو مطلوبہ خود مختاری دینے کے حق میں نہیں تھے بلکہ وہ ملک کی بقا کے لئے ایک طاقتور اور مضبوط مرکز کا قیام ضروری سمجھتے تھے۔ وہ اپنے اس نظریاتی ڈھانچے میں مشرقی پاکستان کی مخصوص جغرافیائی، تاریخی، ثقافتی، سیاسی اور معاشرتی حیثیت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ان کی سفارشات کا خلاصہ یہ تھا۔

1۔ مرکزی پارلیمنٹ، وفاق کے کسی بھی صوبے میں کمی بیشی کر سکتی ہے اور اس کا نام بھی تبدیل کر سکتی ہے۔

2۔ وفاق کی ہیئت انتظامیہ (ایگزیکٹو) کے اختیارات حکومت کے سربراہ کو سونپے جانے چاہئیں تاکہ وہ انہیں آئین اور قانون کے مطابق استعمال کر سکے۔ سربراہ حکومت کی اصطلاح کا مطلب وہ سربراہ حکومت ہے جو وزارت کے مشورے کے مطابق کام کرتا ہو۔ سربراہ حکومت کا انتخاب مرکزی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں کیا جائے گا۔

3۔ سربراہ حکومت کو انتخاب کرانے کے لئے خاص اختیارات حاصل ہونے چاہئیں۔ اسے ایسے اقدامات اختیار کرنے کی اجازت ہونی چاہیے جن کی وجہ سے انتخابات بالکل آزادانہ عمل میں آسکیں۔

4۔ مسلح افواج کے سپریم کمانڈر کا عہدہ بھی سربراہ حکومت کو ہی سونپا جانا چاہیے۔

5۔ سربراہ مملکت اپنے محولہ فرائض کی بجا آوری کے سلسلے میں کسی عدالت کے سامنے جوابدہ نہیں ہونا چاہیے۔ جب تک وہ اس منصب جلیلہ پر فائز رہے اس کے خلاف کسی عدالت میں مجرمانہ اقدام کے الزام میں مقدمہ نہیں چلنا چاہیے۔ جب تک وہ اس عہدے پر فائز رہے۔ کسی عدالت کی طرف سے اس کی گرفتاری یا نظر بندی یا حاضر عدالت ہونے کا حکم جاری نہیں ہونا چاہیے۔ سربراہ مملکت کو اختیار ہونا چاہیے کہ وہ مرکزی پارلیمنٹ کے منظور کردہ کسی قانون کی منظوری دے یا ایوان سے یہ کہے کہ وہ اس پر دوبارہ غور کرے۔ سربراہ مملکت کو ہنگامی حالت نافذ کرنے اور آئین کو جزوی یا کلی طور پر معطل کرنے کا اختیار ہونا چاہیے۔ آئین میں کوئی ایسی دفعہ شامل نہیں ہونی چاہیے جس کے مطابق سربراہ مملکت، صوبوں کے سربراہوں، مرکزی یا صوبائی وزراء اور مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے ارکان کو ماخوذ کیا جاسکے۔

6۔ مرکزی پارلیمنٹ کو حق حاصل ہے کہ جس صورت میں کہ اس کے ہر ایوان کے ارکان کی اکثریت سربراہ مملکت کی برطرفی کا مطالبہ کرے۔ اور اس کے دونوں ایوانوں کے مشترک اجلاس میں ارکان کی مجموعی تعداد کی دو تہائی اکثریت سے اس مفہوم کی

قرارداد منظور ہو جائے تو اس صورت میں سربراہ مملکت کو برطرف کر دے لیکن یہ فیصلہ محض مشترک اجلاس میں شامل شدہ ارکان کی دو تہائی اکثریت کا فیصلہ نہیں ہونا چاہیے۔ سربراہ مملکت کو برطرف کرنے کے لئے ایک مہینے کا نوٹس دینا ضروری ہوگا۔

7۔ ایک مرکزی پارلیمنٹ قائم کی جائے جو حسب ذیل دو ایوانوں پر مشتمل ہو:

(1) ہاؤس آف یونٹس جو یونٹوں کی مجالس قانون ساز کی نمائندگی کے فرائض سرانجام دے۔

(2) ہاؤس آف پیپلز (جسے عوام منتخب کریں)

8۔ ایوان اعلیٰ (ہاؤس آف یونٹس) میں تمام موجودہ صوبوں، جس میں بلوچستان بھی شامل ہے، کی مساوی نمائندگی ہونی چاہیے۔

9۔ مرکزی انتظام سے تعلق رکھنے والے علاقوں کو ہاؤس آف پیپلز (ایوان زیریں) میں دوسرے صوبوں کی بنیاد کے مطابق نمائندگی ملنی چاہیے۔

10۔ دو ایوانوں کے مشترک اجلاس کو طلب کرنے کا اختیار سربراہ مملکت کو ہونا چاہیے۔ مشترک اجلاس حسب ذیل صورتوں میں منعقد ہونا چاہیے۔

(الف) جب دونوں ایوانوں میں کسی وجہ سے اختلاف پیدا ہو جائے۔

(ب) سربراہ مملکت کے انتخاب یا اس کی برطرفی کا معاملہ

(ج) بجٹ اور دوسرے مالی بلوں پر غور

(د) کابینہ پر عدم اعتماد کی تحریک پر غور

11۔ مرکزی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے اختیارات مساوی ہونے چاہئیں۔ اگر کسی مسئلہ پر دونوں میں جھگڑا شروع ہو جائے تو اس صورت میں دونوں ایوانوں کا مشترکہ اجلاس طلب کیا جائے تاکہ کوئی مناسب فیصلہ کیا جا سکے۔

12۔ صوبوں کے صدروں کے اختیارات اپنے اپنے صوبوں میں سربراہ مملکت کے اختیارات کے تقریباً مماثل ہوں گے اور وہ سربراہ مملکت کی منشا تک اپنے عہدے پر فائز رہیں گے۔ اگر صوبائی اسمبلی صوبائی وزارء کو برطرف کرے تو اس اختیار کو کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جانا چاہیے۔

(13) مرکزی امور میں دفاع، تعلقات خارجہ، رسل و رسائل کے علاوہ صنعتی ترقی، معدنی وسائل، زکوٰۃ، سینما ٹوگراف فلموں کی نمائش کی تجارت اور ملک کے کسی حصے میں ہنگامی صورتحال پیدا ہونے پر ضروری اقدام اٹھانے کے اختیارات شامل ہونے چاہئیں۔ مرکزی پارلیمنٹ صوبائی اسمبلی کی درخواست پر صوبے کے لئے قانون وضع کر سکے گی۔ اگر صوبائی قانون اور مرکزی قانون متصادم ہو جائیں تو مرکزی قانون کو ترجیح دی جائے گی۔

(14) ہر صوبہ کی اسمبلی یک ایوانی ہوگی اور عاملہ کے اختیارات صوبہ کے صدر کو حاصل ہوں گے۔

(15) اردو زبان مملکت کی سرکاری زبان ہوگی

وزیراعظم لیاقت علی خان نے 28 ستمبر 1950ء کو ہی دستور ساز اسمبلی میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی اس رپورٹ کے علاوہ بنیادی حقوق سے متعلقہ عبوری رپورٹ بھی پیش کی۔ بنیادی حقوق کی یہ کمیٹی قائداعظم محمد علی جناح کی 11 اگست 1947ء کی دستور ساز اسمبلی میں مشہور و معروف تقریر کے اگلے دن 12 اگست 1947ء کو مقرر کی گئی تھی۔ تقریباً تین سال کے بعد اس کمیٹی نے جو عبوری رپورٹ پیش کی اس میں کہا گیا تھا کہ:

(1) تمام شہری قانون کی نظر میں یکساں ہیں۔

(2) ہر شخص کو قانون کا مساوی تحفظ حاصل ہوگا

(3) کسی شخص کو بھی اس کی زندگی یا آزادی سے محروم نہیں کیا جائے گا لیکن متعلقہ قانون کے تحت ایسا ہو سکے گا۔

(4) کسی شخص سے مذہب، نسل، ذات، جنس یا جائے پیدائش کی بنا پر امتیازی سلوک نہیں ہو گا۔

(5) ہر شخص کو ہائی کورٹ میں حبس بے جا کی درخواست دائر کرنے کا حق حاصل ہوگا بشرطیکہ سنگین ہنگامی حالات نہ ہوں۔

(6) غلام داری یا جبراً مزدوری کرانے کی ممانعت ہوگی۔

(7) کسی شخص کو اذیت نہیں پہنچائی جائے گی یا اس سے ظالمانہ اور انسانیت سوز سلوک نہیں ہوگا۔

(8) ہر شخص کو تقریر، اظہار خیال، انجمن سازی، پر امن احتجاج، کوئی پیشہ، تجارت یا کاروبار شروع کرنے اور جائیداد کی خرید وفروخت کی آزادی ہوگی۔

(9) ہر شخص کو آزادی ضمیر حاصل ہوگی اور اسے اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے کی اجازت ہوگی بشرطیکہ اس کا یہ فعل امن عامہ اور اخلاق کے منافی نہ ہو۔ تاہم حکومت کو لادینی نوعیت کی سرگرمیوں پر پابندی عائد کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔

(10) تعلیمی اداروں میں کسی طالب علم کو اس کے اپنے مذہب کے سوا کسی دوسرے مذہب کی تعلیم حاصل کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔

(11) چھوت چھات کی قانونی طور پر ممانعت ہوگی۔

اس کمیٹی کے ایک ہندو رکن پروفیسر راجکمار چکرورتی نے اس رپورٹ کے بعض حصوں سے اختلاف کر کے اپنا ایک الگ نوٹ لکھا جس میں یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ حکومت کو یہ اختیار نہیں ہونا چاہیے کہ وہ امتناعی نظر بندی کے قانون کے تحت کسی شخص کو غیر معینہ عرصے کے لئے آزادی سے محروم کر دے۔ اس سلسلے میں حکومت کے لئے یہ لازمی قرار دینا چاہیے کہ اگر وہ کسی شخص کو تین ماہ سے زیادہ عرصے کے لئے نظر بند رکھنا ضروری خیال کرے تو اس کا کیس ایک مشاورتی بورڈ کے روبرو پیش کیا جائے۔ کسی شخص کے ہائی کورٹ میں حبس بے جا کی درخواست دائر کرنے کے حق میں سنگین ہنگامی حالات کی مبہم شرط عائد نہیں ہونی چاہیے بلکہ اس کی بجائے بغاوت یا بیرونی بغاوت یا بیرونی حملے کی غیر مبہم شرط ہونی چاہیے۔

مجوزہ غیر جمہوری و غیر وفاقی آئین کے خلاف مشرقی بنگال کے مسلم لیگ سمیت تمام سیاسی، تجارتی، تعلیمی اور عوامی حلقوں کا شدید رد عمل اور یوم احتجاج

مشرقی بنگال میں بنیادی حقوق کی کمیٹی کی اس رپورٹ کا کوئی خاص نوٹس نہ لیا گیا البتہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ پر اس قدر احتجاجی شور مچا کہ کراچی کے ایوان اقتدار کی دیواریں ہل گئیں۔ 29 ستمبر 1950ء کو ڈھاکہ کے اخبارات میں اس رپورٹ کا مکمل متن شائع ہوا تو صوبہ مسلم لیگ کے صدر مولانا اکرم خان کے اخبار روزنامہ آزاد سمیت سارے اخبارات نے اس پر

شدید نکتہ چینی کی۔ پاکستان آبزرور کا تبصرہ یہ تھا کہ ''چونکہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کے 29 ارکان میں مشرقی بنگال کے مسلمانوں کے صرف دو غیر سرکاری نمائندے شامل ہیں اس لئے اس کمیٹی سے ایک ایسی ہی رپورٹ کی توقع کی جاسکتی تھی جس میں اس صوبہ کو ایک میونسپلٹی کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ چونکہ سربراہ مملکت جسے مرکزی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں منتخب کیا جائے گا، وزیر اعظم کا نامزد کردہ ہوگا اور چونکہ سربراہ مملکت کو صوبہ کی قانون ساز اسمبلی اور عاملہ پر بہت کنٹرول حاصل ہوگا لہٰذا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مرکزی حکومت صوبہ کو اپنے چنگل میں پھنسائے رکھے گی۔ سربراہ مملکت کے برعکس صوبہ کے گورنر عارضی ثابت نہیں ہوں گے بلکہ اس کا تقرر مرکزی حکومت کرے گی اور صوبائی حکومت کو اتنے اختیارات حاصل نہیں ہوں گے جتنے کہ 1935ء کے ایکٹ میں دے دیئے گئے تھے۔''[9]

اسی دن مشرقی بنگال چیمبر آف کامرس کے ترجمان کا اس رپورٹ پر تبصرہ یہ تھا کہ مرکز کے راج کی ''برکتوں'' سے مشرقی بنگالیوں کو روز بروز تجارت کے شعبہ سے باہر نکالا جارہا ہے اور اب وہ وقت دور نہیں جب مشرقی بنگالی اپنے وطن میں ہی غیر ملکی بن جائیں گے۔ یکم اکتوبر کو پاکستان آبزرور نے اس مسئلہ پر پھر ایک اداریہ لکھا جس میں یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ ''جس کسی نے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ لکھی ہے وہ جمہوریت کا مطلب ہی نہیں سمجھتا یا وہ جمہوریت کا قائل ہی نہیں ہے۔ ذرا رپورٹ کی اس دفعہ کو بھی دیکھئے کہ سربراہ مملکت، ہنگامی حالات نافذ کر کے آئین کو جزوی یا کلی طور پر معطل کر سکتا ہے اور یہ کہ ہنگامی حالات میں صدر اور اس کے وزراء کے اقدامات کو عدالت میں چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔ اب فرض کیجئے کہ برسر اقتدار پارٹی کا کوئی اخلاق باختہ سربراہ اعلان کر دیتا ہے کہ ملک میں ہنگامی حالات ہیں اور وہ آئین کو معطل کر کے براہ راست اپنی شخصی حکومت قائم کر لیتا ہے تو اس کا یہ اقدام قانون کے عین مطابق ہوگا اگرچہ وہ ہماری بڑی مشکل سے حاصل کردہ آزادی کو قتل کر دے۔''

صوبہ مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری شاہ عزیز الرحمان، حمید الحق چودھری کے دھڑے کا آدمی نہیں تھا لیکن اس کے باوجود اسے پاکستان آبزرور کی اس رائے سے اتفاق تھا کہ ''بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی اس رپورٹ کے پس پردہ نظریہ یہ ہے کہ وفاق کی آڑ میں ایک خالص آمریت قائم کی جائے جس کے تحت بذریعہ دہشت کروڑوں لوگوں کو فرمانبرداری پر مجبور کیا جائے گا۔ جس

چیز نے ہم سب کو سب سے زیادہ حیران وششدر کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ صوبہ مشرقی بنگال کی آبادی اتنی زیادہ ہے تاہم اس کی پوزیشن کو میونسپلٹی کے درجہ تک گھٹا دیا گیا ہے اور اس حقیقت کو بحقارت نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ مشرقی بنگال میں بے پناہ ذرائع ہیں، یہ مالدار ہے، یہ طاقتور ہے اور اس کا رقبہ اتنا زیادہ ہے کہ اگر اس رپورٹ کے مطابق آئین نافذ ہوا تو اس کا ناگزیر نتیجہ یہ نکلے گا کہ ملک میں ایسی بدامنی اور لاقانونیت پھیل جائے گی جس پر حکومت کنٹرول نہیں کر سکے گی۔ اگر مشرقی بنگال کو خود مختاری نہ دی گئی تو یہاں کوئی صنعتی اور معاشی ترقی نہیں ہو سکے گی اور نہ ہی یہاں کوئی بیرونی جارحیت کا مقابلہ کر سکے گا۔"[10]

3/ اکتوبر 1950ء کو ڈھاکہ میں مختلف مکاتب فکر کے ممتاز شہریوں کا اجلاس ہوا جس میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اس رپورٹ میں تشکیل کردہ غیر جمہوری اور فسطائی اصولوں پر سخت برہمی کا اظہار کیا گیا اور پھر اس قسم کے آئین کے خلاف مہم چلانے کے لئے مجلس عمل قائم کی گئی۔ اجلاس میں کمیٹی کے ان بنگالی ارکان کی مذمت کی گئی جنہوں نے اس قسم کی غیر جمہوری سفارشات سے اختلاف کا اظہار نہ کر کے عوام کے حقوق کو فروخت کر ڈالا ہے اور ان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ دستور ساز اسمبلی سے مستعفی ہو جائیں۔ اجلاس میں عطا الرحمان خان، سخاوت حسین، عبدالسلام (کنوینر)، قمر الدین احمد اور محمد ادریس پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کی گئی جو "قرارداد لاہور کو پیش نظر رکھ کر ان اصولوں کی تشکیل کرے گی جن کی بنیاد پر آئین مرتب ہونا چاہیے۔" مجوزہ غیر جمہوری آئین کے خلاف مہم چلانے کے لئے جو 17 رکنی مجلس عمل مقرر کی گئی وہ عبدالرحمان خان، عبدالسلام، قمر الدین احمد (کنوینر)، سخاوت حسین، محی الدین احمد، پروفیسر عبدالقاسم، یوسف حسین، محمد زین العابدین، چودھری علی احمد، ظہور حسین چودھری، مرزا غلام حافظ، قاضی محمد ادریس، کے۔ ایم۔ عباس، سید عبدالرحمان، تفضّل حسین، ایم۔ اے۔ ودود اور رفیق الحسین پر مشتمل تھی۔"[11] اسی دن صوبائی اسمبلی میں حزب اختلاف کے پانچ ارکان اسمبلی خیرات حسین، بیگم انورا خاتون، چودھری شمس الدین، عثمان علی اور علی احمد نے ایک مشترکہ بیان میں یہ رائے ظاہر کی کہ "اگر بنیادی اصولوں کی کمیٹی کے ان اصولوں کو ایک مرتبہ تسلیم کیا گیا تو موجودہ حکمرانوں کو قانونی ذرائع سے ہٹانا ناممکن ہو جائے گا۔ ہمارے کوتاہ اندیش وزیروں نے اقتدار پر اپنی اجارہ داری قائم رکھنے کے لئے فوجی انقلاب کے امکانات پیدا کر دیئے ہیں۔ کچھ

عرصے کے بعد لوٹ کے مال کی تقسیم کے سوال پر ان کے درمیان لازمی طور پر جھگڑا ہوگا اور اس بنا پر پاکستان چلی یا شام بن جائے گا جہاں ہر چھ ماہ کے بعد کوئی نہ کوئی جرنیل یا سیاسی لیڈر کچھ مسلح لوگوں کو ساتھ ملا کر قصر صدارت کا گھیراؤ کر لیتا ہے اور پھر بزور شمشیر ملک کا کنٹرول سنبھال لیتا ہے یا پھر جو ٹولہ برسر اقتدار ہوتا ہے وہ اپنے مخالفین کو نیست و نابود کرنے کے لئے سٹین گن کا استعمال کرتا ہے۔" 12

4/اکتوبر کو حمید الحق چودھری نے ایک بیان میں کہا کہ "بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ میں وفاق کے نظریے کی نفی کی گئی ہے اور وحدانی نظام حکومت کے لئے راستہ ہموار کیا گیا ہے لیکن جن لوگوں نے یہ رپورٹ لکھی ہے انہوں نے اس حقیقت کو نظر انداز کیا ہے کہ کراچی اور مشرقی بنگال کے درمیان سمندری فاصلہ 2500 میل کا ہے مجوزہ آئین کے تحت صوبائی کابینہ کو جو حیثیت دی گئی ہے وہ دفعہ 92 الف کے تحت گورنر راج سے مختلف نہیں ہے۔ آئندہ یہ صوبائی وزراء بیک وقت دو آقاؤں کے خدمت گزار ہوں گے لیکن وہ اپنے ذاتی مفادات کی خاطر صوبائی مقننہ کی بجائے مرکزی حکومت کے فرمانبردار ہوں گے کیونکہ ان کا تقرر مرکز کی جانب سے ہی ہوگا۔" اور اسی دن مشرقی بنگال مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے رکن فقیر عبدالمنان ایم ایل اے نے ایک بیان میں یہ رائے ظاہر کی کہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے دو مقاصد کے تحت یہ رپورٹ لکھی ہے۔ اول یہ کہ پاکستان کو ایک مطلق العنان مملکت بنایا جائے جس میں سارے اختیارات صدر اور وزیر اعظم کو حاصل ہوں گے۔ اور دوئم یہ کہ ملک میں اکثریت کی بجائے اقلیت کی حکومت قائم ہوگی۔ مجوزہ دو ایوانی پارلیمنٹ میں مشرقی بنگال کے نمائندے اقلیت میں ہوں گے حالانکہ وہ ملک میں آبادی کی اکثریت کے منتخب کردہ ہوں گے۔ 5/اکتوبر کو ایسٹ پاکستان مسلم سٹوڈنٹس لیگ نے ایک بیان میں کہا کہ مجوزہ آئین قرارداد لاہور اور جمہوری اصولوں کے منافی ہے کیونکہ اس کے تحت سارے اختیارات ایک شخص کی ذات میں مرتکز کر دیئے گئے ہیں۔

6/اکتوبر کو پاکستان دستور ساز اسمبلی نے بنیادی حقوق کی کمیٹی کی رپورٹ منظور کر لی تو مشرقی بنگال میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ کے خلاف عوامی برہمی میں اور بھی اضافہ ہو گیا کیونکہ اس بنا پر یہ خدشہ ہو گیا تھا کہ دستور ساز اسمبلی مجوزہ غیر جمہوری آئین کو بعجلت منظور کر کے اسے بہ نوک شمشیر ملک پر مسلط کر دے گی اور اس طرح پاکستان میں وزیر اعظم لیاقت علی خان کی

شخصی آمریت قائم ہو جائے گی۔ اس عوامی ہیجان میں 7/ اکتوبر کو بھی کوئی کمی نہ ہوئی حالانکہ اس دن کراچی سے یہ خبر آئی تھی کہ مرکزی پارلیمنٹ کی مسلم لیگ پارٹی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ پر موجودہ سیشن میں غور وخوض نہیں ہوگا بلکہ یہ رپورٹ نومبر میں زیر بحث آئے گی۔ پارٹی کے اس فیصلے کی وجہ یہ تھی کہ مختلف ارکان اسمبلی نے رپورٹ میں 700 ترمیمیں پیش کی تھیں اور 14/ اکتوبر تک جبکہ موجودہ سیشن ختم ہونے والا تھا ان ترمیموں پر بحث مکمل کرنا ممکن نہیں تھا۔ مزید برآں مرکزی وزیر قانون جوگندر ناتھ منڈل چند دن قبل بھاگ کر کلکتہ چلا گیا تھا اور مرکزی حکومت کو اسی دن اس کا استعفیٰ موصول ہوا تھا۔ دو دن بعد 9/ اکتوبر کو مشرقی بنگال کے سیاسی ہیجان نے اور بھی زور پکڑ لیا جبکہ پاکستان مسلم لیگ کی کونسل نے چودھری خلیق الزماں کی جگہ وزیر اعظم لیاقت علی خان کو متفقہ طور پر اپنا صدر منتخب کر کے یہ تاثر پختہ تر کر دیا کہ لیاقت علی خان واقعی پاکستان میں اپنی شخصی آمریت قائم کرنے کا عزم رکھتا ہے۔

10/ اکتوبر کو جب پاکستان آبزرور کے پہلے صفحے پر ڈھاکہ کے 26 ممتاز شہریوں کی جانب سے مشرقی بنگال کے عوام کے نام یہ اپیل شائع ہوئی کہ وہ مجوزہ آئین کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر دیں تو یہ ظاہر ہو گیا کہ نومبر میں بھی اس آئین کو منظور کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان دنوں پنجاب میں بھی بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ کی سخت مخالفت ہو رہی تھی۔ اس مخالفت کی بنیاد یہ نہیں تھی کہ مجوزہ آئین میں مشرقی پاکستان کو اس کی مخصوص جغرافیائی پوزیشن کے باوجود اسے مطلوبہ علاقائی خودمختاری سے محروم رکھا گیا تھا بلکہ اس کی بنیاد یہ تھی کہ پنجاب میں عام انتخابات ہونے والے تھے اور انتخابی مہم کے دوران اس صوبہ کا عوامی مسلم لیگ سے منسلکہ درمیانہ طبقہ ہر بہانے سے لیاقت علی خان اور اس کی مسلم لیگ کی مخالفت ضروری سمجھتا تھا۔ اس کا سب سے بڑا مخالفانہ نعرہ یہ تھا کہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی سفارشات کا اسلام یا اسلام کے اصولوں سے کوئی واسطہ نہیں اور یہ قرآن حکیم پر مبنی نہیں ہیں۔ پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے برعکس مشرقی بنگال کے درمیانہ طبقہ کی جانب سے مجوزہ آئین کی جن وجوہ کی بنا پر مخالفت کی جا رہی تھی ان میں مذہب کا کوئی عنصر شامل نہیں تھا۔ ان کی مخالفت کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ آئینی تجاویز غیر جمہوری ہیں اور ان میں نہ صرف مشرقی بنگال کو میونسپلٹی کا درجہ دے دیا گیا ہے بلکہ اس امر کا بھی انتظام کیا گیا ہے کہ مرکزی حکومت کے نظام میں بھی مشرقی بنگالیوں کو کوئی مؤثر کردار

حاصل نہ ہونے پائے۔ چنانچہ پاکستان آبزرور میں شائع شدہ متذکرہ اپیل میں یہ مطالبات کیئے گئے تھے کہ:

1۔ پاکستان میں جمہوری وفاقی نظام رائج ہونا چاہیے اور اس کے آئین میں آمریت کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے۔

2۔ وفاقی ریاستوں کو دفاع، امور خارجہ اور کرنسی کے سوا باقی سارے امور پر مکمل طور پر خودمختار ہونا چاہیے۔ مشرقی بنگال کو ایک صوبہ تصور نہیں کرنا چاہیے بلکہ اسے پاکستان کے دو زونوں میں سے ایک زون سمجھنا چاہیے۔

3۔ ہاؤس آف یونٹس اور ہاؤس آف پیپلز کی تشکیل اس طرح ہونی چاہیے کہ مشرقی بنگال کی اکثریت گھٹ کر اقلیت نہ بن جائے۔

4۔ کسی فرد یا افراد کے کسی گروہ کو آئین معطل کرنے کا اختیار نہیں ہونا چاہیے۔

5۔ صوبائی حکومت کے کام میں مرکزی حکومت کی جانب سے کوئی مداخلت نہیں ہونی چاہیے۔

6۔ سربراہ مملکت اور سربراہ صوبہ کے انتخاب کا حق عوام الناس کو ملنا چاہیے۔

اس اپیل پر دستخط کرنے والوں میں خواجہ حبیب اللہ نواب بہادر آف ڈھاکہ، سید صاحب عالم صدر سٹی مسلم لیگ ڈھاکہ، شاہ عزیز الرحمان قائم مقام سیکرٹری صوبہ مسلم لیگ، مولانا اکرم خان کے اخبار آزاد کے ایڈیٹر اے۔ کے۔ شمس الدین، ایم ایل اے کے نام بھی شامل تھے۔

ان مطالبات میں ان جذبات و احساسات کی لہر دوڑی ہوئی تھی جو گزشتہ تین سال میں مشرقی بنگال کے درمیانہ طبقہ میں بنگالیوں کے حقوق و مفادات کے بارے میں پیدا ہو گئے تھے۔ لیکن ان میں اس شدید غم وغصہ کا پوری طرح اظہار نہیں ہوا تھا جو کہ مجوزہ آئین کے خلاف وہاں کے تعلیم یافتہ حلقوں میں پیدا ہو گیا تھا۔ اس غم وغصہ کی انتہا کیا تھی اس کا کچھ اندازہ ان ''آئینی تجاویز'' سے ہوا جو کشور گنج کی ایک لڑکی مس ایس۔ این۔ رقیہ بیگم نے 11 ر اکتوبر کو پاکستان آبزرور میں چھپوائیں۔ رقیہ بیگم کی آئینی سفارشات کا خاکہ یہ تھا کہ:

1۔ سربراہ مملکت، اس کی بیگمات اور اس کی اولاد کو منزہ عن الخطا اور مملکت کے سارے قوانین سے بالاتر قرار دے دیا جائے۔ سربراہ مملکت اور اس کے اہل وعیال کے

محلات، تفریح گاہیں اور حرم خانوں کو قومی محفوظات بنا دیا جائے۔

2۔ سر براہ مملکت، اس کی اولاد اور دوسرے رشتہ داروں کو، جو آئندہ کبھی سر براہ مملکت یا وزیر اعظم یا کوئی عہدیدار بننے کے متمنی ہوں، یہ اختیار دیا جائے کہ وہ مملکت کی سلامتی کی خاطر اپنے مبینہ یا فرضی مخالفین کو موت کے گھاٹ اتار دیں۔

3۔ سر براہ مملکت انتظامیہ، قانون سازی اور عدلیہ کے طبقوں میں اعلیٰ ترین فرمانروا ہوگا۔ مملکت کا انتظام غلام داری نظام کے تحت چلایا جائے گا۔ سارے اعلیٰ سول وفوجی حکام سر براہ مملکت کے غلام ہوں گے اور اسے یہ اختیار ہوگا کہ وہ جب چاہے ان میں سے کسی کا بھی سر قلم کر دے۔

4۔ پاکستان میں کسی بھی شخص کو حق رائے دہندگی کا حامل شہری نہیں سمجھا جائے گا بجز اس کے کہ:

(الف) وہ اس علاقے کا رہنے والا ہو جسے عام طور پر مغربی پاکستان کہا جاتا ہے۔

(ب) وہ اردو زبان جانتا ہو۔

(ج) وہ خاصی جائیداد کا مالک ہو۔

(د) وہ سرکاری پنشنر ہو یا سر براہ مملکت کی جانب سے عطا کردہ تمغات کا حامل ہو۔

(ر) وہ ان لوگوں کی اولاد ہو جو متذکرہ اہلیت کے مطابق پاکستان کے شہری ہوں یا ماضی میں شہری رہ چکے ہوں۔

5۔ پاکستان کے زیر حفاظت علاقوں، طفیلی علاقوں یا دوسرے ملکیتی علاقوں، جن میں آج کل صرف وہ علاقہ شامل ہے جسے مشرقی بنگال کا صوبہ کہتے ہیں، کے کسی شخص کو پاکستان کا شہری بننے یا ووٹ دینے یا قانون سازی، عدلیہ اور انتظامیہ کے امور میں کوئی رائے دینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہوگا بجز اس کے کہ وہ کسی آقا کے خاندان میں شامل ہو جائے اور اس آقا کی فرمانبرداری، تعظیم اور وفاداری کو اپنا فرض سمجھے۔

6۔ جن افراد کا اس طریقے سے اندراج نہیں ہوگا انہیں کوئی سول، پولیٹیکل یا دوسرے حقوق حاصل نہیں ہوں گے اور وہ پاکستان کے شہریوں کی نجی ملکیت ہوں گے اور مالک کو ان کی زندگی اور موت کا فیصلہ کرنے کا پورا اختیار ہوگا۔"[12]

رقیہ بیگم کا یہ مراسلہ کراچی اور پنجاب کے حکمران طبقوں کے لئے تشویش کا باعث ہونا چاہیے تھا کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ صرف تین سال کے عرصے میں مشرقی بنگال کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ میں احساس محرومیت اتنا شدید ہو گیا تھا کہ اس احساس میں علیحدگی پسندی یا بغاوت یا قومی جدوجہد آزادی کی علامتیں نظر آنے لگی تھیں۔ اس سے پہلے بھی پاکستان آبزرور اور دوسرے مقامی اخبارات میں بہت سے خطوط چھپتے رہے تھے جن میں غیر بنگالی بیوروکریسی سے استدعائیں کی گئی تھیں کہ وہ بنگالی عوام سے بدسلوکی کر کے ملک کی سالمیت کو نقصان نہ پہنچائیں۔ مگر کراچی اور لاہور کے فرعونوں میں سے کسی کے کان میں خطرے کی گھنٹی نہ بجی۔ مغربی پاکستان کے یہ مفاد پرست عناصر مشرقی بنگالیوں کو عملی طور پر واقعی اپنا طفیلی یا موالی یا غلام تصور کرتے تھے۔

مشرقی بنگال میں مجوزہ آئین کی مخالفت کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ پاکستان آبزرور نے 3/ اکتوبر سے اپنے دو کالم اس مسئلہ پر عوام کی رائے کے اظہار کے لئے وقف کر دیئے تھے۔ اور ہر روز یہ دونوں کالم اساتذہ، طلبا، وکلا اور دوسرے تعلیم یافتہ لوگوں کے تنقیدی خطوط سے بھرے ہوئے ہوتے تھے۔ اخبار کا بیشتر بقیہ حصہ مشرقی بنگال کے مختلف شہروں اور قصبوں میں احتجاجی جلسوں، رپورٹوں اور سیاسی لیڈروں کے بیانات سے بھرپور ہوتا تھا۔ تاہم 14/ اکتوبر کو کراچی کے ارباب اقتدار نے دستور ساز اسمبلی کے ان ارکان سے، جو مشرقی بنگال سے منتخب ہوئے تھے، ایک مشترکہ بیان دلوایا جس میں مشرقی بنگال کے بعض حلقوں کے ان خدشات کو بے بنیاد قرار دیا گیا تھا کہ مرکزی پارلیمنٹ میں مشرقی بنگال کی اکثریت کو اقلیت بنا دیا گیا ہے اور صوبائی حکومت کے اختیارات کو انتہائی محدود کر دیا گیا ہے۔ اس بیان پر اے۔ کے۔ فضل الحق، مولانا اکرم خان، فضل الرحمان، خواجہ شہاب الدین، نور الامین، ڈاکٹر محمود حسین، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، مولانا محمد عبداللہ الباقی، مفیض الدین احمد، ابوالقاسم خان، عبداللہ المحمود، عبدالمنعم خان، اسداللہ، عبدالحمید، اے۔ ایم۔ اے۔ حمید، سید اے۔ بی۔ محمد حسین، شہود الحق، عزیز الدین احمد، نور احمد، غیاث الدین پٹھان، معظم حسین، سراج الاسلام، ابراہیم خان اور مرتضیٰ چودھری کے دستخط تھے۔ ان دستخط کنندگان میں مولوی فضل الحق کے نام کی وجہ یہ تھی کہ مولوی فضل الحق اور حسین شہید سہروردی میں پرانی سیاسی رقابت تھی۔ حکومت نے اس سے فائدہ اٹھا کر مولوی کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور اس کے عوض اسے مشرقی بنگال میں ایڈووکیٹ جنرل کے عہدے کی پیشکش کی

تھی۔ اگرچہ مولوی فضل الحق کی سیاسی زندگی اس قسم کی قلابازیوں سے بھری پڑی تھی تاہم اس نے اپنی اس قلابازی کی بہت ہی تھوڑی قیمت وصول کی تھی۔ غالباً اس کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ مولانا بھاشانی کسان لیڈر کی حیثیت سے مولوی فضل الحق کو بہت پیچھے چھوڑ گیا تھا اور اب غریب کسانوں میں فضل الحق کا سکہ نہیں چلتا تھا۔ اس بیان پر دستخط کرنے والوں میں وزیراعظم لیاقت علی خان، وزیرخزانہ غلام محمد اور وزیر مواصلات سردار عبدالرب نشتر کے نام شامل نہیں تھے حالانکہ یہ تینوں بھی مشرقی بنگال ہی سے منتخب شدہ تھے۔

مرکزی حکومت کے پٹھوؤں کے اس بیان کو ڈھاکہ کے اخبارات میں کوئی خاص اہمیت نہ دی گئی البتہ اسی دن ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبا کی اس قرارداد کو نمایاں طور پر شائع کیا گیا کہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ کے خلاف پورے صوبہ میں یوم احتجاج منایا جائے گا۔ مجلس نے یہ قرارداد سنٹرل کمیٹی آف ایکشن فار ڈیموکریٹک کنفیڈریشن کے زیر اہتمام ایک جلسہ میں منظور کی تھی۔ اس قرارداد میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ کو غیر جمہوری اور مکمل طور پر ناقابل قبول قرار دیا گیا تھا کیونکہ اس میں قرارداد لاہور کے علاقائی خودمختاری کے تصور کی دانستہ طور پر خلاف ورزی کی گئی تھی۔ طلبا کی ایک قرارداد میں دستور ساز اسمبلی میں مشرقی بنگال کی نمائندگی کرنے والے ارکان پر عدم اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے ان سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ اگر دستور ساز اسمبلی میں یہ مجوزہ آئین منظور کروانے کی کوشش کی جائے تو وہ اسمبلی کے اس سیشن کا بائیکاٹ کریں۔ اسی دن ڈھاکہ کے اخبارت میں مقامی بار ایسوسی ایشن کی ایک احتجاجی قرارداد کی بھی بہت تشہیر ہوئی، جس میں یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی سفارشات غیر جمہوری اور فسطائی اصولوں پر مبنی ہیں۔ 17/ اکتوبر کو آبزرور کے بعض مراسلہ نگاروں نے یہ مطالبہ کیا کہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ کو مشرقی بنگال کی ساری مساجد میں جلایا جائے۔ اس دن دوسری جگہوں پر بھی اس رپورٹ کو نذر آتش کیا جائے۔ روزہ رکھا جائے اور پورے مشرقی بنگال میں مکمل ہڑتال کی جائے۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود مشرقی بنگال کے مسلم عوام اس وقت تک کلکتہ کے مارواڑیوں کو مغربی پاکستان کے استحصالیوں پر ترجیح دینے کو تیار نہیں تھے۔ گویا اس وقت تک قومی تضاد کے مقابلے میں داخلی علاقائی تضاد کی حیثیت ثانوی تھی۔ پاکستان آبزرور نے اسی وجہ سے

اپنے اداریے میں کلکتہ کے اخبارات کو متنبہ کیا تھا کہ وہ ''مشرقی بنگال کے مسلمانوں کے لئے مگرمچھ کے آنسو نہ بہائیں اور یہ خواب نہ دیکھیں کہ بالآخر پاکستان کی سالمیت خطرے میں پڑ جائے۔'' اداریے میں کہا گیا تھا کہ ''ہم سرحد کے اس پار کے دوستوں کو بہترین الفاظ میں بتا دینا چاہتے ہیں کہ ہم اپنے داخلی اختلافات کی بنا پر یہ بات نہیں بھول سکتے کہ چند ماہ قبل ہمارے یہی ''دوست'' مشرقی بنگال پر حملے کا زور شور سے مطالبہ کر رہے تھے۔[14]

اگرچہ مشرقی بنگال کے مسلم طلبا کو آبزرور کے اس موقف سے اتفاق تھا اور انہوں نے 13/اکتوبر کو جو قرارداد منظور کی تھی اس میں صرف علاقائی خودمختاری کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ تاہم 20/اکتوبر کو ان کی سنٹرل کمیٹی آف ایکشن فار ڈیموکریٹک کنفیڈریشن نے اعلان کیا کہ 4 اور 5/نومبر کو مشرقی بنگال کے سارے طبقوں کے لوگوں کا ایک آئینی کونشن منعقد ہو گا اور پھر 12/نومبر کو یوم احتجاج منایا جائے گا۔ 22/اکتوبر کو طلبا کی اس سنٹرل کمیٹی آف ایکشن کے اجلاس میں روزنامہ مارننگ نیوز کی مذمت کی گئی کیونکہ اس اخبار نے اپنے 18 اور 19/اکتوبر کے اداریوں میں مجوزہ آئین کی مخالفت کرنے والوں کو تخریب پسند اور غدار قرار دیا تھا۔ مزید برآں یہ اخبار مشرقی بنگال کے ان ضمیر فروشوں کے بیانات کو بہت اچھالتا تھا جو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے تھے کہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی سفارشات میں مشرقی بنگال سے کوئی بے انصافی نہیں ہوئی اور یہ کہ وزیراعظم لیاقت علی خان کے ہاتھوں میں مشرقی بنگال کے حقوق ومفادات محفوظ ہیں۔ اس قسم کا ایک بیان 19/اکتوبر کو صدر صوبہ مسلم لیگ مولانا اکرم خان کے نام سے اور 22/اکتوبر کو سٹیٹ بینک آف پاکستان کے ڈائریکٹر وحید الزماں کے نام سے شائع ہوا تھا۔

چونکہ اس قسم کے بیانات مشرقی بنگال کی رائے عامہ کی تضحیک کے مترادف تھے اس لئے ان سے تعلیم یافتہ حلقوں میں بہت اشتعال پھیلتا تھا اور یہ تاثر پختہ تر ہو جاتا تھا کہ لیاقت علی خان کی حکومت آمرانہ آئین نافذ کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے۔ چنانچہ اسی تاثر کے بعد مسلم لیگ کے جائنٹ سیکرٹری شاہ عزیز الرحمان نے 23/اکتوبر کو صوبہ کی تمام ضلعی اور سب ڈویژنل مسلم لیگوں کو ہدایت کی کہ وہ 27/اکتوبر کو یوم احتجاج منائیں اور بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ کی مذمت کے لئے قراردادیں منظور کریں۔ صدر صوبہ مسلم لیگ مولانا اکرم خان نے 24/اکتوبر کو ایک بیان میں شاہ عزیز الرحمان کے اس ہدایت نامہ کا سخت نوٹس لیا اور مسلم لیگیوں کو تنبیہ کی کہ

انہیں اس ہدایت نامے پر عمل کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔ شاہ عزیز الرحمان نے 25/اکتوبر کو اکرم خان کے اس بیان پر نکتہ چینی کی اور کہا کہ اگر مسلم لیگیوں کو بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرنے کا حق حاصل نہیں تو پھر یہ رپورٹ شائع کیوں کی گئی ہے۔ مجوزہ آئین کو رائے عامہ کو کلیتہً نظر انداز کر کے ویسے ہی نافذ کر دینا چاہیے تھا۔ شاہ عزیز الرحمان کا یہ بیان مؤثر ثابت ہوا اور اس کی ہدایت کے مطابق 27/اکتوبر کو پورے مشرقی بنگال میں یوم احتجاج منایا گیا جس میں کمیونسٹ پارٹی نے بھی بھرپور حصہ لیا۔

طلبا کی ایکشن کمیٹی کی طرف سے 1940ء کی قرارداد لاہور کی بنیاد پر خودمختاری کا مطالبہ

اسی دن طلبا کی کمیٹی آف ایکشن نے اپنی آئینی تجاویز شائع کیں اور یہ اعلان کیا کہ ان تجاویز پر 4 اور 5/نومبر کو نیشنل کنونشن میں غور ہوگا۔ ان تجاویز میں مشرقی بنگال کی علیحدگی کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ البتہ یہ کہا گیا تھا کہ پاکستان میں 1940ء کی قرارداد لاہور کے مطابق مشرقی اور مغربی پاکستان کی دو علاقائی خودمختار حکومتوں پر مشتمل ایک ری پبلیکن طرز کی حکومت قائم ہونی چاہیے جس میں ایک مرکزی پارلیمنٹ ہوگی جس کا انتخاب آبادی کی بنیاد پر کیا جائے گا اور یہ پارلیمنٹ صرف دفاع، تعلقات خارجہ اور کرنسی کے امور نمٹائے گی۔ پاکستان کی مملکت کا نام یونائیٹڈ سٹیٹس آف پاکستان ہوگا۔[15] اس میں مخلوط طریقۂ انتخاب رائج ہوگا اور انتخاب بالغ رائے دہندگی کے اصول کی بنیاد پر ہوگا۔ کمیٹی آف ایکشن کی ان آئینی تجاویز کے ساتھ اس کا یہ فیصلہ بھی شائع کیا گیا کہ آئندہ اس تنظیم کا نام کمیٹی آف ایکشن فار دی ڈیموکریٹک کنفیڈریشن کی بجائے کمیٹی آف ایکشن فار ڈیموکریٹک فیڈریشن ہوگا۔ اس فیصلے کا مطلب یہ تھا کہ اس وقت تک مشرقی بنگال کے طلبا کا ذہنی رجحان ان کی بے شمار شکایتوں کے باوجود مغربی پاکستان کے ساتھ رابطہ منقطع کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ وہ دو خودمختار علاقوں پر مشتمل حقیقی وفاقی نظام حکومت کے خواہاں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ملک کی معیشت سوشلسٹ بنیادوں پر استوار ہو اور وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ری پبلیکن پاکستان میں بنگالی اور اردو دونوں ہی زبانوں کو سرکاری زبانوں کی حیثیت حاصل ہو۔ یہ طلبا مغربی بنگال کے اخبارات کے پاکستان دشمن پروپیگنڈے کے بھی خلاف تھے اور ان کی یہ خواہش نہیں

تھی کہ مغربی بنگال کے کسی حلقے کی طرف سے ان کی تحریک کی تائید وحمایت ہو۔

صوبائی مسلم لیگ مجلس عاملہ کی قرارداد میں مواصلات، تجارت، ترقیات، صنعت اور درآمد و برآمد سمیت شعبوں کی وسیع فہرست کے لئے مکمل خودمختاری کا مطالبہ

اگرچہ طلبا کی مجلس عمل اور دوسرے تعلیم یافتہ حلقوں کا بنیادی اصولوں کی کمیٹی کے مجوزہ آئین کے خلاف یہ واویلا صوبائی اسمبلی کی مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کی اس قرارداد کے عین مطابق تھا جو اس نے 20ر دسمبر 1949ء کو وزیراعلیٰ نورالامین کی زیر صدارت مشرقی بنگال کی خودمختاری کے بارے میں منظور کی تھی اور اگرچہ اب اکتوبر 1950ء میں صدر صوبہ مسلم لیگ مولانا اکرم خان کے موقف کے برعکس شاہ عزیز الرحمان اور متعدد دوسرے ضلعی مسلم لیگی لیڈروں نے مجوزہ آئین کے خلاف عوامی مہم میں زور شور سے حصہ لیا تھا لیکن صوبہ مسلم لیگ نے ابھی تک بحیثیت جماعت اس مسئلہ پر خاموشی اختیار کئے رکھی تھی۔ یہ خاموشی بالآخر زبردست عوامی دباؤ کے تحت 30ر اکتوبر 1950ء کو ٹوٹی جبکہ صوبہ لیگ مجلس عاملہ نے طویل اور گرما گرم بحث وتمحیص کے بعد اس مفہوم کی قرارداد منظور کی کہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی سفارشات میں ایسی ترمیم کی جائے کہ مشرقی بنگال کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری ملے اور اسے مواصلات، تجارت، ترقیات اور صنعت کے امور پر بھی کنٹرول حاصل ہو۔ مجلس عاملہ کی رائے یہ تھی کہ اگرچہ پاکستان کے وفاقی آئین کا نفاذ ضروری ہے لیکن وفاقی ڈھانچے کی تعمیر کرتے ہوئے اس حقیقت پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کہ مشرقی بنگال پاکستان کے دوسرے یونٹوں اور وفاقی دارالحکومت سے الگ تھلگ ہے۔ اس کی جغرافیائی پوزیشن کا تقاضا یہ ہے کہ آئین میں ان امور کی ایک الگ فہرست مرتب کی جائے جو اس علاقے کے زیر انتظام ہونے چاہئیں۔ چونکہ مشرقی بنگال کے ریلوے سسٹم اور دریائی سفر کے نظام کا پاکستان کے دوسرے یونٹوں سے کوئی تعلق نہیں، اس لئے اس علاقے کی مواصلات مرکزی حکومت کی تحویل میں نہ ہو سکتی ہیں اور نہ ہونی چاہئیں۔ یہاں تک کہ اس علاقے کی درآمدی و برآمدی تجارت پر بھی مرکز کا کم از کم کنٹرول ہونا چاہیے۔''[16] مجلس عاملہ کی یہ قرارداد بڑے محتاط الفاظ میں لکھی گئی تھی لیکن اس کے مطلب میں کوئی ابہام نہیں تھا۔ اس کا مطلب وہی تھا جو کہ لیگ

اسمبلی پارٹی کی 20/دسمبر 1949ء کی قرارداد کا تھا یعنی یہ کہ دفاع اور امور خارجہ کے علاوہ تمام شعبوں میں مشرقی بنگال کو خودمختاری ملنی چاہیے۔ مجلس عاملہ نے اپنی اس قرارداد میں تجویز کردہ ترامیم کا مسودہ تیار کرنے کے لئے ایک کمیٹی بھی مقرر کی جو حمید الحق چودھری، نور الامین، ابوالقاسم خان (کنوینر)، خواجہ حبیب اللہ بہادر، غیاث الدین پٹھان، مولانا عبداللہ الباقی اور عزیز الدین احمد پر مشتمل تھی۔

صوبائی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کی یہ قرارداد دراصل دستور ساز اسمبلی کے ان 24 ارکان پر عدم اعتماد کے اظہار کی حیثیت رکھتی تھی جنہوں نے 13/اکتوبر کو ایک مشترکہ بیان میں یہ اعلان کیا تھا کہ مشرقی بنگال میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی سفارشات کے بارے میں جن خدشات کا اظہار کیا جارہا ہے وہ بے بنیاد ہیں۔ ان ارکان میں صدر صوبہ مسلم لیگ مولانا اکرم خان بھی شامل تھا۔ یہ قرارداد خواجہ شہاب الدین، ڈاکٹر محمود حسین اور وحید الزمان جیسے ان جغادری مسلم لیگی لیڈروں پر بھی بے اعتمادی کا اظہار کرتی تھی جو گزشتہ ایک ماہ کے دوران بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی سفارشات کے حق میں بیانات دے رہے تھے۔ مزید برآں اس قرارداد سے صوبائی گورنر ملک فیروز خان نون کی بھی مذمت ہوتی تھی جس نے اس روز یعنی 30/اکتوبر کو ہی کومیلا میں ایک جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی سفارشات کے خلاف تنقید اور غیر صحت مندانہ پروپیگنڈا پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا اور کہا تھا کہ ''اگر یہاں کے لوگ صوبہ پرستی کے طوق کو نہیں اتاریں گے تو وہ کبھی بھی ایک صحیح قوم نہیں بن سکیں گے۔''

گورنر فیروز خان نون اور محکموں کے سیکرٹریوں کے پاس اصل اقتدار تھا، وزیروں کی حیثیت محض نمائشی تھی

ملک فیروز خان نون کی متذکرہ تقریر ڈھاکہ کے جمہوریت پسندوں کی رائے میں اس لئے بھی قابل مذمت تھی کہ اس سے ان ساری اطلاعات کی تائید ہوتی تھی جو گزشتہ کئی مہینوں سے اس شخص کی غیر آئینی کاروائیوں کے بارے میں مختلف باخبر حلقوں میں گشت کر رہی تھیں۔ ان حلقوں کا الزام یہ تھا کہ پنجابی گورنر اپنے پیشرو انگریز گورنر سر فریڈرک بورن کے برعکس غیر آئینی طور پر صوبائی انتظامیہ کے معاملات میں مداخلت کرتا ہے اور اس بنا پر انتظامیہ کے کام میں

غیر متوقع طور پر رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ کراچی کے اخبار ڈان کی ایک رپورٹ کے مطابق ''صوبائی سیکرٹریٹ میں اس قسم کی باتیں ہوتی ہیں کہ گورنر نون متعلقہ وزیر کی اطلاع کے بغیر فائلیں منگوا لیتا ہے اور حمید الحق چودھری کے خلاف پروڈا کے مقدمہ میں منکشف شدہ ان حقائق کے بارے میں بھی گپ شپ ہوتی ہے کہ اعلیٰ حکام صوبائی وزراء کے بارے میں بھی مرکزی حکومت کو خفیہ رپورٹیں بھیجتے ہیں اور یہ کہ صوبائی وزیروں کی حیثیت محض مشیروں کی ہے کیونکہ اگر کسی وزیر اور اس کے محکمہ کے سیکرٹری کے درمیان کسی مسئلہ پر اختلاف رائے ہو جائے تو متعلقہ فائل آخری فیصلہ کے لئے گورنر کے پاس بھیجی جاتی ہے۔ چونکہ صوبائی وزراء سیکرٹریوں کی ان رپورٹوں کے صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں کچھ کہنے سے احتراز کرتے ہیں اس لئے ان سے صوبہ کی سیاسی فضا کو، جو پہلے ہی بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی سفارشات کے بارے میں پیدا شدہ غلط فہمیوں کی وجہ سے مکدر ہو چکی ہے، نقصان پہنچ رہا ہے۔ ڈھاکہ کے سیاسی حلقوں کا خیال ہے کہ اس سیاسی فضا کو بہتر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان رپورٹوں کی قطعی طور پر تردید کی جائے کہ گورنر صوبائی انتظامیہ کے معاملات میں مداخلت کرتا ہے اور بعض اعلیٰ حکام اب بھی آزادی سے پہلے کے جذبہ کے تحت کام کرتے ہیں۔''[17]

ڈھاکہ یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین اور طلبا مجلس عمل کی طرف سے مجوزہ غیر جمہوری و غیر وفاقی آئین کے خلاف بھرپور اور منظم تحریک

صوبہ لیگ کی مجلس عاملہ نے اپنی قرارداد میں صوبائی سیکرٹریٹ کی ان رپورٹوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا البتہ اس نے اس الزام کی تردید کی تھی کہ دستور ساز اسمبلی کے بنگالی ارکان نے اپنے علاقے کے مفادات سے غداری کی ہے۔ لیکن اگلے ہی دن 31/اکتوبر کو ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبا نے اپنے اس الزام کا پہلے سے بھی زیادہ زوردار الفاظ میں اعادہ کیا اور مطالبہ کیا کہ موجودہ دستور ساز اسمبلی کو توڑ کر اس کے لئے انتخابات کرائے جائیں۔ کیونکہ اب اسے پاکستان کے عوام کی نمائندگی کرنے کا کوئی حق نہیں رہا۔ طلبا نے یہ مطالبہ یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے زیر اہتمام ایک جلسہ میں کیا۔ اس سلسلہ میں جو طویل قرارداد منظور کی گئی اس میں یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ ''بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ پاکستان کے عوام میں ایک آمرانہ

آئین کے تحت مٹھی بھر جاگیرداروں اور بڑے سرمایہ داروں کے جابرانہ اقتدار کو دوام بخشا جائے گا۔ سربراہ مملکت کو غیر محدود اختیارات دیئے گئے ہیں۔ غیر جمہوری ایوان بالا کی تشکیل کی گئی ہے اور صوبائی حکومتوں کو میونسپلٹیوں کا درجہ دے دیا گیا ہے تاکہ ملک میں جاگیرداروں اور بڑے سرمایہ داروں کا راج قائم ہو۔ اس رپورٹ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کراچی کے حکمران حلقوں کو مشرقی بنگال کے قومی وقار اور مطالبات کی کوئی پرواہ نہیں۔ انہوں نے اردو کو ملک کی واحد سرکاری زبان قرار دے کر اور ایک انتہائی طاقتور اور مضبوط مرکز تجویز کر کے اس مشہور ومعروف قرارداد لاہور سے نہایت بے شرمی کے ساتھ انحراف کیا ہے جس میں واضح طور پر یہ طے کیا گیا تھا کہ پاکستان میں زونل حکومتیں قائم ہونگی۔ لہٰذا مشرقی بنگال کے طلبا انتہائی ذمہ دار الفاظ میں یہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ اپنے صوبے کو اصفہانیوں اور ہارونوں کی کالونی بنانے کی ناپاک کوششوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ کا دنیا کی موجودہ صورتحال کے حوالے سے مطالعہ کیا جائے تو اس کا مقصد یوں معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کے عوام اپنی تعلیم اور روزگار کی ترقی کے لئے جو جدوجہد کر رہے ہیں، اس کا سدباب کیا جائے اور اس بنا پر اس سے بین الاقوامی رجعت پسند کیمپ کے مفاد کو لازمی طور پر فروغ حاصل ہوگا۔ لہٰذا طلبا اور دوسرے عوام سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ مجوزہ آئین کے خلاف متحدہ محاذ بنائیں اور اس طرح ان حکمران حلقوں اور جاگیرداروں کی سازش کو ناکام بنائیں جو پاکستان میں ایسا راج قائم کرنا چاہتے ہیں جیسا کہ چیانگ کائی شیک نے چین میں کیا تھا۔ گزشتہ تین سال کے تجربے سے یہ ثابت ہوا ہے کہ موجودہ دستور ساز اسمبلی عوام کے استحصال اور جمہوری آزادیوں کو سلب کرنے کے کام میں حکمران ٹولے کے ہاتھ میں آلۂ کار ہے۔ یہ اسمبلی عوام کی نمائندہ اور ان کے حقوق کی محافظ نہیں ہے۔ اس لئے اسے فوراً توڑ کر نئی دستور ساز اسمبلی کے انتخابات کرانے چاہئیں۔''[18] اس قرارداد کے الفاظ اور اس کے مضمون سے ظاہر ہوتا تھا کہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبا کا یہ جلسہ کمیونسٹ پارٹی کے زیر اثر ہوا تھا اور یہ کہ چونکہ مشرقی بنگال کے مسلم طلبا کوریا میں شمالی کوریا اور چین کی فتوحات سے بہت متاثر ہوئے تھے اس لئے مقامی کمیونسٹ عناصر مجوزہ آئین کے خلاف تحریک کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لینے کی کوشش کر رہے تھے اور قدرتی طور پر یہ بات پاکستان کے حکمران طبقوں کے لئے تشویش کا باعث تھی۔ ان دنوں پاکستان کا وزیر داخلہ خواجہ شہاب الدین ڈھاکہ میں تھا

اور سب کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجوزہ آئین میں کوئی خرابی نہیں۔ اس آئین کے نفاذ کے بعد مشرقی بنگال کو مرکزی اقتدار میں سب سے زیادہ حصہ ملے گا۔

گرینڈ نیشنل کنونشن اور پہلے سے زیادہ بھرپور یوم احتجاج ...... صوبہ بھر میں جلسے، ہڑتالیں اور مظاہرے

طلبا کی مجلس عمل کے 19 ر اکتوبر کے فیصلے کے مطابق 4 اور 5 ر نومبر کو دو روزہ گرینڈ نیشنل کنونشن منعقد ہوا جس میں دستور ساز اسمبلی کے ارکان سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ لیاقت علی خان کی طرف سے پیش کردہ آئینی رپورٹ مسترد کر کے ان آئینی تجاویز کو منظور کریں جو مجلس عمل نے مرتب کر کے 7 ر اکتوبر کو شائع کی تھیں۔ ان تجاویز کا بنیادی تصور یہ تھا کہ پاکستان میں مشرقی اور مغربی پاکستان کی خود مختار علاقائی حکومتوں پر مشتمل ری پبلیکن طرز کی حکومت قائم ہونی چاہیے اور ایک ہی مرکزی پارلیمنٹ ہونی چاہیے جسے صرف دفاع، تعلقات خارجہ اور کرنسی کے امور نمٹانے کا اختیار حاصل ہو۔ اس کنونشن میں ایک قرارداد کے ذریعہ مولانا عبدالحمید بھاشانی سمیت سارے سیاسی قیدیوں کی غیر مشروط رہائی اور جابرانہ قوانین کے خاتمہ کا مطالبہ کیا اور یہ اعلان کیا کہ 12 ر نومبر کو یوم احتجاج منایا جائے گا۔

حکومت نے اس کنونشن کو ناکام کرنے کے لئے اپنا روایتی حربہ استعمال کیا مگر اسے کامیابی نہ ہونی تھی اور نہ ہوئی۔ اس کا روایتی حربہ یہ تھا کہ کنونشن کمیونسٹوں اور انڈین ایجنٹوں کی تحریک پر منعقد کیا جا رہا ہے۔ کراچی کے روزنامہ ڈان نے اس حربہ کے طور پر دو ایک دن پہلے اپنے قاہرہ کے نامہ نگار کے حوالے سے یہ خبر شائع کی تھی کہ ''مصر میں ہندوستانی سفارت خانے نے گزشتہ دس دن سے کانا پھوسی کی یہ مہم شروع کرائی ہے کہ مشرقی پاکستان ہندوستان میں شامل ہونے ہی والا ہے۔ ہندوستانی سفیر روزانہ اخبار نویسوں اور سیاسی لیڈروں کو دعوت دیتا ہے اور ان میں سے بعض کے ساتھ مشرقی پاکستان کی ہندوستان میں شمولیت کے امکان کا ذکر بھی کرتا ہے''[19] اور پھر مارننگ نیوز نے 5 ر نومبر کو کنونشن کے پہلے روز کی کاروائی کی رپورٹ پر یہ شہ سرخی جمائی تھی کہ اس اجتماع میں ''اللہ تعالیٰ کے اقتدار کو چیلنج کیا گیا ہے۔''

کنونشن کے دوسرے روز کے سیشن میں مولوی فضل الحق نے بھی شرکت کر کے اپنی

روایت کے مطابق بڑی گرجدار اور لچھے دار تقریر کی تھی۔ اس نے اپنی تقریر میں پہلے تو یہ الزام عائد کیا تھا کہ اس سے 14 راکتوبر کے اس بیان پر دھوکے سے دستخط کرائے گئے تھے جس میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی سفارشات کی حمایت کی گئی تھی اور پھر مزید الزام عائد کیا تھا کہ آئینی تجاویز لیاقت علی خان نے اپنی آمریت قائم کرنے کے لئے مرتب کرائی ہیں۔ ''وہ اب ملک کا وزیراعظم ہونے کے علاوہ پاکستان مسلم لیگ کا صدر بھی بن گیا ہے اور آئندہ وہ اس ملک کا سلطان یا شہنشاہ بننا چاہتا ہے۔'' اس نے اعلان کیا کہ ''مشرقی بنگال ایسی پوزیشن کبھی قبول نہیں کرے گا جس میں کہ اس کے جمہوری اختیار اور خودمختاری کو کچلا گیا ہو۔''[20] مولوی فضل الحق کی اس نئی قلابازی کی بظاہر وجہ یہ تھی کہ جب وہ کراچی میں 14 راکتوبر کے مشترکہ بیان پر دستخط کرنے کے بعد واپس ڈھاکہ پہنچا تو یہاں اس نے یہ محسوس کیا کہ مجوزہ آئین کے خلاف بڑی تند و تیز سیاسی ہوائیں چل رہی ہیں لہٰذا اس کی سیاست کا رخ بھی ان ہواؤں کے ساتھ ہی ہونا چاہیے۔ مولوی فضل الحق آئے دن اس قسم کی سیاسی قلابازیاں کھانے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کیا کرتا تھا۔ 1937ء کے بعد اس کی سیاست اس قسم کی قلابازیوں سے بھرپور تھی لیکن اس کے باوجود مشرقی بنگال میں اس کا سیاسی اثر ورسوخ کبھی بھی بالکل ختم نہیں ہوا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ غریب کسانوں سے رابطہ رکھنے اور ان کے اجتماعات میں جذباتی تقریریں کرنے کا بہت ماہر تھا۔ اس کا شاید ہی کوئی جلسہ عام ایسا ہوتا تھا کہ جس میں وہ مفلوک الحال حاضرین کو اشکباری پر مجبور نہیں کر دیتا تھا۔

اس گرینڈ نیشنل کنونشن کے فوراً بعد صوبائی اسمبلی کے 13 ارکان نے پہلے تو ایک خط کے ذریعہ اور پھر ایک مشترکہ بیان کے ذریعے وزیراعلیٰ نورالامین سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ پر غور کرنے کے لئے لیگ اسمبلی پارٹی کا اجلاس بلائے۔ اس خط اور بیان پر دستخط کرنے والوں میں اے۔ کے۔ فضل الحق، حمیدالحق چودھری، عبدالمنان اور شمس الدین احمد بھی شامل تھے۔ لیکن نورالامین نے اپنے جوابی خط اور بیان میں یہ مطالبہ پورا کرنے سے اس بنا پر معذوری ظاہر کی کہ ''میں حق رائے دہندگی کی کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لئے 12 یا 13 رنومبر کو کراچی جا رہا ہوں۔''

تاہم نیشنل کنونشن کے فیصلے کے مطابق 12 رنومبر 1950ء کو پورے مشرقی بنگال میں

بڑے جوش وخروش سے یوم احتجاج منایا گیا۔ اس دن سارے چھوٹے بڑے شہروں اور قصبوں میں ہڑتالیں ہوئیں، جلسے ہوئے اور جلوس نکالے گئے۔ جن میں ہٹلری راج مردہ باد، قرارداد لاہور کی بنیادوں پر آئین مرتب کرواور مولانا بھاشانی کو رہا کرو، کے نعرے لگائے گئے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے سلیم اللہ مسلم ہال میں ایک جلسہ میں طلبا کی مجلس عمل کے نائب صدر مصطفی نورالاسلام نے اپنی تقریر میں کہا کہ اکرم خان اور نورالامین رسی سے لیاقت علی خان کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ جس نے ان سب کو بذریعہ ڈاؤننگ سٹریٹ (لندن) واشنگٹن کے ساتھ باندھ رکھا ہے۔ 13 رنومبر 1950ء کو صوبائی اسمبلی کے متذکرہ 13 ارکان نے اپنی ایک میٹنگ کر کے مطالبہ کیا کہ ملک کا آئین اس طرح مرتب کیا جائے جس کے تحت دفاع، تعلقات خارجہ اور کرنسی کے امور کے علاوہ تمام شعبوں میں مشرقی پاکستان کو مکمل خودمختاری حاصل ہو اور اردو اور بنگالی دونوں ہی زبانوں کو ملک کی سرکاری زبانیں قرار دیا جائے۔

بھرپور عوامی ردعمل کی تاب نہ لا کر حکومت نے مجوزہ آئینی تجاویز پر دستورساز اسمبلی میں غوروخوض کو ملتوی کرنے کا اعلان کردیا

جب طلبا کے اس صوبہ گیر یوم احتجاج اور 13 ارکان اسمبلی کی اس میٹنگ کی رپورٹیں کراچی پہنچیں تو اس وقت تک وزیراعلیٰ نورالامین اور دستورساز اسمبلی میں مشرقی بنگال سے تعلق رکھنے والے دوسرے ارکان کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ اگر اسمبلی کے 16 رنومبر کو شروع ہونے والے اجلاس میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی کے مجوزہ آئین کی منظوری دے دی گئی تو وہ واپس مشرقی بنگال نہیں جا سکیں گے۔ چنانچہ انہوں نے 15 رنومبر کو وزیراعظم لیاقت علی خان سے ملاقات کر کے یہ استدعا کی کہ مجوزہ آئین پر اسمبلی میں غوروخوض مزید کچھ عرصہ کے لئے ملتوی کر دیا جائے۔ 16 رنومبر کو ان کی اس استدعا کو منظور کر لیا گیا جبکہ مسلم لیگ کی مرکزی پارلیمانی پارٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ اسمبلی کے نومبر سیشن میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ پر بحث نہیں ہوگی اور پھر 21 رنومبر کو ایک پریس نوٹ میں دستورساز اسمبلی کی اس قرارداد کا اعلان کیا گیا کہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی عبوری رپورٹ پر اسمبلی کے رواں سیشن میں غور نہیں ہوگا تاکہ ان عناصر کو پورا موقع مل سکے جو اس سلسلے میں کوئی تجاویز پیش کرنا چاہتے ہیں۔ دستورساز اسمبلی کے دفتر میں 31 رجنوری 1951ء

تک قرارداد مقاصد کے مطابق جو ٹھوس تجاویز موصول ہوں گی کمیٹی ان پر غور کر کے مناسب سفارشات پیش کرے گی۔ اسمبلی میں یہ قرارداد لیاقت علی خان نے پیش کی تھی اور اس نے اپنی تقریر میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ دستور ساز اسمبلی نے قرارداد مقاصد کو خلوص اور دیانت کے جذبے کے ماتحت منظور کیا تھا کیونکہ دستور ساز اسمبلی کے ارکان کی دلی خواہش یہ ہے کہ پاکستان میں ایسا آئین مرتب ہو جو قرآن اور سنت نبوی کی سپرٹ کے منافی نہ ہو۔ دستور ساز اسمبلی کے ارکان اس خیال پر متفق ہیں کہ یہی اصول ہیں جن پر کاربند رہ کر دکھی دنیا میں خوشحالی کا دور دورہ ہوسکتا ہے۔ دستور ساز اسمبلی کے ارکان کا یہ پختہ یقین ہے کہ اسلام کے اصول کسی خاص قوم یا ملک کی فلاح و بہبود تک محدود نہیں بلکہ دنیا کی ساری قومیں اور سارے ملک (بشرطیکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہوں) ان اصولوں سے مساوی طور پر استفادہ کر سکتے ہیں۔ پاکستان کے باشندوں کا فرض ہے کہ وہ اسلامی اصولوں کی روشنی میں ایسا آئین مرتب کریں کہ ان کا اقدام دنیا بھر کے ملکوں اور قوموں کے لئے مشعل راہ ثابت ہو اور ساری دنیا کے لئے بہترین مواقع پیدا کرنے کا موجب ہو۔'' چٹا گانگ کے رکن اسمبلی نور احمد نے وزیر اعظم کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ ''بنیادی اصولوں کی رپورٹ کے بارے میں مشرقی بنگال میں جو خدشات پیدا ہو گئے ہیں...... وزیر اعظم کی اس پیشکش سے دور ہو جائیں گے۔'' سید ابوالبشر محمود حسین نے کہا کہ ''بعض مفاد پرست عناصر نے بنیادی اصولوں کی رپورٹ کے بارے میں مشرقی بنگال کے عوام میں بے چینی پھیلا دی تھی لیکن وزیر اعظم کی اس قرارداد کے بعد مفاد پرست عناصر کی کوششوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔''[21]

لیاقت علی خان کی اس قرارداد کا مطلب یہ تھا کہ اب آئین سازی کا کام غیر معینہ عرصہ کے لئے ملتوی کر دیا گیا ہے۔ نوائے وقت کا قیاس یہ تھا کہ اب دستور سازی کا کام ناگزیر طور پر معرض تاخیر میں پڑ جائے گا۔ بنیادی اصولوں کی رپورٹ نئی شکل میں غالباً آئندہ سال کے وسط یا دستور ساز اسمبلی کے سرمائی اجلاس میں پیش ہو گی۔ 31 رجنوری 1951ء تک پاکستانی عوام سے جو دستوری سفارشات طلب کی گئی ہیں، بنیادی اصولوں کی متعلقہ کمیٹی کی سب کمیٹی ان سفارشات پر غور کرنے کے بعد انہیں بڑی کمیٹی کو بھیج دے گی۔ پھر یہ بڑی کمیٹی اپنی نئی رپورٹ مرتب کر کے دستور ساز اسمبلی میں پیش کر دے گی۔

لیاقت علی خان کے اس فیصلے کی وجہ بظاہر اس منصوبے میں مضمر تھی جو چودھری محمد علی کے بیان کے مطابق اس نے صوبائی اور مرکزی انتخابات کے بارے میں تیار کیا تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ پہلے یکے بعد دیگرے صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کرائے جائیں گے پھر مرکزی اسمبلی کا انتخاب ہوگا اور یہ نئی مرکزی اسمبلی آئین سازی کا کام مکمل کرے گی۔ لیکن لیاقت علی خان نے یہ منصوبہ جس خیال کے تحت تیار کیا تھا وہ کم از کم مشرقی بنگال کی حد تک سراسر غلط تھا۔ اس وقت تک مشرقی بنگال میں پاکستان مسلم لیگ، لیاقت علی خان کی مرکزی حکومت اور نورالامین کی صوبائی حکومت اس قدر رسوا اور بدنام ہو چکی تھی کہ آئندہ صوبائی اور مرکزی انتخابات میں لیاقت علی خان کے پسندیدہ افراد کا انتخابات میں کامیاب ہونا تقریباً ناممکن نظر آتا تھا۔ نومبر 1950ء میں صوبائی اسمبلی کی 9 نشستیں خالی تھیں لیکن نورالامین ان میں سے کسی ایک نشست کا بھی ضمنی انتخاب کرانے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔

باب:9

دونوں بازوؤں کے مابین مشترکہ مفاد کی بنیاد پر اتحاد استوار کرنے کی بجائے مذہبی نعروں کی آڑ میں مشرقی بازو کا استحصال کیا گیا

دونوں بازوؤں کے مابین مشترکہ مفاد کی بنیاد پر اتحاد استوار کرنے کے بجائے کھوکھلے مذہبی نعروں کا سہارا لیا گیا

پاکستان کے مشرقی اور مغربی بازوؤں کے مابین جغرافیائی، معاشرتی اور ثقافتی خلیج کی موجودگی میں اتحاد اور یکجہتی صرف مشترکہ مفاد کی بنیاد پر ہی قائم رہ سکتی تھی نہ کہ مغربی بازو کے حکمرانوں کی جانب سے مشرقی بازو کے مفادات کو مسلسل نظرانداز کر کے ایسا ممکن ہوسکتا تھا۔ اس پہلو پر مشرقی بنگال کے تعلیم یافتہ حلقے بار بار زور دیتے تھے۔ چنانچہ پاکستان آبزرور نے اپنے ایک اداریے میں لکھا کہ ''مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان اتحاد کا رشتہ مشترکہ مفاد کا رشتہ ہے۔ ان دونوں کو اس اتحاد سے جتنے زیادہ فوائد حاصل ہوں گے ان میں اتحاد کا اتنا ہی زیادہ جذبہ پیدا ہوگا۔ اگر اس کے برعکس اس باہمی اتحاد کو ایک علاقہ دوسرے علاقے کے استحصال کے لئے استعمال کرے گا تو اتحاد کا رشتہ ناپید ہو جائے گا......ایک قوم آزادی کے بغیر زندہ رہ سکتی ہے، لیکن وہ روٹی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ سرکاری ملازمت تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے زندگی کی روٹی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر ان سے یہ ملازمت لے لی جائے تو وہ زندہ رہنے کے ذریعہ سے محروم ہو جاتے ہیں۔ مشرقی بنگال کے عوام نے ایک مرتبہ آزادی کے لئے لڑائی لڑی ہے۔ اب وہ روٹی

کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ان کے پاس صرف دو ہی راستے ہیں ایک یہ کہ وہ مر جائیں اور دوسرا یہ کہ اپنے جائز حقوق منوائیں۔ وہ مصمم عزم کے ساتھ جدوجہد کریں گے خواہ اس کے نتائج کچھ ہی نکلیں۔ مشرقی بنگال کے ہر کونے سے، ہر سرکاری دفتر سے، ریلویز سے، کسٹمز، پوسٹ اینڈ ٹیلیگراف، بینکوں اور ریڈیو سے ایک ہی کہانی سنائی دیتی ہے اور وہ یہ کہ ان سب اداروں میں اقربا نوازی ہوتی ہے۔ باہر کے لوگوں کو درآمد کیا جاتا ہے اور مشرقی بنگالیوں کے حقوق پر نظر رکھی جاتی ہے۔ اب ہائی کورٹ میں بھی ہر طرف بے اطمینانی پھیل رہی ہے۔ وکلا کا الزام یہ ہے کہ جو ارباب اقتدار ہائی کورٹ کے ججوں اور لا افسروں کا تقرر کرتے ہیں وہ مشرقی بنگالیوں کے خلاف امتیاز روا رکھتے ہیں۔ وہ مقامی بار ایسوسی ایشن سے مشورہ کئے بغیر ہندوستان سے لوگوں کو بلوا کر ان کا کلیدی آسامیوں پر تقرر کرتے ہیں۔ مرکز میں مشرقی بنگالیوں کا مقام برائے نام ہے۔ پبلک سروس کمیشن میں اور مرکز اعلیٰ ملازمتوں میں کوئی ایک بھی مشرقی بنگالی نہیں ہے۔ مرکزی سیکرٹریٹ میں بنگالی کلرکوں کا تناسب تین سے چار فیصد ہے۔ بری، بحری اور ہوائی فوج کے علاوہ محکمہ خارجہ میں حالت اس سے بھی زیادہ بری ہے۔ ہم صوبہ پرستی کے خلاف ہیں لیکن ہم استحصال کے بھی اتنا ہی خلاف ہیں۔"[1]

22 نومبر کو ڈھاکہ ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن نے ایک قرارداد میں حکومت کی اس پالیسی کے خلاف احتجاج کیا جس کے تحت ہائی کورٹ کی کلیدی اسامیوں پر تقرر کرتے وقت صوبہ کے حقوق کو نظر انداز کیا جاتا تھا اور 23 نومبر کو چٹا گانگ کے ایک شخص ایف۔ رحمان نے اپنے ایک مراسلے میں پاکستان آبزرور کے اس اداریے کا حوالہ دیئے بغیر اس کی تائید کی۔ ایف۔ رحمان کا مراسلہ یہ تھا کہ "قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد میں بنیادی تبدیلی آ گئی ہے۔ آزادی کے بعد ہم مشرقی بنگال کے لوگ ہر روز غریب سے غریب تر ہو رہے ہیں۔ ہم بڑی تیزی کے ساتھ اپنی ملازمتیں، تعلیمی سہولتیں اور تجارتی مواقع کھو رہے ہیں۔ ہر جگہ رشوت ستانی، اقربا نوازی اور دوسری بدعنوانیوں کا دور دورہ ہے۔ ہم پر آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل کی کہاوت صادق آتی ہے۔ اگر ملک کا دارالحکومت اڑھائی ہزار میل کے فاصلہ پر واقع ہو تو مشرقی بنگال کی حالت اس سے بہتر نہیں ہو سکتی جیسی کہ آج کل ہے۔"

گزشتہ تین سال میں مشرقی بنگال کے عوام کا یہ احساس محرومی اس قدر شدید ہو چکا تھا

کہ 21 نومبر 1950ء کو بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ پر غور وخوض ملتوی کیئے جانے کے بعد بھی اس کے خلاف عوامی احتجاجات کا سلسلہ جاری رہا حالانکہ گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین یہ احتجاجی تحریک بند کرانے کے لئے 25 نومبر کو ڈھاکہ پہنچا تھا اور اس کا پروگرام یہ تھا کہ وہ صوبہ میں تقریباً دو ہفتے قیام کر کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرے گا لیکن اس کی یہ کوشش مذہبی نعرے کا سیاسی حربہ استعمال کرنے کے باوجود کامیاب نہ ہوئی۔ اس نے یہ حربہ ڈھاکہ میں جمعیت العلمائے اسلام کے سپاس نامے کے جواب میں استعمال کیا۔ اس کی مقامی مولویوں کے اس اجتماع میں تقریر یہ تھی کہ "ملک میں اسلامی نظام قائم کرنے کے بارے میں ہر جگہ ہی مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ اس مسئلہ کے حل کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ پہلا یہ کہ اسلامی قوانین کو قانون کے ذریعے مسلط کیا جائے یعنی حکومت ایسے قوانین بنائے اور ان کو نافذ کرے کہ پاکستان کے آئین سازوں نے اس چیز کے پیش نظر قرارداد مقاصد منظور کی ہے جس کا مقصد ملک میں ایسے سازگار حالات پیدا کرنا ہے جس کے ماتحت مسلمانوں کو یہ موقع مل سکے کہ وہ اپنی زندگیوں کو اسلامی قوانین اور اصولوں کے مطابق سنوار سکیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں تھوڑا بہت وقت لگے گا۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ خود مسلمان اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہو جائیں۔ پاکستان کے مسلمانوں کے لئے اسلامی زندگی بسر کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہے اور اگر وہ صحیح معنوں میں مسلمان ہو جائیں تو پاکستان خود بخود اسلامی ملک بن جائے گا۔"[2] خواجہ ناظم الدین اسلامی ملک، اسلامی نظام، اسلامی قوانین اور اسلامی آئین کے بارے میں اس قسم کی باتیں اس حقیقت کے باوجود کرتا تھا کہ اس کی ساری سیاسی زندگی برطانوی سامراج کی فرمانبرداری میں گزری تھی اور اس نے برطانوی مفادات کو فروغ دینے میں کبھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ وہ اپریل 1947ء میں متحدہ بنگال کی سیکولر آزاد، خود مختار ریاست کے قیام کا اعلانیہ طور پر حامی تھا۔ اگست 1947ء میں وہ اصفہانی وغیرہ کے ساتھ ساز باز کر کے مشرقی بنگال کی مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کا قائد منتخب ہوا تھا حالانکہ 1945ء میں عملی سیاست سے ریٹائر ہونے کا اعلان کر چکا تھا اور اس بنا پر اگست 1947ء میں صوبائی اسمبلی کا ممبر بھی نہیں تھا۔ پھر اگست 1947ء سے لے کر ستمبر 1948ء تک مشرقی بنگال کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے کوئی سیاسی بدعنوانی ایسی نہیں تھی جو اس نے نہ کی تھی۔ اس نے مارچ 1948ء میں اپنی حکومت کو قائم رکھنے کے لئے قومی زبان کے بارے میں

طلبا سے معاہدہ کیا۔ پھر اس نے محمد علی بوگرا کو بطور سفیر برما بھجوا کر سیاسی رشوت ستانی کا ارتکاب کیا اور پھر دو باغی ارکان اسمبلی کے ساتھ سیاسی سودا بازی کر کے انہیں اپنی کابینہ میں شامل کیا۔ مزید برآں اس نے محض اپنے اقتدار کی خاطر تقریباً نصف درجن غیر بنگالیوں کو مشرقی بنگال سے دستور ساز اسمبلی کا رکن منتخب کروایا۔ چونکہ مشرقی بنگال کے باشعور عوام اس شخص کے اس قسم کے ناپاک سیاسی کردار سے اچھی طرح واقف تھے اس لئے ان پر اس کی نام نہاد اسلام پسندی کا نہ پہلے کبھی کوئی اثر ہوتا تھا اور نہ اب ہوا تھا۔ انہوں نے بنیادی اصولوں کی غیر جمہوری اور غیر اسلامی رپورٹ کے خلاف اپنی تحریک زور شور سے جاری رکھی۔

28/نومبر کی ایک اخباری رپورٹ کے مطابق چٹا گانگ میں ایسٹ پاکستان مسلم سٹوڈنٹس لیگ کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان جلسہ میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی اس رپورٹ کو قطعی طور پر مسترد کر کے ملک میں اسلامی سوشلزم رائج کیا جائے۔ ڈسٹرکٹ چیئرمین فضل القادر چودھری نے بھی اس جلسہ میں تقریر کی اور الزام عائد کیا کہ جن لوگوں نے یہ رپورٹ لکھی ہے وہ ملک میں دہشت پھیلا کر ہٹلری نظام نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ اس جلسہ کے دو دن بعد چٹا گانگ کے نزدیک سیتا کنڈ میں ایسٹ پاکستان مسلم لیگ کے جوائنٹ سیکرٹری شاہ عزیز الرحمان نے طلبا اور دوسرے عوام کے مشترکہ جلسہ میں کہا کہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ لکھنے والوں نے جمہوریت کی آڑ لے کر ایک ایسی بادشاہت نافذ کرنے کی کوشش کی ہے جیسی کہ فرانس میں نپولین نے قائم کی تھی اور اس کے دو دن بعد ایسٹ پاکستان مسلم سٹوڈنٹس لیگ کے جنرل سیکرٹری عبدالودود، پاکستان سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کے کنوینر روح الامین اور پاکستان سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ایک لیڈر اے۔ زمان نے ایک مشترکہ بیان میں لیاقت علی خان کے دستور ساز اسمبلی میں اس بیان کی مذمت کی کہ جن لوگوں کو بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ پر اعتراض ہے وہ اس رپورٹ کے ان حصوں کی نشاندہی کریں جو قرارداد مقاصد کے منافی ہیں۔ سٹوڈنٹس لیڈروں کی رائے یہ تھی کہ ”لیاقت نے اس طرح چالاکی سے قرارداد لاہور کے بارے میں مکمل خاموشی اختیار کی ہے جس کی بنیاد پر تحریک پاکستان چلائی گئی تھی۔ لیاقت علی خان کے لئے بہتر یہی ہوگا کہ وہ اس حقیقت کو نظر انداز نہ کرے کہ اس رپورٹ کے خلاف وسیع پیمانے پر غم وغصہ کا اظہار اس لئے کیا گیا ہے کہ یہ جمہوریت اور حق خود ارادیت کے منافی ہے، اس سے علاقائی

دوام بخشا گیا ہے اوراس سے قرارداد لاہور کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہوئی ہے۔طلبا کے اس بیان میں مزید کہا گیا تھا کہ عوام الناس کو پاکستانی لیڈروں کے وعدوں کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ماضی میں وہ اپنے کئی وعدوں سے پھر گئے تھے مثلاً 23/مارچ 1940ء کو قرارداد لاہور میں آزاد وخودمختار مملکت کا نقشہ کھینچا گیا تھالیکن اب دستور ساز اسمبلی میں وزیراعظم لیاقت علی خان کا نور احمد کے ایک سوال کے جواب میں بیان یہ ہے کہ ہم ابھی تک برطانیہ کی رعایا ہیں۔پھر 15/مارچ 1948ء کو خواجہ ناظم الدین نے وعدہ کیا تھا کہ وہ بنگالی زبان کو ملک کی سرکاری زبان بنانے کی سفارش کرے گالیکن بعد میں اس نے اپنے اس وعدے کی پابندی نہیں کی تھی اور پھر 13/دسمبر 1949ء کو صوبائی حکومت نے اعلان کیا تھا کہ بنگالی زبان کے لئے عربی رسم الخط رائج کرنے کی خبریں بے بنیاد ہیں مگر بعد میں اس اعلان کے برعکس 17 مراکز قائم کئے گئے جن میں عربی رسم الخط میں بنگالی زبان پڑھائی جانے لگی۔''

20/نومبر 1950ء کو فیڈریشن آف ایسٹ پاکستان چیمبرز آف کامرس نے ایک قرارداد میں بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ کو بالکل ناقابل قبول قرار دیا کیونکہ فیڈریشن کی رائے میں یہ رپورٹ 1940ء کی قرارداد کے منافی تھی۔فیڈریشن کی مزید رائے یہ تھی کہ ملک میں صرف ایسا آئین ہی چل سکتا ہے جس کی بنیاد مشرقی اور مغربی پاکستان کے دوعلاقوں کے تصور پر ہواور جس کے تحت مرکزی حکومت صرف دفاع،تعلقات خارجہ اور کرنسی کے امور کی انچارج ہو۔

9/دسمبر 1950ء کو گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین ڈھاکہ ریڈیو سے اپنی الوداعی نشری تقریر میں مشرقی بنگال کے حالات پر اطمینان کا اظہار کرکے واپس کراچی پہنچا تو اسی دن لندن کے ہفت روزہ اکونومسٹ (Economist) نے اپنی ایک رپورٹ میں اس حقیقت پر روشنی ڈالی کہ قیام پاکستان کے فوراً ہی بعد سے مشرقی پاکستان میں یہ احساس پایا جاتا ہے کہ اسے نظرانداز کیا جارہا ہے اور کراچی اور مغربی پاکستان اس سے اپنی نوآبادی کا سا سلوک کرتے ہیں۔

گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کی واپسی کے تقریباً ایک ہفتہ بعد وزیراعظم لیاقت علی خان مشرقی بنگال کے حالات کا جائزہ لینے کے لئے 17/دسمبر 1950ء کو ڈھاکہ پہنچا تو اسی دن سنٹرل کمیٹی آف ڈیموکریٹک فیڈریشن کی جانب سے پاکستان آبزرور کے پہلے صفحے پر ایک نونکاتی سوالنامہ شائع کرایا گیا۔اس سوالنامے کے آٹھ سوال تو بنیادی اصولوں کی کمیٹی کے مجوزہ

آئین پران اعتراضات پر مبنی تھے جو گزشتہ تین چار ماہ کے دوران مشرقی بنگال کے سارے حلقوں کی جانب سے کئے گئے تھے لیکن سب سے اہم نویں سوال میں ان آئینی اعتراضات کی مادی بنیاد پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ پانچ ضمنی سوالوں پر مشتمل نواں سوال یہ تھا کہ کیا تم اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے کہ گزشتہ تین سال میں مرکز نے مشرقی پاکستان کے امور پر کنٹرول حاصل کر کے یہاں عوام کی معاشی اور ثقافتی زندگی پر تباہ کن نتائج مرتب کئے ہیں۔ ان نتائج میں سے چند ایک یہ ہیں:

(1) (الف) پٹ سن کی آمدنی میں غیر معمولی کمی ہوئی ہے...... 1948ء میں 114 کروڑ، 1949ء میں 75 کروڑ اور 1950ء میں صرف 35 کروڑ روپے۔

(ب) کاشتکاروں کو پٹ سن کی قیمت حکومت کی مقرر کردہ کم از کم قیمت سے بھی کم ملتی ہے۔ مشرقی بنگال میں اس کی قیمت 12 روپے من ہے جبکہ مغربی بنگال میں یہ 55 روپے من کے بھاؤ سے بک رہی ہے۔

(ج) کیا جیوٹ بورڈ کاشتکاروں کے مقابلے میں محض اصفہانیوں، ہارونوں اور آدم جیوں کے مفادات کو فروغ نہیں دیتا۔

(2) چھالیہ کا نرخ 75 روپے فی من سے کم ہو کر 10 روپے فی من ہو گیا ہے جبکہ ہندوستان میں اس کا بھاؤ 90 روپے من ہے۔

(3) چونکہ مرکز نے بنگال کے سارے ذرائع آمدنی غصب کر لئے ہیں اس لئے یہاں پرائمری، سیکنڈری اور یونیورسٹی تعلیم کا ڈھانچہ مکمل طور پر تباہ ہو گیا ہے جبکہ مرکزی حکومت مغربی پاکستان میں کئی ایک نئی یونیورسٹیاں کھول رہی ہے۔

(4) مرکزی حکومت کی غلط درآمدی پالیسی کے باعث مشرقی بنگال کی دستکاری کی صنعت میں کوئی ترقی نہیں ہوئی۔

(5) چٹاگانگ کی بندرگاہ کی ترقی کے کام میں غفلت کی وجہ سے مشرقی بنگال ابھی تک انڈین یونین کے دست نگر ہے اور اس کا عوام کی صنعتی اور تجارتی زندگی پر بہت برا اثر پڑا ہے۔

لیاقت علی خان پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ڈھاکہ میں صرف ایک رات ٹھہرا اور اگلے دن صبح ہی چٹاگانگ چلا گیا۔ جہاں وزیر اعلیٰ نور الامین نے کئی دن پہلے سے اس

کے لئے جلسہ عام کا انتظام کر رکھا تھا اور یہ بھی انتظام کر رکھا تھا کہ وہ مقامی مسلم لیگ اور چیمبر آف کامرس کے وفود کے علاوہ بعض دوسری تنظیموں کے نمائندوں سے بھی ملاقات کرے گا۔ڈسٹرکٹ اورسٹی مسلم لیگ کے وفد کی ملاقات دوپہر سے پہلے ہوئی جس کے دوران ارکان وفد نے شکایت کی کہ بنیادی اصولوں کی رپورٹ میں مشرقی پاکستان کی جغرافیائی پوزیشن کونظرانداز کر دیا گیا ہے۔ وفد کا مطالبہ یہ تھا کہ مشرقی پاکستان کو زیادہ سے زیادہ اختیارات ملنے چاہئیں۔ دوسرے مجوزہ ایوان کے انتخاب کا حق عوام کو ملنا چاہیے۔ اور اس ایوان بالا کو مالی بلوں کے بارے میں ایوان زیریں کے سے اختیارات حاصل نہیں ہونے چاہئیں۔شام کو اس نے ایک جلسہ عام کو خطاب کیا جس میں اس سے مجوزہ آئین کے بارے میں بہت سے سوالات پوچھے گئے تو نوائے وقت کی اطلاع کے مطابق اس کا جواب یہ تھا کہ ''بنیادی اصولوں کی سفارشات پر اعتراضات غلط فہمی یا غلط رہنمائی کا نتیجہ ہیں۔ آئین عوام کے لئے ہے اور عوام ہی اسے مرتب کریں گے۔ چنانچہ اسی لئے بنیادی اصولوں کی سفارشات پر غور وخوض ملتوی کر دیا گیا ہے کہ عوام کی تجاویز طلب کرنے کے بعد ان پر غور کیا جائے۔'' پاکستان آبزرور کی رپورٹ یہ تھی کہ اس جلسہ کی حاضری پانچ چھ ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ تاہم اس میں بنیادی اصولوں کی رپورٹ کے خلاف اشتہارات تقسیم کئے گئے اور جب لیاقت علی خان نے اپنی تقریر میں عوام کی آزادی اور آسودہ حالی کا ذکر کیا تو حاضرین نے نہیں !نہیں !! کے نعرے لگائے۔ اگرچہ اخباری رپورٹوں کے مطابق لیاقت علی خان نے اپنی اس تقریر میں اسلام کا اس طرح کوئی ذکر نہیں کیا تھا جس طرح کہ اس نے دستورساز اسمبلی میں اپنی 12 نومبر کی تقریر میں کیا تھا۔ تاہم پاکستان آبزرور میں اس کی اس تقریر کی رپورٹ کے ساتھ کومیلا کے ایک شخص شہاب الدین احمد کا ایک خط بھی شائع ہوا جو اس حقیقت کا مظہر تھا کہ مشرقی بنگال کے مفلوک الحال عوام لیاقت علی خان، خواجہ ناظم الدین اور دوسرے مسلم لیگی ارباب اقتدار کے کھوکھلے مذہبی نعروں سے بہت تنگ آچکے تھے۔ اس خط کا مضمون یہ تھا کہ ''جب کبھی تعلیمی اصلاحات کا سوال اٹھایا جاتا ہے تو ہمارے لیڈر یہ کہتے ہیں کہ انشا اللہ ہم اسلامی تعلیم رائج کریں گے۔ جب کبھی پٹ سن کی قیمتوں کا ذکر کیا جاتا ہے تو جواب ملتا ہے کہ ماشا اللہ ہماری ساری پٹ سن غیر ممالک میں بک جائے گی لیکن میرے بعض رفقا کہتے ہیں کہ الحمد اللہ اگرچہ ہمیں صرف دس روپے ماہوار مہنگائی الاؤنس ملتا ہے اب جناب والا...... انشا اللہ، ماشا اللہ، اسلامی زندگی، اسلامی

موت، اسلامی لباس، اسلامی ثقافت، اسلامی معاشرہ، اسلامی ریاست، اسلامی تعلیم، اسلامی تجارت کا کسی عمل کے بغیر اتنا زیادہ ورد کیا گیا ہے کہ کان پک گئے ہیں۔ اگر چہ یہ ساری چیزیں اپنی جگہ بہت اچھی ہیں لیکن ہم ان سے اس قدر بیزار ہو گئے ہیں جس قدر کہ کوئی مریض سا گو دانہ یا جو سے بیزار ہوتا ہے۔ اب ہم کوئی نئی اور تازگی بخش بات سننا چاہتے ہیں۔''[3]

فوجی اور سول ملازمتوں کے مرکزی ڈھانچہ میں محرومی پر بنگالی مسلم لیگیوں کا احتجاج اور لیاقت علی کا جوابی چیلنج

20 ردسمبر کو لیاقت علی خان نے ڈھاکہ میں صوبائی لیگ اسمبلی پارٹی کے اجلاس میں شرکت کی تو وہاں بعض ارکان اسمبلی نے کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر بنیادی اصولوں کی سفارشات پر سخت نکتہ چینی کی اور مطالبہ کیا کہ مشرقی بنگال کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری دی جائے۔ اس نکتہ چینی کی ابتدا نواکھلی کے رکن عبدالحکیم کے تحریری خطبہ استقبالیہ سے ہوئی۔ اس خطبہ میں ان ساری آئینی تجاویز کی تائید وحمایت کی گئی تھی جو طلبا کی جانب سے 4 اور 5 رنومبر کو منعقد کردہ گرینڈ کنونشن میں پیش کی گئی تھیں اور یہ شکایت کی گئی تھی کہ مسلح افواج میں مشرقی بنگال کی نمائندگی نہیں ہے حالانکہ ملک کی 70 فیصد آمدنی مسلح افواج پر خرچ ہوتی ہے اور اس خرچ کا بیشتر بوجھ مشرقی پاکستان برداشت کرتا ہے۔ ان مسلح افواج میں بھرتی کے موقع پر بنگالی نوجوانوں کو محض اس بنا پر مسترد کر دیا جاتا ہے کہ ان کا قدوقامت اور ڈیل ڈول مقررہ معیار کے مطابق نہیں ہوتا۔ یہ معیار برطانوی سامراجیوں کا مقرر کردہ ہے اور اس کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ بنگالی مارشل نسل سے تعلق نہیں رکھتے۔ اگر ساری دنیا میں اسی فسطائی معیار پر عمل ہو تو پھر جاپانی، چینی، کوریائی، ویت نامی اور گورکھوں کے لئے تو کسی فوج میں کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیے۔'' عبدالحکیم کے خطبہ استقبالیہ میں مزید شکایت یہ تھی کہ ''مرکزی حکومت نے 7 رنومبر کو ایک نئی مرکزی سول سروس قائم کرنے کا جو فیصلہ کیا ہے اس سے صوبائی حقوق پر بڑی سخت ضرب لگی ہے چونکہ اس سول سروس کے ارکان کسی صوبہ کے کنٹرول میں نہیں ہوں گے بلکہ مرکزی حکومت کے ماتحت ہوں گے اور وہ انہیں جس صوبہ میں چاہے گی مقرر کر دے گی یعنی ان افسروں کی عنان مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہو گی اور جس صوبہ میں وہ برسر کار ہوں گے اس صوبہ کی حکومت کو ان پر کنٹرول حاصل نہ ہو گا۔ اس لئے صوبائی

انتظامیہ کے نظم وضبط پر اس کا بہت برا اثر پڑے گا۔ یہ اعلیٰ حکام صوبائی وزراء کی کوئی پرواہ نہیں کریں گے اور ہر معاملے میں اپنی من مانی کریں گے۔ ہمارے تصور میں یہ بات نہیں آتی کہ کراچی کے مرکزی سیکرٹریٹ سے ایسے سب ڈویژنل آفیسر یا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا تقرر کیا جاسکتا ہے جو کہ مقامی حالات سے بالکل ناواقف ہو۔ اس قسم کی سول سروس کے قیام سے ملک کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ لہٰذا اعلیٰ افسروں کی بھرتی کے لئے وہی طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے جو 1935ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں درج ہے۔

یہ مرکزی سول سروس حکومت پاکستان کے سیکرٹری جنرل چودھری محمد علی کی تجویز کے مطابق قائم کی گئی تھی۔ مزید فیصلہ یہ تھا کہ ابتدائی بھرتی میں کچھ تو سول سروس آف پاکستان کی اساس کو وسیع تر بنانے اور قدرے افسروں کی قلت کو دور کرنے کے لئے 12 فیصد فوجی افسروں اور 10 فیصد صوبائی سروس کے افسروں کا بھی تقرر ہوگا۔ ابتدائی بھرتی کا یہ طریقہ پرانی روایت سے کچھ الگ تھا۔ پرانے قواعد کے تحت صوبائی سروس کے افسروں کو متعینہ مناصب پر فائز کیا جا سکتا تھا لیکن انہیں کسی عنوان بھی ترقی دے کر انڈین سول سروس کے ارکان نہیں بنایا جاسکتا تھا۔ آئندہ کی بھرتی کے لئے یہ طریق کار وضع کیا گیا تھا کہ 20 فیصد امیدوار اہلیت کی بنا پر سارے پاکستان سے لئے جائیں گے اور مشرقی ومغربی پاکستان میں سے ہر ایک سے 40 فیصد امیدواروں کی بھرتی ہوگی۔ اگرچہ اس سروس کا بنیادی ڈھانچہ وہی تھا جو برطانوی سامراجیوں نے تعمیر کیا تھا اور اس کی شرائط ملازمت بھی وہی تھیں جو انگریزوں نے طے کی تھی یعنی انہیں آئینی تحفظ حاصل تھا اور انہیں کسی الزام کی بنا پر برطرف کرنا بہت ہی مشکل تھا۔ تاہم اس نئی سروس کے قواعد میں صرف اتنا ردوبدل کیا گیا کہ اسے صوبائی زمروں میں منقسم نہ کیا گیا بلکہ مختلف صوبائی زمروں کو ایک ہی زمرے میں اس خیال سے مدغم کر دیا گیا کہ اس طرح صوبائی وفاداریاں قومی زاویۂ نگاہ پر غالب نہیں آئیں گی۔ اس کے برعکس اعلیٰ افسروں میں ملک کے دونوں بازوؤں کے معاشرتی اور معاشی حالات کا فہم پیدا ہو جائے گا۔ مشرقی اور مغربی پاکستانیوں میں دوستی کے رشتے استوار ہو جائیں گے اور بعد میں جب یہ افسر مرکزی حکومت سے منسلک ہوں گے تو انہیں سارے ملک کے انتظامی مسائل سے واقفیت ہوگی اور وہ ان سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت حاصل کر چکے ہوں گے۔ اس طرح انتظامی یک جہتی کے ذریعہ قومی وحدت کو استحکام نصیب ہوگا لیکن بہت جلد معلوم

ہو گیا کہ یہ سول سروس جس امید کے تحت قائم کی گئی تھی اس کی کوئی بنیاد نہیں تھی۔ بہت جلد مشرقی پاکستان میں یہ احتجاج ہونے لگا کہ مرکزی حکومت میں مغربی پاکستانیوں کی اجارہ داری ہے اور یہ شکایت پیدا ہوئی کہ اس سروس میں صلاحیت و قابلیت کی بنیاد پر بھرتی نہیں ہوتی۔ لاہور کے اخبار نوائے وقت کا مرکزی حکومت کے اس فیصلہ پر ادارتی تبصرہ یہ تھا ''کہا جاتا ہے کہ یہ اقدام نظم و نسق میں یکسانیت پیدا کرنے کے لئے اٹھایا گیا ہے۔ ہماری وزارت بھی خوب ہے جب اعلیٰ مرکزی ملازمتوں میں بھرتی کا سوال پیدا ہوتا ہے تو اسے یکسانیت کی کوئی فکر نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے عمل سے صوبائی تعصب کی آگ کو ہوا دیتی ہے اور قابلیت کو ملازمت میں داخلہ کا معیار بنانے کی بجائے صوبائی سٹیٹس کو معیار بنا کر صوبہ وار کوٹا مقرر کر دیتی ہے...... لیکن جب ''جمعداری'' اور ''چودھراہٹ'' کا معاملہ ہو تو مرکزی وزارت، نظم و نسق میں یکسانیت، کی قائل ہو جاتی ہے۔ مقصد یکسانیت نہیں آمریت ہے۔ اگر صوبوں کو اسی طرح بے دست و پا بنا کر میونسپل کمیٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں تبدیل کرنا مقصود ہے تو پھر صوبوں کے تکلف کی ضرورت ہی کیا ہے۔ سارے ملک میں ایک وحدانی حکومت قائم کر دیجئے۔''[4]

وزیر اعظم لیاقت علی خان پر پاکستان میں آمرانہ اور وحدانی طرز حکومت نافذ کرنے کے عزم کا الزام 21 دسمبر کو میمن سنگھ میں بھی لگایا گیا جبکہ اس نے صوبہ لیگ کونسل کے اجلاس میں شرکت کی۔ اس اجلاس میں ارکان کونسل نے بنیادی اصولوں کی سفارشات پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے انہیں غیر جمہوری اور غیر اسلامی قرار دیا اور یہ رائے ظاہر کی کہ مرکز آئندہ آئین میں آمرانہ اختیارات حاصل کرنے کا خواہاں ہے۔ ان الزامات کو سننے کے بعد لیاقت علی خان نے ارکان کونسل کو یقین دلایا کہ جب تک وہ پاکستان کا وزیر اعظم ہے وہ مرکزی حکومت کے ہاتھوں مشرقی بنگال سے کوئی ناانصافی نہیں ہونے دے گا۔ اس نے کہا کہ میں اس الزام کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ مرکزی حکومت نے مشرقی بنگال کو نظر انداز کیا یا اس صوبہ سے ناانصافی کی۔ میں لیگ کونسل کو یہ پیشکش کرتا ہوں کہ وہ پانچ ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کر دے جو کسی مبینہ بے انصافی کے سلسلہ میں مرکزی حکومت کے خلاف کیس مرتب کرے۔ اس کمیٹی کے ارکان دستور ساز اسمبلی کے ارکان نہیں ہوں گے۔ میں انہیں یقین دلاؤں گا کہ ان کے تمام خدشات غلط ہیں۔ پاکستان کسی ایک فرد یا گروہ کی جاگیر نہیں۔ بنیادی اصولوں کی سفارشات پر اس اعتراض کا ذکر کرتے ہوئے کہ

پاکستان کے ارباب اقتدار مرکز کو نہایت وسیع اختیارات تفویض کرنا چاہتے ہیں۔ لیاقت علی خان نے کہا کہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں خود بھی مرکز کو اتنے اختیارات دینے کے حق میں نہیں، جس سے کسی صوبہ کی ترقی اور نشوونما ختم ہو کر رہ جائے۔ نہ صرف مشرقی بنگال بلکہ تمام پاکستانی صوبے زیادہ سے زیادہ اختیارات اور وسیع دائرہ عمل چاہتے ہیں جو ایک قدرتی خواہش ہے لیکن مرکز اور صوبوں کے درمیان اختیارات کے سوال پر بہت غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح قرارداد لاہور کی تعبیر کے بارے میں بھی غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ اس قرارداد کی تعبیر کے سلسلے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان ایک دوسرے سے بالکل آزاد و خود مختار رہوں لیکن میں اس چیز پر زور دیتا ہوں کہ مشرقی اور مغربی پاکستان ایک دوسرے سے گہرے رشتہ میں منسلک ہیں۔ ان حالات میں مرکزی حکومت کا ڈھانچہ اس قسم کا ہونا چاہیے کہ صوبوں کو ایک وفاقی نظام کے تحت اپنی نشوونما کا پورا موقع مل سکے۔ پاکستان کا آئین ہی ایسا ہونا چاہیے کہ پاکستان کے ہر طبقہ کو اقتصادی، سماجی اور ثقافتی اعتبار سے ترقی کرنے کی پوری آزادی حاصل ہو۔'' لیاقت علی خان کی تقریر سے قبل صوبہ لیگ کے جنرل سیکرٹری یوسف علی چودھری۔ صوبہ لیگ کے جائنٹ سیکرٹری شاہ عزیز الرحمان، ایم۔ اے۔ صبور، ابوالقاسم خان، مولانا محمد محسن اور عبدالحمید نے جو تنقیدی تقریریں کیں ان میں مرکزی نکتہ یہ تھا کہ بنیادی اصولوں کی سفارشات میں مشرقی بنگال کی جغرافیائی حیثیت کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے حالانکہ اس صوبہ کو کامل آزادی درکار ہے۔ مشرقی بنگال کے سابق وزیر خزانہ حمید الحق چودھری کی تقریر یہ تھی کہ بنیادی اصولوں کی رپورٹ قرارداد مقاصد کے اس بنیادی اصول کی صریح خلاف ورزی کرتی ہے کہ پاکستان کی حکومت وفاقی ہونی چاہیے۔ جس میں صوبوں کو حقیقی آزادی مل سکے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرکز کو صرف دفاع، امور خارجہ اور کرنسی پر خصوصی اختیارات حاصل ہونے چاہئیں۔ مواصلات اور باقی تمام امور صوبائی دائرۂ اختیار میں شامل کر دینے چاہئیں۔''[5] صوبائی کونسل کے اس اجلاس کے آخر میں لیاقت علی خان کی مجوزہ پانچ رکنی تحقیقاتی کمیٹی تو مقرر نہ کی گئی البتہ ایک 21 رکنی کمیٹی مقرر کی گئی جس کے ذمہ یہ کام کیا گیا کہ وہ متبادل آئینی تجاویز مرتب کر کے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کے روبرو پیش کرے گی۔ اس کمیٹی میں دوسرے ممتاز مسلم لیگیوں کے علاوہ یوسف علی چودھری، نور الامین، حمید الحق چودھری، ایم۔ اے۔ صبور اور خواجہ حبیب اللہ بہادر نواب آف ڈھاکہ بھی شامل تھے۔

بنگالیوں کی جانب سے لیاقت کے چیلنج کا جواب ...... ملازمتوں میں بے انصافیوں کی چند مثالیں

تاہم لیاقت علی خان نے کونسل کے اس اجلاس میں مشرقی پاکستان سے کی گئی بے انصافیوں کی تحقیقات کے لئے ایک کمیٹی مقرر کرنے کا جو چیلنج زبانی طور پر دیا تھا، غیر لیگی، سیاسی اور صحافتی حلقوں نے اس کا فوراً ہی نوٹس لیا اور اخباری اداریوں، بیانات اور خطوط کے ذریعہ ان سیاسی، معاشی، اور ثقافتی بے انصافیوں کا انبار لگا دیا تھا جو گزشتہ تین ساڑھے تین سال میں مشرقی بنگال سے کی گئی تھیں۔ مختلف مرکزی دفاتر میں چھوٹے بڑے ملازمین کے علاقائی تناسب کی مثالیں دے کر یہ الزام عائد کیا گیا کہ نہ صرف کراچی کے مرکزی دفاتر میں مشرقی بنگال کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر ہے بلکہ مرکزی حکومت کے ریجنل دفاتر میں بھی ملازمین کی بھاری اکثریت مغربی پاکستانیوں پر مشتمل ہے۔

پاکستان آبزرور کے یکم جنوری 1950ء کے شمارہ میں ہارلے سٹریٹ ڈھاکہ کے ایک شخص عبدالعزیز چودھری نے اعداد و شمار کے ذریعہ یہ ثابت کیا کہ مرکزی حکومت کے 8 دسمبر 1949ء کے تحت مرکزی محکمہ بحالیات و روزگار نے ملک کے دونوں حصوں میں جو دفاتر اور تربیتی ادارے کھول رکھے ہیں ان پر ایک نظر ڈالنے سے صاف دکھائی دیتا ہے کہ نہ صرف مشرقی بنگالیوں کو روزگار کی سہولتیں اور مواقع مہیا کرنے میں بخیلی کی گئی ہے بلکہ ان دفاتر اور تربیتی اداروں میں مشرقی بنگالیوں کی نمائندگی بہت ہی کم ہے حالانکہ ملک کی کل آبادی کی اکثریت اس صوبے میں رہتی ہے اور یہاں بے روزگاروں کی تعداد بھی نسبتاً بہت زیادہ ہے۔ عبدالعزیز چودھری کے اس مراسلے میں بتایا گیا تھا کہ مرکزی محکمہ بحالیات و روزگار کے تحت تین ریجنل ڈائریکٹوریٹس قائم ہیں جن میں سے دو مغربی پاکستان میں ہیں اور ایک مشرقی پاکستان میں ہے۔ ایمپلائمنٹ ایکسچینج آرگنائزیشنز کی کل تعداد 22 ہے جن میں سے 18 مغربی پاکستان میں اور 4 مشرقی پاکستان میں ہیں، ٹیکنیکل ٹریننگ سنٹروں کی تعداد 7 ہے جن میں سے 6 مغربی پاکستان میں اور ایک مشرقی پاکستان میں ہے۔ تین ریجنل ڈائریکٹوریٹس میں ملک کے دونوں حصوں کے ملازمین کے تناسب کا خاکہ یہ ہے:

نام عہدہ	مغربی پاکستان	مشرقی پاکستان	مکمل تعداد
ریجنل ڈائریکٹرز	2	1	3
ڈپٹی ڈائریکٹرز	1	x	1
اسسٹنٹ ڈائریکٹرز	1	1	2
سپرنٹنڈنٹ	2	1	3
اپر ڈویژن کلرکس	5	2	7
لوئر ڈویژن کلرکس	11	5	16
سٹینو ٹائپٹس	2	1	3
دفتری	2	1	3
چپڑاسی	10	5	15
کمپوزرز	4	2	6

ایمپلائمنٹ آرگنائزیشنز

نام عہدہ	مغربی پاکستان	مشرقی پاکستان	مکمل تعداد
ریجنل ٹیچرز	3	1	4
سب ریجنل ٹیچرز	7	2	9
اسسٹنٹ ٹیچرز	33	3	36
سپرنٹنڈنٹس	4	1	5
کمپوزرز	19	7	26
اپر ڈویژن کلرکس	22	7	29
لوئر ڈویژن کلرکس	78	24	102
سٹینو ٹائپٹس	18	5	23
دفتری	18	5	23
چپڑاسی	65	19	84

ٹریننگ سنٹرز

پرنسپلز	6	1	7
وائس پرنسپلز	4	x	4
فورمین	9	1	10
سپروائزرز	25	3	28
انسٹرکٹرز	95	13	108
ہوسٹل سپرنٹنڈنٹس	6	1	7
اسسٹنٹ ہوسٹل سپرنٹنڈنٹس	4	x	4
اپر ڈویژن کلرکس	6	1	7
ورکشاپ اسسٹنٹس	14	2	16
چپڑاسی	14	2	16
زیر تربیت افراد کی گنجائش	1100	150	1250

پاکستان آبزرور نے اپنے اداریے میں مشرقی بنگال سے بے انصافی کی مثالیں دیں۔ ان میں سے ایک مثال یہ تھی کہ ''مشرقی بنگال میں نیشنل بینک آف پاکستان کا خاصا بڑا دفتر ہے۔ اس کے کلریکل سٹاف کی اکثریت مغربی پاکستان سے آئی ہے۔ اس مغربی پاکستانی سٹاف کے سب کے سب ارکان انڈر گریجوایٹ ہیں اور انہیں بینکاری کا کوئی تجربہ نہیں ہے لیکن ان میں سے ہر ایک کو اتنی تنخواہ (75 روپے ماہوار) ملتی ہے جتنی کہ مشرقی بنگال کے گریجوایٹ کو دی جاتی ہے۔ مزید برآں ان میں سے ہر ایک کو 20 روپے ماہوار کمپنسیٹری الاؤنس ملتا ہے جبکہ بنگالی گریجوایٹوں کو اس قسم کا کوئی الاؤنس نہیں ملتا۔ کیا اس صورت حال کے پیش نظر ہم باور کر لیں کہ اس صوبہ میں ایسے گریجوایٹ اور انڈر گریجوایٹ نہیں ہیں جن کا مناسب تربیت کے بعد ماتحت اسامیوں پر تقرر ہو سکے۔ بظاہر یہ چھوٹی سی بات ہے لیکن ہم اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کر سکتے کہ جب کبھی بھی اس صوبہ کی جانب سے تجاویز کی پیش گئیں، کہ یہاں صوبائی کمرشل بینک کھولنے کی اجازت دی جائے تو مرکزی حکومت نے ان تجاویز کو مسترد کر دیا۔ ان حالات میں یہاں کے

لوگ یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہیں کہ کراچی کے ارباب اقتدار کو اس صوبہ کے معاشی، صنعتی اور تجارتی مستقبل کی منصوبہ بندی کی بجائے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے محفوظ اور آرام دہ جگہیں تلاش کرنے کی زیادہ فکر ہے۔ یہی حال جیوٹ بورڈ کا ہے۔ اگرچہ ابھی اس بورڈ کی کارکردگی کے بارے میں سرکاری طور پر کوئی تفصیل شائع نہیں کی گئی لیکن عام خیال یہی ہے کہ اس بورڈ اور نیشنل بینک کی جانب سے چند ایسے منظور نظر افراد کو مراعات دی گئی ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو اس صوبہ کی تقدیر سے وابستہ نہیں کیا ہوا ہے۔'' پاکستان آبزرور کے اس اداریے میں مشرقی بنگال سے بے انصافی کی بعض دوسری مثالوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا کہ ''مرکزی حکومت کی غلط مالیاتی، تجارتی اور انتظامی پالیسیوں کی وجہ سے اس صوبہ میں چھالیہ اور پٹ سن کی صنعت و تجارت بالکل تباہ ہوگئی ہے۔ یہاں کے صارفین اور خوردہ فروش مغربی پاکستان سے غیر ملکی اشیائے صرف مہنگے داموں خریدنے پر مجبور ہیں اور متعدد بنگالی گزٹیڈ حکام مجبوراً اپنے عہدوں سے مستعفی ہوگئے ہیں کیونکہ ان کی شکایات کی کہیں شنوائی نہیں ہوئی تھی۔ اس صوبہ میں پرائمری سے لے کر یونیورسٹی تک کا تعلیمی نظام چکنا چور ہو رہا ہے کیونکہ اس نظام کو قائم رکھنے اور اسے بہتر بنانے کے لئے سرمایہ ہی نہیں ہے۔ 52 لاکھ روپے کی وہ رقم کہاں گئی جو اس صوبہ کو پرائمری تعلیم کے لئے بطور گرانٹ دینے کا وعدہ کیا گیا تھا؟ ڈھاکہ یونیورسٹی کو جو گرانٹ دی جاتی ہے وہ پنجاب یونیورسٹی کی گرانٹ کے مقابلے میں کتنی ہے؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ مغربی بنگال کی حکومت پر مشرقی بنگال کی 16 کروڑ روپے کی جو رقم واجب ہے اس کی ادائیگی محض اس لئے نہیں ہو رہی ہے کہ مغربی پنجاب کی حکومت مشرقی پنجاب کی حکومت کو اتنی ہی واجب الادا رقم دینے سے انکاری ہے؟ پاکستان جو زرمبادلہ کماتا ہے اس میں سے مشرقی بنگال کو کتنا حصہ دیا جاتا ہے؟ مرکزی حکومت کی جانب سے بیرونی ممالک میں حصول تعلیم کے لئے جو وظائف دیئے جاتے ہیں ان میں سے مشرقی بنگال کو کتنے ملتے ہیں؟ پاکستان کی آمدنی کا بیشتر حصہ دفاع پر خرچ ہوتا ہے لیکن اس میں سے اس صوبہ کے لئے اور اس صوبہ میں کتنا خرچ ہوتا ہے۔؟''[6]

غیر لیگی وفود کی لیاقت علی سے ملاقاتیں اور چیمبر آف کامرس کا کھلا خط

24 دسمبر کو سنٹرل کمیٹی آف ڈیموکریٹک فیڈریشن کے ایک وفد نے لیاقت علی خان

سے ملاقات کی اور اسے بتایا کہ اس صوبہ کی جغرافیائی پوزیشن اور تجارتی ضرورتوں کا تقاضا یہ ہے کہ پاکستان میں مشرقی اور مغربی پاکستان کی دو علاقائی حکومتوں پر مشتمل ایک وفاق قائم ہو۔ 25/دسمبر کو عوامی مسلم لیگ کے ایک وفد نے عطاالرحمان خان کی زیر قیادت لیاقت علی خان سے ملاقات کے دوران کہا کہ حکومت پاکستان کو خلوص اور دیانتداری کے ساتھ اپنے عوام کی خیر سگالی پر بھروسہ کرنا چاہیے نہ کہ ان غیر ممالک کے سرٹیفکیٹوں پر جو پاکستان میں اپنا الوسیدھا کرنا چاہتے ہیں۔ وفد نے 4 اور 5/نومبر کو گرینڈ نیشنل کنونشن کی آئینی تجاویز کی تائید وحمایت کی اور مطالبہ کیا کہ صوبہ میں گھریلو دستکاری کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ مناسب تعلیم کا بندوبست کیا جائے، مہاجرین کا مسئلہ تسلی بخش طریقے سے حل کیا جائے اور شہری آزادیاں بحال کی جائیں۔ وفد نے اسے مزید بتایا کہ ''اس نے پبلک جلسوں میں بنیادی اصولوں کی رپورٹ پر اعتراضات کے جو گول مول جوابات دیئے ہیں، وہ مشرقی بنگال کے عوام کے لئے مایوس کن ہیں۔ اگر موجودہ دستور ساز اسمبلی بروقت کوئی آئین مرتب نہیں کرسکتی تو اسے توڑ کر نئے عام انتخابات کروائے جائیں اور پھر نومنتخب نمائندوں کو آئین سازی کا کام سپرد کیا جائے۔

26/دسمبر کو مقامی اخبارات میں اس وفد کی وزیراعظم کے ساتھ ملاقات کی رپورٹ چھپی تو اس کے ساتھ ڈھاکہ مسلم چیمبر آف کامرس کے صدر سخاوت حسین کا لیاقت علی خان کے نام ایک کھلا خط بھی شائع ہوا۔ اس خط میں حکومت پاکستان کے ڈائریکٹر کمرشل انٹیلیجنس وشماریات کی جانب سے شائع کردہ اعداد وشمار کا حوالہ دے کر بتایا گیا تھا کہ ''1949-50ء میں پاکستان کو برآمدی تجارت سے 121 کروڑ روپے کی کی آمدنی ہوئی تھی جس میں 67 کروڑ مشرقی بنگال نے کمائے تھے اور مغربی پاکستان کی کمائی 54 کروڑ روپے تھی لیکن درآمدات کے لئے مشرقی بنگال کو صرف 35 کروڑ روپے ملے جبکہ مغربی پاکستان کے حصے میں 77 کروڑ روپے آئے۔ اس سے قبل 1947-48ء اور 1948-49ء میں بھی برآمدی اور درآمدی تجارت کی صورتحال تقریباً ایسی ہی تھی۔'' سخاوت حسین کے اس خط میں اس قسم کی مزید کئی بے انصافیوں کا ذکر کرنے کے بعد آخر میں یہ کہا گیا تھا کہ ''گزشتہ تین سال کے تجربے کے پیش نظر اب مشرقی بنگال کے عوام کی متفقہ رائے یہ ہے کہ مرکزی حکومت کے پاس صرف دفاع، خارجہ اور کرنسی (ماسوا بینکنگ وتجارت) کے امور ہونے چاہئیں اور باقی سارے امور پر مشرقی بنگال کی انتظامیہ کا کنٹرول ہونا چاہیے۔''

وزیراعظم لیاقت علی خان نے صبح کو یہ خط پڑھا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ مشرقی بنگال کے نوروزہ دورے کی ناکامی کا بھاری بوجھ اٹھا کر واپس کراچی چلا گیا۔

کمانڈر انچیف ایوب خان کا بنگالیوں کو فوجی ملازمت سے محروم رکھنے کا بے بنیاد جواز

لیاقت علی خان کی واپسی کے تین چار دن بعد پاکستان کا نامزد کمانڈر انچیف لیفٹیننٹ جنرل محمد ایوب خان ڈھاکہ پہنچا۔ اس شخص میں ویسے تو علم و فراست اور عقل و فہم کی بہت کمی تھی لیکن یہ محض اپنے قدوقامت، شکل وصورت اور کلف دار خاکی وردی کی وجہ سے بہت برخود غلط اور فرعون مزاج تھا اور گوراشاہی انگریزی بولنے کی صلاحیت کی وجہ سے اپنے آپ کو بہت لائق فائق سمجھتا تھا۔ 1947ء میں اس نے باؤنڈری فورس میں پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے مشرقی پنجاب کے خانماں برباد مہاجرین کے بارے میں جس مجرمانہ غفلت اور شقاوت قلبی کا مظاہرہ کیا تھا اس کی وجہ سے قائداعظم محمد علی جناح اسے بہت ناپسند کرتے تھے اور اسی وجہ سے انہوں نے اس شخص کو پس پشت ڈال کر دو جونیئر افسروں کو میجر جنرل کے عہدوں پر ترقی دے دی تھی لیکن وزیراعظم لیاقت علی خان نے ستمبر 1950ء میں برطانوی کمانڈر انچیف جنرل گریسی کی سفارش پر تین چار دوسرے سینیئر پاکستانی افسروں کو نظرانداز کر کے اسے پہلا پاکستانی کمانڈر انچیف مقرر کر دیا تھا۔ اس سے قبل یہ شخص تقریباً دو سال تک مشرقی بنگال کے جنرل آفیسر کمانڈنگ کے فرائض سرانجام دے چکا تھا اور اس دوران اس نے مشرقی بنگال کے عوام اور ان کے سیاسی لیڈروں کے بارے میں اپنی حقارت اور بیزاری کا اس قدر کھلم کھلا اظہار کیا تھا کہ وہاں کے ہر طبقہ کے عوام اس سے نفرت کرنے لگے تھے۔ یہ کہا کرتا تھا کہ ''مشرقی بنگال کے نوجوانوں میں رہبری وقیادت کی صلاحیت نہیں ہے۔ ان کے لئے پبلک سکول کھولنے چاہئیں تاکہ ان کی جسمانی اور دماغی صحت اچھی ہو۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا اس وقت تک مسلح افواج کے ذمہ دار عہدوں کے لئے بنگالیوں کی بھرتی مناسب نہیں ہوگی۔'' اس پس منظر کے ساتھ جب یہ نامزد کمانڈر انچیف کی حیثیت سے دسمبر 1950ء کے اواخر میں ڈھاکہ پہنچا تو کسی کو بھی یہ امید نہیں تھی کہ اس شخص کی قیادت میں بری فوج کے ذمہ دار عہدوں پر بنگالیوں کے لئے کوئی گنجائش ہوگی۔ یکم جنوری 1951ء کو لیفٹیننٹ

جنرل ایوب خان نے ڈھاکہ کے تعلیم یافتہ حلقوں کی اس احساس ناامیدی کو صحیح ثابت کیا جبکہ اس نے ملٹری ہیڈ کوارٹر میں اخبار نویسوں سے غیر رسمی بات چیت کے دوران کہا کہ "بری فوج کے آفیسر کیڈر میں بھرتی کے لئے مشرقی پاکستان میں صحیح قسم کے افراد نہیں ملتے۔ یہاں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ انہیں زیادہ تنخواہ والی ملازمتیں ملیں۔ دفاعی افواج کے لئے بہترین قسم کے جوان آگے نہیں آتے۔ یہاں ایسے اداروں کی ضرورت ہے جن میں رہبری و قیادت کی صلاحیت رکھنے والے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت ہو کیونکہ جب زندگی اور موت کا سوال ہو تو ہم دفاعی افواج میں صرف اول درجہ کے جوانوں کو ہی لے سکتے ہیں" لیکن اس نے اپنی اس بات چیت میں یہ نہیں بتایا تھا کہ حکومت مشرقی بنگال میں ایسے اداروں اور پبلک سکولوں کے کھولنے کے لئے کیا اقدام کر رہی تھی جہاں سے اس کے "مطلوبہ معیار" کے نوجوان تیار ہو سکتے تھے اور یہ کہ اس کے پاس جوانوں کی درجہ بندی کا جو پیمانہ تھا وہ وہی تھا جو دو سو سال پہلے اس کے برطانوی آقاؤں نے مقرر کیا تھا۔ اور وہ پیمانہ یہ تھا کہ جوان کا قد و قامت تقریباً چھ فٹ ہونا چاہیے، وہ جسمانی لحاظ سے فربہ ہونا چاہیے اور اس کی چھاتی 34-32 انچ سے کم نہیں ہونی چاہیے۔ اس میں کوئی سیاسی شعور نہیں ہونا چاہیے، اسے تاریخ اور سیاسی حالات حاضرہ سے بالکل بے خبر ہونا چاہیے، اسے اخبار پڑھنے کی عادت نہیں ہونی چاہیے اور کسی اچھی کتاب میں تو اسے بالکل ہی کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیے، اسے قومی یا بین الاقوامی امور کے بارے میں کوئی سیاسی رائے نہیں رکھنی چاہیے اور اگر خدانخواستہ اس کی کوئی رائے ہو تو اس کا کبھی اظہار نہیں کرنا چاہیے، اس کا اپنے مفلوک الحال عوام سے کوئی رابطہ نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی اسے اپنے مظلوم عوام سے کوئی ہمدردی ہونی چاہیے، اس میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بالکل نہیں ہونی چاہیے، اسے حکم کا غلام ہونا چاہیے اور اسے بلا چون و چرا نظم و ضبط کی پابندی کرنی چاہیے، اسے شعوری نظم و ضبط کے تصور سے نا آشنا ہونا چاہیے، اسے اپنے ماتحت جوانوں کو محض جانور تصور کرنا چاہیے اور ان سے مسلسل اتنی مشقت کرانی چاہیے کہ انہیں ایک منٹ کے لئے بھی آرام کرنے کا موقع نہ مل سکے۔ اسے فوجی کلبوں میں بیٹھ کر مرغ کی ٹانگ کھانے، وہسکی پینے اور گورا شاہی انگریزی بولنے کا ماہر ہونا چاہیے، اسے ٹینس، گاف، شکار اور پولو کھیلنے کا شوق ہونا چاہیے، اسے سویلین کی کسی محفل میں کوئی بات نہیں کرنی چاہیے تاکہ یہ تاثر پیدا ہو کہ اس کے سینے میں کوئی بہت بڑے راز ہیں وغیرہ وغیرہ۔

لیفٹیننٹ جنرل محمد ایوب خان کی اس غیر رسمی پریس کانفرنس کے دو دن بعد 3 رجنوری 1951ء کو عوامی مسلم لیگ کا قائد حسین شہید سہروردی ڈھاکہ پہنچا۔ ایوب خان کی سہروردی کے بارے میں رائے کوئی اچھی نہیں تھی۔ چنانچہ وہ 1948ء میں ڈھاکہ میں سہروردی سے ایک ''بڑی نتیجہ خیز'' ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے 1967ء میں لکھتا ہے کہ ''کرزن ہال میں کوئی تقریب تھی۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ کسی نے سہروردی سے میرا تعارف کرایا۔ یہ ان سے میری پہلی ملاقات تھی۔ انہوں نے اپنے مخصوص بلند آہنگ لہجے میں مجھ سے خطاب کرتے ہوئے کہا ''جنرل! حکومت نے مجھے صوبہ بدر کرنے کا حکم جاری کر دیا ہے لیکن وہ نہیں جانتی کہ میں آنکھ جھپکتے میں ناظم الدین کو ختم کر سکتا ہوں۔'' میں نے کہا ''مسٹر سہروردی آپ مشرقی پاکستان کو اس کے حال پر ہی کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔ اس کی مشکلات پہلے ہی کچھ کم نہیں کہ آپ ان میں اور اضافہ کریں۔'' اس کے جواب میں انہوں نے جو کچھ کہا میں اسے دہرا نہیں سکتا کیونکہ وہ فوت ہو چکے ہیں لیکن اس سے مجھ پر ظاہر ہو گیا کہ وہ مشرقی پاکستان کی صورتحال سے کس طرح فائدہ اٹھانے کی سوچ رہے تھے۔ چونکہ وہ سیاسیات میں کلیدی حیثیت رکھتے تھے اس لئے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ صوبے میں سیاسی دباؤ کی جو تحریک چلائی جا رہی ہے اس کا زور جلد کم نہیں ہوگا۔''[7] گویا ایوب خان کی 1967ء کی تحریر کے مطابق سہروردی سیاسی لحاظ سے ایک فتنہ پرور اور شر پسند انسان تھا اور وہ اپنا سیاسی مقصد پورا کرنے کے لئے ہر حربہ جائز سمجھتا تھا۔ سہروردی کے برعکس خود ایوب خان اپنے آپ کو ایک امن پسند اور با اصول آدمی سمجھتا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ مشرقی بنگال میں کسی مسئلہ پر بھی کوئی سیاسی تحریک نہیں ہونی چاہیے۔

تاہم سہروردی نے 5 رجنوری 1951ء کو، جبکہ لیفٹیننٹ جنرل ایوب خان ابھی ڈھاکہ میں ہی تھا، ریس کورس گراؤنڈ میں ایک عظیم الشان پبلک جلسہ کو خطاب کیا۔ اس نے اپنی تقریر میں لیاقت علی خان کی مرکزی حکومت اور نور الامین کی صوبائی حکومت پر سخت نکتہ چینی کی۔ اس نے کہا کہ ''مشرقی بنگال پاکستان کی روح اور اس کے دماغ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر آج یہ کمزور ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ لیاقت علی خان نے اسے اس کے جائز حقوق سے محروم رکھا ہوا ہے۔ ہر سال پاکستان کی بری فوج کے لئے 75 کروڑ روپے مختص کئے جاتے ہیں لیکن مشرقی پاکستان کے عوام کو اپنے ملک کے دفاع میں کوئی کردار ادا کرنے کا حق نہیں دیا جاتا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی جسمانی

صحت اتنی اچھی نہ ہو جتنی کہ مغربی پاکستانیوں کی ہے تاہم انہیں موزوں فوجی تربیت کے لئے مناسب سہولتیں ملنی چاہئیں۔"[8]

ایوب خان نے 6/جنوری کو 1951ء کو ڈھاکہ ریڈیو سے اپنی الوداعی نشری تقریر میں سہروردی کے اس الزام کا جواب دیا۔ اس نے کہا کہ "مجھے معلوم ہے کہ بعض احباب مجھ سے اتفاق نہیں کریں گے کہ یہاں کے نوجوانوں میں مناسب تعلیم و تربیت کی کمی ہے۔ تاہم میں ان سے کہوں گا کہ وہ حقیقت سے گریز نہ کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ نوجوانوں کی بالعموم اور یہاں کے طالب علموں کی بالخصوص تعلیم و پرورش اس طرح نہیں ہو رہی کہ ان میں ایسی بنیادی صلاحیتیں پیدا ہوں جو ایک فوجی آفیسر بننے کے لئے درکار ہوتی ہیں۔ میں یہ بات بھرتی کے طریقہ سے اپنے طویل تعلق اور اس صوبہ کے حالات سے تفصیلی واقفیت کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔ لہٰذا جو میں کہتا ہوں اسے باور کرلو۔ اگر تم یہ نہیں کرو گے تو ہم اس صورتحال کی کبھی بھی اصلاح نہیں کرسکیں گے۔ آج کل اپنے قصور کی ذمہ داری دوسرے پر ڈالنے کا جو رواج چل نکلا ہے اس سے کسی کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ موجودہ مسئلہ کا حل یہ نہیں ہے کہ غیر معین عرصہ کے لئے رعایتی طور پر گھٹیا درجہ کے لڑکوں کو بھرتی کیا جائے۔ اس سے تمہاری بری فوج تباہ ہو جائے گی کیونکہ کوئی فوج اپنے افسروں کے بغیر بہتر نہیں ہو سکتی۔"[9] ایوب خان وغیرہ کی اس قسم کی تقریروں اور بیانات کا مطلب یہ تھا کہ مشرقی بنگالیوں کو بڑی دیر تک مسلح افواج کے آفیسر کیڈر میں بھرتی ہونے کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔ انہیں اس مقصد کے لئے پہلے گھوڑا گلی اور حسن ابدال وغیرہ کی قسم کے پبلک سکول کھولنے چاہئیں (اگرچہ مرکزی حکومت مشرقی بنگال کو مطلوبہ تعلیمی گرانٹ نہیں دیتی تھی) اور پھر جب دس پندرہ سال کے بعد بنگالی نوجوان ان پبلک سکولوں سے مناسب تعلم و تربیت حاصل کر کے فارغ ہوں گے تو پھر انہیں مسلح افواج کے آفیسر کیڈر میں بھرتی کا موقع مل سکے گا لیکن اس موقع پر بھی بنگالی نوجوانوں کا اس معیار پر اترنا مشکوک تھا جو کہ ایوب خان کے برطانوی آقاؤں نے مقرر کر رکھا تھا۔ تاریخی وجوہ کی بنا پر بنگالی نوجوانوں کے سیاسی شعور کا معیار بلند تھا اور ان کا اپنے مفلوک الحال عوام کے ساتھ گہرا رابطہ تھا اور یہ بات ایسی تھی جو ایوب خان کی بری فوج میں بھرتی کے راستے میں زبردست رکاوٹ تصور کی جاتی تھی۔

سہروردی اور بھاشانی کا صوبہ میں دورہ اور جواب میں مرکزی حکومت کی طرف سے پیرزادہ عبدالستار اور مولانا سلیمان ندوی کا دورہ

لیفٹیننٹ جنرل ایوب خان کی ڈھاکہ سے روانگی کے بعد حسین شہید سہروردی نے تین چار دن تک مشرقی بنگال کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا۔ اس دورے میں اس کے ساتھ مولانا عبدالحمید بھاشانی بھی تھا جسے 11 ردسمبر کو 14 ماہ کی نظر بندی کے بعد رہا کیا گیا تھا۔ اس کی گرفتاری 14 راکتوبر 1949ء کو پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت عمل میں آئی تھی جبکہ اس نے وزیر اعظم لیاقت علی خان کے ڈھاکہ پہنچنے پر ایک احتجاجی جلوس کی قیادت کی تھی اور 12 راکتوبر کو اس کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے ڈھاکہ میں مکمل ہڑتال ہوئی تھی۔ لاہور کے اخبار نوائے وقت کا اس وقت اس گرفتاری پر تبصرہ یہ تھا کہ ''اگر ہمارے جیسا آدمی آسام مسلم لیگ کے سابق صدر بھاشانی کی سیفٹی ایکٹ کے ماتحت گرفتاری کی خبر پڑھے تو اس کے دل پر کیا گزرے گی؟ مولانا عبدالحمید اس زمانے میں بھی قائداعظم کے نہایت ممتاز صوبائی نائبین میں سے تھے جب سر سکندر، مولوی فضل الحق، شیخ غلام حسین ہدایت اللہ میں سے کوئی بھی مسلم لیگ میں شامل نہیں تھا۔ مسٹر لیاقت علی خان ابھی آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری مقرر نہیں کئے گئے تھے اور پنجاب کے لیگی لیڈروں کی تو ابھی مسیں بھی نہ بھیگی تھی۔ مولانا بھاشانی، لیگ کے ان چند لیڈروں میں سے ہیں جن کا دامن ہر آلودگی سے پاک رہا اور جن کی ذاتی زندگی اسلامیت، خلوص، بے غرضی اور سادگی کا نمونہ تھی...... مولانا کا قصور صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بنگال کی نالائق اور نااہل وزارت پر نکتہ چینی کی۔ مگر کیا سیفٹی ایکٹ وزیروں کی حفاظت کے لئے بنایا گیا ہے؟''[10]

مولانا بھاشانی کی ستائش میں نوائے وقت کے اس تبصرے کی بنیاد یہ تھی کہ اکتوبر 1949ء میں پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے شاونسٹوں کی لیاقت علی خان کی مرکزی حکومت کے خلاف محاذ آرائی شروع ہو چکی تھی۔☆ اس لئے جو کوئی بھی جہاں کہیں کسی وجہ سے لیاقت علی خان کی مخالفت کرتا تھا اسے ''مظلوم پنجاب'' کا حلیف تصور کیا جاتا تھا۔ جنوری 1951ء تک مولانا بھاشانی، پنجابی شاونسٹوں کی نظر میں غدار وطن اور انڈین ایجنٹ اور اسلام دشمن نہیں بنا تھا بلکہ اس وقت وہ

☆ تفصیل کے لئے دیکھئے پاکستان کی سیاسی تاریخ جلد 4 جناح لیاقت تضاد اور پنجابی مہاجر تضاد

ان کا پہلے سے بھی زیادہ منظورنظر تھا کیونکہ وہ مشرقی بنگال میں عوامی مسلم لیگ کا اہم ترین ستون تھا جبکہ اس جماعت کے قائد حسین شہید سہروردی نے پنجاب میں صوبائی شاونسٹوں کے قائد نواب افتخار حسین خان ممدوٹ سے گٹھ جوڑ کر لیا تھا۔ چنانچہ جب مولانا بھاشانی نے 7رجنوری سے لے کر 11رجنوری تک حسین شہید سہروردی کے ساتھ میمن سنگھ، چٹاگانگ اور بعض دوسرے علاقوں کا دورہ کیا تو نوائے وقت اور لاہور کے بعض دوسرے اخبارات نے اس کی اچھی خاصی تشہیر کی۔ اس دورے میں ان دونوں لیڈروں کی تقریروں کا خلاصہ یہ تھا کہ بنیادی اصولوں کی سفارشات غیر جمہوری اور غیر اسلامی ہیں اور ان میں صوبائی خودمختاری کے تصور کو کچل دیا گیا ہے لہٰذا ان سفارشات کو مسترد کر کے پورے پاکستان میں عام انتخابات منعقد کرنے چاہئیں۔ لیاقت علی خان کی حکومت شہری آزادیاں سلب کر رہی ہے اور آمرانہ نظام کے لئے راستہ ہموار کیا جا رہا ہے۔ 12رجنوری کو حسین شہید سہروردی نے ڈھاکہ میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی کہ لیاقت علی خان کے حالیہ دورے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس صوبہ میں ایک ایسی تحریک نے جنم لیا ہے جس کا مقصد ملک کے دونوں حصوں کے درمیان رابطہ کو محدود کرنا ہے اور قومی زبان کا مسئلہ پھر کھڑا ہو گیا ہے۔ اس نے کہا کہ صوبائی اسمبلی کی متعدد نشستیں کافی عرصہ سے خالی پڑی ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ صوبائی حکومت ان کا ضمنی انتخاب کرانے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ اسے یہاں کے عوام کا اعتماد حاصل نہیں ہے۔

حسین شہید سہروردی کے اس دورۂ مشرقی بنگال کے موقع پر وزیر اعظم لیاقت علی خان برطانوی دولت مشترکہ کی کانفرنس میں شرکت کرنے کی غرض سے لندن میں تھا لیکن وہ 6رجنوری کو کراچی سے لندن کے لئے روانگی سے قبل مرکزی وزیر خوراک پیرزادہ عبدالستار اور علما بورڈ کے صدر مولانا سید سلیمان ندوی کو مشرقی بنگال بھیج گیا تھا تاکہ وہ وہاں نہ صرف سہروردی کے دورے کے اثرات زائل کریں بلکہ بنیادی اصولوں کی سفارشات کے حق میں بنگالی رائے عامہ کو ہموار کریں۔ چنانچہ پیرزادہ عبدالستار نے 17رجنوری تک سلہٹ، رنگپور اور بعض دوسرے شہروں کا دورہ کیا۔ اس نے اس دورے میں کسی پبلک جلسے میں تو کوئی تقریر نہ کی البتہ بعض مقامی مسلم لیگیوں اور اخبار نویسوں سے ملاقاتیں کر کے جن خیالات کا اظہار کیا ان کا خلاصہ یہ تھا کہ بنیادی اصولوں کی سفارشات 1940ء کی قرارداد لاہور کے عین مطابق ہیں۔ اس قرارداد کے مطابق

پاکستان ایک وفاقی مملکت ہوگا جس میں تمام وحدتیں مساوی حصہ ادا کریں گی۔ اس لئے اس امر کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا کہ ایک وحدت دوسری وحدت پر تسلط حاصل کر لے گی۔ مشرقی پاکستان میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پاکستان میں کئی وحدتیں ایسی ہیں جو مشرقی پاکستان پر چھا جانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ یہ خیال غلط ہے۔ مغربی پاکستان کے صوبے، مشرقی پاکستان کے خلاف متحد نہیں ہو رہے ہیں۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ مغربی پاکستان کے صوبے بعض اہم مواقع پر مشرقی پاکستان کے ساتھ مل جانے کو تیار ہوں گے۔ وفاقی مجلس قانون ساز کے ایوان زیریں میں مشرقی پاکستان کو آبادی کی اساس پر نمائندگی حاصل ہوگی لیکن مالی بل منظور کرنے کا اختیار صرف اسی ایوان کو نہیں دیا جاسکتا اس مقصد کے لئے ایوان بالا کی، جس میں سب علاقوں کو مساوی نمائندگی حاصل ہوگی، منظوری ضروری ہوگی کیونکہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو یہ بات 1940ء کی قرارداد لاہور کے منافی ہوگی۔ 17 رجنوری کو پیرزادہ عبدالستار نے ڈھاکہ ریڈیو سے اپنی الوداعی نشری تقریر میں کہا کہ "اگر مشرقی پاکستان نے مرکزی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں اکثریت کے مطالبہ پر اصرار کیا تو مغربی پاکستان کے صوبے لازمی طور پر اس کی مخالفت کریں گے۔"[11]

پیرزادہ عبدالستار کے ان بیانات پر مقامی سیاسی حلقوں نے کڑی نکتہ چینی کی۔ سنٹرل کمیٹی آف ڈیموکریٹک فیڈریشن کے کنوینر قمر الدین احمد نے پیرزادہ کے اس موقف کو لغو اور گمراہ کن قرار دیا کہ بنیادی اصولوں کی سفارشات منصفانہ اور مناسب ہیں اور قرارداد لاہور کے عین مطابق ہیں۔ اس نے کہا کہ "یہ سفارشات عوام کے لئے قطعاً منصفانہ اور مناسب نہیں ہیں البتہ یہ پیروں، میروں، ملکوں، ٹوانوں، خواجوں، ہارونوں اور اصفہانیوں جیسے مفاد پرست عناصر کے لئے بہت مناسب ہیں۔"[12] مسلم لیگی لیڈر ایم۔ اے صبور کی رائے یہ تھی کہ پیرزادہ کے یہ بیانات غیر ذمہ دارانہ، ناعاقبت اندیشانہ اور غیر تعمیری ہیں اور عوامی مسلم لیگ کے قائد مولانا عبدالحمید بھاشانی کا بیان یہ تھا کہ پیرزادہ نے اپنے اس دورۂ مشرقی بنگال کے دوران ایسی باتیں کہی ہیں جو لیاقت علی خان اپنے یہاں قیام کے دوران کہنے کی جرأت نہیں کر سکا تھا۔ یہ پیرزادہ عبدالستار جیسے لوگوں کی بدعنوانیوں کا ہی نتیجہ ہے کہ مشرقی بنگال میں گندم 18 روپے 12 آنے فی من بک رہی ہے جبکہ مغربی پاکستان میں اس کا بھاؤ 12 روپے فی من ہے۔[13]

صوبائی مسلم لیگ کی آئینی کمیٹی کی تجاویز میں بھی اسی خودمختاری کا مطالبہ کیا گیا جس کا اپوزیشن کے گرینڈ نیشنل کنونشن میں مطالبہ کیا گیا تھا

پیرزادہ عبدالستار کے اس موقف سے صوبہ مسلم لیگ کی اس 21 رکنی سب کمیٹی کو بھی پوری طرح اتفاق نہیں تھا جو کہ 21ردسمبر کو لیاقت علی کی تجویز کے مطابق میمن سنگھ میں صوبائی لیگ کونسل کے اجلاس میں آئینی تجاویز پر غور کرنے کے لئے مقرر کی گئی تھی۔ اس کمیٹی کے چھ روزہ اجلاس میں مرتب کردہ آئینی تجاویز کے بارے میں 16رجنوری 1951ء کو جو خبر شائع ہوئی تھی اس کے مطابق کمیٹی کی آئینی تجاویز اور 4 اور 5رنومبر 1950ء کے گرینڈ نیشنل کنونشن کی آئینی تجاویز میں صرف الفاظ کا فرق تھا ان کے مفہوم میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ کمیٹی کی اہم تجاویز یہ تھیں کہ:

1۔ چونکہ مشرقی پاکستان دارالسلطنت کراچی سے بہت دور ہے اس لئے مرکزی حکومت کا فرض ہے کہ وہ مشرقی پاکستان کو زیادہ سے زیادہ داخلی اختیارات عطا کرے تا کہ متعدد امور کو مقامی حالات کے مطابق خود بخود سلجھا لیا جائے۔

2۔ ایسے محکمے مشرقی پاکستان کی حکومت کو سونپ دینے چاہئیں جن کا مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے درمیان کوئی خاص تعلق نہیں۔ مشترکہ امور کی فہرست میں بہت کمی کرنی چاہیے۔

3۔ مرکز میں ایسی پارلیمنٹ قائم ہونی چاہیے جو دو ایوانوں پر مشتمل ہو۔ ایوان زیریں کی نشستوں کا تعین صوبائی آبادی کے تناسب سے مقرر کیا جائے اور ایوان بالا کی تشکیل اس طرح ہونی چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے وہ آبادی کی آئینہ داری کرے۔ شرط صرف یہ ہونی چاہیے کہ اس ایوان میں کسی ایک صوبہ کی اکثریت نہ ہو اور چھوٹے صوبوں کو ویٹیج دیا جائے۔ سارے مالی بل ایوان زیریں میں پیش ہونے چاہئیں اور ایوان بالا کو ان میں ترمیم کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہونا چاہیے۔

4۔ مرکزی وزارت ایوان زیریں کے سامنے جوابدہ ہونی چاہیے اور صوبائی وزارت کو صوبائی اسمبلی کے سامنے جوابدہ ہونا چاہیے اور مرکز کی جانب سے اس سلسلے میں کوئی

مداخلت نہیں ہونی چاہیے۔

5۔ سربراہ مملکت، وزراء، گورنروں اور پارلیمنٹ کے ارکان پر بھی اسی طرح مقدمے چلنے چاہئیں جس طرح دوسرے ملازموں پر چلائے جاسکتے ہیں۔

6۔ ہائی کورٹ اور فیڈرل کورٹ کے ججوں پر مشتمل ایک انتخابی ٹریبونل کا تقرر کیا جائے تاکہ غیر جانبدارانہ انتخابات کی ضمانت مل سکے۔

7۔ سربراہ مملکت کو ہنگامی حالات نافذ کرنے کے اختیارات صرف مسلح بغاوت یا جنگ کی صورت میں ہی ہونے چاہئیں اور حبس بے جا کی درخواست دائر کرنے کا حق کسی صورت میں معطل نہ کیا جائے۔

8۔ مرکزی حکومت کی ساری چھوٹی بڑی ملازمتوں میں مشرقی پاکستان کے لئے 50 فیصد کوٹا مقرر کیا جائے۔

9۔ برآمدی اور درآمدی تجارت کا انتظام صوبائی حکومت کی تحویل میں ہونا چاہیے۔[14]

ان آئینی تجاویز کی خصوصی اہمیت یہ تھی کہ یہ ایک ایسی سب کمیٹی نے مرتب کی تھیں جو دائیں بازو کے مسلم لیگی لیڈروں پر مشتمل تھی۔ اس سب کمیٹی کا کنوینر یوسف علی چودھری تھا اور اس کے دوسرے ارکان میں وزیر اعلیٰ نورالامین، حمید الحق چودھری، ایم۔اے۔ صبور اور خواجہ حبیب اللہ نواب آف ڈھاکہ شامل تھے۔ اگرچہ ان میں سے کسی ایک کا بھی بائیں بازو کے عناصر یا حزب اختلاف کے ''کتوں، ابولہبوں، انڈین ایجنٹوں، وطن دشمنوں، ففتھ کالمنسٹوں، کمیونسٹوں اور اسلام دشمنوں'' سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن اس کے باوجود ان کی آئینی تجاویز نفس مضمون کے لحاظ سے وہی تھیں جو ستمبر 1949ء کے بعد بائیں بازو کے عناصر یا حزب اختلاف کی جانب سے پیش کی جارہی تھیں۔ ان تجاویز کا لب لباب وہی تھا جو 4 اور 5 نومبر 1950ء کو گرینڈ نیشنل کنونشن کے آئینی مسودے اور 20 دسمبر 1950ء کی مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کی قرارداد کا تھا یعنی کہ دفاع، امور خارجہ اور کرنسی کے علاوہ باقی تمام شعبوں میں مشرقی پاکستان کو خودمختاری ملنی چاہیے اور مرکز کے اقتدار میں بھی مشرقی پاکستان کو اس کی آبادی کے مطابق حصہ ملنا چاہیے۔ مسلم لیگی لیڈروں کی ان آئینی تجاویز کا مطلب یہ تھا کہ مرکزی وزیر خوراک پیرزادہ عبدالستار نے اپنے دورۂ مشرقی پاکستان کے دوران بنیادی اصولوں کی سفارشات کے بارے میں بطور وکیل موشگافیاں کر کے ان

کا رشتہ 1940ء کی قرارداد لاہور کے ساتھ جوڑنے کی جو کوشش کی تھی اس سے بیشتر مسلم لیگی حلقے بھی مطمئن نہیں ہو سکے تھے۔ وزیر اعلیٰ نورالامین وغیرہ کے اس رویے کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان کے لئے رائے عامہ کا دباؤ نا قابل برداشت تھا۔

سلیمان ندوی کی زیر صدارت مشرقی بنگال جمیعت العلمائے اسلام کی نظام شریعت پر مبنی آئینی تجاویز میں تھیوکریٹک شخصی آمریت کا مطالبہ کیا گیا

مسلم لیگ کی سب کمیٹی کی یہ آئینی تجاویز اس لحاظ سے بھی بہت اہم تھیں کہ ان کی اشاعت اس دن ہوئی تھی جس دن کہ پاکستان کے سب سے بڑے سرکاری مولوی سید سلیمان ندوی کی اس تقریر کی تشہیر ہوئی تھی جو اس نے سلہٹ میں مشرقی بنگال کی جمیعت العلمائے اسلام کے ایک خصوصی اجلاس میں کی تھی اور جس میں اس نے علاقائی قومیت کو غیر اسلامی قرار دے کر مسلم قومیت کے نظریے کی تبلیغ کی تھی۔ مولوی ندوی نے اپنی اس تقریر میں تلقین کی تھی کہ ''پاکستانی عوام کو کمال پاشا کے ترکیہ کی تقلید نہیں کرنی چاہیے پاکستان کی پالیسی یا تو قومیت پر مبنی قرار دی جا سکتی ہے یا اسلامیت پر لیکن اگر یہ پالیسی قومیت کی کمزور بنیادوں پر قائم ہوئی تو ہزاروں بنگالی، پنجابی، پٹھان اور سندھی قومیت کے جذبات سے غلط طور پر فائدہ اٹھا کر پاکستان کے اتحاد کو پاش پاش کرنے کی کوشش کریں گے لہٰذا ہمارے لئے صرف یہ طریق کار باقی رہ جاتا ہے کہ پاکستان کی پالیسی صرف اسلامیت پر مبنی قرار دیں تاکہ بابائے ملت کے فرمان کے مطابق اس مقدس ملک کے اتحاد کو قائم رکھ سکیں۔'' اس نے فقہ کے ماہروں کو دعوت دی کہ وہ میدان میں آکر اسلامی آئین مرتب کریں۔[15] اس اجلاس میں صوبہ مسلم لیگ کا صدر مولانا اکرم خان بھی موجود تھا لیکن اس نے کوئی تقریر نہ کی۔ البتہ مولانا ظفر انصاری، مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا راغب احسن، مولانا معظم حسین اور مولانا ثناء اللہ نے تقریریں کیں۔ مولوی ندوی کی اس تقریر میں کوئی ابہام نہیں تھا۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ مشرقی بنگالیوں کو اپنے سیاسی، آئینی، معاشی، ثقافتی اور معاشرتی مفادات کا ذکر نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ اسلامی نظریہ قومیت کے منافی ہے اور اس طرح ملک کا اتحاد پارہ پارہ ہو جائے گا۔ جمیعت العلمائے اسلام کے اس اجلاس میں نظام شریعت کے مطابق ایک آئین کے مسودہ پر بھی غور کیا گیا۔ اس مسودہ میں کہا گیا تھا کہ پاکستان کی

حاکمیت خدا کے لئے ہوگی۔ مملکت میں حدود شریعت کے مطابق عمل کیا جائے گا۔ انسانی زندگی مقدس خیال کی جائے گی اور شریعت کی اجازت کے بغیر انسانی زندگی کو ختم نہیں کیا جا سکے گا۔ امیر شریعت (ہیڈ آف سٹیٹ) اپنی کونسل کی مدد سے حکومت کرے گا۔ نظام حکومت وحدانی ہوگا جس میں صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دیئے جائیں گے۔ امیر کو پارلیمنٹ منتخب کرے گی۔ وہ ایک نیک اور صالح شخص ہوگا اور جب تک عوام اس پر اعتماد کریں وہ برسر حکومت رہے گا۔ امیر اپنے ذاتی اور سرکاری اعمال کے لئے عوام کے سامنے جوابدہ ہوگا اور قرآن وسنت کے کسی اصول سے روگردانی پر عام آدمی کی طرح اس پر عدالت میں مقدمہ چلایا جا سکے گا۔ امیر شریعت کی امداد کے لئے مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کو آبادی کی بنیاد پر عوام منتخب کریں گے۔ عوام کو امیر کی وفاداری کا حلف اٹھانا ہوگا۔ نظام حکومت غیر جماعتی ہوگا اور صرف ان ہی لوگوں کو انتخاب میں کھڑے ہونے کی اجازت دی جائے گی جنہیں عوام پسند کریں گے۔ ہر اس بالغ کو ووٹ کا حق ہوگا جو ریاست کے بنیادی اصولوں پر عمل پیرا ہوگا۔ امیر شوریٰ کا صدر ہوگا اور اس کی کابینہ براہ راست اس کے سامنے جوابدہ ہوگی۔ اگر کبھی امیر شریعت اور اس کی مجلس شوریٰ میں کسی مسئلہ پر اختلاف ہوا تو یہ اختلافی مسئلہ برائے فیصلہ عوام کے سامنے پیش کیا جائے گا اور اگر عوام کا فیصلہ امیر کے فیصلے کے خلاف ہوا تو امیر کو اپنے منصب سے علیحدہ ہونا پڑے گا۔ تاہم قران وسنت میں طے شدہ کسی قانون میں کسی ترمیم کی اجازت نہیں ہوگی خواہ عوام الناس اس شرعی قانون کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر قرآن کی تعبیر کے بارے میں امیر شریعت اور اس کی مجلس شوریٰ میں اختلاف ہو تو اسی کا فیصلہ شوریٰ کرے گی۔ لیکن جہاں شریعت خاموش ہوگی وہاں شوریٰ کو قرآن وسنت کی حدود میں رہ کر فیصلہ کرنے کا اختیار ہوگا۔ لوگوں کے انفرادی اور اجتماعی امور انصاف کے ساتھ چکانے کے لئے ایک عدلیہ ہوگی جس کا تقرر امیر شریعت کرے گا لیکن یہ امیر کے انتظامی اختیارات کے ماتحت نہ ہوگی۔ عدالت کے دروازے ہر شخص پر کھلے ہوں گے اور ہر ایک سے بلا معاوضہ انصاف کیا جائے گا۔ کسی شخص کو اپنی حیثیت، اختیارات یا مرتبہ کی وجہ سے عدالتوں میں پیش ہونے سے مستثنیٰ نہیں کیا جائے گا۔ جمعیت کے اس اجلاس میں اس مسودۂ آئین کی تائید میں تقریروں کے بعد ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ صوبے میں تمام مدرسوں میں سنسکرت رسم الخط کی جگہ عربی رسم الخط میں بنگلہ زبان کی تعلیم دی جائے۔ اس سلسلے میں دس سالہ منصوبہ تیار

کیا جائے اور مرکزی حکومت کی اس سکیم پر پوری مستعدی کے ساتھ عمل کیا جائے جو اس نے بالغوں کو عربی رسم الخط میں بنگلہ زبان کی تعلیم دینے کے لئے بنائی ہوئی ہے۔[16]

جمعیت العلمائے اسلام اور پیرزادہ عبدالستار کے جواب میں پاکستان آبزرور کا ردعمل اور صوبائی مسلم لیگ کا مطالبہ کہ بنگالی یا عربی کو پاکستان کی سرکاری زبان بنایا جائے

کراچی کے سرکاری مولوی سید سلیمان ندوی کے زیر صدارت مشرقی بنگال کی جمعیت العلمائے اسلام کے مرتب کردہ اس آئینی مسودے پر ایک نظر ڈالنے سے صاف دکھائی دیتا تھا کہ مولویوں کی تنظیم مشرقی بنگال کی رائے عامہ کے برعکس پاکستان میں ایک ایسے تھیوکریٹک شخصی نظام حکومت کے حق میں تھی جس میں علاقائی خودمختاری یا عوام الناس کے اقتدار اعلیٰ کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی تھی البتہ ملاؤں کے لئے مجلس شوریٰ اور عدلیہ میں غیر محدود اختیارات کے امکانات روشن تھے۔ چونکہ سرکاری ذرائع ابلاغ سے مولویوں کے اس خصوصی اجلاس کی کاروائی کا بہت چرچا کیا گیا تھا اس لئے قدرتی طور پر مشرقی بنگال کے تعلیم یافتہ حلقوں میں یہ تاثر پیدا ہوا کہ ''لیاقت علی خان کی حکومت مذہب کے نام پر نہ صرف ان کے الگ سیاسی و معاشی تشخص کو ختم کرنے کے درپے ہے بلکہ وہ ان کی ثقافت و معاشرت کو بھی تباہ و برباد کرنے کا عزم رکھتی ہے اور یہ کہ اس عزم کی تہہ میں یہ خیال کارفرما ہے کہ مشرقی پاکستان کے عوام الناس خوش اور مطمئن ہیں صرف مٹھی بھر شرپسند صوبہ کے لئے زیادہ اختیارات اور مرکز میں آبادی کے لحاظ سے نمائندگی کے لئے ایجی ٹیشن کر رہے ہیں۔'' پاکستان آبزرور نے اپنے اداریے میں پہلے تو پیرزادہ عبدالستار کے اس قسم کے بیانات پر کڑی نکتہ چینی کی اور پھر لکھا کہ ''اس کے ساتھ ایک گروہ ایسا بھی ہے جو مشرقی بنگال کو مذہب کے نام پر یہ ترغیب دے رہا ہے کہ وہ علاقائی مفادات کے نقطۂ نگاہ سے نہ سوچے۔ مولانا اکرم خان اور بعض دوسرے ایسے ہی لوگ، جن کی پاکستان کے ساتھ وفاداری کی کوئی علاقائی بنیاد نہیں ہے، ایک ایسا نظریہ گھڑنے کی کوشش کرتے رہے ہیں جس کو آج کل کی دنیا میں کبھی بھی بروئے کار نہیں لایا جا سکتا۔ حب الوطنی اور قومی اقتدار اعلیٰ کا قطعی طور پر جغرافیائی حقیقت سے تعلق ہوتا ہے۔ سارے مسلم ممالک میں ہمیشہ سے ایسا ہی ہے لیکن یہ گروہ تاریخ کو

محض اس لئے جھٹلانا چاہتا ہے کہ مشرقی بنگال کا استحصال جاری رہے۔ ان کے حساب کے مطابق ایک مغربی پاکستانی دو مشرقی پاکستانیوں کے برابر ہوتا ہے حالانکہ اسلامی جمہوریت ایک پاکستانی اور دوسرے پاکستانی کے درمیان عدم مساوات کی بنیاد پر قائم نہیں کی جاسکتی......پیرزادہ عبدالستار نے خطرے کا سگنل بلند کر دیا ہے۔ اب مسلم لیگ کی جانب سے محض قراردادیں منظور کرنے سے کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ پیرزادہ عبدالستار نے اخباری نمائندوں سے کہا ہے کہ مسلم لیگ کی سب کمیٹی کچھ زیادہ ہی آگے چلی گئی ہے۔''[17]

تاہم صوبائی مسلم لیگ کے بیشتر صوبائی لیڈروں نے پیرزادہ عبدالستار کی قانونی موشگافیوں اور جمعیت العلمائے اسلام کی مذہبی تبلیغ کا 21 رجنوری 1951ء کو اس طرح نوٹس لیا کہ صوبائی لیگ کونسل نے مسلم لیگ کی سب کمیٹی کی ان آئینی تجاویز کو منظور کر لیا جو اس نے 15 رجنوری کو شائع کی تھیں۔ لیکن اس منظوری سے قبل پاکستان دستور ساز اسمبلی کے رکن چودھری معظم حسین نے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی سفارشات میں ملک کی سرکاری زبان سے متعلق ترمیم کرنے کے لئے ایک قرارداد پیش کی اور کہا کہ ''پاکستان کی سرکاری زبان اردو نہیں عربی ہونی چاہیے۔ چودھری معظم حسین نے کہا کہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی اس سفارش نے کہ مسلمانوں کے لئے قرآن پاک کا مطالعہ ضروری قرار دیا جائے، اس امر کو منطقی لحاظ سے ضروری بنا دیا ہے کہ عربی کو پاکستان کی قومی زبان قرار دیا جائے۔ عربی کو پاکستان کی قومی زبان قرار دینے سے پاکستان کے مسلمانوں میں مذہبی روح بیدار ہوگی اور اس طرح پاکستان، جو دنیا میں پانچویں بڑی اور اسلامی دنیا کی سب سے بڑی مملکت ہے، دنیا میں اپنا صحیح مقام حاصل کر سکے گا......اور یہ بات کسی دوسری زبان کو پاکستان کی قومی زبان قرار دینے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ عربی زبان میں ٹائپ رائیٹنگ، اسٹینو گرافی اور جدید طباعت کی سہولتیں موجود ہیں۔ عربی کے سوا کسی دوسری زبان کی ترویج میں مسلمان اتنی گہری دلچسپی نہیں لیں گے۔ اسلامی ملکوں کے مجوزہ وفاق...... کی ایک وحدت کی حیثیت سے پاکستان اسی صورت میں اپنا پارٹ اچھی طرح ادا کر سکے گا جبکہ اس کی سرکاری زبان عربی ہوگی۔ اگر صرف جمہوری اصولوں کی اساس پر پاکستان کی سرکاری زبان منتخب کی گئی تو اس صورت میں صرف بنگالی ہی کو پاکستان کی سرکاری زبان قرار پانا چاہیے جو کہ پاکستان کے 60 فیصد عوام کی زبان ہے نہ کہ اردو جو پاکستان کی آبادی کے ایک چھوٹے سے طبقہ میں بولی

جاتی ہے اوراس کو سندھی، پنجابی یا پشتو سے، جوان زبانوں کے بولنے والوں کو مساوی طور پر عزیز ہیں، زیادہ حیثیت نہیں دی جاسکتی ہے اور وہ جداگانہ طور پر پاکستان کے کسی صوبہ میں نہیں بولی جاتی۔ بدیں وجہ پاکستان کے دونوں حصوں مشرقی اور مغربی پاکستان کے لوگ صرف عربی ہی کو پاکستان کی قومی زبان قرار دینے کی حمایت کر سکتے ہیں۔'' جب چودھری معظم حسین کی اس قرارداد پر رائے شماری ہوئی تو کونسلروں کو تین دفعہ اپنے ہاتھ کھڑے کرنا پڑے۔ مجوزہ قرارداد کے حق میں 48 اور اس کے خلاف 36 ووٹ آئے۔[18] صوبائی وزراء نے قرارداد کے خلاف ووٹ دیئے کیونکہ چودھری معظم حسین نے یہ قرارداد مولویوں اور مغربی پاکستان میں اردو زبان کے علمبرداروں کے غیر جمہوری اور فسطائی رویے پر طنز کے طور پر پیش کی تھی اور اس کا اصلی مقصد اردو کو پاکستان کی قومی زبان بنانے کے فیصلے کے خلاف احتجاج کرنا تھا۔ کراچی میں اردو زبان کے علمبرداروں کی جانب سے مسلم قومیت کی تبلیغ کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ان میں سے بیشتر کی پاکستان کے ساتھ وفاداری کی کوئی علاقائی بنیاد نہیں تھی۔ یہ لوگ یو۔ پی، دہلی، بہار اور حیدر آباد (دکن) کے مہاجر تھے اور یہ اردو زبان کو اسلامی تہذیب وثقافت کی آئینہ دار قرار دیتے تھے اور بنگالی زبان کے بارے میں ان کا موقف یہ تھا کہ یہ ہندوؤں کی زبان ہے کیونکہ یہ دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور اس میں سنسکرت کے الفاظ اور اصطلاحات کی بھرمار ہے۔

حمید الحق کے صوبائی مسلم لیگ کا صدر منتخب ہونے پر دھڑے بندی......
بالآخر حمید الحق دھڑے کو مسلم لیگ سے خارج کر دیا گیا

مشرقی بنگال کی مسلم لیگ کا صدر مولانا اکرم خان بھی اسی مکتب فکر سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ کلکتہ کا رہنے والا تھا اور اس کے آباؤ اجداد بھی اصفہانیوں، سہروردیوں، آدم جیوں اور خواجوں وغیرہ کے آباؤ اجداد کی طرح غیر بنگالی تھے چونکہ پاکستان آبزرور کے بقول پاکستان سے اس کی وفاداری کی کوئی علاقائی بنیاد نہیں تھی اس لئے اس کی سیاسی اور صحافتی دکانداری کا انحصار لیاقت علی خان کی حکومت کی پشت پناہی پر تھا اور اس وجہ سے وہ مشرقی بنگال میں مرکزی حکومت کی ہر پالیسی کی کسی نہ کسی طرح تائید وحمایت کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ صوبہ میں مسلم لیگ کے وقار اور مقبولیت کے اتنی جلدی خاتمہ کی ایک بڑی وجہ اس کی اس موقع پرستی اور مفاد پرستی میں بھی پنہاں

تھی۔ چنانچہ جب دسمبر 1950ء کے تیسرے ہفتے میں لیاقت علی خان کے دورۂ مشرقی بنگال کے دوران لیگ اسمبلی پارٹی، مسلم لیگ کونسل اور ہر سطح کی دوسری مسلم لیگی تنظیموں کی جانب سے بنیادی اصولوں کی سفارش پر نکتہ چینی ہوئی تو اس نے 26/دسمبر کو لیاقت علی خان کی ڈھاکہ سے روانگی کے اگلے دن 27/دسمبر 1950ء کو صوبہ لیگ کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اب جب 20/جنوری 1951ء کو ڈھاکہ میں لیگ کونسل کا متذکرہ اجلاس شروع ہوا تو سب سے پہلے مولانا اکرم خان کا استعفیٰ منظور کرلیا گیا۔ 21/جنوری کو مسلم لیگ کی سب کمیٹی کی مرتب کردہ آئینی تجاویز کی منظوری کے بعد عربی کو پاکستان کی قومی زبان بنانے کی قرارداد منظور ہوئی۔ 22/جنوری کو کونسل کے ایک خصوصی اجلاس میں حمید الحق کو اکرم خان کی جگہ صوبہ مسلم لیگ کا صدر منتخب کرلیا گیا اور اس طرح مشرقی بنگال کی مسلم لیگ بھی سندھ، بلوچستان، پنجاب اور صوبہ سرحد کی طرح کھلم کھلا دھڑے بندی کا شکار ہوگئی۔ مشرقی بنگال میں حمید الحق چودھری، سندھ کے ایوب کھوڑو، پنجاب کے نواب ممدوٹ اور سرحد کے پیر مانکی کی طرح مسلم لیگ کے باغی دھڑے کا سرغنہ تھا۔ جبکہ اکرم خان اور یوسف علی چودھری وغیرہ بدستور وفادار سرکاری دھڑے سے وابستہ تھے۔

لاہور کے اخبار پاکستان ٹائمز کا مشرقی بنگال کی مسلم لیگ میں اس تفرقہ پر تبصرہ یہ تھا کہ ''یہ واقعہ مرکزی وزیر خوراک پیرزادہ عبدالستار کی سرزنش کے مترادف ہے کیونکہ جب وہ مشرقی بنگال گیا تھا تو اس پر الزام عائد کیا گیا تھا کہ اس نے مشرقی بنگالیوں کی توہین کی ہے، مزید برآں مشرقی بنگال میں مرکزی حکومت کی بد انتظامی اور ناانصافی کے بارے میں مواد جمع کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی ہے۔ تاہم اس سے پیرزادہ عبدالستار اور دوسرے مرکزی وزراء کی نیندیں حرام نہیں ہونی چاہئیں کیونکہ وزیراعظم پاکستان پہلے ہی یہ اعلان کر چکا ہے کہ وہ کسی بھی معاملہ میں صرف آل پاکستان مسلم لیگ کے مشورے پر ہی عمل کرے گا اور اس امر کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ لیاقت علی خان بحیثیت صدر پاکستان مسلم لیگ ایسے اقدام کا مشورہ دے گا جو کہ لیاقت علی خان کو بحیثیت وزیراعظم منظور نہیں ہوگا۔''[19] پاکستان ٹائمز کے اس ادارتی تبصرے کا مطلب یہ تھا کہ مشرقی پاکستان میں حمید الحق چودھری کی زیر قیادت مسلم لیگی دھڑا جو کچھ کہے گا وزیراعظم لیاقت علی خان کی حکومت اس پر عمل نہیں کرے گی بلکہ لیاقت علی خان بحیثیت صدر پاکستان مسلم لیگ حمید الحق چودھری کے خلاف تادیبی کاروائی کا بندوبست کرے گا۔ چنانچہ ایک ماہ

بعد 23ر فروری کو مولانا عبدالباقی کی زیر صدارت مشرقی پاکستان کی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا اور اس میں حمید الحق چودھری کے علاوہ اس کے سات ساتھیوں خوندکر عزیز الرحمان، مطیع الرحمان، نوراللہ چودھری، محی الدین احمد، علی اشرف، عبدالحمید موز مدار اور مجیب الرحمان کو پانچ سال کے لئے لیگ کی ابتدائی رکنیت سے خارج کر دیا۔ مجلس عاملہ کے اس اجلاس میں وزیر اعلیٰ نور الامین کے علاوہ تفضّل علی، حبیب اللہ بہار، ایس۔ اے۔ سلیم اور ڈاکٹر اے۔ ایم۔ مالک نے بھی شرکت کی تھی۔ اجلاس ڈھاکہ کے مجسٹریٹ کے حکم امتناعی کے باوجود اس عذر کے تحت منعقد ہوا تھا کہ وزیر اعلیٰ نور الامین پر اس عدالتی حکم کی تعمیل اجلاس کے خاتمہ کے ایک گھنٹہ بعد ہوئی تھی۔

یوں تو حمید الحق چودھری کا مسلم لیگ سے یہ اخراج اس کشمکش اقتدار کا منطقی تھا جو گزشتہ تقریباً اڑھائی سال سے اس کے اور نور الامین کے درمیان جاری تھی۔ اس کشمکش کے باعث حمید الحق چودھری کو 5ر دسمبر 1949ء کو وزارت خزانہ سے مستعفی ہونا پڑا تھا اور پھر اس کے بعد اس کے خلاف پروڈا کے تحت مقدمہ چلایا گیا تھا۔ خیال یہ تھا کہ حمید الحق چودھری اس کارروائی سے پریشان اور خوفزدہ ہو کر مرکزی اور صوبائی ارباب اقتدار کے سامنے گھٹنے ٹیک دے گا لیکن اس نے ایسا نہ کیا بلکہ وہ سندھ کے ایوب کھوڑو اور پنجاب کے نواب ممدوٹ کی تقلید کرتے ہوئے پہلے سے بھی زیادہ سرکش ہو گیا اور اس طرح وہ مشرقی بنگالیوں کے حقوق و مفادات کا عظیم علمبردار بن گیا۔ تاہم 23ر فروری 1951ء کو اس کے اخراج کی فوری وجہ یہ بھی تھی کہ 15ر فروری کو صوبائی اسمبلی کا بجٹ سیشن شروع ہونے سے پہلے اور اس کے دوران عوامی مسلم لیگ اور طلبا کی جانب سے آئینی، معاشی، تعلیمی اور دوسرے مسائل کے بارے میں ایجی ٹیشن پھر تیز ہو گئی تھی اور حمید الحق چودھری نہ صرف مسلم لیگ کے اندر بعض عناصر کو صوبائی اور مرکزی قیادت کے خلاف بغاوت کی ترغیب دیتا تھا بلکہ وہ غیر مسلم لیگی حلقوں کی عوامی ایجی ٹیشن کو بھی ہوا دیتا تھا۔

مولانا بھاشانی کا مطالبہ خود مختاری، طلبا کی ہڑتالیں اور صوبائی بجٹ سیشن میں پنجابی بیوروکریسی اور مرکز پر سخت نکتہ چینی

مولانا بھاشانی کی عوامی مسلم لیگ نے 2ر فروری 1951ء کو دستور ساز اسمبلی کے سیکرٹری کو آئین کے بنیادی اصولوں کا جو خاکہ پیش کیا تھا وہ تقریباً وہی تھا جو قبل ازیں حمید الحق

چودھری اپنی تقریروں اور بیانات میں پیش کرتا رہا تھا۔ اس خاکہ کا خلاصہ یہ تھا کہ پاکستان میں دو خودمختار علاقائی یونٹ ہوں گے۔ ایک مشرق میں دوسرا مغرب میں۔ مملکت کی حدود کے اندر ان دونوں کو پوری مقامی خودمختاری حاصل ہوگی۔ مرکز میں ایک ایوان ہوگا اور علاقائی یونٹوں میں بھی ایک ہی ایوان ہوگا۔ وزراء کی کونسل مجلس قانون ساز کے سامنے جوابدہ ہوگی۔ مرکز کے پاس صرف دفاع، خارجہ اور کرنسی کے امور ہوں گے۔ دستور کو کسی صورت میں بھی معطل نہیں کیا جا سکے گا اور صرف جنگ یا دوسری اہم بغاوت کی وجہ سے یا مملکت کے وجود، دفاع، امور خارجہ یا کرنسی کو خطرہ لاحق ہونے کی صورت میں ایوان ہی ہنگامی حالات کے اعلان کرنے کا مجاز ہوگا۔ دونوں یونٹوں کی فوجوں کے دو جنرل ہوں گے جو وفاقی حکومت کی اعلیٰ کمان کے ماتحت ہوں گے۔ یہ فوج وہیں کے باشندوں پر مشتمل ہوگی اور دوسرے تمام اختیارات یونٹوں ہی کو حاصل ہوں گے۔ بنگالی زبان کو بھی سرکاری زبان تسلیم کیا جائے گا۔[20]

6رفروری 1951ء کو مولانا بھاشانی نے ایک بیان میں بتایا کہ میں نے دسمبر 1950ء میں جیل سے رہا ہونے کے بعد مشرقی بنگال کے مختلف علاقوں کا دورہ کرنے کے بعد محسوس کیا ہے کہ جیوٹ بورڈ کی نااہلی کے باعث کاشتکاروں کی حالت بہت ہی بری ہوگئی ہے اور انہیں پٹ سن کی پیداوار میں تقریباً 30 روپے فی من کے حساب سے نقصان ہو رہا ہے چھالیہ کی قیمت دس روپے من ہے جبکہ ہندوستان میں اس کا بھاؤ 110 روپے فی من ہے۔ محکمہ سول سپلائیز کی بدعنوانی کے باعث لاکھوں من اناج تباہ ہوگیا۔ یہ محکمہ اناج کے کاروبار میں نفع کما رہا ہے۔ مغربی پاکستان میں گندم ساڑھے چھ روپے من ہے (نوائے وقت کی جنوری 1951ء کی رپورٹوں کے مطابق پنجاب میں گندم کا بھاؤ 8 روپے من تھا) جبکہ مشرقی پاکستان میں اس کا بھاؤ پونے انیس روپے من ہے مولانا بھاشانی نے مزید بتایا کہ ''یہ مسائل اس قدر سنگین ہیں کہ میں نے ان پر غور کرنے کے لئے 30 اور 31رمارچ کو ڈھاکہ میں ایک آل پارٹیز کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔''[21]

جب مولانا بھاشانی کا یہ بیان شائع ہوا تھا اس وقت ڈھاکہ، چٹاگانگ، میمن سنگھ اور سلہٹ میں میڈیکل سکولوں کے طلبا کی ہڑتال جاری تھی۔ طلبا نے یہ ہڑتال اپنے 26ردسمبر 1950ء کے نوٹس کے مطابق 26رجنوری 1951ء کو شروع کی تھی۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ متحدہ بنگال کی حکومت کے فیصلے کے مطابق انہیں مزید مختصر کورس کی تعلیم دے کر ایم۔ بی۔ ایس کی

ڈگری دی جائے۔ 9رفروری کو پولیس نے ڈھاکہ کے مختلف علاقوں میں طلبا کے ہوسٹلوں میں ان پانچ طلبا کی گرفتاری کے لئے چھاپے مارے جنہوں نے مبینہ طور پر یہ ہڑتال شروع کروائی تھی۔ 14رفروری کو صوبہ کی سیاسی فضا میں مزید کشیدگی پیدا ہوگئی جبکہ انتخابی ٹربیونل نے عوامی لیگ کے ایک رکن اسمبلی شمس الحق کے انتخاب کو کثرت رائے سے کالعدم قرار دے دیا۔ اس نوجوان نے 1949ء میں تانگیل کے حلقہ سے ایک ضمنی انتخاب میں مسلم لیگ کے ایک بہاری امیدوار خرم خان کو شکست دی تھی جو قیام پاکستان کے بعد پہلا ضمنی انتخاب تھا اور اس کے بعد نورالامین کی حکومت نے کوئی ضمنی انتخاب کرانے کی جرأت نہیں کی تھی۔

15رفروری 1951ء کو صوبائی اسمبلی کا بجٹ سیشن شروع ہوا تو وزیراعلیٰ نورالامین نے حمید الحق چودھری کے اس سوال پر کہ گزشتہ گیارہ ماہ میں اسمبلی کا اجلاس کیوں نہیں بلایا گیا یہ عجیب وغریب جواب دیا کہ اس عرصہ میں اسمبلی کی عمارت خالی نہیں تھی۔ 12رفروری تک یہ عمارت اس انکوائری کمیشن کی تحویل میں رہی تھی جو 8راپریل 1950ء کو لیاقت۔نہرو معاہدہ کے تحت قائم کیا گیا تھا۔ اسمبلی کے اس سیشن میں ایوان کے 171 ارکان میں سے صرف 80 نے شرکت کی تھی۔ 18 نشستیں اس لئے خالی تھیں کہ ان کا ضمنی انتخاب نہیں کرایا گیا تھا۔ 15رفروری کو ڈھاکہ کے مختلف تعلیمی اداروں کے طلبا نے میڈیکل سکولوں کے ہڑتالی طلبا کی حمایت میں ہڑتال کی اور 17رفروری کو تقریباً 300 طالبات نے ہڑتالی طلبا کی حمایت میں جلوس نکالا۔ ان طالبات نے ارکان اسمبلی سے اپیل کی کہ وہ ہڑتالی طلبا کی حمایت کریں مگر ایوان اقتدار میں ان کی شنوائی نہ ہوئی۔

یہ ہڑتال جاری ہی تھی کہ 21رفروری کو اسمبلی میں 52-1951ء کے لئے تین کروڑ 97 لاکھ روپے کے خسارے کا بجٹ پیش کیا گیا۔ اس بجٹ پر بحث کے دوران اسمبلی کے ایک آزاد رکن خیرات حسین نے الزام عائد کیا کہ نورالامین کی صوبائی وزارت بیوروکریسی کی تابع فرمان ہے۔ اس نے اس سلسلے میں سابق چیف سیکرٹری عزیز احمد اور محکمہ خزانہ کے ڈپٹی سیکرٹری کے نام لئے اور مزید بتایا کہ محکمہ تعلیم کا سیکرٹری بھی بنگالیوں کے خلاف پالیسیوں پر عمل پیرا ہے۔ خیرات حسین نے بجٹ میں خسارے کی مذمت کی اور کہا کہ صوبائی وزارت پہلے ہی مرکز سے 26 کروڑ روپے لے کر اس صوبہ کو کراچی میں رہن رکھ چکی ہے۔ ایک مسلم لیگی رکن عبداللہ نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہماری انتظامیہ تعلیم کے بارے میں اپنی مجرمانہ غفلت، نااہلی، اور شرمناک بے

عملی پر پردہ ڈالنے کے لئے سرمایہ کی کمی کا عذر پیش کرتی ہے۔ ہمارا حکمران ٹولہ غیر ممالک کے دوروں پر لاکھوں روپے خرچ کرتا ہے جبکہ ہمارے تعلیمی شعبہ کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہو رہی ہے۔ ایک اور مسلم لیگی رکن ایم۔ اے۔ صبور نے اس صوبائی بجٹ کو ''مرکز کے حضور میں بھکاریوں کی عرضداشت'' سے تعبیر کیا۔ اس نے نورالامین کی وزارت کو متنبہ کیا کہ وہ مشرقی بنگال کے عوام پر کوئی نیا ٹیکس نہ لگائے کیونکہ موجودہ ٹیکسوں کا ہی بوجھ اتنا زیادہ ہے کہ عوام کی کمر ٹوٹ گئی ہے۔ اگر حکومت نے مزید ٹیکس لگانے کے لئے کوئی اقدام کیا تو اس کی وجہ سے وہ چیانگ کائی شیک کی راہ پر چل نکلے گی۔ اس نے کہا کہ ہر روز یہ حقیقت واضح سے واضح تر ہو رہی ہے کہ قیام پاکستان سے صرف آقاؤں کی تبدیلی ہوئی ہے یعنی گوروں کی مسند اقتدار بادامی رنگ کے لوگوں نے سنبھال لی ہے۔

سابق وزیر خزانہ حمید الحق چودھری نے بجٹ پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ ''جب سے نورالامین نے وزارت خزانہ کا قلمدان سنبھالا ہے اس وقت کے بعد سے صوبہ کے اہم معاشی معاملات بتدریج مرکز کی انتظامیہ کے سپرد کر دیئے گئے ہیں۔ اس نے کہا کہ اس صوبہ میں فی کس آمدنی پاکستان کے دوسرے سارے صوبوں کے مقابلے میں سب سے کم ہے لیکن یہاں فی کس ٹیکس سب سے زیادہ ہیں۔ مرکز مشرقی بنگال کے عوام کی زبوں حالی کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا۔ مرکز کو اس صوبہ سے سالانہ 35 سے لے کر 40 کروڑ روپے تک آمدنی ہوتی ہے لیکن اس کی جانب سے یہاں صرف تقریباً پانچ کروڑ روپے خرچ کئے جا رہے ہیں اور یہ خرچ بھی مرکز کی جانب سے مقرر کردہ ایجنسیوں کی تنخواہوں کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس نے کہا کہ جب میں 18 ماہ قبل صوبائی وزیر خزانہ تھا تو میرا مرکز سے صوبائی و معاشی حقوق کے بارے میں جھگڑا رہتا تھا۔ اگر اس وقت صوبائی کابینہ میں میرے رفقا مجھ سے تعاون کرتے تو آج ہمارے صوبہ کی اتنی بری حالت نہ ہوتی۔ میں اب بھی صوبائی وزراء سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ جلد از جلد مرکز کو سیلز ٹیکس سے دستبردار ہونے پر مجبور کریں اور جیوٹ ڈیوٹی اور انکم ٹیکس میں سے اپنا صوبائی حصہ حاصل کریں۔''[22] بظاہر حمید الحق چودھری کی یہ اپیل اس حقیقت پر مبنی تھی کہ حکومت ہندوستان نے بالآخر 25 فروری 1951ء میں پاکستان کی کرنسی کی شرح منظور کر کے اپنی تقریباً ڈیڑھ سال پرانی تجارتی جنگ ختم کر دی تھی اور اس بنا پر مشرقی بنگال میں یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ آئندہ اس صوبہ

میں متذکرہ ٹیکسوں کی آمدنی میں اضافہ ہوگا اور یہ کہ اگر اس آمدنی میں صوبہ کو اس کا جائز حصہ دیا گیا تو یہاں عوام کی معاشی حالت کے بہتر ہونے کی صورت پیدا ہوگی۔

کراچی کے مرکزی دفاتر میں بنگالیوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی......

بنگالیوں کا کوٹہ پورا کرنے کی فضل الرحمن کی کوشش اور غلام محمد کی مخالفت

صوبائی بجٹ پر مذکورہ بحث کے دوران پنجابی بیورو کریسی اور مرکز میں پنجابی وزیر خزانہ کے محکمہ کو ہدف تنقید بنانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت تک کراچی کے مرکزی دفاتر میں بھی بنگالی اور غیر بنگالی کے مسئلہ میں خاصی شدت پیدا ہو چکی تھی۔ مرکزی وزیر تجارت و تعلیم فضل الرحمان جو قائداعظم کی زندگی میں مرکزی حکومت کے ہر فیصلے کو بلا چون چرا جامہ عمل پہنایا کرتا تھا ستمبر 1948ء کے بعد رفتہ رفتہ مرکز میں بنگالی مفادات کا علمبردار بن گیا تھا۔ دوسری طرف وزیر خزانہ غلام محمد پنجابی مفادات کا محافظ تھا اور اس کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ قومی زندگی کے ہر شعبہ میں پنجابیوں کی بالادستی قائم ہو۔ چنانچہ چودھری محمد علی لکھتا ہے کہ ”قائداعظم کی وفات کے بعد ان دونوں کے درمیان مستقل مناقشت پیدا ہوگئی تھی۔ ان میں ایک کٹاری کی طرح تیز اور پنکھ تھا اور دوسرے سونٹے کی طرح گٹھل اور بھاری۔ میں نے وزیراعظم سے کئی مرتبہ اس جاریہ تنازعہ کو ختم کرنے کے لئے کہا جو خواہ مخواہ کابینہ کے کام میں حارج ہوتا تھا لیکن وہ اس معاملے میں فلسفیانہ نقطۂ نظر سے کام لیتے تھے۔ ممکن ہے کہ وہ ان دونوں طاقتور شخصیتوں میں تصادم کو بالکل غیر مفید نہ سمجھتے ہوں۔“[23] گویا وزیراعظم لیاقت علی خان اپنی کابینہ میں بھی ”لڑاؤ اور حکومت کرو“ کی پالیسی پر عمل پیرا تھا۔ غالباً اس کا ”فلسفیانہ نقطۂ نظر“ یہ تھا کہ بنگالی مفادات اور پنجابی مفادات میں تصادم ہوگا تو ”تلیئروں“ کے مفادات کو فروغ حاصل ہوگا۔

لیاقت علی خان کی یہ پالیسی 1950ء کے اوائل میں مزید کامیاب ہوتی نظر آئی جبکہ وزیر تجارت و تعلیم فضل الرحمان کے پرائیوٹ سیکرٹری نے اپنے وزیر کے سارے محکموں کے سربراہوں کے نام ایک سرکلر میں ان کی توجہ مرکزی ملازمتوں میں بھرتی کی پالیسی کی طرف مبذول کرائی تھی اور یہ ہدایت کی تھی کہ ”آئندہ وزیر تجارت و تعلیم کے ماتحت سارے دفاتر میں گزیٹڈ اور نان گزیٹڈ عملہ کی بھرتی کے موقع پر صوبائی کوٹہ کی پوری طرح پابندی کی جائے۔ جب

کبھی کسی آسامی کو براہ راست بھرتی کے ذریعہ یا ترقی کے ذریعہ پر کرنے کا سوال پیدا ہو تو اس سلسلے میں کوئی فیصلہ وزیر کی طرف رجوع کئے بغیر نہ کیا جائے۔ وزیر موصوف تک اس مسئلہ پر بات چیت کرنے کے لئے ہر وقت رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اگر کوئی تقرری کوٹا سسٹم کے مطابق نہیں ہو سکتی تو اس معاملہ کو بھی برائے فیصلہ وزیر کے روبرو پیش کیا جائے۔" جب یہ سرکلر جاری ہوا تو پنجابی شاونسٹوں نے کہرام مچا دیا اور فضل الرحمان پر صوبہ پرستی کا الزام عائد کر کے یہ مطالبہ کیا کہ مرکزی ملازمتوں میں بھرتی محض قابلیت وصلاحیت کے مطابق ہونی چاہیے جبکہ وزیر خزانہ غلام محمد پس پردہ اس مطالبہ کی تائید وحمایت کرتا تھا۔ فروری 1951ء تک الزام تراشیوں کا یہ سلسلہ اس قدر زور پکڑ گیا کہ روزنامہ ڈان نے ایک اداریے میں اس کی سخت مذمت کی اور فضل الرحمان کے بعض محکموں میں بنگالی اور غیر بنگالی ملازمین کی تفصیل شائع کر کے یہ ثابت کیا کہ مرکزی محکموں میں بنگالیوں کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر ہے۔

ڈان کے اس طویل اداریے کا خلاصہ یہ تھا کہ مرکزی ملازمتوں میں بھرتی کے موقع پر صوبائی کوٹا سسٹم کی پالیسی پر عمل نہیں کیا جاتا۔ "ہم نے کئی بار یہ تجویز پیش کی ہے کہ اس پالیسی پر عملدرآمد کرنے کے لئے ایک خاص آفیسر مقرر کیا جائے مگر یوں معلوم ہوتا ہے کہ افسر شاہی کی سند اس سلسلے میں مناسب فیصلے کے راستے میں حائل ہے۔ یہ مفاد پرست حلقے سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری عناصر پر مشتمل ہیں اور یہ "بھائی۔ ملاپ" کے جذبے کے تحت ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ یہ لوگ ملازمتوں میں صوبائی تناسب کے اصول کی مخالفت کرتے ہیں اور جہاں ممکن ہو یہ اس پالیسی پر عمل درآمد کے راستے میں رکاوٹ حائل کرتے ہیں کیونکہ اس پالیسی کو جامہ عمل پہنانے کے لئے کوئی واضح قواعد وضوابط نہیں اور نہ ہی اس پالیسی پر عمل درآمد کی نگرانی کی جاتی ہے۔ یہ لوگ ان وزراء پر اندھا دھند حملے کرتے ہیں جو کابینہ کے اس فیصلے پر عمل کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ اس پالیسی سے صوبہ پرستی کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور سرکاری کارگردگی کا معیار پست ہوتا ہے...... ان کی یہ سب باتیں ہندو فرقہ پرستوں کی یاد دلاتی ہیں۔ یہ ایک المیہ ہے کہ پاکستان میں مسلمان مسلمانوں کے خلاف وہی حربہ استعمال کرتے ہیں۔ یہ لوگ بڑے پاکیزہ اصولوں کے علمبردار بنتے ہیں لیکن ان کا مقصد بہت ناپاک ہوتا ہے۔ یہ ملک کی انتظامیہ میں دوسرے لوگوں کو ان کے جائز حصہ سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔ اس قسم کے تنگ دل

لوگوں کے ایک ترجمان (نوائے وقت) نے حال ہی میں وزیر تجارت و تعلیم فضل الرحمان پر بہت ہی غلیظ حملے کئے ہیں کیونکہ وزیر موصوف نے تقریباً ایک سال قبل یہ حکم صادر کیا تھا کہ اس کے محکموں میں صوبائی کوٹا سسٹم کی پوری طرح پابندی کی جائے۔ اس حکم کا مقصد یہ تھا کہ مرکزی محکموں میں سارے صوبوں کے حقوق کا تحفظ ہو لیکن اس پر الزام تراشی اس تاثر کے تحت کی گئی ہے کہ وہ صرف اپنے صوبہ مشرقی پاکستان کے مفادات کو فروغ دیتا ہے حالانکہ مرکزی ملازمتوں میں مشرقی بنگال کے علاوہ صوبہ سندھ کی نمائندگی بھی نہیں ہے بلکہ ہماری اطلاع کے مطابق تو کوئی ایک سندھی بھی مرکزی ملازمت میں نہیں ہے...... ہماری استدعا ہے کہ پاکستان میں صوبہ پرستی کے خلاف اسی طرح بیان بازی نہ کی جائے جس طرح کہ غیر منقسم ہندوستان میں فرقہ پرستی کے خلاف کی جاتی تھی اور نہ ہی اسلام کا نام ان حقائق کی پردہ پوشی کے لئے استعمال کیا جائے جو کہ غیر اسلامی نہیں ہیں۔ اسلام کا نام اس پالیسی پر عمل کے راستے میں رکاوٹ کھڑی کرنے کے لئے استعمال نہیں ہونا چاہیے جو کہ ہمارے عظیم اسلامی ملک کے مختلف یونٹوں میں رہنے والے مسلمانوں میں زندگی کی آسائشوں کی منصفانہ تقسیم کے لئے وضع کی گئی ہے۔ جو لوگ دوسرے صوبوں کے لوگوں کو ان کے حقوق سے محروم کرنا چاہتے ہیں وہ خود صوبہ پرستی کے مجرم ہیں۔ موجودہ حالات میں ان حقوق کا تحفظ ایک قومی فریضہ ہے۔ صوبائی فریضہ نہیں۔ جو لوگ آج کل سرکاری کارگردگی میں اعلیٰ معیار کا شور مچاتے ہیں وہ بات بھول رہے ہیں کہ قیام پاکستان سے پہلے ان کی اپنی کارگردگی کا معیار کیا تھا۔"[24]

ڈان نے اپنے اس اداریے کے ساتھ مختلف مرکزی محکموں میں بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کی نمائندگی کے تناسب کی تفصیل بھی شائع کی جو اس نے سرکاری ریکارڈ سے حاصل کی تھی۔ اس تناسبی خاکے کی جدولیں یہ تھیں:

وزارت صنعت

عہدہ	کل تعداد	بنگالی
جائنٹ سیکرٹری	2	x
ڈپٹی سیکرٹری	2	x

انڈر سیکرٹری	5	x
اسسٹنٹ سیکرٹری	3	x
سپرنٹنڈنٹ	8	3
اسسٹنٹ انچارج	4	3
افسر بکار خاص	1	1

ڈیپارٹمنٹ آف کامرس انٹیلی جنس اینڈ سٹیٹکس

اسسٹنٹ اکونومسٹ	1	x
ریسرچ آفیسر	4	x
کنٹرولر آف انشورنس	1	x

چیف کنٹرولر آف امپورٹس اینڈ ایکسپورٹس

چیف کنٹرولر	1	x
ڈپٹی چیف کنٹرولر	3	1
اسٹنٹ چیف کنٹرولر	6	2
افسر بکار خاص	2	x
اگیزیکٹو آفیسرز	7	1
ڈائریکٹر آرکیالوجی	1	1
اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ	1	x

ڈیپارٹمنٹ آف کامرس

سیکرٹری	1	x
جائنٹ سیکرٹری	1	x
ڈپٹی سیکرٹری	3	x
انڈر سیکرٹری	4	x
اسسٹنٹ سیکرٹری	4	x

محکمہ تعلیم

مشیر تعلیم و جائنٹ سیکرٹری	1	x
ڈپٹی سیکرٹری	1	x
انڈر سیکرٹری	1	1
ڈپٹی ایجوکیشن ایڈوائزر	1	x
اسسٹنٹ سیکرٹری	1	x
اسسٹنٹ ایجوکیشنل ایڈوائزر	2	x
ایجوکیشنل آفیسرز	1	x
اسسٹنٹ ایجوکیشنل آفیسرز	1	x

ڈیپارٹمنٹ آف سپلائی اینڈ ڈویلپمنٹ

ڈائریکٹر جنرل	1	x
ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل	1	x
ڈائریکٹرز	9	x
ڈپٹی ڈائریکٹرز	13	x
افسر بکار خاص	2	x
فیلڈ آفیسر اور انسپکٹر	13	x
اسسٹنٹ ڈائریکٹرز	40	3

پٹرولیم

ڈپٹی پٹرولیم آفیسر	1	x
اسسٹنٹ کنٹرولر	1	x

کاغذ اور سٹیشنری ونگ

ڈپٹی کنٹرولر	1	x
اسسٹنٹ کنٹرولر	1	x

انسپکشن ونگ

انسپکٹنگ آفیسر	3	x
اسسٹنٹ انسپکٹنگ آفیسر	3	x
آئرن اینڈ سٹیل کنٹرولر	1	x
اسسٹنٹ آئرن اینڈ سٹیل کنٹرولر	3	x
انسپکٹر	1	x
فیلڈ آفیسر	1	x

جنرل کنسیشن ونگ

ڈائریکٹر	1	x
اسسٹنٹ ڈائریکٹر	1	x
مائننگ انسپکٹر	2	x

سنٹرل انجینئرنگ اتھارٹی

چیئرمین	1	x
ڈائریکٹر	1	x
ڈپٹی ڈائریکٹرز	6	x
ایڈمنسٹریٹو آفیسرز	1	x
اسسٹنٹ ڈائریکٹرز	5	x
ایکسٹرا اسسٹنٹ ڈائریکٹرز	8	x

کول کمشنر

کول کمشنر	1	x
اسسٹنٹ کول کمشنر	1	x
کمشنر انجینئر	1	x

پرنٹنگ وسٹیشنری

کنٹرولر	1	x
اسسٹنٹ کنٹرولر	5	2

ایکسپلوسیوز (Explosives)

چیف انسپکٹر	1	x
انسپکٹر	1	x
اسسٹنٹ انسپکٹر	1	1

ٹیکسٹائلز

چیئرمین	1	x
ڈائریکٹر	1	x
ڈپٹی ڈائریکٹرز	4	x
اسسٹنٹ ڈائریکٹرز	3	x
ایڈمنسٹریٹو آفیسر	1	x

ڈان کے اس اداریے اور اس کے ساتھ بعض مرکزی محکموں میں بنگالی اور غیر بنگالی ملازمین کے تناسب کے اس خاکے کے سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ قیام پاکستان سے کچھ عرصہ قبل بالخصوص 46-1945ء میں لاہور کے بعض مسلم اخبارات مثلاً ایسٹرن ٹائمز، انقلاب اور نوائے وقت وغیرہ آئے دن اسی قسم کے جدولیں شائع کر کے مسلمانوں کی اس دیرینہ شکایت کی طرف توجہ مبذول کرایا کرتے تھے کہ ہندوستان کی مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں بالخصوص پنجاب کی حکومت میں، مسلمان ملازمین کا تناسب بہت ہی کم ہے اور ہندو اخبارات اور سیاسی لیڈروں کا جواب یہ ہوتا تھا کہ یہ مسلم اخبارات اور سیاسی لیڈر خواہ مخواہ فرقہ پرستی کو ہوا دیتے ہیں۔ سرکاری ملازمین میں بھرتی محض قابلیت وصلاحیت کی بنا پر ہوتی ہے اور ایسا ہی ہونا چاہیے۔ جس طرح غیر منقسم ہندوستان میں ہندو اخبارات اور سیاسی لیڈروں کو فرقہ پرستی کی مذمت کرتے ہوئے اور غیر فرقہ وارانہ انڈین نیشنلزم کا پرچار کرتے ہوئے احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ مسلمانوں کو

ان کے جائز حقوق سے محروم رکھ رہے ہیں اسی طرح قیام پاکستان کے بعد پنجابی و تلیئر مفاد پرستوں اور اسلام پسندوں کو یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ صوبہ پرستی کی مذمت اور اپنی اسلام پسندیت کی آڑ میں بنگالیوں، سندھیوں، بلوچستانیوں اور پٹھانوں کے حقوق غصب کر رہے ہیں۔ جس طرح برصغیر کی تقسیم سے پہلے ہندو اخبارات اور سیاسی لیڈروں کو یہ دکھائی نہیں دیتا تھا کہ مسلمانوں کو ان کے حقوق سے مسلسل محروم رکھنے کا بالآخر کیا نتیجہ نکلے گا۔ اسی طرح پاکستان میں پنجابیوں اور تلیئروں کو یہ نظر نہیں آتا تھا کہ پسماندہ علاقوں میں ہندوؤں کے غیر فرقہ وارانہ انڈین نیشنلزم اور پاکستان میں پنجابیوں اور تلیئروں کے صوبائی عصبیت سے بالاتر مسلم قومیت کا مطلب ایک ہی تھا اور وہ یہ کہ ملک کے پسماندہ عوام کے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی استحصال کا سلسلہ بہرصورت جاری رہنا چاہیے۔ بالفاظ دیگر دونوں کا مقصد ایک ہی تھا صرف نعرے مختلف تھے۔

باب:10

لیاقت علی اپنے قتل تک بھی مشرقی بنگال کو نوآبادی بنا کر رکھنے کی ہٹ دھرمی پر قائم رہا

اردو کو قومی زبان بنانے کی حکومتی مہم کے خلاف بھرپور احتجاج کے لئے

''یوم بنگالی زبان''

ان دنوں مغربی پاکستان کے مختلف تعلیمی اداروں میں اردو کو بطور قومی زبان ذریعہ تعلیم بنانے کے لئے اعلانیہ طور پر اقدامات کئے جا رہے تھے۔ اس مقصد کے لئے 18رفروری 1951ء کو نام نہاد بابائے اردو مولوی عبدالحق کی زیر صدارت ایک 19 رکنی کمیٹی مقرر کی گئی تھی۔ اس کمیٹی کے پانچ ارکان بظاہر مشرقی پاکستان سے تعلق رکھتے تھے لیکن ان میں سے بنگالی نژاد ایک بھی نہیں تھا۔ گزشتہ ایک سال کے دوران اس کمیٹی کی سفارش پر مشرقی بنگال میں بنگالی زبان کو عربی رسم الخط میں لکھنے کی سرکاری مہم چلائی گئی تھی اور مغربی پاکستان کے شہر کراچی میں نہ صرف ایک اردو کالج قائم کیا گیا تھا بلکہ پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کے تعلیمی اداروں میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے لئے کئی ایک اقدامات کئے گئے تھے۔ مشرقی بنگال کے تعلیم یافتہ عناصر نے مرکزی حکومت کی اس ناعاقبت اندیشانہ پالیسی کے خلاف مسلسل احتجاج کیا تھا لیکن فروری 1951ء تک ان کے اس احتجاج کے مؤثر ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آئی تھی۔ لہٰذا 23رفروری کو ڈھاکہ یونیورسٹی کے بنگالی ڈیپارٹمنٹ کے پروفیسر ڈاکٹر محمد شہید اللہ، پرنسپل ابراہیم خان اور ڈاکٹر مطاہر حسین نے وزیراعلیٰ نورالامین سے ملاقات کر کے اسے ایک میمورنڈم پیش کیا۔ جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ ''صوبائی اسمبلی نے 18راپریل 1948ء کو اس وقت کے

وزیراعلیٰ خواجہ ناظم الدین کی تحریک پر متفقہ طور پر جو قرارداد منظور کی تھی اس کے مطابق بنگالی زبان کو عملی طور پر صوبائی حکومت کی سرکاری زبان بنایا جائے۔ ہمیں افسوس ہے کہ مغربی پاکستان کے مختلف صوبوں میں اردو زبان کو سرکاری زبان بنانے کے لئے بڑی مستعدی کے ساتھ اقدامات کئے گئے ہیں لیکن مشرقی بنگال میں بنگالی زبان کو سرکاری دفتروں میں رائج کرنے کے لئے ابھی تک کوئی کاروائی نہیں کی گئی۔ سرکاری محکموں میں جو غیر بنگالی کام کر رہے ہیں انہیں بھی بنگالی زبان سیکھنی چاہیے تا کہ وہ یہاں کے عوام کے مسائل کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔'' اس میمورنڈم پر بہت سے ارکان اسمبلی، پروفیسروں، وکیلوں، مصنفوں، پبلشروں اور طلبا نے دستخط کئے ہوئے تھے۔[1]

اس واقعہ کے تقریباً ایک ہفتہ بعد ڈھاکہ یونیورسٹی کے چار اساتذہ کا ایک مراسلہ پاکستان آبزرور میں شائع ہوا جس میں ڈنکے کی چوٹ یہ اعلان کیا گیا تھا کہ ''اگر صرف اردو کو پاکستان کی قومی زبان بنانے کی کوشش کی گئی تو مشرقی بنگال میں مرکزی حکومت کے اس حکم کی تعمیل نہیں کی جائے گی کیونکہ ہر ملک کے شہریوں کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ حکومت کے شرانگیز یا تباہ کن حکم کی تعمیل نہ کریں اور حکومت کوئی احمقانہ حکم صادر کرتی ہے تو اسے اس کے نتائج بھگتنے کے لئے تیار رہنا چاہیے۔'' اس مراسلے پر عبدالرزاق لیکچرر پولیٹیکل سائنس ڈھاکہ یونیورسٹی، مظفر احمد چودھری ڈھاکہ یونیورسٹی، عنایت کریم لیکچرر اکنامکس ڈھاکہ یونیورسٹی، ایس۔ مرشد لیکچرر انگلش ڈھاکہ یونیورسٹی کے دستخط تھے[2] اور پھر 7/مارچ کو ایسٹ پاکستان سٹوڈنٹس مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری خلیق نواز خان، پاکستان سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کے کنوینر روح الامین اور ایسٹ پاکستان سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ایک ممتاز لیڈر راے۔ زمان نے ایک مشترکہ بیان میں مشرقی پاکستانیوں سے اپیل کی کہ وہ 11/مارچ کو یوم بنگالی زبان منائیں...... کیونکہ 11/مارچ 1948ء کو بنگالی زبان کو قومی زبان بنانے کی تحریک شروع کی گئی تھی۔ مشترکہ بیان میں مزید کہا گیا تھا کہ اس تحریک کے ذریعے مشرقی پاکستان کے عوام نے پہلی مرتبہ غیر منصفانہ اور غیر جمہوری اقدامات کے خلاف اپنے جذبات کا مظاہرہ کیا تھا۔ اسی دن صوبائی اسمبلی میں انورا خاتون اور حمید الحق چودھری نے صوبائی حکومت پر الزام عائد کیا کہ وہ بنگالی ٹیکس دہندگان کے خرچ سے صوبہ میں اردو زبان کو فروغ دے رہی ہے اور پھر چار دن بعد 11/مارچ کو پورے مشرقی بنگال کے طلبا نے مکمل ہڑتال کر کے یوم بنگالی زبان منایا۔ اس دن جلوس نکالے گئے اور جلسے ہوئے جن میں اس مفہوم کی قراردادیں منظور کی

گئیں کہ اردو زبان کی طرح بنگالی زبان کو پاکستان کی سرکاری زبان قرار دیا جائے اور مشرقی بنگال کے سارے تعلیمی اداروں میں اس زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ ایک اور قرارداد میں میڈیکل اسکولوں کے ان طلبا کی حمایت کی گئی جنہوں نے 26 رجنوری سے ہڑتال کر رکھی تھی۔

16 رمارچ کو کومیلا میں ایسٹ بنگال یونیورسٹی اینڈ کالج ٹیچرز کنونشن منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر محمد شہید اللہ نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "اگر مشرقی بنگال میں بنگلہ کے سوا کسی اور زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی کوئی نئی کوشش کی گئی تو ہم اساتذہ کو چاہیے کہ اس کے خلاف نہ صرف زوردار احتجاج کریں بلکہ ضرورت پڑے تو بغاوت کریں۔ مشرقی بنگال میں کسی دوسری زبان کو بطور ذریعہ تعلیم مسلط کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ یہاں کے لوگوں کا قتل عام کیا جا رہا ہے۔" ڈاکٹر شہید اللہ نے مشرقی بنگال میں تعلیمی زبوں حالی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "اس علاقے کے چار کروڑ عوام کے لئے صرف ایک یونیورسٹی ہے۔ اس کے مقابلے میں مغربی پاکستان میں چار یونیورسٹیاں ہیں حالانکہ اس علاقے کی آبادی مشرقی بنگال کی آبادی سے آدھی ہے...... ہمیں تعلیم بالغاں کے لئے مشرقی بنگال کی حکومت کی سکیموں کا کوئی علم نہیں البتہ ہمیں یہ علم ہے کہ مرکزی حکومت عوام کا سرمایہ اردو رسم الخط میں بنگالی زبان پڑھانے کے تجربہ پر ضائع کر رہی ہے۔ یہ سرمایہ مشرقی بنگال کے بالغوں کو ان کی خواہش کے مطابق بنگالی زبان بنگالی رسم الخط میں اور اردو زبان اردو رسم الخط میں پڑھانے پر بہتر طریقے سے صرف کیا جا سکتا ہے۔"[3] پاکستان کے دونوں حصوں کی آبادی کے بارے میں ڈاکٹر شہید اللہ کا تخمینہ مبالغہ آمیز تھا کیونکہ کچھ عرصہ بعد حکومت پاکستان نے 1951ء کی مردم شماری کے جو اعداد و شمار شائع کئے تھے ان کے مطابق مارچ 1951ء میں پاکستان کی کل آبادی 75,842,000 افراد پر مشتمل تھی۔ اس میں سے مشرقی پاکستان کی آبادی 42,063,000 تھی اور مغربی پاکستان کی آبادی 33,779,000 تھی۔ پورے پاکستان میں ہندوؤں کی آبادی کی تناسب 14.1 فیصد تھا لیکن صرف مشرقی پاکستان میں ان کی آبادی کا تناسب 23.2 فیصد تھا۔ غالباً ڈاکٹر شہید اللہ نے پاکستان کی آبادی کے بارے میں اس قسم کا تخمینہ اس عام تاثر کی بنا پر لگایا تھا کہ 1951ء کی مردم شماری بوگس ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کی اکثریت کو، جتنا ممکن ہو سکے، کم دکھایا جائے تا کہ ملک کے آئندہ کے آئینی و سیاسی ڈھانچے میں اس علاقے کی قطعی بالادستی قائم نہ ہو سکے۔ مولانا بھاشانی نے

18 / مارچ 1951ء کو اپنے ایک بیان میں اسی قسم کا الزام عائد کیا تھا اور گورنر ملک فیروز خان نون کے اس بیان پر نکتہ چینی کی تھی کہ مشرقی پاکستان کی آبادی ''تقریباً آدھی'' ہے۔

صوبہ میں عام انتخابات کا مطالبہ کیونکہ صوبائی اسمبلی کی میعاد ختم ہو چکی تھی

مولانا عبدالحمید بھاشانی نے مذکورہ بیان ایسے وقت دیا تھا جبکہ پنجاب کے سرکاری ذرائع سے یہ خبریں آرہی تھیں کہ اس صوبہ کے عام انتخابات میں لیاقت علی خان کی مسلم لیگ جیت رہی ہے اور حزب اختلاف کی جانب سے یہ الزامات عائد ہو رہے تھے کہ حکومت نے مسلم لیگ کو کامیاب کرانے کے لئے بے شمار دھاندلیوں کا ارتکاب کیا ہے۔ مزید برآں یہ خبریں بھی آرہی تھیں کہ اگرچہ وزیراعظم لیاقت علی خان نے ملک کے سارے صوبوں میں جلد ہی عام انتخابات کرانے کا فیصلہ کیا ہے لیکن مشرقی بنگال میں انتخابات دیر میں ہوں گے۔ غالباً 1953ء میں۔ حالانکہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ (1935ء) کے تحت ساری صوبائی اسمبلیوں کی پانچ سالہ میعاد مارچ 1951ء میں ختم تصور ہونی چاہیے۔ مولانا بھاشانی کا اس بیان میں مطالبہ یہ تھا کہ ''مشرقی بنگال میں بلاتاخیر انتخابات کرائے جائیں اور ان انتخابات سے پہلے ملک میں کوئی آئین مسلط کر کے مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان کی نوآبادی بنانے کی کوشش نہ کی جائے۔ اگر اس طرح کسی ٹولے نے ہمیں غلام بنانے کی ناپاک کوشش کی تو ہم متحد ہو کر اس کی سخت مزاحمت کریں گے۔'' مولانا بھاشانی نے الزام لگایا کہ ''پنجاب میں سرکاری مسلم لیگ کی انتخابی کامیابی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قیام پاکستان کے بعد وزیراعظم لیاقت علی خان نے مغربی پاکستان میں اپنی پارٹی کے حامیوں کو بے شمار مراعات سے نوازا ہے۔ مغربی پاکستان میں سکول، کالج اور یونیورسٹیاں کھولی گئی ہیں اور فوجی ملازمتیں دی گئیں۔ جبکہ مشرقی پاکستان کے عوام کو ان سہولتوں سے محروم رکھا گیا ہے۔ پنجاب میں انتخابات سے پہلے سیلاب زدگان کو کروڑوں روپے دیئے گئے ہیں حالانکہ چٹاگانگ میں 1947ء کے سیلاب اور کھلنا میں 1950ء کے سیلاب سے متاثرہ لوگوں کو کوئی امداد نہیں دی گئی تھی۔'' بھاشانی نے اپنے بیان کے آخر میں لیاقت علی خان کو متنبہ کیا کہ وہ ''مشرقی بنگال کے انتخابات میں اپنی پارٹی کی کامیابی کے لئے سرکاری مشینری کے ذریعے کوئی دھاندلی کرنے یا ووٹ حاصل کرنے کے لئے کوئی اور حربہ استعمال کرنے کی کوشش نہ کرے۔ اگر اس

نے ایسا کیا تو یہاں اس کی بددیانت پارٹی کی قطعی موت واقع ہو جائے گی۔''[4]

بھاشانی کے اس بیان کے دس بارہ دن بعد 27 مارچ کو ڈھاکہ کے ایک نواحی گاؤں میں مشرقی پاکستان کے مختلف علاقوں کے تقریباً 200 نوجوانوں کا کنونشن منعقد ہوا جس میں مشرقی پاکستان یوتھ لیگ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس تنظیم کے صدر کے عہدے کے لئے محمود علی کا انتخاب ہوا اور جنرل سیکرٹری کا عہدہ علی احمد کو دیا گیا۔ اس کی 16 رکنی مجلس عاملہ میں نور اللہ، محمد طٰہٰ، مطیع الرحمان، تاج الدین، مطاہر حسین، کبیر احمد اور رقیہ خانم شامل تھے۔ بظاہر مشرقی بنگال کے نوجوانوں کی یہ غیر فرقہ وارانہ تنظیم بھی صوبہ میں عام انتخابات کی خبروں کے پیش نظر قائم کی گئی تھی۔ اس کے منشور میں لکھا تھا کہ ''قیام پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان میں کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ زمینداری نظام بدستور قائم ہے۔ (اگرچہ مشرقی بنگال اسمبلی نے زمینداری کے خاتمہ کا قانون فروری 1950ء میں منظور کر دیا تھا لیکن کسی آئینی کاروائی کی وجہ سے مارچ 1951ء تک اس پر عمل نہیں ہوا تھا۔) بے روزگاری عام ہے۔ درمیانہ طبقہ میں بھی اب کوئی سکت نہیں رہی۔ عورتیں بدستور غلامی کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ پورا مشرقی پاکستان معاشی بحران کا شکار ہے۔ تعلیمی شعبہ تباہ ہو رہا ہے۔ قومی صحت برباد ہو چکی ہے اور کسی کو ان حالات کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی اجازت نہیں کیونکہ ساری شہری آزادیاں سلب کی جا چکی ہیں۔'' منشور میں مندرجہ مطالبات یہ تھے کہ ''پاکستان کو برطانوی کامن ویلتھ سے الگ ہو کر ایک آزاد جمہوری ری پبلک بننا چاہیے۔ اس ری پبلک میں ہر لسانی صوبہ کی خودمختاری کا پورا حق ملنا چاہیے اور ہر ذیلی قوم کو ثقافتی اور سیاسی خودمختاری حاصل ہونی چاہیے۔ ہر شخص کو بلا لحاظ ذات اور عقیدہ شہریت کے مکمل حقوق حاصل ہونے چاہئیں اور اردو کے ساتھ بنگالی زبان کو بھی قومی زبان قرار دینا چاہیے۔ زمینداری نظام کا بلا معاوضہ خاتمہ کیا جائے۔ نوجوانوں کو فوجی تربیت دی جائے۔ اقلیتوں کے مذہبی اور دوسرے حقوق کا تحفظ کیا جائے اور سارے جابرانہ قوانین منسوخ کئے جائیں۔''

گورنر فیروز خان نون نے پریس کانفرنس میں بنگالیوں کے متعلق بیہودہ اور حقارت آمیز گفتگو کی

جب نوجوانوں کا مذکورہ کنونشن منعقد ہوا تھا اس وقت ڈھاکہ شہر میں دفعہ 144 نافذ تھی

اور پاکستان آبزرور پر سنسر شپ عائد ہو چکی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ میڈیکل اسکولوں کے طلبا کی ہڑتال جاری تھی اور دوسرے تعلیمی اداروں کے طلبا بھی آئے دن ان ہڑتالیوں کی حمایت میں مظاہرے کرتے رہتے تھے۔ اس کی دوسری وجہ غالباً مشرقی بنگال کے گورنر ملک فیروز خان نون کی اس انتہائی اشتعال انگیز یاوہ گوئی میں مضمر تھی جو اس نے 22 مارچ کو کراچی میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کی تھی۔ اس پریس کانفرنس میں مشرقی پاکستان کا وزیر صحت حبیب اللہ بہار بھی موجود تھا اور اس کی وہیں کھلے عام صوبائی گورنر سے جھڑپ بھی ہوگئی تھی۔ ڈان کی رپورٹ کے مطابق اس پریس کانفرنس میں فیروز خان نون کی ذاتی رائے یہ تھی کہ مشرقی بنگال میں ایک عام دیہاتی بنگالی زبان سیکھنے کے لئے عربی رسم الخط کو ترجیح دے گا لیکن وزیر صحت کا خیال یہ تھا کہ بنگالی زبان عربی رسم الخط کے مقابلے میں آسان بنگالی رسم الخط میں زیادہ آسانی سے سیکھی جا سکتی ہے۔ گورنر صاحب کا کہنا تھا کہ بنگالی مسلمانوں میں عربی رسم الخط میں قرآن مجید پڑھنے کی بہت تمنا ہے کیونکہ وہ ابھی تک ایسا نہیں کر سکے تھے۔ لیکن وزیر صحت کا موقف یہ تھا کہ مشرقی بنگال کے مسلمانوں کی بھاری اکثریت عربی رسم الخط سے اچھی طرح واقف ہے اور وہ قرآن مجید عربی رسم الخط میں ہی پڑھتے ہیں۔ فیروز خان نون کی رائے یہ تھی کہ مشرقی پاکستان کے چند دانشور حلقے نہیں چاہتے کہ وہاں اردو رسم الخط رائج ہو۔ تاہم اس نے تسلیم کیا کہ "اگر کسی نے دانشوروں کی خواہش کے خلاف کوئی کاروائی کرنے کی کوشش کی تو یہ اس کی غلطی ہوگی کیونکہ دانشور عوام کے لیڈر ہیں"، لیکن اس کی پریس کانفرنس کے بارے میں پاکستان آبزرور کی رپورٹ قدرے مختلف تھی۔ اس رپورٹ میں لکھا تھا کہ ملک فیروز خان نون نے جو پنجابی ہے، اس یقین کا اظہار کیا کہ مشرقی بنگال کا ایک عام دیہاتی عربی رسم الخط کو ترجیح دے گا۔ اس پر وزیر صحت حبیب اللہ بہار نے، جو یونہی پریس کانفرنس میں آ گیا تھا، شدید اختلاف کا اظہار کیا اور کہا کہ مشرقی بنگال کا عام دیہاتی بنگالی رسم الخط کو ہی ترجیح دے گا۔ حبیب اللہ بہار نے مزید کہا کہ "اگرچہ پاکستان کی مرکزی حکومت اردو زبان کی بہت شیدائی ہے اور اس نے مشرقی پاکستان میں اردو کو فروغ دینے کے ارادے کا بھی اظہار کیا تھا لیکن ابھی تک اس سلسلے میں وہاں کچھ نہیں کیا گیا۔ مرکزی حکومت نے اس مقصد کے لئے صوبائی حکومت کو نہ تو کوئی سرمایہ دیا ہے اور نہ ہی اساتذہ مہیا کئے ہیں۔ اس نے بتایا کہ مرکزی حکومت نے مشرقی بنگال کی حکومت سے کوئی مشورہ کئے بغیر بنگالی زبان کے لئے

عربی رسم الخط رائج کرنے کی غرض سے کچھ رقم مختص کی تھی لیکن مرکز کی یہ پروپیگنڈا مہم ناکام ہوگئی ہے۔'' بعد میں پریس کانفرنس کے دوران جب فیروز خان نون نے بچے کا نام رکھوانے کے بارے میں بنگالی رواج کا ذکر کیا تو حبیب اللہ نے اس کی تردید کی۔ نون نے یہ کہا تھا کہ ''میں نے اپنے اہلکاروں سے سنا ہے کہ جب کسی بنگالی مسلمان کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اسے کسی ہندو کے پاس لے جاتا ہے جو اس کا ایسا نام رکھتا ہے جس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ ہندو نام ہے یا مسلمان نام ہے۔'' حبیب اللہ بہار نے نون کے اس بیان پر احتجاج کیا اور کہا کہ ''ہمارے ہاں کبھی ایسی بات نہیں ہوئی۔'' اس پر نون نے جواباً کہا کہ ''اگر بہار کہتا ہے کہ ایسی بات کبھی نہیں ہوئی تو پھر اس کی اس بات کو مان لینا چاہیے۔''[5]

چونکہ پریس کانفرنس میں فیروز خان نون کی یہ گفتگو نہایت بیہودہ اور حقارت آمیز تھی، اس لئے پاکستان آبزرور نے اپنے اداریے میں اس پر شدید احتجاج کیا۔ اداریے میں لکھا تھا کہ ''فیروز خان نون نے پہلے بھی کئی مرتبہ مبینہ طور پر یہ کہا تھا کہ مشرقی بنگال کے بیشتر مسلمانوں کے ختنے نہیں ہوئے اور یہ کہ انہیں مرغ ذبح کرنے کا طریقہ نہیں آتا۔ فیروز خان نون کو یہاں گورنری کے عہدے پر فائز ہوئے کافی عرصہ ہو گیا ہے۔ اگر ابھی تک اسے بنگالی مسلمانوں کے بارے حقائق کا علم نہیں ہوا تو ہماری تجویز یہ ہے کہ اسے کسی دن ایک عام شہری کی حیثیت سے ضلع نواکھلی میں جا کر کسی درمیانی عمر کے آدمی سے اس سلسلے میں استفسار کرنا چاہیے...... جب فیروز خان نون اس صوبہ کا گورنر مقرر ہوا تھا تو ہر مشرقی پاکستانی نے اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ پہلا پاکستانی گورنر، ملک کے دونوں حصوں کے عوام کے درمیان خیر سگالی اور باہمی مفاہمت کے رابطہ کے طور پر کام کرے گا۔ قیام پاکستان کے بعد ابتدا ہی سے یہاں بعض افراد کا ایک گروہ مشرقی بنگال کے خلاف باقاعدہ الزام تراشی کر رہا ہے۔ یہ لوگ پاکستان اور اسلام کے خودساختہ محافظین ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مشرقی بنگال کے عوام ثقافتی، سیاسی اور معاشی طور پر پسماندہ ہیں۔ انہوں نے ایک مرتبہ اشارۃً یہ الزام بھی عائد کیا تھا کہ ایک صوبائی وزیر، جس نے بنگالی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے مطالبہ کی حمایت کی تھی، ہندوستان کا ایجنٹ ہے۔ ان ''فرشتوں'' کا یہ خیال ہے کہ یہ تہذیب سکھانے کے لئے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ یہ صرف ہماری ثقافت پر حملہ کرنے سے ہی مطمئن نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے مشرقی بنگال کی سیاسی اور مالی خودمختاری کے ہر مطالبہ پر کیچڑ

اچھالنا شروع کر دیا۔ جن لوگوں نے بھی اس صوبہ کے عوام کی جائز شکایات کے بارے میں آواز بلند کی ہے، انہوں نے انہیں بلا امتیاز کمیونسٹ اور ففتھ کالمنسٹ قرار دیا ہے۔ ابتداً اس صوبہ کے عوام نے ان نعروں پر حقارت کا اظہار کیا لیکن کچھ عرصہ بعد یہ تاثر پھیلنا شروع ہو گیا کہ یہ نعرے مشرقی پاکستان کو مستقل طور پر سیاسی، ثقافتی اور معاشی لحاظ سے زیر دست رکھنے کی سنجیدہ کوشش کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نتیجتاً اس صوبہ میں تلخی بڑھتی رہی ہے اور اب یہ اس سطح پر پہنچ گئی ہے کہ ملک کا ہر خیر خواہ خطرہ محسوس کرنے لگا ہے۔ بدقسمتی سے ملک کے دونوں حصوں کے عوام ایک دوسرے سے بے خبر ہیں۔ ہمیں توقع تھی کہ فیروز خان نون مغربی پاکستان میں مشرقی پاکستان کے بارے میں بے خبری کو دور کرنے کی مہم چلائے گا لیکن اب ہمیں یہ جان کر دکھ ہوا ہے کہ وہ خود ہی یہاں کے عوام کی زندگی سے بالکل ناواقف ہے۔"[6] مگر مشرقی پاکستان میں مقیم مغربی پاکستان کے ان "فرشتوں" پر اس اداریے کا خوشگوار اثر نہ ہوا۔ چنانچہ اسی دن اس اخبار پر سنسر شپ عائد کر دیا گیا۔

5 اپریل کو گورنر نون کے سیکرٹری نے ڈھاکہ میں ایک پریس نوٹ کے ذریعہ 22 مارچ کی پریس کانفرنس کی توضیح کی۔ اس پریس نوٹ میں کہا گیا تھا کہ "ہز ایکسیلنسی گورنر مشرقی بنگال کے عوام کا بہت احترام کرتے ہیں۔ ان عوام نے اتحاد اور یقین محکم کے ساتھ پاکستان بنایا تھا اور اب وہی اس کی تعمیر کر رہے ہیں اور ان کے ساتھ پاکستان کی قوت اور ترقی وابستہ ہے۔ گورنر کو رسم الخط کے سوال میں مداخلت کرنے کی کوئی خواہش نہیں۔ اسکولوں میں رسم الخط کونسا ہونا چاہیے اس کا فیصلہ اس صوبہ کے عوام خود ہی کر سکتے ہیں۔" تاہم اس پریس نوٹ میں اس حقارت آمیز گفتگو کی غیر مبہم الفاظ میں تردید نہیں کی گئی تھی جو فیروز خان نون نے کراچی کی پریس کانفرنس میں کی تھی اور نہ ہی اس سے منسوب کردہ اس بیان کی تردید کی گئی تھی کہ "مشرقی بنگال کے بیشتر مسلمانوں کے ختنے نہیں ہوئے اور انہیں مرغ ذبح کرنے کا طریقہ نہیں آتا۔"

گورنر نون کی طرف سے اپنی صفائی میں اس قسم کا وضاحتی بیان جاری کروانے کی ایک وجہ یہ تھی کہ اگر وہ اس مسئلہ پر خاموشی اختیار کرتا تھا تو وہ مشرقی بنگال کے عوام کی نفرت کا واحد ہدف بن جاتا اور اس طرح وہ سیاسی طور پر ذلیل و خوار ہو کر اپنے عہدے سے سبکدوش ہوتا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ جب وہ اس پریس کانفرنس کے چند دن بعد کراچی سے واپس ڈھاکہ پہنچا تھا تو اسے معلوم ہوا تھا کہ مقامی طلبا قومی زبان کے مسئلہ پر پھر ایجی ٹیشن کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔

بنگالی کوقومی زبان بنانے کے لئے ڈھاکہ یونیورسٹی ایکشن کمیٹی کا میمورنڈم

4/اپریل 1951ء کو ڈھاکہ یونیورسٹی کی سٹیٹ لینگوئج کمیٹی آف ایکشن کی جانب سے پاکستان دستور ساز اسمبلی کے ارکان کو ایک میمورنڈم دیا گیا جس میں متنبہ کیا گیا کہ ''اگر بنگالی زبان کو ملک کی قومی زبان نہ بنایا گیا تو یونیورسٹی کے طلبا چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ مرکزی حکومت اردو زبان کی شاید اس لئے سرپرستی کر رہی ہے کہ مرکزی کابینہ اور سیکرٹریٹ میں بعض اہم شخصیتوں کی مادری زبان ہے۔ اردو زبان بنگلہ کے مقابلے میں مفلس اور تہی دامن ہے۔ یہ پاکستان کے کسی صوبہ کی بھی مادری زبان نہیں ہے۔ یہ ایک زوال پذیر ثقافت کی علامت ہے۔ مرکزی حکومت کے یہ ارباب اقتدار اس زبان کو مشرقی بنگال کے عوام پر مسلط کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں اور اس خواب کی تعبیر کے لئے ہزاروں روپے اس صوبہ میں عربی رسم الخط رائج کرنے پر خرچ کر رہے ہیں جبکہ یہاں کے پرائمری سکولوں کے اساتذہ فاقہ کشی کر رہے ہیں۔'' یاد رہے کہ پرائمری اساتذہ نے اپنی تنخواہوں میں اضافہ کے لئے یکم اپریل سے ہڑتال کر رکھی تھی اور انہوں نے اپنے بازوؤں پر جو بیج لگائے ہوئے تھے ان پر لکھا تھا کہ ''ہم بھوکے ہیں۔''

میمورنڈم میں اس موقف کی تردید کی گئی کہ اردو اسلامی زبان ہے اور یہ کہ اردو کثیر اللسانی صوبوں کے درمیان ایک مشترکہ زبان کی حیثیت اختیار کر سکتی ہے۔ 5/اپریل کو ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبا نے ''فلیگ ڈے'' منایا جس کا مقصد یہ تھا کہ بنگالی زبان کو قومی زبان بنانے کے مطالبہ کے حق میں رائے عامہ کو منظم کیا جائے اور چندہ جمع کیا جائے۔ 6/اپریل کو باریسال کی ڈسٹرکٹ مسلم لیگ کے زیر اہتمام ایک جلسہ عام میں مطالبہ کیا گیا کہ بنگالی زبان کو ملک کی قومی زبان بنایا جائے اور مشرقی بنگال میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ (1935ء) کے مطابق بلا تاخیر عام انتخابات کرائے جائیں۔

سرکاری حلقوں کی جانب سے کراچی میں دو روزہ اردو کانفرنس میں بنگلہ تحریک کے خلاف تقریریں

6/اپریل کو ڈھاکہ میں ایک سرکاری افسر الطاف گوہر کی زیر صدارت حلقۂ ارباب ذوق کا ایک غیر معمولی اجلاس ہوا جس میں اردو ادب و زبان کی ترویج و ترقی کے لئے ایک پانچ

سالہ منصوبہ تیار کیا گیا۔ قومی زبان کے مسئلہ پر ان دونوں فریقین کی جانب سے اس قسم کی کاروائیاں اس لئے ہو رہی تھیں کہ کراچی میں دستور ساز اسمبلی کا اجلاس 11 رمارچ سے تھوڑے تھوڑے دنوں کے بعد ہو رہا تھا اور ہر فریق کی کوشش یہ تھی کہ اگر مرکزی اسمبلی کے اس سیشن میں قومی زبان کا مسئلہ اٹھے تو فیصلہ اس کے حق میں ہو۔ اس سلسلے میں 14 اور 15 راپریل کو کراچی میں مرکزی وزیر مواصلات سردار عبدالرب نشتر کی زیر صدارت دو روزہ اردو کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نے افتتاحی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''اگرچہ مشرقی بنگال، سندھ، پنجاب، سرحد اور بلوچستان کے دیہات میں اردو زبان نہیں بولی جاتی تاہم ان دیہاتی علاقوں کے لوگ اس زبان سے واقفیت رکھتے ہیں۔ بنگالی، سندھی، پنجابی اور پشتو کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جاسکتی۔ یہ زبانیں صرف متعلقہ علاقوں کی حدود کے اندر ہی بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ اس لئے صرف اردو ہی پورے پاکستان کی مشترکہ زبان ہوسکتی ہے۔'' اس نے کہا کہ ''قائداعظم کی مادری زبان اردو نہیں تھی لیکن اس کے باوجود قومی مفاد کے تحت انہوں نے یہ محسوس کیا تھا کہ صرف اردو ہی واحد زبان ہے جو مختلف علاقوں کے لوگوں کو متحد رکھ سکتی ہے۔ اور اس لئے انہوں نے اعلان کیا تھا کہ اردو پاکستان کی قومی زبان ہوگی۔'' مرکزی وزیر مواصلات سردار عبدالرب نشتر نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ''زبان کا اتحاد پاکستان کی ایک بڑی بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور یہ اتحاد صرف اردو کو ہی قومی زبان بنانے سے حاصل ہوسکتا ہے۔'' اس نے کہا کہ ''نہ تو عربی میں اور نہ ہی کسی صوبائی زبان میں قومی زبان بننے کی موزونیت ہے۔ صرف اردو ہی قومی زبان بن سکتی ہے جو ملک کے مختلف علاقوں میں بآسانی سمجھی جاسکتی ہے۔'' اس نے اس موقف کی تردید کی کہ اردو زبان برصغیر میں مسلمانوں کے اقتدار کے زوال کی علامت ہے اور کہا کہ مشرقی بنگال میں جو ''مفاد پرست عناصر'' بنگالی زبان کو قومی زبان بنانے کا مطالبہ کر رہے ہیں اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔'' ''بابائے اردو'' ڈاکٹر عبدالحق نے اپنی تقریر میں کہا کہ ''اردو زبان کے مقابلے میں کسی دوسری زبان کو قومی زبان کی حیثیت نہیں دی جاسکتی۔ اردو زبان میں ایک ابھرتی ہوئی قوم کی ضروریات پوری کرنے کی ساری صفات موجود ہیں۔ اگر اس زبان کی بجائے کسی صوبائی زبان کو قومی زبان بنانے کا دعویٰ کیا گیا تو اس طرح صوبائی رکاوٹیں کھڑی ہوجائیں گی اور پاکستان کی سالمیت اور یکجہتی ناپید ہوجائے گی۔

اس کانفرنس کے دوسرے دن کا اجلاس مولانا اکرم خان کی زیر صدارت ہوا اور وزیر تعلیم فضل الرحمان نے انگریزی زبان میں خطبہ استقبالیہ پڑھا جس میں اس نے اردو کو قومی زبان بنانے کی حمایت کی۔ مولانا اکرم خان نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ''مشرقی پاکستان میں بعض مفاد پرست لوگوں کے پروپیگنڈے کی وجہ سے مخالفین اردو کا ایک گروہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس گروہ کو ایسے لوگوں کی حمایت حاصل ہے جو ہر اس چیز کے خلاف ہیں جو ان کی نظروں میں اسلامی ہے۔ چونکہ اردو برصغیر میں مسلمانوں کی ثقافت کی مظہر ہے اس لئے وہ اس کے مخالف بن گئے ہیں۔''[7] لاہور کا اخبار نوائے وقت ان دنوں پنجاب کی دولتانہ حکومت کے زیر عتاب تھا اور نوائے وقت کی اشاعت بند ہونے کی وجہ سے اس ادارے کی جانب سے ''جہاد'' کے نام سے ایک اخبار شائع ہو رہا تھا۔ چنانچہ اس اخبار کا کراچی کی اردو کانفرنس کے انعقاد سے تقریباً ایک ہفتہ قبل تبصرہ یہ تھا کہ ''موجودہ صوبائی عصبیت کو ختم کرنے کا مؤثر علاج اردو کو قومی زبان تسلیم کرنے اور اسے ترقی دینے میں ہے اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ ہر پاکستانی کسی صوبے کے امتیاز کے بغیر اردو بولے اور دوسروں کو اس پر آمادہ کرے''[8] لیکن اس کانفرنس کے خاتمہ کے دو دن بعد ڈھاکہ کے اخبار پاکستان آبزرور نے مولانا اکرم خان کی تقریر کے اس حصے پر بہت تنقید کی کہ مشرقی بنگال میں جو لوگ اردو کی مخالفت کرتے ہیں وہ اسلام دشمن ہیں۔ اخبار کا قیاس یہ تھا کہ ''غالباً اکرم خان کا اشارہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر محمد شہید اللہ کی جانب تھا۔'' جس نے ڈان کی 15 رمارچ 1951ء کی رپورٹ کے مطابق 12 رمارچ 1951ء کو ڈھاکہ کے ایک جلسہ میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی تھی کہ عربی زبان کو پاکستان کی قومی زبان بنایا جائے اور 1952ء سے مشرقی بنگال کے اسکولوں میں مسلمان طلبا کے لئے عربی زبان کو لازمی کلاسیکی مضمون قرار دیا جائے اور اردو کو لازمی مضمون قرار دینے کی کوشش ترک کر دی جائے۔ ڈاکٹر شہید اللہ کی اس تجویز کے مطابق اس جلسہ میں متفقہ طور پر ایک قرارداد بھی منظور کی گئی تھی۔ پاکستان آبزرور نے اپنے اس اداریے کے آخر میں اس اطلاع پر افسوس کا اظہار کیا کہ ''ایک اعلیٰ بنگالی افسر کو ڈھاکہ سے محض اس لئے تبدیل کر دیا گیا ہے کیونکہ وہ بنگالی زبان کی حمایت کرتا تھا۔''[9]

پرائمری سکولوں کے اساتذہ کی ہڑتال اور صوبائی حقوق کے لئے عوامی مسلم لیگ کی قرارداد

''آل پاکستان'' اردو کانفرنس کی مذکورہ کاروائی سے مشرقی بنگال میں مسلم لیگ اور اردو زبان کے مخالفین میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ان مخالفین میں بنگالی زبان کے وہ بااثر پرائمری اساتذہ پیش پیش تھے جنہوں نے اپنی تنخواہوں میں اضافہ کے لئے یکم مارچ سے ہڑتال کر رکھی تھی۔ پاکستان آبزرور کی رائے یہ تھی کہ ''حکومت کے اپنے مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ ان اساتذہ کے مطالبات تسلیم کر لئے جائیں کیونکہ اگر یہ ہزاروں اساتذہ غیر مطمئن رہے تو وہ آئندہ انتخابات میں مسلم لیگ کے لئے مشکلات پیدا کریں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بھوک اور احتجاج سے تنگ آ کر کمیونزم کا راستہ اختیار کرلیں گے۔'' ان پرائمری اساتذہ کے علاوہ مسلم لیگ اور اردو کے مخالفین میں شمالی اضلاع کے وہ مفلوک الحال کسان بھی شامل تھے جن کی زندگی مولانا بھاشانی کے 20 راپریل کے بیان کے مطابق اشیائے صرف کی مہنگائی کی وجہ سے اجیرن ہوگئی تھی اور جن کی ربیع کی فصل خشک سالی کے باعث تباہ ہوگئی تھی۔

26 راپریل کو بھاشانی کی عوامی مسلم لیگ کی تنظیمی کمیٹی نے ان سارے مخالفین کے جذبات کی ترجمانی کی جبکہ اس نے ایک قرارداد میں مشرقی پاکستان کے عوام سے اپیل کی کہ وہ متحد ہو کر مکمل صوبائی خودمختاری کے لئے جدوجہد کریں تاکہ تعلقات خارجہ، دفاع اور کرنسی کے امور کے سوا باقی سارے امور پر صوبائی حکومت کا کنٹرول ہو۔اس قرارداد میں کہا گیا تھا کہ ''جب سے پاکستان قائم ہوا ہے مرکزی حکومت سول اور فوجی ملازمتوں، تجارت، تعلیم اور ترقیاتی گرانٹس کے بارے میں مشرقی پاکستان کے مطالبات کو مسلسل نظر انداز کررہی ہے۔مرکز نے سیلز ٹیکس اور دوسرے ذرائع آمدنی اپنی تحویل میں لے کر صوبائی خزانے میں مستقل طور پر کمی پیدا کر دی ہے۔ مرکزی حکومت کی جیوٹ پالیسی سے کاشتکار اور درمیانہ طبقہ بالکل تباہ ہوگیا ہے۔مشرقی بنگال کی حکومت نے صوبہ کے حقوق کے تحفظ کے لئے ابھی تک کوئی مؤثر جدوجہد نہیں کی۔اس کے برعکس کوششیں کی جارہی ہیں کہ مٹھی بھر لوگوں کو وزارتیں اور دوسرے اعلیٰ عہدے پیش کرکے (یہ اشارہ مرکزی حکومت کے 24 راپریل کے اس فیصلے کی طرف ہے جس کے تحت عزیز الدین احمد کو ڈاکٹر

اے۔ ایم مالک کی جگہ مرکزی وزیر مملکت مقرر کیا تھا اور غیاث الدین پٹھان کو نائب وزیر مملکت کا عہدہ دیا تھا) عوام کی بے اطمینانی کا سدباب کیا جائے۔ اس لئے تنظیمی کمیٹی مشرقی پاکستان کے بارے میں مرکزی حکومت کے رویے کی زوردار الفاظ میں مذمت کرتی ہے اور صوبائی حکومت اور عوام سے اپیل کرتی ہے کہ وہ مشرقی پاکستان کے ذرائع آمدنی پر مرکزی حکومت کی دست درازی کے خلاف جدوجہد کریں۔ تاکہ ہمارے صوبہ کو مکمل خودمختاری حاصل ہو اور مرکز کے پاس صرف تعلقات خارجہ، دفاع اور کرنسی کے امور رہ جائیں۔'' تنظیمی کمیٹی کی ایک اور قرارداد میں مطالبہ کیا گیا کہ ''ہائی کورٹ کے ججوں پر مشتمل ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا جائے جو اس الزام کی تحقیقات کرے کہ چند مفاد پرستوں نے پٹ سن کے کاروبار سے کتنا منافع کمایا ہے اور کاشتکاروں کو کس قدر نقصان پہنچا ہے۔'' کمیٹی کی اطلاع یہ تھی کہ اصفہانی جیسے چند مفاد پرستوں نے مرکزی وزارت خزانہ کی اعانت سے بے پناہ منافع کمایا ہے اور لاکھوں کسانوں کو نقصان پہنچایا ہے۔ تیسری قرارداد میں تنظیمی کمیٹی نے پاکستان دستورساز اسمبلی پر اس وجہ سے عدم اعتماد کا اظہار کیا ہے کہ وہ ''گزشتہ چار سال کے عرصے میں آئین بنانے میں ناکام رہی ہے۔ مسلم لیگ پارٹی کے قائد نے آئین سازی کرنے کی بجائے اپنی پارٹی کے 44 ارکان میں سے 36 کو وزارتیں، گورنریاں، اور سفارتیں وغیرہ دے کر اندرون ملک اور بیرون ممالک میں لوگوں کے اعتماد پر ضرب لگائی ہے۔ اس نے ایسا اس لئے کیا ہے کہ عوام پر اس کا غلبہ قائم رہے۔'' کمیٹی کا مطالبہ یہ ہے کہ ''مشرقی پاکستان میں 1952ء میں عام انتخابات کرائے جائیں اور ان انتخابات کی نگرانی کے لئے ہائی کورٹ کے ججوں پر مشتمل ایک ٹربیونل مقرر کیا جائے۔ تنظیمی کمیٹی کو تشویش ہے کہ ملک میں حکمران جماعت کا رجحان مطلق العنانیت اور آمریت کی طرف ہے۔ اس رجحان کے خاتمہ کے لئے ضروری ہے کہ سیفٹی قوانین منسوخ کئے جائیں، جن لوگوں کو مقدمہ چلائے بغیر نظربند کر رکھا ہے انہیں رہا کیا جائے اور شہری آزادیاں بحال کی جائیں۔ ہمارے عظیم ملک میں صحت مند جمہوریت کی نشوونما کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے۔''[10] عوامی مسلم لیگ نے یہ قرارداد مولانا بھاشانی کے شمالی اضلاع کے دورے کے بعد منظور کی تھی اور اس کے الفاظ اور نفس مضمون کی تلخی سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان اضلاع کے عوام میں مسلم لیگ کی مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے خلاف سخت غم وغصہ پایا جاتا تھا۔ قرارداد کی تلخی اس عام تاثر پر مبنی تھی کہ مرکزی حکومت کو عنقریب مشرقی

بنگال میں انتخابات کرانے پڑیں گے اوران انتخابات کی تیاری کے لئے مسلم لیگی ارباب اقتدار کے خلاف ایک تندوتلخ چارج شیٹ کی ضرورت تھی۔

مرکزی وزیر ڈاکٹر محمود حسین کا اشتعال انگیز بیان اور بنگالیوں کے تلخ ردعمل میں اضافہ

6 رمئی 1951ء کو مرکزی حکومت میں ریاستی امور کے وزیر مملکت ڈاکٹر محمود حسین نے اس چارج شیٹ میں مزید تلخی بھردی جبکہ اس نے کراچی میں حلقۂ ارباب ذوق کے سالانہ اجلاس میں اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ''اردوزبان کوقومی زبان بنانے سے صوبائی زبانوں سے کوئی بے انصافی نہیں ہوگی۔ اس سلسلے میں جس خدشے کا اظہار کیا جارہا ہے وہ یاتو لاعلمی پر مبنی ہے یا وہ ایسے لوگوں کا پیدا کردہ ہے جو ابھی تک پاکستان کی سالمیت ویکجہتی کے خلاف ہیں۔'' اس نے کہا کہ ''چونکہ یہ بات سب لوگ تسلیم کرچکے ہیں کہ اردو پاکستان کی بین الصوبائی اورقومی زبان ہوگی، چونکہ پاکستان کی جدوجہد کے دوران اس سلسلے میں مسلم عوام سے وعدہ کیا گیا تھا اور یہی نعرہ لگایا گیا تھا اس لئے اس سوال پر مزید بحث کی گنجائش نہیں۔''[11] یہ ڈاکٹر محمود حسین دہلی کا رہنے والا تھا اوراس کا شمار پاکستان میں چوٹی کے چند اہل علم افراد میں ہوتا تھا۔ یہ مشرقی پاکستان سے پاکستان دستورساز اسمبلی کا رکن منتخب ہوا تھا لیکن وہاں کے عوام کے مسائل اور جذبات سے اس قدر ناواقف تھا کہ اسے احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ اس کی اس قسم کی باتیں ملک میں اتحاد ویکجہتی پیدا کرنے کی بجائے انتشار وافتراق پیدا کرنے کا باعث بنتی تھیں۔ کراچی میں اس قسم کے بزرجمہر جب مشرقی بنگال میں بنگالی زبان کے علمبرداروں کو اسلام دشمن اور وطن دشمن قرار دیتے تھے تو انہیں پتہ نہیں ہوتا تھا کہ اس طرح وہ خود اسلام دشمنی اور وطن دشمنی کے مرتکب ہوتے تھے کیونکہ پاکستان آبزرور کے بقول اس طرح بنگالی زبان کے حامیوں کا رویہ سخت سے سخت تر ہوجاتا تھا۔ ڈاکٹر محمود حسین کی تقریر کا یہی نتیجہ نکلنا تھا اور یہی نکلا۔ 9 رمئی کو سنٹرل کمیٹی آف ڈیموکریٹک فیڈریشن کے کنوینر قمرالدین احمد نے ایک بیان میں ڈاکٹر محمود حسین کی اس تقریر کو اس امر کا ایک اور ثبوت قرار دیا کہ مرکزی حکومت مشرقی بنگال کے ثقافتی اور معاشی سلامتی کے مطالبہ کو مسترد کرنے کی ناپاک کوشش کررہی ہے۔ بیان میں مزید کہا گیا کہ ''کچھ عرصہ قبل مولانا اکرم خان نے

اردو کی مخالفت کرنے والوں کو اسلام دشمن قرار دیا تھا۔ اس نے اپنے فتوے کی تائید میں کسی آیت یا حدیث کا حوالہ نہیں دیا تھا اس لئے اس کے اس فتوے کی تردید کا کوئی فائدہ نہیں۔ البتہ میں اس کی توجہ رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اس حدیث کی طرف مبذول کراتا ہوں کہ جو لوگ عادتاً جھوٹ بولتے ہیں، وعدہ شکنی کرتے ہیں اور امانت میں خیانت کرتے ہیں ان پر جنت کے دروازے بند کر دیئے جائیں گے۔"[12]

پنجاب کے سیلاب زدگان کے ساتھ فراخدلی مگر بنگال کے سیلاب زدگان کی بہت واویلے کے بعد امداد

10رمئی 1951ء کو وزیر اعظم لیاقت علی خان نے مشرقی بنگال کے عوام کے جذبات کی تلخی میں اور بھی اضافہ کر دیا جبکہ اس نے کراچی میں میمن برادری کے نمائندوں سے پنجاب کے سیلاب زدگان کی امداد کے لئے تین لاکھ روپے کی تھیلی وصول کی اور اس موقع پر اس نے اس امر پر بہت خوشی کا اظہار کیا کہ پاکستان میں کاروباری حلقوں نے بہت منافع کمایا ہے۔ اس نے کہا کہ "سرمایہ جمع کرنے میں کوئی برائی نہیں۔ برائی یا اچھائی صرف اس بات میں ہے کہ اس سرمائے کا استعمال نامناسب طریقے سے ہوتا ہے یا مناسب طریقے سے۔ اگر دولت کا استعمال مناسب طریقے سے کیا جائے تو اس سے اچھی بات کوئی اور نہیں ہوتی اور اگر اس کا استعمال نامناسب طریقے سے کیا جائے تو یہ ایک لعنت ہوتی ہے۔"[13] مشرقی بنگال میں لیاقت علی خان کی اس تقریر کا برا اثر ہونے کی دو وجوہ تھیں۔ ایک یہ کہ میمن برادری نے پاکستان کے اصفہانیوں اور خوجوں، شیخوں، اور سیدوں وغیرہ کی طرح بے پناہ منافع پٹ سن کے کاروبار میں کمایا تھا اور مرکزی حکومت نے اس سلسلے میں ان غیر بنگالی کاروباری شہریوں کی پوری طرح اعانت کی تھی اور دوسری یہ تھی کہ لیاقت علی خان نے تین لاکھ روپے کی یہ رقم پنجاب کے سیلاب زدگان کے لئے وصول کی تھی حالانکہ وہ انہیں عام صوبائی انتخابات سے پہلے بھی کروڑوں کی امداد دے چکا تھا۔ مشرقی بنگال کے عوام کے نقطۂ نگاہ سے لیاقت علی خان کا یہ رویہ اس لئے قابل اعتراض تھا کہ گزشتہ چھ ماہ کے عرصے میں ایک زبردست طوفان باد و باراں نے میمن سنگھ اور فرید پور کے اضلاع میں اور سیلاب نے کھلنا کے ضلع میں اتنی تباہی مچائی تھی کہ صوبہ کے ریلیف منسٹر مفیض الدین احمد کے 7رمئی کے بیان کے

مطابق ان متاثرہ علاقوں کے لوگوں کی معاشی حالت بہت ہی ناگفتہ بہ ہوگئی تھی۔ ان کی فصلیں تباہ ہوگئی تھیں اور خوراک کی کمی کے باعث انہیں قحط کا خطرہ درپیش تھا۔ 11 رمئی کو کھلنا کے ایوان تجارت کے صدر اور مشرقی بنگال اسمبلی کے رکن اے۔ صبور کا بیان یہ تھا کہ اس ضلع کے 135 مربع میل علاقے کے تقریباً 9 لاکھ لوگ فاقہ کر رہے ہیں اور 13 رمئی کو مولانا بھاشانی نے ایک بیان میں کھلنا، جیسور اور کشور گنج کے سیلاب زدگان کے بارے میں مسلم لیگی حکومت کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کی اور بتایا کہ ''وزیر اعلیٰ نورالامین نے کھلنا کے سیلاب زدگان کے لئے مرکزی حکومت سے ایک کروڑ روپے کی امداد طلب کی تھی مگر وہاں سے کورا جواب ملا ہے۔ حالانکہ مرکزی حکومت کے سال رواں کے میزانیہ میں 20 کروڑ روپے کا جو منافع ہوا ہے وہ زیادہ تر مشرقی بنگال کی برآمدی تجارت کی وجہ سے ہوا ہے۔'' بھاشانی نے اس بیان کے آخر میں ایسے سارے متعلقہ لوگوں کو متنبہ کیا کہ ''ان کا یوم حساب قریب آرہا ہے اور عوام ان سے پورا حساب چکا لیں گے۔''

13 رمئی 1951ء کو ڈھاکہ کے وکٹوریہ پارک میں مولوی فضل الحق کی زیر صدارت ایک جلسہ ہوا جس میں مشرقی بنگال کے عوام سے اپیل کی گئی کہ وہ کھلنا اور جیسور کے بعض علاقوں کے مفلوک الحال عوام کی مشکلات دور کرنے کے لئے دل کھول کر چندہ دیں۔ مولانا بھاشانی نے اپنی تقریر میں بڑے سرمایہ داروں اور پٹ سن کے بیوپاریوں کو ان لوگوں کی معاشی بدحالی کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ مولوی فضل الحق، ایم۔ اے صبور اور پاکستان آبزرور کے ایڈیٹر عبدالسلام نے اپنی تقریروں میں بھاشانی کے اس الزام کی تائید کی۔ 15 رمئی کو ڈان کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا کہ ضلع فرید پور میں 11 رمئی کو جو طوفان بادوباراں آیا تھا اس سے کم از کم 300 افراد جاں بحق ہو گئے ہیں۔ مدھو اکھلی کے علاقے کے 12 دیہات میں 3000 سے زائد مکان پیوست زمین ہو گئے ہیں ہزاروں خاندانوں کے لئے اب سر چھپانے کی کوئی جگہ نہیں رہی اور دھان اور پٹ سن کی فصلیں بالکل تباہ ہوگئی ہیں اور پھر اس قسم کا جلسہ 24 رمئی کو کھلنا میں ہوا جس میں مرکزی حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ کھلنا کے سیلاب زدگان کی امداد کے لئے ایک کروڑ روپے کی امداد کرے۔ چونکہ یہ مطالبہ دو ایک ماہ قبل وزیر اعلیٰ نورالامین سرکاری طور پر بھی کر چکا تھا اس لئے بالآخر 29 رمئی کو کراچی میں اعلان ہوا کہ مرکزی حکومت نے مشرقی بنگال کے آفت زدہ عوام کی امداد کے لئے 25 لاکھ روپے کی گرانٹ دی ہے اور قائداعظم ریلیف فنڈ کی مرکزی کمیٹی نے اس مقصد کے

لئے 5 لاکھ روپے کی منظوری دی ہے۔

بظاہر مرکزی حکومت کی جانب سے مشرقی بنگال کے لئے 30 لاکھ روپے کی امداد کی رقم اس منظوری کا پس منظر صرف بھاشانی، فضل الحق، صبور اور بعض دوسرے سیاسی لیڈروں کی احتجاجی تقریروں اور بیانات تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ اس میں ڈھاکہ کے اخبارات کی وہ بے شمار رپورٹیں اور ادارتی تبصرے شامل تھے جن میں مثالیں دے دے کر یہ واویلا کیا گیا تھا کہ بین الاقوامی منڈی میں پٹ سن کی مانگ میں یکایک اضافہ ہونے کے باعث نہ صرف غیر بنگالی خوجوں، میمنوں، بوہروں، شیخوں اور سیدوں وغیرہ نے کروڑوں روپے کا منافع کمایا ہے بلکہ مرکزی حکومت کو اس وجہ سے کم از کم 20 کروڑ روپے کی بچت ہوئی ہے جبکہ یہاں کے غریب کسانوں اور درمیانہ طبقہ کی معاشی حالت بد سے بدتر ہوگئی ہے۔

صوبائی حق تلفیوں پر بنگالی اخباروں کا غم وغصہ اور لیاقت علی کی جانب سے ایک برطانوی ماہر اور ایک تحقیقاتی کمیٹی کا تقرر

پاکستان آبزرور نے 22، 23 اور 24 رمئی 1951ء کو ''صوبہ پرستی'' کے زیر عنوان تین اداریوں میں مشرقی بنگال اور مرکز کے درمیان روز بروز بگڑتے ہوئے حالات پر تبصرہ کیا۔ ان اداریوں میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا گیا تھا کہ ''جب کبھی مشرقی بنگال کے عوام اپنے صوبے کی تجارت اور صنعت وحرفت کے بارے میں مرکز کی غفلت کا ذکر کرتے ہیں جب کبھی وہ شکایت کرتے ہیں کہ چٹاگانگ کی بندرگاہ کی ترقی کا کام نہیں ہورہا، جب کبھی وہ کہتے ہیں کہ ان کی چائے اور چھالیہ کی صنعت تباہ ہوگئی ہے، جب کبھی وہ پٹ سن کی تجارت میں جیوٹ بورڈ کی بدعنوانیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں، جب کبھی وہ اناج اور دوسری ضروریات زندگی کی کمیابی اور مہنگائی کا رونا روتے ہیں اور جب کبھی وہ اردو کے ساتھ بنگالی کو بھی سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ کرتے ہیں تو ان کی نیت پر شبہ کرکے ان پر صوبہ پرستی کا ٹھپہ لگادیا جاتا ہے حالانکہ یہاں کے تعلیم یافتہ حلقے بحیثیت مجموعی اپنے ملک کو طاقتور اور مربوط دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ بلاشبہ ایسے عناصر بھی ہیں جو یہ دیکھ کر خوش ہوں گے کہ اس صوبہ کا مرکز کے ساتھ رشتہ ہمیشہ کے لئے منقطع ہوجائے لیکن ایسے عناصر صرف مشرقی بنگال تک ہی محدود نہیں ہیں اور مرکزی حکومت اس صوبہ

کے بارے میں بے بنیاد خدشات کا شکار ہو کر ایسے عناصر کے ہاتھوں میں کھیل رہی ہے۔ آزادی سے قبل مشرقی بنگال کے لوگ غیر مسلموں کی بالا دستی کا شکار تھے۔ آزادی کے بعد انہیں اس قسم کے شکنجے سے رہائی ملنی چاہیے تھی لیکن ایسا نہ ہوا۔ قیام پاکستان کے بعد جو غیر بنگالی افسر، بیوپاری اور پیشہ ور لوگ یہاں آئے وہ اس صوبہ کے دل کی آواز اس لئے نہ سمجھ سکے کہ انہیں یہاں کے عوام سے ہمدردی نہیں تھی۔ انہوں نے اپنے احساس برتری کا مظاہرہ کر کے یہاں کے بہت سے حساس لوگوں کو اپنا مخالف بنالیا۔ انہوں نے اس صوبہ کی زبان، ادب، ثقافت اور فنی زندگی کو سمجھنے کی کوشش کرنے کی بجائے یہ فرض کر لیا کہ یہاں کے لوگوں کے پاس کوئی بھی قابل فخر چیز نہیں ہے۔ چونکہ ہندوستان اور پاکستان نے محض نعروں کے زور پر آزادی حاصل کی تھی اس لئے ہم میں سے بعض لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ ملک کے ہزاروں پیچیدہ مسائل کو بھی محض جذباتیت کے ذریعہ حل کر لیں گے حالانکہ یہ مسائل صرف حقیقت پسندی اور دانشمندی کے ذریعہ ہی حل ہو سکتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ غیر سیاسی اور غیر سرکاری ارکان پر مشتمل ایک کمیشن مقرر کیا جائے جو مشرقی بنگال کی شکایات کا جائزہ لے کر یہ بتائے کہ ان کا ازالہ کیسے ہو سکتا ہے۔"[14]

27رمئی 1951ء کو ایک شخص تفضّل حسین نے اپنے ایک مضمون میں پاکستان آبزرور کے اس موقف کی تائید کی اور یہ الزامات عائد کئے کہ "(1) جیوٹ بورڈ سے منسلکہ اصفہانی جیسے کاروباری لوگوں نے نیشنل بینک آف پاکستان سے سرمایہ لے کر پٹ سن کی تجارت سے کروڑوں روپے کمائے ہیں۔ (2) صوبائی محکمہ سول سپلائیز نے اناج اور دوسری ضروریات زندگی کی سرکاری تجارت کے ذریعے دیہاتی عوام کو بے پناہ نقصان پہنچایا ہے۔ یہ محکمہ کسانوں سے 10 روپے من چاول خرید کر ساڑھے بائیس روپے من کے حساب سے فروخت کرتا رہا ہے۔ دیہاتی عوام کو سمگل شدہ ساڑھی 16 سے لے کر 20 روپے تک ملتی ہے اور سرسوں کے تیل کا بھاؤ پانچ سے چھ روپے فی سیر تک ہے۔ (3) مرکزی حکومت نے صوبہ کے بہت سے ذرائع آمدنی غصب کر لئے ہیں اور صوبائی حکومت اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکی۔ حیرت ہے کہ ان حالات میں وزیر اعلیٰ نور الامین مسلم لیگ کی مقبولیت کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس نے اپریل 1949ء میں تانگیل کے ضمنی انتخاب کے بعد کوئی ضمنی انتخاب نہیں کرایا۔ اگر اسے اپنے اس دعویٰ کے صحیح ہونے کا یقین ہے تو اسے چاہیے کہ وہ ہائی کورٹ کے ججوں پر مشتمل الیکشن کمیشن کی نگرانی میں عام انتخابات کرائے۔ اس طرح مسلم

لیگ کی مقبولیت کے ڈھول کا پول کھل جائے گا۔"

چونکہ وزیر اعظم لیاقت علی خان کا اپنا منصوبہ بھی یہ تھا کہ وہ پنجاب میں عام انتخابات کے بعد یکے بعد دیگرے دوسرے صوبوں میں بھی عام انتخابات کرائے گا اس لئے اس نے جون میں اپنے انتخابی تقاضے کی بنا پر مشرقی بنگال کی بعض شکایات کا اس طرح ازالہ کرنے کی کوشش کی کہ اس نے صوبوں اور مرکز کے درمیان ذرائع آمدنی کی تقسیم کے مسئلہ کا جائزہ لینے کے لئے ایک برطانوی ماہر سر جیرمی ریز مین (Jeremy Raisman) کی خدمات حاصل کیں۔ یہ شخص متحدہ ہندوستان میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا ممبر فنانس رہا تھا اور اس وجہ سے اسے مالی امور کا بہت بڑا ماہر تصور کیا جاتا تھا۔ اسی مہینے میں اس نے مرکزی محکمہ دفاع کے وزیر مملکت ڈاکٹر محمود حسین کی زیر صدارت ایک اور تحقیقاتی کمیٹی بھی مقرر کی جس کے ذمے یہ کام کیا گیا کہ وہ پہلے تو یہ معلوم کرے کہ پاکستان کی مسلح افواج میں بھرتی ہونے والے بنگالی نوجوانوں کی تعداد اتنی کم کیوں ہوتی ہے اور پھر یہ سفارش کرے کہ کس طرح مسلح افواج میں بنگالیوں کی بھرتی میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ لیاقت علی خان کو مختلف مسائل کا جائزہ لینے کے لئے تحقیقاتی کمیٹیاں مقرر کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا تھا۔ وہ قبل ازیں بلوچستان کے سیاسی امور، ریاستی امور، قبائلی امور اور کئی دوسرے مرکزی اور صوبائی امور کا جائزہ لینے کے لئے اس قسم کی کمیٹیاں مقرر کر چکا تھا۔ کیونکہ تحقیقاتی کمیٹی مقرر کرنے کا عملاً مطلب یہ ہوتا تھا کہ متنازعہ فیہ مسئلہ کم از کم دو ایک سال کے لئے تو کھٹائی میں پڑا رہے گا جبکہ متعلقہ لوگ اس کمیٹی سے امیدیں وابستہ کر کے خاموشی سے بیٹھے رہیں گے لیکن مشرقی بنگال میں اس قسم کی تحقیقاتی کمیٹیوں سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوسکتا تھا۔ وہاں گزشتہ چار سال میں برملا طور پر اتنی ناانصافیاں ہوچکی تھیں کہ ان میں سے کسی ایک کا بھی تحقیقاتی کمیٹی کے ذریعے ازالہ نہیں ہوسکتا تھا۔

صوبوں کے لئے فلاحی رقم کی تقسیم میں مشرقی بنگال کے ساتھ شدید بے انصافی اور پنجابی شاونسٹوں کی تنگ نظری

مشرقی بنگال سے مرکزی حکومت کی تازہ ترین ناانصافی 4/جون 1951ء کو منظر عام پر آئی جبکہ وزیر اعظم لیاقت علی خان نے ملک کے مختلف علاقوں کی فلاحی سکیموں کے لئے دس کروڑ

روپے کی گرانٹ کا اعلان کیا۔ اس گرانٹ کی تقسیم اس طرح کی گئی تھی کہ مشرقی بنگال کو 3 کروڑ، پنجاب کو اڑھائی کروڑ، سندھ کو ایک کروڑ، صوبہ سرحد کو 75 لاکھ، سرحدی قبائلی علاقوں کو 40 لاکھ، بہاولپور کو 35 لاکھ، بلوچستان کو 40 لاکھ اور کراچی کو ایک کروڑ 45 لاکھ روپے اور دیگر علاقوں کو 15 لاکھ روپے دیئے گئے تھے۔ قبل ازیں وزیر خزانہ غلام محمد نے مارچ 1951ء میں بجٹ پیش کرتے وقت صوبوں کی معاشرتی بہبود کے لئے 8 کروڑ روپے کے خرچ کا اعلان کیا تھا۔ اس میں سے مشرقی بنگال کو اڑھائی کروڑ، پنجاب کو اڑھائی کروڑ، سندھ کو ایک کروڑ، صوبہ سرحد کو 75 لاکھ بلوچستان کو 40 لاکھ اور کراچی کو 45 لاکھ روپے اور سرحدی و دیگر علاقوں کو 40 لاکھ روپے دیئے گئے تھے۔ اس رقم کو ملا کر ملک کے مختلف علاقوں کو فلاحی کاموں کے لئے 18 کروڑ روپے دیئے گئے تھے۔ گویا:

مشرقی بنگال	=	ساڑھے پانچ کروڑ
پنجاب	=	پانچ کروڑ
سندھ	=	دو کروڑ
سرحد	=	ڈیڑھ کروڑ
بلوچستان	=	اسی لاکھ
کراچی	=	ایک کروڑ نوے لاکھ
سرحدی علاقے	=	اسی لاکھ
بہاولپور	=	پینتیس لاکھ
دیگر علاقے	=	پندرہ لاکھ

اس بندر بانٹ سے ظاہر تھا کہ ملک کی تقریباً 56 فیصد آبادی کو 30 فیصد اور باقی 44 فیصد آبادی کو 70 فیصد رقم دی گئی تھی۔ فلاحی رقم کی تقسیم میں یہ کھلم کھلا ناانصافی اس حقیقت کے باوجود کی گئی تھی کہ مشرقی بنگال کے عوام پاکستان میں سب سے زیادہ غریب تھے اور اس بنا پر ان کی فلاح و بہبود کے لئے زیادہ سے زیادہ رقم کی ضرورت تھی۔ بالخصوص ایسے حالات میں کہ ان دنوں پاکستان کو 75 فیصد زرمبادلہ کی آمدنی پٹ سن سے ہوتی تھی لیکن ستم بالائے ستم یہ تھا کہ پنجاب کے شاونسٹ عناصر اس تقسیم سے بھی خوش نہیں تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ "پنجاب اس سے

زیادہ رقم کا حقدار تھا۔ پنجاب نے مرکزی حکومت کو بیس بائیس کروڑ روپے کی رقم تو صرف کپاس پر برآمدی محصول میں اضافہ کی شکل میں ہی مہیا کی ہے...... اب جبکہ حکومت پاکستان نے صوبوں کو عوامی بہبود کی سکیموں کے لئے روپیہ منظور کیا تو پنجاب کو صرف پانچ کروڑ روپے دینا پیاسے کے منہ میں شبنم ٹپکانے کے مترداف ہے۔''[15]

پنجابی شاونسٹوں کی اس شکایت سے پتہ چلتا تھا کہ انہیں صوبائی عصبیت اور مفاد پرستی نے بالکل اندھا کر رکھا تھا۔ یہ عناصر زبانی طور پر تو حب الوطنی، اسلامی مساوات اور مسلم قومیت کے عظیم ترین علمبردار بنتے تھے لیکن عملی طور پر یہ بدترین قسم کے صوبہ پرست، اسلام دشمن اور قومی یکجہتی کے مخالف تھے۔ انہیں مشرقی بنگال کے مفلوک الحال مسلمان اور پاکستانی بھائیوں کی بدحالی پر کوئی ترس نہیں آتا تھا۔ انہیں یہ احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ اگر مشرقی بنگالی بھائیوں سے اسی طرح سوتیلی ماں کا سلوک ہوتا رہا تو ایک نہ ایک دن وطنی سالمیت کے پرخچے اڑ جائیں گے۔ ان کی مفاد پرستی، فرعونیت اور سیاسی کوتاہ اندیشی کی حد یہ تھی کہ جب کبھی بھی مشرقی بنگال کے کسی حلقے کی جانب سے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق کی آواز اٹھائی جاتی تھی تو یہ فوراً اس کو اسلام دشمن، وطن دشمن، ففتھ کالمنسٹ، کمیونسٹ اور انڈین ایجنٹ قرار دے کر اسے واجب القتل قرار دے دیتے تھے۔ یہ لوگ عملاً پاکستان کو سخت نقصان پہنچا رہے تھے۔ یہ پاکستان کے دشمنوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے۔ یہ شب و روز اپنے احساس برتری کا مظاہرہ کر کے، عوامی مباحثہ پر پابندی عائد کر کے اور مشرقی بنگال میں اپنے سیاسی نکتہ چینوں کو وطن دشمن قرار دے کر، بنگالی نوجوانوں اور ملک کے موجودہ حکمرانوں کے درمیان ایک ایسی غلط فہمی پیدا کر رہے تھے جو اس نصب العین کے لئے ناگزیر طور پر نقصان دہ تھی جس کے وہ علمبردار بنتے تھے۔ یہ مشرقی پاکستان کو بلوچستان کی طرح کا ایک غریب اور پسماندہ صوبہ قرار دیتے تھے جبکہ مشرقی پاکستانیوں کا ابتدا ہی سے مطالبہ یہ تھا کہ ان کی جغرافیائی پوزیشن کا لحاظ کر کے ان کے علاقے کو قرارداد لاہور کے مطابق پاکستان کا ایک خودمختار مشرقی حصہ تصور کیا جائے۔

مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان فلاحی اور تعمیراتی سرگرمیوں میں کتنا فرق تھا، اس کا اندازہ 21 رجون 1951ء کو پاکستان آبزرور میں شائع شدہ ایک خط سے ہوا جس میں بتایا گیا تھا کہ ''مغربی پاکستان کے مقابلے میں مشرقی پاکستان میں مرکزی محکمہ تعمیرات عامہ کے دفاتر کی

تعداد بہت ہی کم ہے۔ مغربی پاکستان میں اس محکمہ کے چار سرکل آفس ہیں جبکہ مشرقی پاکستان میں صرف ایک سرکل آفس ہے۔ مغربی پاکستان میں ڈویژنل دفتروں کی تعداد 16 ہے جبکہ مشرقی پاکستان میں اس قسم کے صرف دو دفتر ہیں۔ مغربی پاکستان میں 64 سب ڈویژنل دفتر ہیں جبکہ مشرقی پاکستان میں ایسے دفتروں کی تعداد صرف بارہ ہے'' اور پھر 23/جون 1951ء کو حمید الحق چودھری نے اپنے خلاف پروڈا کے تحت مقدمہ کی سماعت کے دوران جو کچھ کہا اس سے اس خط کی تائید ہوئی۔ حمید الحق چودھری کا بیان یہ تھا کہ اس کے خلاف یہ مقدمہ مشرقی بنگال کے سابق چیف سیکرٹری عزیز احمد کی تحریک پر قائم کیا گیا ہے۔ اس نے بتایا کہ ''میری عزیز احمد کے ساتھ مخالفت کی ابتدا اس وقت ہوئی تھی جب میں نے بطور وزیر خزانہ یہ تجویز پیش کی تھی کہ صوبائی حکومت کے مختلف محکموں کے سیکرٹریوں پر مشتمل قائم شدہ ترقیاتی بورڈ کو توڑ دیا جائے اور صوبہ کی نمائندہ حکومت جو ترقیاتی منصوبے بنائے ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ حائل نہ کی جائے۔''

مشرقی بنگال مسلم لیگ کی جانب سے جیوٹ بورڈ کو توڑ کر پٹ سن کی تجارت کو قومیانے کا مطالبہ اور کراچی کے کاروباری حلقوں کا ردعمل

جب جولائی میں ہندوستان کی جانب سے مغربی پنجاب کی سرحد پر فوجیں جمع کئے جانے کے باعث ایک مرتبہ پھر بین المملکتی کشیدگی پیدا ہوگئی تو مشرقی بنگال میں مرکز کی ناانصافیوں کے خلاف احتجاجی آوازیں بھی وقتی طور پر مدھم پڑ گئیں۔ جب 15/جولائی کو وزیراعظم لیاقت علی خان نے کراچی میں ہندوستان کی اس فوجی نقل وحمل کا انکشاف کیا تھا تو اسی دن مشرقی پاکستان کی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا سہ روزہ اجلاس ختم ہوا تھا۔ یہ مجلس عاملہ وزیراعلیٰ نورالامین اور اس کی حکومت کے حامیوں پر مشتمل تھی لیکن اس کے باوجود ایک طویل قرارداد میں جیوٹ بورڈ کی کارگردگی پر سخت نکتہ چینی کی گئی اور مطالبہ کیا گیا کہ موجودہ جیوٹ پالیسی میں تبدیلی کی جائے۔ مجلس عاملہ کی رائے یہ تھی کہ ''صوبائی مسلم لیگ اور صوبائی حکومت کے مشورے کے مطابق جیوٹ بورڈ کی اس طرح از سر نو تشکیل ہونی چاہیے کہ اس میں سے جیوٹ کے بیوپاریوں کو نکال دیا جائے اور ان کی جگہ اس میں کاشتکاروں کے نمائندوں کو شامل کیا جائے۔ پٹ سن کی کم از کم قیمت مقرر کی جائے اور اس کا کاروبار سرکاری تحویل میں لے لیا جائے۔ عاملہ کی رائے یہ

تھی کہ مشرقی بنگال میں کسانوں کی مفلوک الحالی کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی معاشی مشکلات کے باعث پٹ سن کی برداشت کے فوراً ہی بعد (جولائی سے ستمبر تک) وہ اسے فروخت کرنا چاہتے ہیں لیکن بیوپاری، بحری جہازوں کے مالکان اور آڑھتی اس موقع پر پٹ سن اٹھانے سے انکار کر دیتے ہیں نتیجتاً غریب کسان اونے پونے اپنی فصل بیچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔" عاملہ نے اپنے اس الزام کی تائید میں مرکزی حکومت کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرائی کہ "آج کل پاکستان میں پٹ سن کا بھاؤ 60 سے 65 روپے فی من ہے لیکن ہندوستان میں 110 روپے من کے حساب سے فروخت ہو رہی ہے۔ اگر یہی صورتحال رہی تو گزشتہ سال کی طرح اس سال بھی کسانوں میں بڑی بے چینی پھیل جائے گی۔"[16] صوبائی مسلم لیگ کی اس قرارداد کے پس منظر میں اس عوامی تاثر کی کارفرمائی تھی کہ کوریا کی جنگ کے باعث عالمی منڈی میں پٹ سن کی مانگ اور قیمت میں جو اضافہ ہوا ہے اس سے کراچی اور پنجاب کے مٹھی بھر سرمایہ دار مرکزی جیوٹ بورڈ کی اعانت و سرپرستی سے بے حد منافع کما رہے ہیں جبکہ مشرقی بنگال کے کسانوں اور درمیانہ طبقہ کے کاروباری عناصر کو بہت ہی کم فائدہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ 18 رجولائی 1951ء کو وزیر اعلیٰ نور الامین نے ایک انٹرویو میں صوبائی مسلم لیگ کی اس قرارداد کی تائید کرتے ہوئے بتایا کہ صوبائی حکومت نے مرکز سے پٹ سن کی کم از کم قیمت مقرر کرنے کی درخواست کی ہے۔ اس کا خیال یہ تھا کہ "غیر ممالک میں پٹ سن کی روز افزوں مانگ اور بندرگاہوں کی صلاحیت میں اضافہ ہونے کے باعث رواں موسم میں اس سنہری ریشے کی بکری جلدی اور مہنگی ہوئی اس لئے اگر سرکاری طور پر پٹ سن کی کم از کم قیمت مقرر کر دی جائے تو مقامی منڈی میں استحکام آجائے گا۔" اس نے بتایا کہ "صوبائی مسلم لیگ نے پٹ سن کی تجارت کو قومیانے کی جو سفارش کی ہے"[17] وہ بھی مرکزی حکومت کے زیر غور ہے لیکن مشرقی بنگال کی مسلم لیگ اور صوبائی حکومت کی یہ دونوں تجویزیں مرکزی حکومت کے زیر غور ہی رہیں اور ان پر کوئی فیصلہ نہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وزیر خزانہ غلام محمد کی پالیسی ان تجویزوں پر عملدرآمد کی اجازت نہیں دیتی تھی اس کی پالیسی یہ تھی کہ نجی سرمایہ داروں کو زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کی کھلی چھٹی دینی چاہیے تاکہ وہ سرمایہ اندوزی کر کے ملک میں صنعتکاری کر سکیں۔ خود وزیر اعظم لیاقت علی خان بھی اس پالیسی کے حق میں تھا اسی لئے اس نے 11 رمئی 1951ء کو اس امر پر مسرت کا اظہار کیا تھا کہ "پاکستان کے کاروباری عناصر نے خوب منافع کمایا ہے۔"

تاہم کراچی کے کاروباری عناصر پٹ سن کی تجارت کو قومیانے کی اس تجویز پر خاموش نہ رہ سکے۔ وہ اس سلسلے میں ذراسی بات بھی سننا گوارا نہیں کرتے تھے۔ ان کے لئے مشرقی بنگال کے سنہری ریشے کی بے پناہ کمائی کے سنہری موقع سے محروم ہونے کا محض تصور بھی ناقابل برداشت تھا چنانچہ جس دن ڈان میں وزیر اعلیٰ نورالامین کا متذکرہ انٹرویو شائع ہوا اسی دن پاکستان کی فیڈریشن آف چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے جنرل سیکرٹری ایم۔ اے۔ جواد کا بھی ایک بیان شائع ہوا جس میں مرکزی حکومت کو متنبہ کیا گیا تھا کہ ''اگر اس نے پٹ سن کی تجارت کو سرکاری تحویل میں لے لیا تو اس سے ملک کا معاشی استحکام تباہ ہو جائے گا۔ ملک کے موجودہ حالات پٹ سن کی تجارت کو قومیانے کی اجازت نہیں دیتے۔ سرکاری خزانے میں صنعت و تجارت کے شعبوں میں سرمایہ کاری کے لئے پیسہ نہیں ہے۔ اس مقصد کے لئے حکومت مطلوبہ سرمایہ صرف اسی صورت میں مہیا کر سکتی ہے کہ وہ معاشرتی بہبود کی سکیموں کو ترک کر دے۔ پٹ سن کی تجارت کو قومیانے کے نتائج بہت برے ہوں گے حکومت کو اس سلسلے میں اپنی پالیسی کی فی الفور وضاحت کرنی چاہیے۔''[18] پاکستان آبزرور نے 21رجولائی کو ایم۔ اے۔ جواد کے اس بیان پر دکھ کا اظہار کیا کہ ''پاکستان کے کاروباری حلقوں کو مشرقی بنگال کے مفلوک الحال کسانوں کی مصیبتوں کا کوئی احساس نہیں۔ انہیں صرف اپنے منافع کی فکر ہے اور وہ یہ منافع کسانوں کو نقصان پہنچا کر کمانا چاہتے ہیں۔'' پاکستان آبزرور کی تجویز یہ تھی کہ پٹ سن کی تجارت کے لئے کاشتکاروں کی کوآپریٹو سوسائٹیاں قائم کی جائیں تاکہ فصل کی برداشت کے موقع پر انہیں اپنے خون پسینے کی کمائی کا مناسب معاوضہ مل سکے۔

24رجولائی 1951ء کو جیوٹ فیڈریشن کے وفد نے گورنر فیروز خان نون سے ملاقات کر کے استدعا کی کہ صوبہ کے شمالی اضلاع کے کاشتکار بڑے پریشان ہیں۔ ان کی پٹ سن کی فصل کا کوئی خریدار نہیں ہے۔ اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ صوبائی حکومت فوراً خود ان کی فصل خریدنے کا بندوبست کرے۔ مگر اسی دن کراچی سے ایسوسی ایٹڈ پریس کی یہ خبر آ گئی کہ مرکزی حکومت سال رواں میں یا مستقبل قریب میں پٹ سن کی فصل کو قومیانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ پاکستان آبزرور کے لئے یہ خبر حیران کن نہیں تھی۔ تاہم اس کے لئے یہ بات افسوسناک تھی کہ ''حکومت ہر سال پٹ سن کے کاشتکاروں کو ان کی فصل کی مناسب قیمت دلوانے کا وعدہ کرتی ہے

لیکن یہ وعدہ کبھی پورا نہیں ہوتا۔ آج کل ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کشیدگی کے باعث پٹ سن کی منڈی پر بہت برا اثر پڑا ہے اور کاشتکاروں کو نقصان ہو رہا ہے مگر جب یہ کشیدگی کم ہو جائے گی اور پٹ سن کی قیمت بڑھے گی تو آڑھتیوں کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔''

پاکستان آبزرور نے اپنے اس اداریے میں قیام پاکستان سے پٹ سن کی تجارت کی پوری کہانی بیان نہیں کی تھی۔ وہ کہانی یہ تھی کہ ستمبر 1949ء میں ہندوستان کی جانب سے تجارتی بائیکاٹ سے پہلے اس تجارت پر مارواڑیوں کا غلبہ تھا البتہ اس کا کچھ حصہ اصفہانیوں اور آدم جیوں وغیرہ کو ملتا تھا جنہوں نے اس وقت تک اپنے دفاتر کلکتہ میں قائم کر رکھے تھے۔ ستمبر 1949ء کے بعد یہ تجارت مرکزی جیوٹ بورڈ کی اعانت سے پوری کی پوری اصفہانیوں، خوجوں، میمنوں، شیخوں اور سیدوں وغیرہ کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ ان سب کے صدر دفاتر کراچی میں تھے۔ ہندوستان کے ساتھ تجارت بند ہونے سے مشرقی بنگال کے کسان کی جو بری حالت ہوئی، انہوں نے اس سے سات آٹھ ماہ تک خوب فائدہ اٹھایا۔ یہ مجبور و لاچار کسان سے دس بارہ روپے من کے حساب سے سنہری ریشہ خریدتے تھے اور پھر حکومت کی بھرپور امداد سے اسے بیرونی ممالک میں مہنگے بھاؤ بیچ کر بے پناہ منافع کماتے تھے۔ جون 1950ء میں کوریا کی جنگ شروع ہوئی تو ان کے ہاں دولت کے انبار لگ گئے۔ فروری 1951ء تک یہ لوگ کسانوں سے پندرہ بیس روپے من کے حساب سے پٹ سن خریدتے تھے اور عالمی منڈی میں اسے پچاس ساٹھ روپے من کے حساب سے فروخت کرتے تھے۔ فروری 1951ء میں جب ہندوستان نے پاکستانی کرنسی کی شرح منظور کر کے تجارتی معاہدہ کر لیا تو ان کی کاروباری لٹیروں کی اور بھی چاندی ہو گئی۔ اس وقت عالمی منڈی میں پٹ سن کا بھاؤ بہت چڑھ چکا تھا اور ہندوستانی مل مالکان بھی اسی بھاؤ خریدنے پر مجبور تھے۔ جبکہ مشرقی بنگال کے کسانوں کے لئے نرخ شاید ہی پچیس تیس روپے من سے زیادہ ہوا تھا۔ اب جب جولائی 1951ء میں پٹ سن کی نئی فصل کی برداشت ہوئی تو عالمی منڈی میں اس کا بھاؤ ایک سو روپے من سے زیادہ تھا لیکن ان استحصالیوں نے اس مہینے میں پیدا شدہ بین المملکتی کشیدگی سے فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے اس موقع پر پہلے تو کسانوں سے پٹ سن خریدنے سے انکار کیا اور پھر جب بہت پس و پیش کے بعد خریدی تو اس کی بہت تھوڑی قیمت دی۔ مشرقی بنگال کے کسانوں کے اس بیدردانہ استحصال کے جرم میں مرکزی حکومت اور اس کے قائم کردہ جیوٹ بورڈ

اور نیشنل بینک آف پاکستان برابر کے شریک تھے۔ وزیر اعظم لیاقت علی خان اور وزیر خزانہ غلام محمد کی جانب سے انہیں کھلی چھٹی تھی کہ وہ بنگالی کسان کے خون اور پسینے کی روزی سے جتنا چاہیں منافع کمائیں۔ بے قید سرمایہ دارانہ معیشت کا تقاضا یہی تھا اور گزشتہ چار سال میں پاکستان کی سیاست کا ڈھانچہ اس تقاضے کی بنیاد پر تعمیر کیا گیا تھا۔

ہڑتالی ملازمین کے خلاف سول سروسز (نیشنل سیکورٹی) رولز کا نفاذ اور حکومت کے خلاف نفرت میں مزید اضافہ

2/اگست 1951ء کو بین المملکتی کشیدگی کم ہوئی تو حکومت مشرقی بنگال نے ایک غیر معمولی سرکاری گزٹ میں سول سروسز (نیشنل سیکورٹی) رولز کا اعلان کر کے پاکستان کے اندر مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان تضاد کی شدت میں اور اضافہ کر دیا۔ ان رولز میں یہ بتایا گیا تھا کہ "اگر کسی سرکاری ملازم کے بارے میں یہ شبہ ہوا کہ وہ تخریبی سرگرمیوں میں ملوث ہوتا ہے یعنی پاکستان کی سالمیت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے، پاکستان کے آئین یا نظم ونسق کی بیخ کنی کرتا ہے، مختلف طبقوں کے درمیان یا کسی صوبے کے خلاف دشمنی یا نفرت کے جذبات پھیلاتا ہے تو اسے جبری طور پر ریٹائر کر دیا جائے۔" مشرقی بنگال میں سرکاری ملازمین کے لئے ان نئے قوائد کے نفاذ کی وجہ یہ تھی کہ صوبائی حکومت کے مواصلات، تعمیرات اور آبپاشی کے تقریباً 300 اوورسیئروں، سب اوورسیئروں اور ڈرافٹسمینوں وغیرہ نے اپنی تنخواہوں میں اضافہ کے لئے 12/جولائی 1951ء سے ہڑتال کر رکھی تھی۔ ایسٹ پاکستان سبارڈینیٹ سروس کے ان ملازمین نے 8/مئی کو ہڑتال کا نوٹس دیا تھا لیکن 8/جون کو حکومت نے ایک خصوصی قانون نافذ کر کے اس مجوزہ ہڑتال کی ممانعت کر دی تھی لیکن اس کے باوجود جب ان ملازمین نے کام کرنے سے انکار کر دیا تو صوبہ میں متذکرہ محکموں کے سارے تعمیراتی کام بند ہو گئے۔ حکومت نے اس صورتحال میں کئی ایک ہڑتالی ملازمین کو گرفتار کیا مگر اس طرح حالات میں کوئی بہتری ہونے کی بجائے اور بھی خرابی ہوئی۔ 23/جولائی کو مزید 9 گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ پانچ ہڑتالیوں کو برطرف کر دیا گیا۔ 76 کو چارج شیٹ دی گئی۔ 20 کے استعفےٰ منظور کر لئے گئے اور سارے ہڑتالیوں کو سرکاری کوارٹروں سے بیدخل کر دیا گیا مگر حالات پھر بھی نہ سدھرے اور ہڑتالیوں کی ایجی ٹیشن تیز سے

تیز تر ہوگئی۔ اس ایجی ٹیشن کے دوران جو نعرے لگتے تھے اور جو پروپیگنڈا کیا جاتا تھا اس کا رخ نہ صرف مرکز اور صوبہ کی مسلم لیگی حکومتوں کی طرف بلکہ غیر بنگالی بیوروکریسی کی طرف بھی ہوتا تھا۔ اسی ہڑتال کے دوران پاکستان آبزرور کے 28 رجولائی کے شمارے میں دو خط شائع ہوئے تھے جن میں تین مثالیں دے کر الزام لگایا گیا تھا کہ ''محکمہ ریلوے کے غیر بنگالی حکام ماتحت بنگالی ملازمین کے خلاف امتیازی سلوک کرتے ہیں۔ وہ ان بنگالیوں کو اعلیٰ تربیت کے لئے برطانیہ جانے کی اجازت نہیں دیتے جنہوں نے اس مقصد کے لئے منعقدہ امتحان میں شاندار کامیابی حاصل کی تھی۔ وہ ان بنگالیوں کو گزیٹڈ سروسز میں بھرتی نہیں کرتے جنہوں نے اس مقصد کے منعقدہ امتحان میں اعلیٰ پوزیشنیں حاصل کی تھیں۔ یہ امتحانات انگریز افسروں کی نگرانی میں ہوئے تھے مگر اب جبکہ یہ انگریز افسر ریٹائر ہو کر چلے گئے ہیں اور ان کی جگہ نئے غیر بنگالی افسر آئے ہیں تو وہ مختلف حیلوں بہانوں سے ان امتحانات کے نتائج پر عمل کرنے سے محض اس لئے انکار کر رہے ہیں کہ اس طرح بنگالیوں کا فائدہ ہوتا ہے۔ وہ پبلک ورکس انسپکٹروں اور برج انسپکٹروں کی بھرتی کے لئے صرف مغربی پاکستان کے اخبارات میں اشتہارات چھپواتے ہیں تاکہ مشرقی پاکستان کا کوئی امیدوار اس قسم کی کوئی اسامی حاصل نہ کر سکے۔''

حکومت مشرقی بنگال کا خیال تھا کہ سرکاری ملازمین کے لئے اس قسم کے سخت قواعد کے نفاذ سے نہ صرف ہڑتالوں میں کمی ہوگی بلکہ اس کے خلاف اشتعال انگیز پروپیگنڈے کا سلسلہ بھی بند ہو جائے گا جو بنگالی ماتحت ملازمین گزشتہ چار سال سے مرکزی حکومت اور غیر بنگالی اعلیٰ حکام کے خلاف کرتے یا کرواتے رہتے تھے۔ اس قسم کے پروپیگنڈے کا سب سے بڑا ذریعہ پاکستان آبزرور تھا جس کا ایڈیٹر عبدالسلام اگست 1947ء میں صوبائی محکمہ سول سپلائیز میں اکاؤنٹنٹ تھا اور اس کا تجربہ یہ تھا کہ مرکزی حکومت کے آڈٹ ڈیپارٹمنٹ کے متعصب، نااہل اور غیر تجربہ کار اہلکاروں نے اس محکمہ کے حسابات میں بہت گڑبڑ مچائی تھی۔ اگست 1947ء کے بعد مشرقی بنگال کی حکومت کئی ماہ تک اس منافع سے چلتی رہی تھی جو محکمہ سول سپلائیز صرف اناج کے کاروبار سے کماتا تھا۔ مرکزی حکومت کے متعلقہ حکام کی نااہلی کی وجہ سے صوبائی حکومت کو وہ پیسہ منتقل نہیں ہوتا تھا جس کی وہ حقدار تھی۔ ان دنوں بھی بعض لوگوں کے ناپاک عزائم کو پورا کرنے کے لئے بنگالیوں کی حب الوطنی پر شبہ کیا جاتا تھا۔[19] اور اس اخبار کے مالک حمید الحق چودھری کا بیان تھا

کہ اس کے خلاف پروڈا کے تحت مقدمہ مشرقی بنگال کے پہلے پنجابی چیف سیکرٹری عزیز احمد کی تحریک پر چلایا گیا تھا۔ اس کے اس مقدمے کی سماعت 30 رجولائی کو ختم ہوگئی اور خیال یہ تھا کہ تحقیقاتی ٹربیونل مرکزی حکومت کو اپنی رپورٹ 15 راگست 1951ء تک پیش کردے گا۔

عبدالسلام اور حمید الحق چودھری کے ان الزامات کی تائید ایوب خان کے سوانح نگار کرنل محمد احمد کی کتاب سے ہوتی ہے۔ یہ شخص قیام پاکستان کے موقع پر ایسٹ پاکستان آرمی ہیڈ کوارٹرز میں جنرل سٹاف برانچ کا سربراہ مقرر ہوا تھا اور جب جنوری 1948ء میں ایوب خان بطور جنرل آفیسر کمانڈنگ مشرقی بنگال گیا تھا تو اس وقت بھی یہ اسی عہدہ پر فائز تھا۔ وہاں سے اس کا تبادلہ جنوری 1951ء میں ہوا جبکہ ایوب خان نے راولپنڈی میں پہلے پاکستانی کمانڈر انچیف کا عہدہ سنبھالا تھا۔ اس کرنل محمد احمد کے تین ساڑھے تین سال تک مشرقی بنگال میں قیام کا تجربہ یہ تھا کہ ''مشرقی پاکستان کی حکومت کے بیشتر سینئر حکام مغربی پاکستانی تھے اور وہ وہاں اپنی ناخوشی کا کھلم کھلا اظہار کیا کرتے تھے۔ وہ انتہائی تلخ الفاظ میں مشرقی پاکستانیوں کی موجودگی میں شکایتیں کیا کرتے تھے اور ان کو اپنی بے آرامی اور تکلیف کے لئے موردالزام ٹھہرایا کرتے تھے۔ ملک کے دونوں صوبوں کے درمیان تقریباً ایک ہزار میل کا فاصلہ پہلے ہی تھا۔ مغربی پاکستانیوں کی بددماغی اور بدتمیزی اس فاصلے کو جذباتی لحاظ سے مزید وسیع کر رہی تھی۔''[20]

اس پس منظر میں صوبائی حکومت کا 3 راگست 1951ء کا اعلان حیرت انگیز تھا۔ غالباً یہ کاروائی مرکزی حکومت کی تحریک پر کی گئی تھی اور اس کی بنیاد اس احمقانہ خیال پر تھی کہ جابرانہ قواعد کے ذریعہ غیر بنگالی اعلیٰ حکام کی بدعنوانیوں کے باوجود سرکاری محکموں میں نظم وضبط قائم رکھا جاسکتا ہے۔ مگر ایسا نہ ہوا اور نہ ہوسکتا تھا۔ مرکزی حکومت اور غیر بنگالی اعلیٰ حکام کے خلاف اقربا نوازی، علاقہ پرستی، رشوت ستانی اور دوسرے الزامات کا پروپیگنڈا جاری رہا۔ کیونکہ اس پروپیگنڈے کی بے شمار ٹھوس وجوہ موجود تھیں۔ ان میں سے ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ملک کی آمدنی کا بیشتر حصہ مسلح افواج پر خرچ ہوتا تھا جن میں مشرقی بنگال کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ پاکستان آبزرور کے 4 راگست کے اداریے کے مطابق گزشتہ چار سال میں پاکستان کی کل آمدنی میں سے محکمہ دفاع کے مستقل اخراجات اور کشمیری مہاجرین پر اخراجات کے علاوہ دفاعی اخراجات کا تناسب یہ تھا:

1948-49ء	=	22.3 فیصد
1949-50ء	=	68.9 فیصد
1950-51ء	=	39.6 فیصد
1951-52ء	=	48.4 فیصد

1950-51ءاور 1951-52ءمیں دفاعی اخراجات کے تناسب میں کمی کا مطلب یہ نہیں تھا کہ مسلح افواج پر سالانہ اخراجات کی رقم میں کمی کی گئی تھی۔ایسی بات نہیں تھی۔اس تناسب میں کمی کی وجہ یہ تھی کہ دوسالوں میں کوریا کی جنگ کے باعث سالانہ سرکاری آمدنی میں اضافہ ہو گیا تھا۔مشرقی بنگال میں جب کوئی ان غیر منصفانہ اخراجات، مرکزی حکومت کی دوسری نا انصافیوں اور غیر بنگالی اعلیٰ حکام کے تعصب کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا تھا تو اس پر فوراً وطن دشمنی، اسلام دشمنی اور صوبہ پرستی کا الزام عائد کر دیا جاتا تھا اور یہ صحیح یا غلط طور پر تصور کر لیا جاتا تھا کہ اس قسم کے پروپیگنڈے کے لئے ضروری مواد ماتحت بنگالی ملازمین کی جانب سے مہیا کیا جاتا ہے۔چونکہ حمید الحق چودھری نہ صرف نورالامین کی جگہ وزیر اعلیٰ بننا چاہتا تھا بلکہ وہ مشرقی بنگال میں اصفہانیوں اور آدم جیوں کا مقام بھی حاصل کرنا چاہتا تھا اور چونکہ مرکزی حکومت اور صوبہ میں غیر بنگالی بیوروکریسی اس کی اس خواہش کے راستے میں حائل تھیں اس لئے وہ اور اس کا اخبار مشرقی بنگال سے کی گئی ناانصافیوں کے خلاف شکایتوں کو بہت ہوا دیتے تھے۔حمید الحق چودھری نے اپنے خلاف پروڈا کے تحت مقدمہ کی سماعت کے دوران جو موقف اختیار کیا تھا وہ بھی ان شکایات پر مشتمل تھا:

1۔ اس نے مشرقی بنگال کی بعض ترقیاتی سکیموں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے عوامی قرضہ لینے کی تجویز پیش کی تھی مگر مرکزی حکومت نے اس کی اجازت نہیں دی تھی۔
2۔ اس نے مشرقی بنگال میں کارخانے لگانے کے لئے سکیمیں بنائی تھیں لیکن مرکزی حکومت نے دستور ساز اسمبلی سے ایک قانون منظور کروا کر صنعتکاری کے امور کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔
3۔ اس نے سیلز ٹیکس کو صوبائی تحویل میں رہنے کی تجویز پیش کی مگر اسے کامیابی نہ ہوئی۔
4۔ اس نے انکم ٹیکس کی آمدنی میں سے صوبہ کے حصہ کا مطالبہ کیا مگر اسے کامیابی نہ ہوئی۔

5۔ اس نے مرکزی حکومت کے اس الزام کے خلاف احتجاج کیا تھا جس کے تحت بعض اقسام کے کپڑے پر ٹیکس لگا دیا گیا۔

6۔ اس نے ایک کمرشل بینک کھولنے کی اجازت طلب کی مگر مرکزی حکومت نے انکار کر دیا اور خود صوبہ میں نیشنل بینک آف پاکستان کی شاخیں کھول دیں۔

7۔ مرکزی حکومت چٹا گانگ کے علاقے کو اپنے کنٹرول میں لینا چاہتی تھی لیکن اس نے اور اس کے رفقا نے اس کے خلاف احتجاج کیا تھا۔

8۔ اس کے اور مرکزی حکومت کے درمیان چائے کے باغات، کان کنی اور تیل کے شعبہ جات کے کنٹرول اور جیوٹ پالیسی کے بارے میں اختلافات تھے۔

9۔ اس نے اپنی 49-1948ء کی بجٹ تقریر میں مرکزی حکومت پر نکتہ چینی کی تھی۔''[21]

کوریا کی جنگ بند ہونے سے پٹ سن کی مانگ میں کمی، بنگالیوں کا مطالبہ کہ پٹ سن کی کم سے کم قیمت مقرر کی جائے مگر حکومت کی سرد مہری

جب اگست 1951ء میں یہ آثار نمایاں ہو گئے کہ کوریا میں چین اور امریکہ کے درمیان عنقریب جنگ بندی کی گفت و شنید شروع ہو جائے گی تو بین الاقوامی منڈی میں پٹ سن کی مانگ میں بھی کمی ہونے لگی۔ اس سے قبل اپریل میں جنرل میکارتھر (Macarthur) کو برطرف کیا جا چکا تھا اور اس کی جگہ رجوے میتھیو (Ridgway Mathew) کا تقرر ہوا تھا جبکہ برطانیہ اور ہندوستان کی طرف سے یہ دباؤ ڈالا جا رہا تھا کہ کوریا کی جنگ کو گفت و شنید کے ذریعہ ختم کیا جائے۔ چونکہ یہ بین الاقوامی صورت حال پاکستان کے اصفہانیوں، خوجوں، میمنوں، بوہروں اور شیخوں وغیرہ کے لئے موافق نہیں تھی اس لئے انہوں نے مشرقی بنگال میں پٹ سن کی خریداری سے اور بھی ہاتھ کھینچ لیا اور اس بنا پر اس سنہری ریشے کا بھاؤ 24 روپے من تک گر گیا۔ پاکستان جیوٹ فیڈریشن نے اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے 6/اگست کو اپنا ایک ہنگامی اجلاس منعقد کیا جس میں جیوٹ پالیسی کے بارے میں مرکزی حکومت کی خاموشی پر برہمی کا اظہار کیا اور مطالبہ کیا کہ صوبہ میں پٹ سن کی کم از کم قیمت چالیس روپے من مقرر کی جائے۔

8/اگست کو صوبہ لیگ کے صدر مولانا عبداللہ الباقی اور جنرل سیکرٹری یوسف علی

چودھری نے وزیراعظم لیاقت علی خان اور وزیر تجارت فضل الرحمان کے نام ایک مشترکہ تار میں مطالبہ کیا کہ ''پٹ سن کی کم از کم سرکاری قیمت کا بلا تاخیر اعلان کیا جائے۔ یہ قیمت 40 روپے فی من سے کم نہیں ہونی چاہیے کیونکہ اس فصل کی قیمت میں یکا یک کمی ہو جانے کے باعث غریب کسان بڑی مشکلات سے دوچار ہو گئے ہیں۔'' جب کئی روز تک اس تار کا کوئی جواب موصول نہ ہوا تو 17 راگست کو نارائن گنج میں جیوٹ ورکرز ایسوسی ایشن نے الزام عائد کیا کہ مرکزی حکومت بروقت جیوٹ پالیسی کا اعلان نہ کر کے پٹ سن کی قیمت میں کمی کا باعث بنی ہے۔ ایسوسی ایشن کا مطالبہ یہ تھا کہ کم از کم قیمت 40 روپے من سرکاری نرخ کا بلا تاخیر اعلان کیا جائے۔ ان دنوں چاول کی قیمت تو پچیس چھبیس روپے من تک بڑھ گئی تھی اور نمک ایک روپیہ فی سیر بک رہا تھا جبکہ پٹ سن کا بھاؤ بعض علاقوں میں 20 روپے من تک گر گیا تھا لیکن جب 18 راگست کو کراچی میں مرکزی وزیر خوراک پیرزادہ عبدالستار کی زیر صدارت سنٹرل جیوٹ کمیٹی کا اجلاس ہوا تو اس مطالبہ کو قابل توجہ نہ سمجھا گیا۔ البتہ پیرزادہ نے اپنی صدارتی تقریر میں پٹ سن کے معیار کو بہتر بنانے کے لئے دو ایک سکیموں کا ذکر کیا اور پھر 31 راگست کو کراچی سے سرکاری طور پر اعلان کر دیا گیا کہ ''حکومت کی موجودہ جیوٹ پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔'' اس اعلان کی تعبیر یہ تھی کہ پٹ سن کی کم از کم سرکاری قیمت مقرر نہیں کی جائے گی اور بڑے بڑے کاروباری لٹیروں کو 52-1951ء میں بھی مشرقی بنگال کے غریب کسانوں کے خون چوسنے کی کھلی چھٹی ہوگی۔

2 رستمبر 1951ء کو مشرقی بنگال کی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے مرکزی حکومت کے اس اعلان پر اپنے مطالبہ کا اعادہ کیا کہ پٹ سن کی کم از کم قیمت مقرر کی جائے اور جیوٹ بورڈ کو توڑ دیا جائے کیونکہ یہ ادارہ کاشتکاروں کے مفادات کا تحفظ کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہا ہے۔ مجلس عاملہ نے صوبائی حکومت پر زور دیا کہ وہ پٹ سن کی تجارت کو قومیانے کی تجویز کا جائزہ لینے کے لئے ایک کمیشن مقرر کرے۔ مجلس عاملہ کی یہ قرارداد جب 4 رستمبر کے اخبارات میں شائع ہوئی تو اس دن صوبہ کی منڈیوں میں پٹ سن کا بھاؤ 17 سے لے کر 18 روپے فی من تھا اور چاول کا نرخ 20 روپے سے 24 روپے من تک تھا۔ 8 رستمبر کو ڈھاکہ میں ایسٹ پاکستان کی یوتھ لیگ کا جلسہ ہوا تو اس میں بھی مرکزی حکومت کی ''قوم دشمن جیوٹ پالیسی'' پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی گئی کہ اس پالیسی کے تحت اصفہانیوں، مارواڑیوں اور انگریز بیوپاریوں کو بے پناہ فائدہ ہو رہا ہے

جبکہ صوبہ کے غریب کاشتکاروں کو بے شمار نقصان پہنچ رہا ہے۔ جلسہ میں اس مطالبہ کی تائید کی گئی کہ پٹ سن کی کم از کم قیمت 40 روپے من مقرر کی جائے اور صوبائی حکومت پر زور دیا گیا کہ وہ مرکزی حکومت کو ایسی جیوٹ پالیسی اختیار کرنے پر مجبور کرے جس کے تحت کاشتکاروں کو ان کی پیداوار کا مناسب معاوضہ مل سکے۔ مگر یوتھ لیگ کی یہ قرارداد مؤثر نہیں ہو سکی تھی کیونکہ سرکاری فتویٰ کے مطابق نوجوانوں کی اس تنظیم پر کمیونسٹوں کا غلبہ تھا اور کمیونسٹوں کی کسی بھی بات کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا تھا۔

لہٰذا مرکزی حکومت اپنی جیوٹ پالیسی پر ڈٹی رہی۔ اسے اس قسم کی کوئی تشویش نہیں تھی کہ اس کی اس جیوٹ پالیسی کی وجہ سے مشرقی بنگال کے کسانوں میں بے چینی پھیلے گی اور کسانوں کی اس بے چینی کا اثر بہت جلد شہروں کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ پر پڑے گا جس میں بے روزگاری نے ایک لا علاج بیماری کی صورت اختیار کر لی تھی اور جس کو اخراجات زندگی کی روز افزوں بوجھ نے بے حال کر رکھا تھا۔ مرکزی حکومت کو اس بنا پر بھی کوئی تشویش نہیں تھی کہ مشرقی بنگال کے عوام گزشتہ کئی ماہ سے نمک کی کمیابی اور گرانی کی وجہ سے بلبلا اٹھے ہیں اور چاول، سرسوں کا تیل اور دوسری ضروریات زندگی کی قیمتوں میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اسے اگر فکر تھی تو یہ تھی کہ کسی طرح مشرقی بنگال کے چار کروڑ سے زائد عوام پر اردو زبان مسلط کی جائے۔

بنگلہ کو عربی رسم الخط میں رائج کرنے کے مراکز اور پرائمری سطح پر عربی اور اردو پڑھانے کے صوبائی حکومت کے فیصلہ پر شدید عوامی ردعمل

11 راگست 1951ء کی خبر یہ تھی کہ مشرقی بنگال کے مختلف اضلاع میں اب تک 72 مراکز کھولے گئے ہیں جن میں تقریباً 450 بالغ مردوں اور عورتوں کو عربی رسم الخط میں بنگالی زبان سکھائی جاتی ہے۔ یہ مراکز مرکزی حکومت کی تعلیم بالغاں کی سکیم کے تحت کھولے گئے ہیں اور ان کا خرچ مرکزی حکومت برداشت کر رہی ہے۔ 13 راگست کو ڈھاکہ میں علما اور ادیبوں کی ایک ''حروف القرآن کانفرنس'' ہوئی۔ اس کانفرنس کی صدارت صوبہ کے ایک مشہور و معروف پیر مولانا صوفی نثار الدین احمد پیر آف سارسینا (Sarsina) نے کی اور دوسرے ممتاز علما اور ادیبوں کے علاوہ مولانا اکرم خان اور دیوان احباب چودھری نے خطاب کیا۔ کانفرنس میں 1200 الفاظ پر مشتمل ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں اولاً مشرقی بنگال کے عوام سے اپیل کی گئی کہ وہ اپنے تعلیمی

اداروں اور نجی خط و کتابت میں عربی رسم الخط استعمال کریں اور ثانیاً حکومت سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ سارے سکولوں اور کالجوں میں عربی رسم الخط رائج کرنے کے لئے ایک دس سالہ منصوبہ بنائے اور ابتدائی مدرسوں میں فوری طور پر عربی رسم الخط رائج کیا جائے۔ مولانا شاہ صوفی نثار الدین احمد کا صدارتی خطبہ یہ تھا کہ ''مشرقی بنگال میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ ثقافت کا نعرہ گمراہ کن ہے۔ رسم الخط اس نعرے کا مؤثر طریقے سے سدباب کرے گا۔'' تاہم مولانا اکرم خان کی رائے یہ تھی کہ ''اگرچہ مشرقی بنگال میں عربی رسم الخط رائج کرنا ضروری ہے لیکن یہ تبدیلی انتہائی غور وفکر کے بعد احتیاط سے کرنی چاہیے۔''[22] 26 راگست کو ڈھاکہ میں انجمن ترقی اردو کا سالانہ اجلاس ہوا تو مولانا اکرم خان نے مشرقی بنگال میں اردو کی ترقی و ترویج کی اپیل کی۔ 21 ستمبر کو صوبائی حکومت نے حروف القرآن کانفرنس کی سفارش کے پیش نظر اپنے اس فیصلے کا اعلان کیا کہ پرائمری اسکولوں میں مسلمان بچوں کے لئے پہلی جماعت سے عربی حروف ابجد اور چوتھی جماعت سے اردو حروف ابجد لازمی مضمون کے طور پر پڑھائے جائیں گے لیکن 26 ستمبر کو مولانا اکرم خان نے ایک بیان میں اس فیصلے کی اس دلیل کی بنا پر مخالفت کی کہ اس طرح پرائمری سکولوں کے ننھے بچوں پر غیر ملکی زبانیں سیکھنے کا ناقابل برداشت بوجھ پڑ جائے گا۔ 28 ستمبر کو ڈھاکہ میں ایسٹ بنگال ٹیچرز ایسوسی ایشن کا اجلاس ہوا تو ایسوسی ایشن کے سیکرٹری نے اپنی رپورٹ میں صوبائی حکومت کے 21 ستمبر کے فیصلے کی مخالفت کی اور کہا کہ پرائمری مرحلہ پر بچوں کو دو یا تین غیر ملکی زبانیں سیکھنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اس اجلاس کی صدارت مولوی فضل الحق نے کی تھی جو یکم فروری 1951ء کو ایک اور قلابازی کھا کر فیاض علی کی جگہ مشرقی بنگال کا ایڈووکیٹ جنرل بن چکا تھا۔ تاہم اس نے اپنی صدارتی تقریر میں ان سکیموں کو احمقانہ قرار دیا کہ ''پرائمری سکولوں میں عربی اور اردو کی تعلیم دی جائے گی اور سارے تعلیمی اداروں میں عربی رسم الخط رائج کیا جائے گا اور اس کی رائے یہ تھی کہ ''بنگالی زبان کی تعلیم بنگالی رسم الخط میں ہی ہونی چاہیے۔'' جب یہ اجلاس ختم ہوا تو استقبالیہ کمیٹی کے سیکرٹری رئیس الدین احمد نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ ''اگر صوبائی محکمہ تعلیم نے پرائمری سکولوں میں عربی اور اردو کی تعلیم رائج کرنے کی کوشش کی تو ہم اپنی پوری طاقت سے اس کی مخالفت کریں گے۔''[23]

جب کراچی کے ارباب اقتدار کی طرف سے مشرقی بنگال کے عوام پر گنگا جمنی زبان

مسلط کرنے کے لئے اس قسم کی بھونڈی کوششیں کی جاتی تھیں تو انہیں یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ مقامی تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ یہ کوشش ایسی حالت میں کبھی کامیاب نہیں ہونے دے گا جبکہ اسے کھلم کھلا بنیادی سیاسی، معاشرتی اور معاشی حقوق سے محروم رکھا جا رہا ہے۔ صوبہ میں نورالامین کی ایک ایسی نااہل و بددیانت حکومت قائم تھی جسے عوام الناس کی کوئی تائید وحمایت حاصل نہیں تھی۔ صوبائی حکومت کی انتظامیہ پر ایسی غیر بنگالی بیوروکریسی کا غلبہ تھا جس کے فرعون مزاج ارکان مقامی عوام سے حقارت آمیز سلوک کرتے تھے۔

مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کے مقابلے میں اشیائے صرف بہت مہنگی تھیں اور درمیانہ طبقہ شدید معاشی دباؤ میں تھا

بے روزگاری اور مہنگائی کی حالت یہ تھی کہ ڈان کی سرکاری ذرائع کے حوالے سے 27 راگست کی ایک رپورٹ کے مطابق ڈھاکہ کے درمیانہ طبقہ کے 27.9 فیصد خاندان اپنی آمدنی سے اپنے ماہانہ اخراجات پورے نہیں کر سکتے تھے۔ یہ تخمینہ بیورو آف سٹیٹیسٹیکل، کمرشل اینڈ انڈسٹریل انٹیلی جنس نے -/100 روپے سے لے کر -/400 روپے تک تنخواہ پانے والے 200 خاندانوں سے استفسار کے بعد لگایا تھا۔ ان خاندانوں کی کل آمدنی میں سے اخراجات کی تفصیل اس طرح تھی:

1۔	خوراک	=	52.5 فیصد
2۔	متفرقات	=	22.9 فیصد
3۔	ایندھن اور روشنی وغیرہ	=	5.38 فیصد
4۔	کرایہ مکان	=	8.42 فیصد
5۔	کپڑے	=	8.58 فیصد

مشرقی بنگال کے درمیانہ طبقہ کی اس مشکل سے گزر اوقات کی ایک وجہ یہ تھی کہ کراچی اور پنجاب کے ناجائز منافع خوروں اور حکومت پاکستان کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے مشرقی اور مغربی پاکستان میں ضروریات زندگی کی قیمتوں میں بڑا فرق تھا۔ چٹاگانگ کی مرچنٹس ایسوسی ایشن کے آنریری سیکرٹری ایم۔ ادریس نے ستمبر کے اواخر میں ایک میمورنڈم کے ذریعہ مرکزی

وزیر تجارت کی توجہ اس کھلی نا انصافی کی طرف مبذول کرائی تھی مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا کیونکہ بے قید سرمایہ دار معیشت میں قیمتوں میں اس قسم کا عدم توازن ناگزیر ہوتا ہے میمورنڈم میں مشرقی اور مغربی پاکستان کی قیمتوں میں جو فرق اٹھایا گیا تھا اس کا خاکہ اس طرح تھا:

جنس	کراچی کی قیمت	چٹاگانگ کی قیمت
مرچ	-/35 روپے من	-/75 روپے من
بیج سرسوں	-/20 روپے من	-/30 روپے من
تیل ناریل	-/88 روپے من	-/115 روپے من
گائے کا گوشت	-/1 روپیہ سیر	-/1 روپیہ 6 آنے تا -/2 روپے سیر
بکری کا گوشت	2 روپے آٹھ آنے سیر	-/3 روپے سیر
نمک	-/16 روپے سیر	ملتا ہی نہیں
دودھ	(کم پانی والا) 8 روپے سیر	(زیادہ پانی والا) -/12 روپے سیر
تیل سرسوں	2 روپے 12 آنے سیر	3 روپے 8 آنے سیر
چاول	-/20 روپے من	-/30 روپے من
سگریٹ (کیپسٹن)	7 آنے فی پیکٹ	10 آنے تا 13 آنے فی پیکٹ

میمورنڈم کے آخر میں لکھا تھا کہ مشرقی بنگال کے لوگ بھول گئے ہیں کہ سوجی کیا چیز ہوتی ہے کیونکہ گزشتہ کئی ماہ سے انہوں نے اس قسم کی کوئی چیز دیکھی ہی نہیں ہے۔"[24]

صوبہ میں نمک کی کمیابی اور مہنگائی کی واحد وجہ یہ تھی کہ حکومت پاکستان مسلسل عوامی مطالبہ کے باوجود نہ تو خود چٹاگانگ، نواکھلی، باریسال اور کھلنا کے ساحلی علاقوں میں نمک سازی کا کوئی بندوبست کرتی تھی اور نہ ہی وہ اس سلسلے میں ایکسائیز ٹیکس کی کوئی چھوٹ دے کر نجی سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کرتی تھی۔ اس کے برعکس کراچی اور پنجاب کے کاروباری لٹیرے مغربی پاکستان سے پہاڑی نمک درآمد کرتے تھے اور اجارہ داری، ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری کے ذریعے بے حد و بے حساب منافع کماتے تھے۔ اسی طرح سرسوں کا تیل بھی مغربی پاکستان سے

درآمد کیا جاتا تھا اور مشرقی بنگال کے عوام آئے دن اس کی کمیابی اور مہنگائی کا رونا روتے رہتے تھے۔ اس سلسلے میں تازہ ترین واویلا 7/ اکتوبر 1951ء کو مشرقی پاکستان پراونشل کوآپریٹو بینک کے وائس چیئرمین اور سٹیٹ بینک آف پاکستان کے سابق ڈائریکٹر وحید الزماں نے ایک بیان میں کیا۔ اس نے مطالبہ کیا کہ ''مشرقی بنگال میں ایسا پہاڑی نمک سپلائی نہ کیا جائے جسے مقامی لوگ پسند نہیں کرتے اور جو ان کی قوت خرید سے باہر ہے۔ اس کی بجائے صوبہ میں نمک ٹیکس منسوخ کیا جائے اور مقامی طور پر نمک سازی ہو اور لوگوں کی روزمرہ کی یہ ضروریات بآسانی اور سستے بھاؤ پوری ہو سکیں۔'' اس نے مزید مطالبہ کیا کہ ''وزیراعظم لیاقت علی خان کو اس مسئلہ کی طرف فوری توجہ مبذول کرنی چاہیے بصورت دیگر بنگالی عوام کا مرکزی محکمہ تجارت وصنعت پر سے اعتماد اٹھ جائے گا۔''

لیکن لیاقت علی خان نے اس مسئلہ کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ اخباری اطلاعات کے مطابق ان دنوں اس کی ساری توجہ اپنی کابینہ میں اہم ردوبدل کرنے کے مسئلہ پر مرکوز تھی۔ وہ وزیر خزانہ غلام محمد کو، جسے جولائی 1951ء میں فالج ہو گیا تھا، کو الگ کر کے اس کی جگہ حکومت کے سیکرٹری چودھری محمد علی کو وزارت خزانہ کا عہدہ دینا چاہتا تھا اور پنجاب کے گورنر سردار عبدالرب نشتر کو ڈپٹی وزیراعظم بنانے کا خواہاں تھا۔ اس نے اکتوبر کے وسط میں اس کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن وہ اس فیصلے کے اعلان سے قبل آزاد کشمیر کے اہم دورے پر روانہ ہو گیا۔ 16/ اکتوبر کو وہ راولپنڈی پہنچا اور سہ پہر کو وہ وہاں کے عوام کو خطاب کرنے کے لئے ایک جلسہ گاہ میں گیا لیکن وہ کوئی تقریر نہ کرنے پایا تھا۔ وہ اس مقصد کے لئے مائیکروفون کے نزدیک پہنچا ہی تھا کہ پنجابی اور مذہبی عصبیت نے گولیوں سے اس کا سینہ چھلنی کر دیا۔

قیام پاکستان کے بعد ابتدائی برسوں میں ہی کراچی اور پنجاب کے بالادست طبقوں کے آمرانہ رویئے کے ردعمل میں مشرقی بنگال میں علیحدگی کا بیج بویا جا چکا تھا

14/ اگست 1947ء کا دن مشرقی بنگال کی مسلم اکثریت کے لئے واقعی نجات کا دن تھا۔ ان بنگالی مسلمانوں نے یہ دن دیکھنے کے لئے گزشتہ دو سو سال کے دوران انگریز

سامراجیوں، مغربی ہندوستان کے مارواڑی سرمایہ داروں وساہوکاروں اور بنگال کے ہندو زمینداروں اور بابوؤں کے خلاف بڑی ہی تلخ اور خونریز جدوجہد کی تھی۔ اس جدوجہد کے دوران کوئی ایسا ظلم نہیں تھا جو ان پر نہیں ڈھایا گیا تھا۔ ان غیر ملکی سامراجیوں اور مقامی استحصالیوں نے باہمی گٹھ جوڑ سے بنگالی مسلمانوں کو پسماندگی، جہالت، مفلوک الحالی، ذلت وخواری اور تنزلی کی اس انتہا تک پہنچا دیا تھا کہ اس سے آگے ان کے لئے کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے مارچ 1940ء کی قرارداد لاہور کی اس قدر زوردار تائید وحمایت کی تھی کہ 43-1942ء میں مولوی فضل الحق جیسی دیوقامت سیاسی شخصیت بھی اس کی مخالفت میں ان کے سامنے نہیں ٹھہر سکتی تھی۔ انہیں اس قرارداد میں اپنی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی نجات کی امید نظر آئی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر وہ اس قرارداد کو جامۂ عمل پہنانے میں کامیاب ہو گئے تو انہیں نہ صرف انگریزوں کی غلامی سے چھٹکارا حاصل ہو گا بلکہ وہ ہندو سرمایہ داروں، ساہوکاروں، زمینداروں اور بابوؤں کے ظالمانہ استحصال سے بھی خلاصی پالیں گے۔ وہ اپنے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی مستقبل کی خود تعمیر کریں گے، وہ اپنی تقدیر کے خود مالک ہوں گے، ان کے سروں پر سے افلاس، جہالت اور بیماری کے سیاہ بادل چھٹ جائیں گے اور ان کے لئے بڑی دیر کے بعد آسودگی، خوشحالی اور ترقی کا سورج طلوع ہو گا مگر اگست 1947ء کے دو ایک ماہ بعد ہی انہیں یہ احساس ہونا شروع ہو گیا کہ طویل تاریک رات کے بعد یہ وہ سحر تو نہیں جس کے لئے انہوں نے اتنی طویل اور خونریز جدوجہد کی تھی۔ انہیں یہ احساس ہوا کہ ان کی سرزمین میں 14راگست 1947ء کی سحر اپنے ساتھ کراچی اور پنجاب کے ایسے عناصر کو لائی ہے جو ان کے بارے میں ایسے ہی سامراجی اور استحصالی عزائم رکھتے تھے جیسے کہ ماضی میں انگریزوں اور مارواڑیوں کے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ کراچی اور پنجاب کے یہ عناصر اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لئے بمبئی اور احمد آباد کے مارواڑیوں کی طرح سیکولر جمہوریت اور وطنی قوم پرستی کے نعرے نہیں لگاتے تھے بلکہ انھوں نے اپنے دیو استبداد کو اسلامی اتحاد و یکجہتی اور مسلم قومیت کا خوشنما لبادہ پہنایا ہوا تھا۔ یہ عناصر پاکستان کی قومی زندگی کے کسی بھی شعبہ میں بنگالی مسلمانوں کو کوئی بھی باعزت مقام دینے کو تیار نہیں تھے۔ وہ کہتے تھے کہ بنگالی مسلمانوں کو پاکستانی پولیس اور فوج میں بھرتی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یہ مارشل نسل سے تعلق نہیں رکھتے، یہ تعلیمی اور جسمانی لحاظ سے کمزور ہیں اور ان میں رہنمایانہ

کردار کا فقدان ہے، وہ کہتے تھے کہ بنگالی مسلمانوں کو پاکستان کی سول سروسز میں ان کی آبادی کے لحاظ سے نمائندگی دینے میں بڑی دیر لگے گی کیونکہ یہ مطلوبہ تعلیمی صلاحیت کے حامل نہیں ہیں اور انہیں انتظامی امور کا قطعی کوئی تجربہ نہیں ہے، وہ کہتے تھے کہ تجارت وصنعت کے شعبوں میں بھی بنگالی مسلمانوں کے لئے فی الحال کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ ان کے پاس اس کام کے لئے نہ تو سرمایہ ہے اور نہ ہی تجربہ ہے۔ وہ کہتے تھے کہ پاکستان کی سیاسی زندگی میں بھی بنگالی مسلمانوں کو ان کا جائز مقام نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اس طرح مغربی پاکستان کے چار صوبوں پر مشرقی بنگال کے ایک صوبہ کی بالادستی قائم ہو جائے گی اور یہ بات اسلامی اخوت ومساوات کے اصولوں کے منافی ہوگی۔ مختصر یہ کہ کراچی اور پنجاب کے یہ سامراجی استحصالی عناصر مشرقی بنگال کو عملاً اپنی نوآبادی سمجھتے تھے، وہ اردو زبان، عربی رسم الخط اور اسلامی آئین کے نعروں کے زور سے اس نوآبادی پر اپنا غلبہ قائم رکھنا چاہتے تھے جبکہ بنگالی مسلمانوں کی تاریخی روایات، ان کی جغرافیائی پوزیشن اور ان کے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق ومفادات کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اس غلبہ کی مزاحمت کریں۔ چنانچہ 1948ء کے اوائل ہی سے یہ مزاحمت شروع ہوگئی تھی۔ اگرچہ ان کی یہ مزاحمت 1949-50ء میں ہندوستان کے ساتھ قومی تضاد میں شدت پیدا ہونے کے باعث کوئی نمایاں پیش قدمی نہیں کر سکی تھی۔ تاہم وزیر اعظم لیاقت علی خان نے مشرقی بنگال پر کراچی اور پنجاب کے حکمران طبقوں کا غلبہ قائم رکھنے کے لئے 1950ء کے اواخر میں جو غیر جمہوری آئینی تجاویز مرتب کروائی تھیں وہ بنگالی عوام کی ایجی ٹیشن کی وجہ سے اسے بہت جلد واپس لینا پڑی تھیں، یہ ایجی ٹیشن اتنی زوردار تھی کہ جب اکتوبر 1951ء میں پنجابی شاونزم کے ہاتھوں لیاقت علی خان کا قتل ہوا تھا اس وقت مشرقی بنگال میں اس کی مسلم لیگ کا جنازہ نکل چکا تھا اور مشرقی بنگال کی مغربی پاکستان سے علیحدگی کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔

حوالہ جات

باب: 1 نا اہل اور غیر مقبول ناظم الدین وزارت اور بنگالیوں پر غیر بنگالی افسروں اور اردو زبان مسلط کرنے کی ابتدا

1- Chaudhry Mohammad Ali, *Emergence of Pakistan*; Lahore, 1973 pp. 334-40

2- *Proceedings of the First All-Pakistan Political Science Conference* 1950, Lahore, 1950, pp. 1-3

3- Kamaruddin Ahmad, *A Social History of Bengal*, Dacca, 1970, pp. 91-92

4- *Constituent Aseembly of Paksitan Debates*, Karachi, 1956, Vol.1 January 16, 1956 pp. 16-18

5- Quaid-e-Azam Mohammad Ali Jinnah, *Speeches as Governor General of Paksitan 1947-48*, Karachi 1949 pp. 60-61

6- *The Pakistan Times*, Lahore, July 10, 1948

7- S.M. Ikram, *Modern Muslim India and the Birth of Paksitan*; Lahore, 1970 pp. 307-208

8- *Dawn*, Karachi, August 27, 1947

9- *Ibid*; September 12, 1947

10- Chaudhry Mohammad Ali, *op. cit*; p. 362

11- *The Pakistan Times*, Lahore, September, 10, 1947

12- *Dawn*, Karachi, September, 11, 1947

13- *Ibid*; September 24, 1947

14- *Ibid*; October 22, 1947

15- *Pakistan Times*, Lahore, November 6, 1947

16- *Ibid*, November 11, 1947

17- *Dawn*, Karachi, Nov 17, 1947

18- *The Pakistan Times*, Lahore, December 3, 1947

19- *Dawn*, December 3, 1947

20- *Ibid*; December 9, 1947

21- *The Pakistan Times*, Lahore, December 12, 1947

22- *Dawn*, Karachi, December 14, 1947

23- *The Civil & Military Gazette*, Lahore December 14, 1947

24- *Dawn*, Karachi, December 17, 1947

25۔ نوائے وقت لاہور۔18دسمبر1947ء

26- *Dawn*, Karachi, December 16, 1947

27۔ نوائے وقت لاہور۔18دسمبر1947ء

28- *Dawn*, Karachi, December 23, 1947

29- *The Morning News,* Calcutta, January 7, 1948

30- *Dawn*, Karachi, January 6, 1948

31- *The Morning News*, Calcutta, January 10, 1948

32- *Dawn*, Karachi, January 13, 1948

33- *The Morning News*, Calcutta, January 15, 1948

باب:2 مشرقی بنگال کے فوجی، معاشی، سیاسی اور ثقافتی حقوق کے مطالبوں پر کراچی اور پنجاب کے ارباب اقتدار کا معاندانہ رویہ

1- *Dawn*, Karachi, January 13, 1948

2- *Ibid*; January 23, 1943

3- Ayub Khan, *Friends Not Masters*, London, 1967. pp. 25-26

4- *Ibid*; p. 24

5- *Dawn*, Karachi January 16, 1948

6- *Ibid*; February 2, 1948

7- *Ibid*; February 15, 1948

8- *The Morning News*, Calcutta, February 17, 1948

9- *Civil & Military Gazette*, Lahore. February 15, 1948

10۔ نوائے وقت لاہور۔ 19/فروری 1948ء

11- *Dawn*, Karachi, February 20, 1948

12- *Ibid;* February 14, 1948

13- *Ibid*; January 4, 1948

14- *Ibid*; January 7, 1948

15- Jyoti Sen Gupta, *Eclipse of East Pakistan*, Calcutta, 1963 p. 32

16- *The Pakistan Times*, Lahore, August 22, 1947

17- *The Civil & Military Gazette*, Lahore, December 10, 1947

18- *The Pakistan Times*, Lahore, February 21, 1948

19- *Dawn*, Karachi, February 20, 1948

20- *The Pakistan Times*, Lahore, February 24, 1948

21- *Constituent Assembly of Pakistan Debates*, Vol. II, Feb 24, 1948. p. 6

22- *Ibid*; p. 7

23- *Ibid*; p. 8

24- *The Pakistan Times*, Lahore, February 14, 1948

25- *Constituent Assembly of Pakistan Debates*, Vol. II; February 25, 1948. p. 15

26- *Ibid*; p. 16

27- *Ibid*; pp 17-18

28- *Ibid*; pp. 18-20

29- *Ibid*; p. 18

30- *Ibid*; p. 20

31- *Ibid*; p. 20-21

32- *Dawn*, Karachi; February 16, 1948

33- *The Pakistan Times*, Lahore, February 29, 1948

34- *Ibid*; March 2, 1948

35۔ نوائے وقت لاہور۔3/مارچ1948ء

36- *Dawn*, Karachi, March 8, 1948

37- *Ibid*; March 4, 1948

38- *Ibid*; March 6, 1948

39۔ نوائے وقت لاہور۔6/مارچ1948ء

40- *The Pakistan Times*, Lahore, March 10, 1948

41- *Dawn*, Karachi, February 23, 1948

42- *Constituent Assembly (Legislature) of Pakistan Debates*; Vol.1; 1948, 28th February, 1948. p. 34

43- *Ibid;* March 1, 1948. p. 53

44- *Ibid;* pp. 60-61

45- *Ibid;* p. 77

46- *Ibid*; pp. 82-83

47- *Ibid*; pp. 90-91

48- *Ibid*; pp. 95-96

49- *Ibid*; March 2, 1948. pp. 117, 118

50- *Ibid;* pp. 127, 128

51- *Ibid*; pp. 137, 138 and 141

52- *Ibid*; pp. 146, 149 and 150

باب: 3 بنگلہ کے حق میں صوبہ کے عوام الناس کی بھرپور ایجی ٹیشن اور قائداعظم کا دورۂ مشرقی بنگال

1- *The Pakistan Times*, Lahore, March 12, 1948

2- *The Mornings News*, Calcutta; March 15, 1948

3- *Dawn*, March 12, 1948

4- *The Civil & Military Gazette*, Karachi March 13, 1948

5- Kamaruddin Ahmad, *op.cit*; pp. 99, 100

6- *The Morning News*, Calcutta, March 14, 1948

7- *Ibid*; March 22, 1948

8- *Dawn*, Karachi, March 14, 1948

9- *The Pakistan Times*, Lahore March 17, 1948

10- *Ibid*; March 17, 1948

11- Mohammad Ayub Khan, *op. cit*; pp. 29-30

12- *The Pakistan Times*, Lahore, March 18, 1948

13- *Dawn*, Karachi, March 19, 1948

14- *The Morning News*, Calcutta, March 17, 1948

15- *Ibid*; March 19, 1948

16- *Dawn*, Karachi, March 21, 1948

17- *The Morning News*, Calcutta, March 22, 1948

18- *Ibid*; March 24, 1948.

19- Quaid-i-Azam Mohammad Ali Jinnah. *op.cit;* pp. 82-91

20- *Dawn*, Karachi, March 24, 1948

21- *Ibid*; March 25m 1948

22- *The Morning News*, Calcutta, March 25, 1948

23- Quaid-i-Azam Speeches *op. cit*; pp. 94-95

24- *Dawn*, Karachi, March 25, 1948

25- Kamaruddin Ahmad, *op. cit*; p. 100

26- *The Morning News*, Calcutta, March 25, 1948

27- *Dawn*, Karachi, March 27, 1948

28- *Ibid*; March 27, 1948

29- *The Pakistan Times*, Lahore, March 28, 1948

30- Quaid-i-Azam *op. cit*; p. 109

31- Chaudhry Mohammad Ali, *op. cit*; p. 368

32- *The Pakistan Times*, Lahore. April 12, 1948

33- *Ibid*; April 4, 1948

34- *The Morning News*, Calcutta, April 3, 1948

35- *Ibid*; April 8, 1948

36- *Dawn*, Karachi, April 8, 1948

37- *Ibid*; April 10, 1948

38- *Ibid;* April 11, 1948

39- *Ibid*; April 15, 1948

40- *Ibid*; April 23, 1948

باب : 4 بگڑتی ہوئی معاشی صورتحال اور بھاشانی، سہروردی اور کمیونسٹ پارٹی سے حکومت کو خطرہ

1- *The Morning News*, Calcutta May 14, 1948

2- *Ibid*; May 19 and 24, 1948

3- *Dawn*, Karachi, June 1, 1948

4- *The Morning News*, Calcutta, May 27, 1948

5- Kamaruddin Ahmad, *op. cit*; p. 84

6- *The Pakistan Times*, Lahore, June 5, 1948

7- *Ibid*; June 6, 1948

8- *Dawn*, Karachi, June 5, 1948

9- *The Pakistan Times*, Lahore, June 8, 1948

10- *Constituent Assembly of Pakistan Debates*, Vol. III, 1948-49 May 22, 1948, pp. 57-58

11- *Ibid*; p. 66

12- *The Pakistan Times*, Lahore, May 9, 1948

13- *Ibid*; May 22, 1948

14- *Ibid*; June 10, 1948

15- *Ibid*; June 26, 1948

16- *The Morning News*, Calcutta, July 2, 1948

17- *Ibid*; July 4, 1948

18- *The Pakistan Times*, Lahore, July 9, 1948

19- *Dawn*, Karachi, July 11, 1948

20- *Ibid*; July 11, 1948

21- *The Morning News*, Calcutta, July 4, 1948

22- *Dawn*, Karachi, July 11, 1948

23- *Ibid*; July 17, 1948

24- Mohammad Ayub Khan, *op. cit.* p. 28

25- *Dawn*, Karachi, July 24, 1948

26- *The Pakistan Times*, Lahore, July 25, 1948

27- *Dawn*, Karachi, August 13, 1948

28- *Ibid*; August 11, 1948

29- *The Morning News*, Calcutta August 27, 1948

30- *Dawn*, Karachi, August 29, 1948

31- *Ibid*; February 27, 1948

32- Yu. V. Gankovsky and Gordon-Polanskaya, *A Short History of Pakistan*, Lahore, 1973,

p. 145

33- *The Morning News*, Calcutta, July10, 1948

34- *Ibid;* August 7, 1948

35- *Dawn*, Karachi, August 21, 1948

36- *Ibid*; August 25, 1948

37- *Ibid*; August 30, 1948

38- *Ibid*; August 21, 1948

39- *The Morning News*, Calcutta, September 3, 1948

باب: 5 مرکزی حکومت کا بنگالی عوام کے سیاسی، معاشی و ثقافتی حقوق تسلیم کرنے سے انکار اور مسلم لیگ کی کوکھ سے عوامی مسلم لیگ کا جنم

1- *The Pakistan Times*, Lahore, September 15, 1948

2- *Ibid*; October 1, 1948

3- *Ibid*; October 3, 1948

4- *Ibid*; September 30, 1948

5- *Ibid*; October 6, 1948

6- *Dawn,* Karachi, October 31, 1948

7- *The Pakistan Times*, Lahore, November 6, 1948

8- *Ibid*; November 10, 1948

9- *Ibid*; November 16, 1948

10- *Dawn*, Karachi, November 16, 1948

11- *Ibid; & Pakistan Times*, Lahore, November 28, 1948

12- *Ibid*; December 16, 1948

13- *The Pakistan Times*, Lahore, December 23, 1948

14- *Dawn*, Karachi, January 4, 1949

15- *Ibid*; January 5, 9, 1949

16- *Ibid*; January 9, 1949

17- *Ibid*; Februrary 10, 1949

18- *Ibid*; February 16, 1949

19- *Ibid*; February 23, 1949

20- *Ibid*; February 26, 1949

21- *Ibid*; March 4, 1949

22- *Ibid*; March 9, 1949

23- *Ibid*; January 5, 1949

24- M. Rafique Afzal (ed), *Speeches And Statements of Quaid-i-Millat Liaquat Ali Khan (1941-51)* Lahore, 1975

25 ۔ نوائے وقت۔لاہور۔18و19/مارچ1948ء

26- *The Pakistan Observer*, Dacca, April 7, 1949

27- *Ibid*; April 9, 1949

28- *Dawn*, Karachi, June 3, 1949

29- *The Pakistan Observer*, Dacca, May 20, 1949

30- *Ibid*; July1, 1949

31- *Dawn*, Karachi, July 9, 1949

باب: 6 صوبائی مسلم لیگ کی جانب سے معاشی، سیاسی، انتظامی وثقافتی خودمختاری کے مطالبات اور کراچی وپنجاب کا فسطائی رویہ

1- *The Pakistan Observer*, Dacca, August 12, 1949

2- *Ibid*; August 26, 1949

3- *Ibid*; September 9, 1949

4۔ نوائے وقت۔لاہور۔2/اکتوبر1949ء

5- M. Rafique Afzal (ed.), *op. cit*; pp. 278-79

6- *Ibid*; p. 290

7- *The Pakistan Observer*, Dacca, October 26, 1946

8- *Dawn,* Karachi, November 12, 1948

9- *The Pakistan Observer*, Dacca, November 24, 1949

10- *Ibid.*, December 6, 1949

11- *Ibid*; December 11, 1949

12- *Ibid*; December 12, 1949

13- *Ibid*; December 14, 1949

14- *Ibid*; December 15, 1949

15- *Ibid*; December 15. 1949

16- *Ibid*; December 20, 1949

17- *Ibid*; December 25, 1949

18- *Ibid*; December 21, 1949

19- *Ibid*; December 16, 1948

20- *Ibid*; December 28, 1949

21۔ نوائے وقت۔لاہور۔ 24/دسمبر 1949ء

22- *The Pakistan Observer*, Dacca, January 10, 1950

23- *Ibid*; January 19, 1950

24- Mohammad Ayub Khan, *op. cit.* p. 26

باب:7 مشرقی ومغربی بنگال، آسام اور تری پورہ میں ہولناک ہندو۔مسلم فسادات اور اقلیتوں کے تحفظ کے لئے لیاقت۔نہرو معاہدہ

1- *Dawn,* Karachi, March 15, 1950

2۔ امروز۔لاہور۔6/فروری 1950ء

3- *Dawn*, Karachi, February 7, 1950

4۔ امروز۔لاہور۔7/فروری 1950ء

5- *The Pakistan Observer*, Dacca, February 6, 1950

6- G.W. Chaudhry, *Pakistan's Relations with India*, London, 1968,

p. 149

7- *Dawn*, Karachi, February 8, 1950

8- *Ibid*; February 12, 1950

9- M. Rafique Afzal (ed.), *op. cit*; pp. 326-27

10۔ امروز۔لاہور۔ 11رفروری1950ء

11- *Dawn*, Karachi Feb. 25, 1950

12- *Ibid*; February 25, 1950

13- M. Rafiq Afzal (ed.), *op. cit*; pp. 328-35

14- *Dawn*, Karachi, March 9, 1950

15- *Ibid*; March 10, 1950

16- *Ibid*; Karachi, March 28, 1950

17- *Ibid*; March 26, 1950

18- *Ibid*; March 29, 1950

باب: 8 غیر بنگالیوں کی آمریت اور لیاقت علی کی غیر جمہوری و غیر وفاقی آئین مسلط کرنے کی کوشش، بنگالی عوام سراپا احتجاج بن گئے

1- Chaudhry Mohammad Ali, *op. cit*; p. 363

2- Mohammad Ayub Khan, *op. cit*; pp. 26-27

3- *The Pakistan Observer*, Dacca July 13, 1950

4- *Ibid;* July 28, 1950

5- *Dawn*, Karachi, August 13, 1950

6- Muhammad Ayub Khan, *op. cit*, p. 24

7- *The Pakistan Observer*, Dacca, September 13, 1950

8- *Ibid*; September 12, 1950

9- *Ibid*; September 30, 1950

10- *Ibid*; October 2, 1950

11- *Ibid*; October 4, 1950

12- *Ibid*; October 4, 1950

13- *Ibid;* October 11, 1950

14- *Ibid*; October 18, 1950

15- *Ibid*; October 27, 1950

16- *Ibid*; October 31, 1950

17- *Dawn*, Karachi, November 2, 1950

18- *The Pakistan Observer*, Dacca, November 1, 1950

19- *Dawn*, Karachi, November 3, 1950

20- *The Pakistan Observer*, Dacca, November 6, 1950

21۔ نوائے وقت۔لاہور۔23/نومبر1950ء

باب:9 دونوں بازوؤں کے مابین مشترکہ مفاد کی بنیاد پر اتحاد استوار کرنے کی بجائے مذہبی نعروں کی آڑ میں مشرقی بازو کا استحصال کیا گیا

1- *The Pakistan Observer*, Dacca, November 19, 1950

2۔ نوائے وقت۔لاہور۔یکم دسمبر1950ء

3- *The Pakistan Observer*, Dacca December 19, 1950

4۔ نوائے وقت۔لاہور۔ 10/نومبر1950ء

5۔ ایضاً۔23/دسمبر1950ء

6- *The Pakistan Observer*, Dacca, December 25, 1950

7- Mohammad Ayub Khan, *op. cit*; p. 25

8- *The Pakistan Observer*, Dacca, January 6, 1951

9- (i) *Dawn*, Karachi, January 8, 1951

(ii) *The Pakistan Observer*, Dacca, January 18, 1951

10۔ نوائے وقت۔لاہور۔21/اکتوبر1951ء

11۔ ایضاً۔10رجنوری1951ء

12- *Ibid*; January 16, 1951

13- *Ibid*; January 18, 1951

14- *Dawn*, Karachi, January 17, 1951

15۔ نوائے وقت۔لاہور۔18رجنوری1951ء

16۔ (الف)ایضاً۔19رجنوری1951ء

16- (ii) *The Pakistan Times*, Lahore, January 17, 1949

(iii) *The Pakistan Observer*, Dacca, January 16, 1951

17- *Ibid*; January 19, 1951

18۔ نوائے وقت۔لاہور۔24رجنوری1951ء

19- *The Pakistan Times*, Lahore, January 27, 1951

20۔ (الف) نوائے وقت۔لاہور۔7رفروری1951

20- (ii) *The Pakistan Observer*, Dacca, February 3, 1951

21- *Ibid*; February 7, 1951

22- *Ibid*; February 27, 28 and March 1, 1951

23- Chaudhry Mohammad Ali, *op. cit*; p.375

24- *Dawn*, Karachi, February 4, 1951

باب:10 لیاقت علی خان اپنے قتل تک بھی مشرقی بنگال کو نوآبادی بنا کر رکھنے کی ہٹ دھرمی پر قائم رہا

1- *The Pakistan Observer*, Dacca, February 24, 1951

2- *Ibid*; March 1, 1951

3- *Ibid*; March 17, 1951

4- *Ibid*; March 19, 1951

5- (i) *Dawn*, Karachi March 24, 1951

(ii) *The Pakistan Observer*, Dacca, March 24, 1951

6- *Ibid*; March 26, 1951

7- *Dawn*, Karachi, 15, 16, 1951

8 ۔ جہاد۔لاہور۔ 7/اپریل 1951ء

9- *The Pakistan Observer*, Dacca, April 18, 1951

10- *Ibid;* April 29, 1951

11- *Dawn*, Karachi, May 7, 1951

12- *The Pakistan Observer*, Dacca, May 10, 1951

13- *Dawn*, Karachi. May 12, 1951

14- *The Pakistan Observer*, Dacca, May 22, 23 and 24, 1951

15 ۔ نوائے وقت۔لاہور۔7/جون 1951ء

16- *Dawn*, Karachi, July 17, 1951

17- *Ibid*; July 19, 1951

18- *Ibid*; July 19, 1951

19- *The Pakistan Observer*, Dacca, August 15, 1966

20- Mohammad Ahmad (col.), *My chief*, Lahore, 1960 pp. 7-8

21- *Dawn*, Karachi, November 26, 1951

22- *Ibid*; August 14, 1951

23- *The Pakistan Observer*, Dacca, September 29, 1951

24- *Ibid*; October 15, 1951

کتابیات

Ahmad, Kamarudin, *A Social History of Bengal*, Progoti Publishers, Dacca, First Pub. 1967, Revised and Enlarged, 1970.

Ali, Chaudhry Mohammad; *The Emergence of Paksitan*, Originally published by Columbia University Press, New York and London, 1967. Reprinted by the Research Society of Pakistan, University of the Punjab, Lahore, 1973.

Gankovsky, Yu. V. and Gordon-Polanskaya, *A short History of Pakistan*, People Publishing House, 1973. First Pub. Nanka Publishing House, Moscow, 1964.

Gupta, Jyoti Sen, *Eclipse of East Pakistan*, Renco, Calcutta 1963.

Ikram, S. M., *Modern Muslim India and the Birth of Pakistan*, Ashraf, Sh. Mohammad, Lahore, 1970. First pub 1965.

Khan, Mohammad Ayub, *Friends Not Masters*: A Political Autobiography, Oxford University Press, London, 1967.

Speeches And Statements of Quaid-i-Millat Liaquat Ali Khan (1941-51), Refiq Afzal M. (ed.), Research Society of Pakistan, University of Punjab Lahore, 2nd Impression. 1975

دستاویزات وسرکاری مطبوعات

Jinnah, Quaid-i-Azam Mohammad Ali, *Speeches, as Governor General of Pakistan 1947-48*, Pakistan Publications, Karachi, 1949.

The Constituent Assembly of Pakistan Debates, (Vols. for 1948 and 1949) Government Printing Press, Karachi, 1948

Proceedings of the First All-Pakistan Political Science Conference, 1950, edited by Dr. Mohammad Aziz Ahmad, The Punjab University Press, Lahore, 1950

اخبارات وجرائد

The Civil & Military Gazette, Lahore, Files of 1947 and 1948

Dawn, Karachi, Files of 1947

The Morning News, Calcutta, Files of 1947 and 1948

The Pakistan Observer, Dacca, Files of 1948-1951

The Pakistan Times, Lahore. Files of 1947-1951

امروز۔فائلیں 1950ء تا 1951ء

جہاد۔لاہور۔فائل اپریل 1951

نوائے وقت۔لاہور۔فائلیں 1947ء تا 1951ء

اشاریہ

ا

آ

چ

ح

غ

ف

گ

ن

و